جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

1718
9

مداری

احمد اقبال

9

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

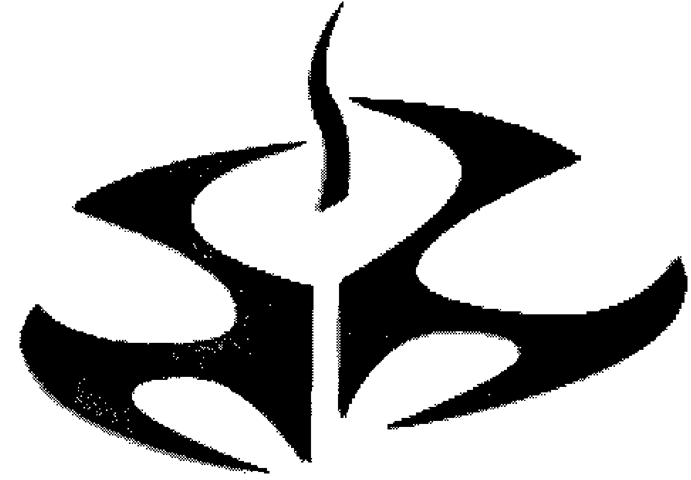
نواں حصہ

احمد اقبال

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

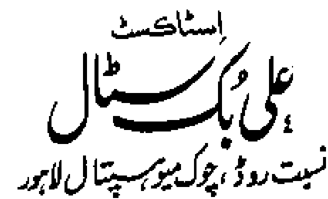


بار اوّل ——— ۲۰۰۳ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۷۰ روپے

Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

ISBN 969-517-099-7

اسٹاکسٹ


نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے وہ گھر تلاش کر لیا جس کا پتا مجھے رئیس نے لکھ کر دیا تھا۔ یہ ایک نیا بنا ہوا خوب صورت گھر تھا جس کا رقبہ شاید دو کنال ہوگا۔ سامنے والے حصے کا سرسبز لان کسی اچھے مالی کی محنت کا آئینہ دار تھا۔ درخت جو کناروں پر لگائے تھے ابھی چھوٹے تھے۔

باہر کے گیٹ میں الیکٹرونک لاک تھا۔ میں نے انٹر کام کا بٹن دبایا تو اندر سے کال بیل کی موسیقی سنائی دینے لگی لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور گیٹ کا لاک بھی نہیں کھولا۔ میں نے پھر ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور میرے قریب آکے رک گئی۔ اس میں سے رئیس اور شبنم اترے۔

شبنم نے لاک کھولا "تم کب سے کھڑے ہو؟ ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔"

رئیس نے کہا "گھر کیسا ہے؟"

"ابھی یہ ایک مکان ہے۔" میں نے کہا "رہنے والے اچھے ہوں اور ان کے نصیب اچھے ہوں تو اچھا گھر بن جاتا ہے۔"

مکان اندر سے خالی تھا۔ میں نے سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ شبنم نے مجھے مطلع کیا کہ اس گھر کے آگے پیچھے فلمی دنیا کے اور شوبزنس کے کون کون سے جانے پہچانے لوگ رہتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ ہم کیسے رہیں گے یہاں۔ اس لق ودق ویرانے میں جہاں کچھ بھی نہیں ہے دیواروں کے علاوہ۔"

"سب آجائے گا آج ہی۔" شبنم نے کہا "ہمیں کچھ دیر اس لیے ہوئی کہ ہم کچھ ضروری کام نمٹاتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے کچھ فرنیچر پسند کیا۔ وہ دوپہر تک آجائے گا۔ کارپٹ کل تک لگ جائیں گے۔ پردے البتہ دو دن بعد ملیں گے۔ وہ یہاں آکے ناپ لے جائیں گے آج۔ رئیس خانے سے تمام ضروری سامان رات کو کسی وقت نکالیں گے۔"

"خدا کے لیے اس منحوس مورتی کے سر کو مت اٹھانا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے تو میں نے کب کا تباہ کر دیا ہوتا مگر چھوڑ دیا یہ سوچ کر کہ شاید رب نواز کے ساتھ کوئی ڈیل کرنے میں کام آئے۔ یہ گاڑی کس کی ہے؟" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارے پاس ہے تو تمہاری ہے۔"

"مالک کون ہے اس کا؟"

"بابو رشید۔ اب تم کہو گی کہ بابو رشید کون۔ تو خاتون۔ انہیں میں نے بھی نہیں دیکھا۔ نیلم نے کہا ہے کہ ہم جب تک چاہیں رکھیں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "کیا ضرورت تھی اس کی؟ ہم اپنی خرید لیتے۔"

"ایک دن میں کیا سارا زمانہ خرید لو گی؟"

"کیوں؟ پیسہ خرچ کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات کسی کنجوس سرکاری افسر کی بیوی کہتی تو ٹھیک تھا۔ خدا نے اتنا دیا ہے۔"

"اچھا پھر چلو۔ مجھے بہت کام ہیں۔ ایک لمبی فہرست ہے میرے پاس۔" شبنم نے کہا "یا ایسا کرتے ہیں۔ تم جا کے کچھ کھانے کے لیے لے آؤ۔ ورنہ رئیس کہاں جائے گا۔"

"یہ کیا یہاں انڈے دے گا؟" میں نے کہا۔

"اوفوہ۔ ابھی بتایا ہے کہ سامان آئے گا۔ کسی کو تو ہونا چاہیے یہاں۔ مجھے تم کو ساتھ لے کر جانا ہے۔" شبنم نے کہا "کام تم سے ہے رئیس سے نہیں۔"

میں نے کہا "ایسا کیا کام ہے؟"

وہ مسکرائی "بہت اہم کام ہے میرے لیے بھی۔ اسے مزید ٹالا نہیں جا سکتا۔"

میں نے روتی شکل بنا کے فریادی لہجے میں کہا "لیکن۔۔۔ میں شادی سے انکار کر دوں پھر۔"

"میں گولی مار دوں گی تمھیں ٹھائیں۔" اس نے ہاتھ کی ایک انگلی سے ریوالور کا رخ میری طرف کیا "لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تمھیں تراش خراش کے انسان بنایا جائے۔ کسی افریقی بن مانس کے ساتھ پھرتے ہوئے کتنی بے عزتی ہوتی ہے میری۔"

یہاں آتے ہوئے میں ایک بازار سے گزرا تھا جہاں انسانی ضرورت کے لیے ہر چیز دستیاب تھی۔ وہاں مجھے "خدا کی شان ہوٹل" بھی نظر آیا تھا۔ اندر ایک نیم تاریک ہال میں دوپہر کے کھانے کا رش تھا۔ ان میں اکثریت بے گھر لوگوں کی تھی۔ لوگ چلا چلا کے بات کر رہے تھے کیونکہ دیوار پر آویزاں اسپیکر گلا پھاڑ پھاڑ کے انھیں ان کی پسند کے گانے سنا رہے تھے۔

میں نے بھی چیخ کر خدا کی شان ہوٹل کے پروپرائیٹر سے عرض مدعا کی۔ وہ بہت مایوس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی شاندار گاڑی سے اترنے والا ڈرائیور چکن قورمہ یا چکن بریانی کا آرڈر تو ضرور دے گا۔ اس نے ایک اور گاہک کے وسیلے سے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کی "تو جی دال روٹی ہی ڈالنی ہو پیٹ میں تو پھر کیا ضرورت ہے جان مار کے مال کمانے کی۔"

مذکورہ گاہک نے آہ بھری "اپنا بھی یہی اصول تھا پہلوان۔ اب ڈاکٹروں نے سب منع کر دیا ہے۔ نہ قورمہ نہ نہاری پائے اور مغز۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ ایسے عوامی ہوٹلوں میں گوشت کی کیا کوالٹی ہوتی ہے اور قورمے بریانی میں گھی کیسا استعمال ہوتا ہے چنانچہ میں نے دال روٹی کو ترجیح دی تھی۔ جب میں کھانا لے کر واپس پہنچا تو دروازے پر ایک ٹرک الٹا کھڑا ہوا تھا اور ریورس گیئر میں اندر جا رہا تھا۔

ٹرک میں فرنیچر لدا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ دو افراد نے اسے اتارنا شروع کیا۔ شبنم نے ذاتی طور پر اس آپریشن کی نگرانی کی اور مسلسل ہدایات دیتی رہی "دیکھو احتیاط سے۔ پالش خراب نہ ہو۔ پہلے یہ کرسیاں اتارو۔ ان کو یہاں مت رکھو۔ اندر لے جاؤ۔ لاؤنج میں۔۔۔"

میں اور رئیس کرسیوں پر بیٹھ کے شبنم کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اس نے ہر کمرے کا فرنیچر ترتیب سے اتروا کے صحیح جگہ پر رکھوایا۔ میں نے ایک میز پر کھانے کا پیکٹ کھول کے رکھا۔

شبنم بولی "یہ کیا کر رہے ہو۔ پالش خراب ہو جائے گی۔"

"میز پوش کہاں سے لاؤں میں؟ اور پالش تو ہمارے بیٹھنے سے بھی خراب ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے فرش پر بیٹھ جائیں۔"

"ایسے ہی تو چیزوں کا ستیاناس ہوتا ہے۔ ٹھہرو گاڑی میں ہوگا کوئی پرانا اخبار یا کپڑا۔" وہ اٹھ کے باہر دوڑی "خبردار۔ ابھی کچھ مت پھیلانا۔"

رئیس ہنسنے لگا "دیکھ لے پیارے۔ کیا اوقات ہوگی تیری اپنے گھر میں۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہر محبوبہ جیسے ہی بیوی بنتی ہے' گھر ہو جاتا ہے تھانہ۔ شوہر کی حیثیت ملزم جیسی ہو جاتی ہے اور گھر والی کی ایس' ایچ' او جیسی۔"

کھانا شروع ہوا بھی نہیں تھا کہ ایک اور ٹرک آ گیا۔ اس میں قالین بچھانے والے اور پردے بنانے والوں کی ٹیم آئی تھی۔ شبنم کھانا ادھورا چھوڑ کے انھیں ہدایات دینے کھڑی ہو گئی۔ ہمیں دس منٹ صبر کے ساتھ اس کے آنے کا انتظار کرنا پڑا۔

"کیسی ہیں یہ چیزیں؟" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "چنے کی دال مزے کی لگ رہی تھی۔ آلو انڈا۔۔۔"

"میں فرنیچر کی بات کر رہی تھی اور قالین کی۔"

میں نے کہا "سیکنڈ ہینڈ چیزیں بھی ایسی مل جاتی ہیں۔"

"کیا؟ یہ تمھیں پرانا سامان لگ رہا ہے؟" وہ بگڑنے لگی۔

"تو کیا نیا ہے؟ خیر ہوگا اور تم لائی ہو جہیز میں۔ میرا

مطلب ہے خرید کے تو اچھا بھی کھلائے گا۔"

"سچ بتاؤ۔"

میں نے کہا "دنیا میں جس نے ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہا اس کا انجام کیا ہوا' جانتی ہو۔ جھوٹی تعریف سننا چاہتی ہو تو واہ واہ۔ کیا بات ہے!"

"تم نے اخبار کھول کے نہیں دیکھا۔ ایک لفظ نہیں کہا کہ خبر کیسی بنائی ہے میں نے اور اداریہ کیسا لکھا ہے۔ یہ خبر سن کے بجلی گرے گی بہت سے لوگوں کے دل پر جو بڑے طرم خاں صحافی بنے پھرتے ہیں کہ میں ایڈیٹر بن گئی ہوں۔ اب تک سب کو پتا چل گیا ہوگا۔ سب تلاش کر رہے ہوں گے مجھے۔"

"کیوں؟ احتجاجی مظاہرہ کرنے کے لیے یا اظہار افسوس کرنے کے لیے۔"

وہ اپنی دھن میں بولتی رہی "اب دیکھنا اخبار کا کیا کرتی ہوں میں۔"

"مجھے معلوم ہے کیا کرو گی؟ وہی جو میرا کیا۔ ایک خاتون اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی کہ پتا ہے میں نے شادی کے بعد اپنے شوہر کو کروڑ پتی بنا دیا۔ سہیلی نے پوچھا کہ پہلے وہ کیا ہے۔ خاتون نے کہا۔ ارب پتی۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ویری فنی۔" شبنم نے منہ بنا کے کہا "بہت پرانا جوک ہے۔ آج میں نے ایک اشتہار بھی لگایا تھا اخبار میں۔"

"ضرورت رشتہ کے لیے۔" میں نے کہا "اتنی گھبراہٹ کیوں سوار ہے تم پر۔ چالیس سال ہی تو ہوئی ہے عمر۔"

"تم سیریس نہیں ہو سکتے۔ میں نے تمھارے لیے اشتہار لگایا تھا۔ کسی اچھے علاقے میں ایک آفس چاہیے۔ کسی اچھے کاروباری علاقے میں پندرہ سے بیس ہزار اسکوائر فٹ۔ ترجیحاً کسی کمرشل بلڈنگ کا ایک فلور۔ بروکرز کے فون آ رہے ہوں گے۔"

میں نے کہا "جی چاہتا ہے اس بات پر تمھارا منہ چوم لوں۔"

وہ شرما کے ہنسی "بدتمیزی نہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا "یہ تو جائز ہے نا۔ پتا نہیں یہ رئیس خاں کیوں موجود ہیں اس وقت یہاں۔ کوئی کام نہیں ہے تمھیں بھائی؟"

رئیس ہنسنے لگا "تو فرض کر سکتا ہے کہ میں اندھا بہرا ہوں۔ ویسے بھی اپنے درمیان کوئی پردہ نہیں۔"

شبنم کھڑی ہو گئی "چلو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کے میں نے کہا "شبنم! آج کا دن واقعی یادگار بنا دیا ہے تم نے۔ اپنی خوش قسمتی پر میں جتنا ناز کروں کم ہے۔"

وہ خوش ہوئی "جھوٹ بول رہے ہو یا سچ؟"

"اس سچ کا اعتراف الفاظ میں کیسے کروں میں۔ تمھارے حسن اور تمھاری ذہانت کا تو زمانہ معترف ہے۔ ایڈیٹر تم کیسی ہو۔ مجھے اس سے کیا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری زندگی کے لیے تم کتنی اہم اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ جیسے بلب کے لیے بجلی۔ جیسے کار کے لیے پیٹرول۔"

وہ ہنسنے لگی "میں تمھیں پہلے لے جا رہی ہوں ایک ہیئر ڈریسر کے پاس۔ بالوں کا یہ جنگل صاف کراتا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اتنی جلدی کیا ہے؟"

"جلدی ہے۔ یہ حلیہ بہت بدنام اور خطرناک ہو گیا ہے۔ صرف رب نواز نہیں وہ ڈی ایس پی کیانی بھی اس حلیے کے داڑھی والے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور تمھیں اب ایک بالکل نئی متاثر کرنے والی اور اہم شخصیت بنانا ہے...... تم ہیئر ڈریسر کے پاس بیٹھنا۔ میں اتنی دیر میں تمھارے لیے پینٹ شرٹ اور نئے شوز لے کر آتی ہوں مگر اس کے لیے سائز کا مسئلہ ہوگا۔"

میں نے کہا "سائز کو چھوڑو۔ اپنی پسند سے لے آنا اور زبردستی پہنا دینا۔ میں اُف تک نہیں کروں گا۔ جو کرن کے۔"

وہ مسکرانے لگی "کتنے عرصے بعد تم اصل روپ میں نظر آؤ گے۔ میں بہت ایکسائٹڈ ہوں یہ سوچ کے۔"

میں نے کہا "مجھے اس تجویز سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور میں تمھارے جذبات کی قدر بھی کرتا ہوں مگر میں عجلت میں کام کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"یہ کام پہلے ہو جاتا تو تم بہت سے مسائل سے بچ جاتے۔ اب بھی خیر ہے مزید نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ اتنی جلدی حلیہ بدلنے سے شکوک پیدا ہوں گے۔ کل ہی مجھے اس ڈی ایس پی خورشید کیانی۔ ایس ڈی ایم۔ عزیز ہاشمی اور تمھارے صحافی ساتھیوں نے اسی حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ کیا سمجھیں گے۔ میں اپنا گیٹ اپ بدلتا رہتا ہوں؟"

"جس کا جو دل چاہے سمجھے۔ آدمی اپنی وضع قطع کے معاملے میں آزاد ہے اور یہ اگر بنیادی حقوق میں شامل نہیں ہے تو ہونا چاہیے۔ میں شلوار قمیص پہنوں یا غرارہ شرارہ۔ بالوں کو کھلا چھوڑوں۔ تراشوں یا جوڑا بناؤں۔ میری مرضی۔

آدمی ڈاڑھی رکھے یا مونچھیں پالے۔ گنجا ہو جائے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات اصولی طور پر ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"اس معاملے میں تمہاری اگر مگر نہیں چلے گی۔" شبنم نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"یعنی تم بچوں کی طرح زبردستی مجھے پکڑ کر لے جاؤ گی اور حجام کے سامنے بٹھا دو گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور تم نہ مانے تو رات کو سوتے میں قینچی سے خود سارا جھاڑ جھنکاڑ صاف کردوں گی۔ بالوں میں لگا دوں گی ہیئر رموونگ لوشن۔ ڈی ایس پی کیانی اور صمد خاں کا تو جلوس نکل ہی نکل گیا تھا کورٹ میں۔ رہی سہی کسر آج اخباروں نے پوری کردی ہے۔ ان کی تم فکر مت کرو۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میرا وہ حلیہ پرابلم پیدا کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھا جس نے دلنواز کو اغوا کیا تھا۔ پکڑا میں گیا۔"

میں نے کہا "او کے بابا۔ تم ہاریں اور میں جیتا۔"

"کیا؟ چکر دے رہے ہو مجھے۔" شبنم ہنسی۔

میری توجہ ذرا سی دیر کے لیے ڈرائیونگ سے ہٹ کے شبنم کی طرف ہوگئی تھی۔ اس نے میری طرف جھک کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا کے آنکھیں بند کرلیں۔ بہت عرصے بعد اس نے وہی ہیجان انگیز خوشبو لگائی تھی جو اس کی شناخت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ مجھ پر مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھنے دو۔ اچھا ہے دونوں پکڑے جائیں۔" وہ ہنسی۔

"شبنم۔ ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "ہو جانے دو۔ اچھا ہے دونوں مرجائیں۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔ سائڈ روڈ سے ایک گاڑی تیزی سے نکلی اور میرے سامنے آگئی۔ اگر میں پوری طرح مستعد ہوتا تب بھی گاڑی کو ٹکرانے سے بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ ملٹری ماڈل کی ایک جیپ تھی جس میں ڈیزل انجن ڈالا گیا تھا۔ اس کے اصل فریم پر کھلے حصے میں پائپ لگا کے ایک جنگلا سا بنایا گیا تھا۔ آگے پیچھے فولادی شہتیروں کا بمپر نصب کیا گیا تھا اور اصل پہیوں کی جگہ بہت بڑے ٹائر لگائے گئے تھے جو جنگلی ٹائر کہلاتے ہیں۔ جیپ کے جنگلے پر سرخ رنگ تھا مگر ٹائروں کے درمیان کا حصہ زرد نارنجی کردیا گیا تھا۔ ایسی جیپ ایک چلتا پھرتا ٹینک ہوتی ہے جسے شوقین مزاج اور شہدے اپنی بدمعاشی کو مشتہر کرنے کے لیے شہر کی سڑکوں پر اندھا دھند دوڑاتے ہیں اور نازک قیمتی کاروں کے مالکوں کو چیلنج دیتے پھرتے ہیں کہ ہمت ہے تو ہم سے ٹکراؤ۔

جیپ بائیں طرف سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کا پچھلا بمپر میری گاڑی کے بائیں حصے پر لگا۔ کار کا اگلا مڈگارڈ ادھڑ گیا اور بائیں ہاتھ کی لائٹس ایک چھناکے سے بکھر گئیں۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ جب میں نے غیر ارادی طور پر کار کو بچانے کے لیے دائیں طرف کیا تو مجھے پیچھے سے اوور ٹیک کرنے والی ایک فاکس ویگن دائیں طرف کے مڈگارڈ میں گھس گئی۔ یہ سب ایک سیکنڈ میں ہوگیا۔ غلطی میری نہیں تھی مگر نقصان میرا بھی ہوا اور فاکس ویگن کا بھی۔ جیپ کا کیا بگڑ سکتا تھا۔ اس کا بمپر چار انچ چوڑے فولادی شہتیر کو ویلڈ کرکے لگایا گیا تھا۔

گاڑی میری ہوتی تب بھی مجھے غصہ آتا۔ یہ کار کسی اور کی تھی۔ اس کا حلیہ خراب ہوگیا تھا۔ اسے دوبارہ اصل حالت میں لانا بیس پچیس ہزار کا نسخہ تھا اور وقت کا زیاں اضافی تھا۔ دوسری طرف سے فاکس ویگن کے ڈرائیور نے میرا راستہ روک کے چلانا شروع کردیا۔

"بیڑا غرق کردیا میری گاڑی کا۔"

میں نے کہا "میری اس میں کوئی غلطی نہیں۔"

"پھر کیا میری غلطی ہے۔ ڈرائیونگ آتی ہے تمہیں۔ لائسنس ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم نے اس جیپ کو دیکھا نہیں تھا۔ میرا تو ڈبل نقصان ہوگیا۔ ایک طرف سے اس نے مارا دوسری طرف سے تم نے۔"

"تمہاری گاڑی لہرائی تھی۔ سارا قصور تمہارا ہے۔"

فاکس ویگن چلانے والا ایک جوشیلا نوجوان تھا جس نے رنگین ڈھیلی ڈھالی اسپورٹ شرٹ کے ساتھ نیکر ٹائپ برمودا شارٹ پہن رکھے تھے۔ اس کے پاؤں میں چپل تھے۔

میں نے کہا "تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟ عمر کیا ہے تمہاری؟"

"کیا؟ تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ میں تمہیں اور تمہاری معشوقہ کو گاڑی سمیت بند کرادوں گا۔" وہ انگریزی میں شور کرنے لگا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔"

اس وقت تک لوگ جمع ہوگئے تھے۔ نوجوان نے سب کو مخاطب کرکے چلانا شروع کیا "دیکھو اس ڈاڑھی والے کے کرتوت۔ یہ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور لڑکی اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر سر رکھے۔۔۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ میرے ساتھ شبنم کی پوزیشن بہت خراب ہو رہی تھی۔ ابھی تک اس نے باہر آکے جھگڑے میں

پڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نوجوان لڑکا جس کی صحت یقیناً بہت اچھی تھی مگر عمر کم تھی کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا جس کا باپ پولیس یا انتظامیہ کا کوئی افسر ہو سکتا تھا۔ وہ اسی کی طاقت پر اکڑفوں دکھا رہا تھا اور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ میں اس لیے بھی بات ختم کرنا چاہتا تھا کہ کسی حد تک غلطی میری تھی اور میں اس بچے کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ حد سے بڑھنے لگا تو شبنم کو باہر آنا پڑا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت مجمع دیکھ کے ایک ٹریفک سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل روک لی اور شبنم نے اسے روک لیا۔ اس نے اپنی شناخت کرا کے پورا فائدہ حاصل کیا۔ صورت حال ایک دم ہمارے حق میں ہوگئی۔ سارجنٹ نے پہلے تو لوگوں کو ڈانٹ کے چلتا کیا "چلو پھٹو ادھر سے۔ نکمے لوگ۔ مداری کا تماشا ہو رہا ہے ادھر۔" اس نے کہا اور پھر نوجوان سے مخاطب ہوا "ہاں بھئی۔ یہ کیا رولا ہے۔"

نوجوان نے پھر انگریزی شروع کی "یہ جنگلی آدمی گاڑی چلاتے ہوئے مستی کر رہا تھا اس عورت کے ساتھ۔"

سارجنٹ نے کہا "اپنا ڈرائیونگ لائسنس نکالو۔"

لڑکا کچھ نروس ہوا "میری کیا غلطی ہے آفیسر۔"

"کوئی غلطی نہیں ڈرائیونگ لائسنس دکھا دو۔ کاغذات گاڑی کے۔ تمہاری گاڑی ہے یا چوری کرکے لائے ہو۔ سیر سپاٹے کے لیے؟"

"کیا میں ایسا نظر آتا ہوں۔" وہ چراغ پا ہوگیا۔

"ہاں۔ اسی لیے میں نے کہا۔" سارجنٹ کا ہاتھ آگے بڑھا رہا۔

"میں کمشنر کے پی اے کا بیٹا ہوں۔" اس نے کاغذات دے دیے۔

سارجنٹ نے کاغذات کو دیکھے بغیر کہا "او ہو۔ کیا نمبر ہے گاڑی کا۔ یہ گاڑی تو ایک واردات میں استعمال ہوئی ہے آج۔ وائرلیس پر پیغام ملا تھا۔"

لڑکا بگڑ گیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

سارجنٹ نے شبنم سے مخاطب ہو کے کہا "آپ جائیں جناب۔ مجرم کی شناخت کے لیے تکلیف دیں گے آپ کو ایڈیٹر صاحب۔ بس آپ کچھ خیال کیا کرو ہمارا۔ ہم تو بہت عزت کرتے ہیں اخبار والوں کی۔"

لڑکے کا رنگ فق ہوگیا "یہ کسی اخبار کی ایڈیٹر ہیں۔"

سارجنٹ نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "میرے پیچھے پیچھے گاڑی کو تھانے لے آ۔"

مجھے کچھ افسوس بھی ہوا مگر اس بددماغ لڑکے کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ اسے کہیں تو یہ سبق ملنا ضروری تھا کہ ہر فرعون کے غرور کی شکست کے لیے ہر دور میں اور ہر جگہ کوئی موسیٰ بھی مل جاتا ہے۔ شبنم کا موڈ اس کی باتوں سے سخت خراب ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "بھئی وہ کمشنر کے پی اے کا پتر ہے۔"

"جھوٹ بک رہا تھا وہ۔ اس قسم کے لونڈے خود کو کسی پائے خان کا پتر ظاہر کرکے بدمعاشی دکھاتے پھرتے ہیں۔ پولیس والے پہچانتے ہیں انہیں۔ ایسا ہوتا تو سارجنٹ کبھی اس کے منہ پر تھپڑ نہ مارتا۔"

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اس کی کارکردگی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ صورت بگڑ گئی تھی "اب کیا کریں۔ گاڑی کو کسی گیراج میں چھوڑ کے نیلم کو بتا دیتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس حالت میں تو گاڑی کو لے کر نہیں پھر سکتے۔ کوئی ٹیکسی لے لیں گے یا ایسا کرتے ہیں۔ پہلے آفس چلتے ہیں۔ وہاں دیکھ لیتے ہیں کہ بروکرز کے کتنے فون ریکارڈ ہوئے ہیں۔ میں اپنی گاڑی لے لیتی ہوں۔ وہیں کھڑی ہے۔" شبنم نے کہا۔

ایک کلو میٹر کے بعد مجھے فرینڈز آٹو گیراج کا بورڈ نظر آگیا۔ یہ خاصا بڑا ورکشاپ تھا اور اِن کی شہر میں گڈول تھی۔ انہوں نے گاڑی کا معائنہ کیا اور بائیس ہزار کا خرچ بتایا۔ شبنم نے یہاں بھی اپنا تعارف کرایا تو منیجر ہمیں اپنے آفس میں لے گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور تیس فیصد ڈسکاؤنٹ دے کر اخراجات پندرہ ہزار کردیے۔ اس نے یقین دلایا کہ ایک ہفتے بعد گاڑی تیار ہوگی تو اس کا کلر اوریجنل سے بہتر ہوگا اور کوئی ماہر بھی نہیں بتا سکے گا کہ اس کا کبھی ایکسی ڈنٹ ہوا تھا۔ مجھے خاصا اطمینان ہوا۔ میں نے وہیں سے نیلم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فلم اسٹوڈیو کا نمبر مسلسل بزی مل رہا تھا۔

میں گیراج سے نکل کے کسی ٹیکسی کا منتظر تھا جب شبنم نے مجھے ٹہوکا دے کر متوجہ کیا "یہ وہی جیپ نہیں ہے۔"

میں نے اس کی نظر کی سمت میں دیکھا تو وہ جیپ مجھے ایک لسی والے کی دکان کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ چار افراد جیپ کے پچھلے حصے میں فولادی پائپوں کے کٹہرے پر چڑھے بیٹھے تھے۔ ایک اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں لسی کے گلاس تھے۔

میں نے کہا "کیا تم ان میں سے کسی کو پہچان سکتی ہو؟"

"نہیں۔ اتنی دور سے شکل واضح نہیں ہے کسی کی اور

پھر ضرورت بھی کیا ہے؟"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا "ضرورت اب محسوس ہو رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

شبنم نے مزاحمت کی "ناصر۔ دفع کرو انہیں۔ بہت وقت ضائع ہو گیا ہے ہمارا پہلے ہی۔"

"ذرا قریب سے دیکھنا۔ ایک چہرہ مجھے یقیناً جانا پہچانا لگتا ہے۔" میں نے دائیں بائیں دیکھ کے سڑک عبور کی۔

دوسری طرف کی سڑک پار کر کے شبنم نے میرے خیال کی تائید کی "جیپ کے ڈرائیور کو دیکھا ہے میں نے۔"

"یہ باز ہے۔ نام ہے شہباز۔ باقی چار میں سے ایک وہی ہے۔ ہاکی پلیئرز۔ اس وقت یہ وردی میں نہیں ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ٹیم وہی ہے قاتلوں کی۔"

شبنم نے مجھے روک لیا "دیکھو۔ پندرہ ہزار کا نقصان اتنا برا نہیں۔ تم جھگڑا کرو گے تو۔۔۔"

میں نے اسے تسلی دی "نقصان کی تو بات ہی نہیں۔ اگر میں پورا کرنا چاہوں تو نیلم نہیں لے گی اور نیلم دینا چاہے گی تو وہ کب لے گا جس کی گاڑی تھی۔ میں ان سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ناصر۔ پلیز۔"

میں نے کہا "مجھے اپنی قسم مت دینا۔ میں مانوں گا نہیں تو تمہیں دکھ ہو گا۔ تم یہاں ٹھہرو' میں ابھی آیا۔" میں شبنم کو پریشان چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔

ابھی میں جیپ سے چالیس پچاس قدم دور تھا کہ ایک انوکھی بات ہوئی۔ جیپ سواروں نے ایک ساتھ خالی گلاس اٹھائے۔ انہوں نے کورس میں کہا "ون۔ ٹو۔ تھری۔۔۔" اور گلاس لسی والے کی دکان کے بڑے بڑے شیشوں پر کھینچ مارے۔

ایک زبردست چھناکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی جیپ سواروں کا بدمعاشی اور خرمستی سے بھرپور قہقہہ گونجا۔ دکان کے اندر اور باہر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لسی شاپ کا مالک اور اس کے ملازم گالیاں بکتے باہر دوڑے۔ باہر کھڑے ہو کے لسی پینے والوں نے بھی جیپ کا راستہ روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر جیپ کسی خون خوار چیتے کی طرح غرا کے آگے بڑھی تو لوگ جان بچا کے ادھر ادھر ہو گئے۔

دکان کے ساتھ ہی گلی میں موڑ کاٹتے ہوئے جیپ میرے سامنے سے تقریباً مجھے چھوتی ہوئی گزری۔ میں ایک دم اچھلا اور میرے ہاتھ میں جیپ کی سائڈ کا ایک پائپ آ گیا۔ بازوؤں کے بل پر میں نے خود کو اوپر کھینچا اور گھوم کے ان چاروں پر گرا جو پیچھے سوار تھے۔ میرے کانوں نے ایک ساتھ ان سب کی غصیلی آواز میں گالیاں سنیں پھر وہ سب مجھے دبوچنے کے لیے میرے اوپر آ گئے ان کے ہاتھ چلنے لگے اور میں نے بڑے دفاعی انداز میں ان کے حملے اور تھپڑ برداشت کیے۔ میری دخل اندازی نے انہیں سخت مشتعل کیا تھا۔

اچانک ان میں سے کوئی بولا "اوئے رکو۔ ٹھہرو۔۔۔"

"کیا ہوا؟" دوسرے نے کہا۔

"دیکھو اسے غور سے۔ کون ہے یہ۔۔۔"

تیسرے نے چلا کے کہا "اوئے یہ۔۔۔ تو وہی ہے۔"

میں نے ان کی بدمعاشی کی طاقت کو چیلنج کیا تھا۔ میرا یہ قصور ناقابلِ معافی تھا۔ پہلے ان سب کا ایک ہی خیال تھا کہ میری ساری ہڈیاں توڑ کے مجھے سڑک پر پھینک دینا چاہیے۔ اب انہوں نے جیپ روک کے آپس میں مشورہ کیا۔ میں نے بے حس و حرکت رہ کے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ان کی مار برداشت نہیں کر سکا اور بے ہوش ہو گیا ہوں۔

"اوئے یہ مر تو نہیں گیا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"پکی بات ہے کہ یہ وہی بندہ ہے۔" دوسرا بولا "جو چھوٹے ملک کو لے گیا تھا؟"

باز نے فیصلہ صادر کیا "میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ وہی۔۔۔ ہے۔"

"مگر استاد۔ کیا کرنا ہے اس کا؟"

باز نے کہا "اسے لے جاتے ہیں ملک صاحب کے پاس۔"

"یہ کل والا بندہ تو نہیں ہے نا۔ چنگی طرح دیکھ لے۔ کیا نام تھا اس کا؟"

"ناصر عظیم۔ وخت ڈال دیا اس نے ملک صاحب کو۔"

باز غرایا "اوئے سوچ سمجھ کے بکواس کرنی چاہیے۔ ملک صاحب کو آج تک کسی نے وخت ڈالا ہے؟ یہ حرامی چراغ علی ہے۔"

"چراغ علی ولد باغ علی۔" کسی نے کہا۔

"چلو پھر ملک صاحب کو دے آئیں یہ سوغات۔"

ان کے درمیان اتفاقِ رائے ہو گیا۔ میں خود ہی یہی چاہتا تھا۔ ایک بھول مجھ سے یہ ہو گئی تھی کہ میں شبنم کو سڑک کے کنارے انتظار میں مصروف چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ کسی وجہ سے میری واپسی میں دیر ہو تو وہ پروگرام کے مطابق اپنے آفس چلی جائے۔ دراصل جیپ

میں سوار ہونے سے پہلے یہ پلان خود میرے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان سب کا اچھی طرح بینڈ بجاؤں۔ سب کی ہڈی پسلی توڑ کے نیچے پھینک دوں اور ان کے سرغنہ باز کو قابو کر لوں اور ہو سکے تو اس کو بھی ناک آؤٹ کر کے جیپ میں اپنے قبضے میں لے لوں۔

یہ کام مشکل ہی نہیں خطرناک اور کسی حد تک ناممکن تھا۔ چار یا پانچ افراد سے نمٹنا اور انہیں ناک آؤٹ کر دینا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن ایک تو چلتی ہوئی جیپ میں سے بندے سڑک پر پھینکتے جانا آسان نہیں تھا۔ سڑک پر ٹریفک تھی اور یہ فلم کی شوٹنگ نہیں تھی کہ لوگ راستہ دیتے جاتے۔ جیپ کہیں بھی روکی جا سکتی تھی پھر یہ بات بھی ممکن تھی کہ وہ مسلح ہوں گے۔ سب نہ سہی ان کے سرغنہ باز کے پاس اسلحہ ہونا یقینی تھا۔

گرفتار ہو کے ملک صاحب کی خدمت میں پیش ہونے کا خیال مجھے دیر سے آیا۔ اب جیپ پوری رفتار سے شہر کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں ان بدمعاشوں کے پیروں میں پڑا ہوا تھا اور وہ مجھے فٹ میٹ کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے جوتوں سمیت اپنے پاؤں میرے اوپر رکھ لیے تھے۔ وہ اس کامیابی پر خوش تھے۔ بدمعاشی کے اس مظاہرے پر خوش تھے جو انہوں نے لسی فروش کی دکان کے شیشے توڑ کے کیا تھا۔ اس بات پر قہقہے لگا رہے تھے کہ لوگ بدحواس ہو کے بھاگے تھے تو کچھ لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور لسی کا گلاس لے کر بھاگ گئے تھے۔ وہ سب کو بزدل' نامرد اور اس سے بھی آگے کی چیز قرار دے رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان کا راستہ روکتا۔

وہ جگہ بہت پیچھے رہ گئی تھی جہاں شبنم کو میں نے جھوٹی تسلی دے کر کہا تھا کہ میں ابھی آیا۔ کیا وہ ابھی تک وہیں کھڑی انتظار کر رہی ہو گی؟ نہیں۔ اس نے سب دیکھا ہو گا۔ مجھے جیپ میں جمپ لگاتے اور جیپ کو ٹریفک میں غائب ہوتے۔ اس کے پاس گاڑی ہوتی تو شاید وہ تعاقب کرتی مگر وہ میرے ساتھ ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے ٹیکسی فوراً کہاں ملے گی اور مل گئی تب بھی جیپ کا پیچھا کرنا محال ہو گا۔ بے چاری شبنم۔ مجھے اس پر ترس آیا اور اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ وہ کیا کرے گی۔ واپس رئیس کے پاس جا کے اسے سب بتائے گی۔ فرید کو فون کرے گی۔ نیلم کو بتائے گی؟ پولیس کو رپورٹ کرے گی؟

جیپ چلتی جا رہی تھی۔ میرے لیے سر اٹھا کے راستہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ بیچ میں مجھے ناک آؤٹ کر دیں۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ ملک رب نواز شہر سے باہر اپنے کسی فارم پر روپوش ہے۔ اس کے بیوی' بچے اور وکیل سب وہیں جا کے ملاقات کر رہے ہیں۔ ضمانت منظور نہ ہونے کی وجہ سے رب نواز دن میں کہیں آنے جانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ وہ رات کے وقت دوسری گاڑی میں نکلے گا اور اپنی بہن کے پاس پنڈی چلا جائے گا۔ ایک دو دن میں وکیل اس کی طرف سے ڈویژن بینچ میں اپیل داخل کر دیں گے۔

میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ خود رب نواز کے پالتو کتے بھی زیادہ پُر امید نہیں تھے۔ وہ کھل کے ایسا نہیں کہہ رہے تھے مگر دبے دبے الفاظ میں اس خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ دشمنوں نے بڑا پکا کام کیا ہے اور شاید سپریم کورٹ بھی تفتیش مکمل ہونے تک رب نواز کی ضمانت پر رہائی منظور نہ کرے۔

رب نواز کی روپوشی کا ٹھکانا شہر سے باہر دس کلومیٹر کے فاصلے پر بھی ہو سکتا تھا اور سو پچاس کلومیٹر دور بھی۔ روایتی جاسوس کی طرح آوازوں سے سمت کا یا مقام کا اندازہ لگانے کی میری کوشش بالکل ناکام رہی۔ سڑکوں پر اپنی علیحدہ شناخت رکھنے والی آواز کوئی نہیں تھی۔ ہر جگہ وہی شور تھا۔ گاڑیوں کا۔ موٹر سائیکلوں کے سائلنسر کا۔ پریشر ہارن کا۔ تانگے والوں کا اور لوگوں کی آوازوں کا۔

بالآخر شور کم ہو گیا۔ ہم غالباً غیر آباد مضافات کے علاقے میں آ گئے تھے یا پھر کسی پوش سوسائٹی کی حدود میں تھے۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ اچانک کسی نے کہا "استاد یہ تو کدھر جا رہا ہے۔"

استاد نے سخت برا مانا "اوئے باز ہے میرا نام۔ شکرے جیسی نظر ہے میری۔ بندے کو پتا نہ ہو کسی بات کا تو چپ رہنا چاہیے۔"

اب دوسرے نے کہا "تو کسی اور راستے سے جا رہا ہے؟"

"ہاں۔ یہ شارٹ کٹ ہے۔" شہباز عرف باز نے کہا۔

میں نے سوچا کہ اب مزید انتظار سے کوئی فائدہ نہیں۔ پیچھے والے چار میں سے دو افراد میری طرف سے مطمئن تھے چنانچہ سیٹ پر پاؤں رکھ کے پائپ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ جو سیٹ پر بیٹھے تھے وہ بھی میری طرف متوجہ نہیں تھے۔

میں یوں تڑپ کے اٹھا۔ جیسے مجھے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میرے دونوں ہاتھوں کی بھرپور ضرب نے لوہے کے جنگلے پر ٹکے ہوئے دونوں افراد کو پیچھے کی طرف الٹ دیا اور وہ جنگلے

کے اوپر سے سر کے بل سڑک پر گرے۔ اس وقت جیپ کی رفتار چالیس پچاس کلومیٹر سے کم نہ تھی۔

سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں بدمعاش ایک ساتھ چلا کے مجھ پر جھپٹے۔ میں نے ایک کے منہ پر کہنی ماری اور دوسرے کے بال پکڑ لیے پھر میں نے اس کا سر فولادی پائپ سے ٹکرایا۔ جس کے منہ پر کہنی لگی تھی' اس نے ناک سے بہتے والے خون کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھے دونوں ہاتھوں سے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے گھٹنا مار کے اٹھایا اور آگے شہباز پر گرا دیا۔

شہباز نے جیپ روکنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر پھر بھی وہ سڑک پر گرنے والوں سے سو گز آگے آ چکا تھا۔ بریک لگاتے ہی اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور میری طرف رخ کر کے گولی چلا دی۔ بدقسمتی سے اس کا چوتھا ساتھی جسے میں نے شہباز پر گرایا تھا' درمیان میں آ گیا اس نے گولی کا راستہ روک لیا ورنہ اتنے کم فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے گولی کا نشانہ بننے والے کی دل خراش چیخ سنی۔ اس کا خون فوارے کی طرح دھار کی صورت میں شہباز پر گرا پھر وہ دونوں جیپ سے باہر گرے۔ میں ان کے اوپر کود گیا۔ شہباز کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میرے پاؤں کی ایک ٹھوکر اس کی گردن پر پڑی۔ وہ اچھلا اور زمین پر پاؤں رگڑنے لگا۔ اس کی گولی کا نشانہ بننے والا پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹ رہا تھا اور بری طرح چلا رہا تھا "ہائے میں مر گیا۔ اوئے مجھے مار ڈالا ظالم۔" خون کو روکنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ لال ہو گیا تھا۔

میں نے شہباز کا ریوالور سنبھالتے ہی پیچھے دیکھا۔ سو گز پیچھے سڑک پر گرنے والوں میں سے ایک وہیں ساکت پڑا تھا اور بے ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ دوسرا اپنی ٹوٹی ٹانگ کو گھسیٹتا آ رہا تھا۔ اس نے ریوالور سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ میں ڈاج کر کے جیپ کی اوٹ میں چلا گیا مگر غیر ارادی طور پر میں نے جوابی فائر کر دیا۔ گولی میری کمر اور پیٹ کی درمیانی جلد کو چھیلتی ہوئی گزر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسی آگ کی ایک لکیر نے مجھے جلا دیا ہے۔

لنگڑاتا' چیختا چلاتا اب بہت نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے صورت حال کا اندازہ کر لیا تھا۔ باز اب ساکت ہو گیا تھا۔ میری ٹھوکر سے اس کی گردن کی ہڈی چٹخ گئی تھی۔ باز کی گولی کا نشانہ بننے والا خون زیادہ بہہ جانے سے جانکنی کے عالم میں تھا۔ اس کا جسم اب بھی کرب سے بل کھا رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک غراہٹ نے لے لی تھی۔

میں نے ڈرائیونگ سائڈ کے اگلے وہیل کی اوٹ سے ریوالور نکالا اور چلا کے کہا "رک جاؤ وہیں۔ ورنہ میں بھیجا اڑا دوں گا۔"

وہ رک گیا "مجھے مت مارو۔"

میں نے کہا "ریوالور دور پھینک دو۔"

اس نے تعمیل کی۔ میں جیپ کے پہیے کی اوٹ سے سامنے آ گیا۔ باز کا ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ باز نے جو شارٹ کٹ اختیار کیا تھا وہ ایک کچے پکے مکانوں کی ملی جلی آبادی کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے نظر آ رہے تھے۔ جیپ ایک کچے راستے پر کھڑی تھی اور اس کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے خاموشی میں بڑی ہلچل پیدا کی تھی۔ لوگ گھروں کی چھتوں پر سے ادھر دیکھ رہے تھے اور ہاتھ سے اشارے کر رہے تھے۔

میں نے ٹوٹی ٹانگ والے سے پوچھا "وہ بندہ مر گیا یا زندہ ہے۔"

"پتا۔ پتا نہیں جی۔ خیر سے مر ہی گیا ہو۔" وہ سخت اذیت میں بولا۔

میں نے اس کا ریوالور بھی اٹھا لیا "بیٹھو جیپ میں۔ گاڑی چلا سکتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "لات ٹوٹ گئی ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا "ملک رب نواز کا ڈیرا کدھر ہے۔"

اس نے بڑی مشکل سے خود کو اوپر کھینچا اور ساتھ والی سیٹ پر گر کے ہانپنے لگا "ادھر۔ ادھر سے راستے کا پتا نہیں مجھے۔"

میں نے جیپ کو یوٹرن دے کر واپس لیا "ٹھیک ہے۔ ہم دوسری طرف سے چلتے ہیں۔"

جیپ سو گز پیچھے پڑے ہوئے شخص کے پاس سے گزری تو میں نے اتر کے دیکھا۔ سر کے بل گرنے سے اسے کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی۔ وہ زندہ تھا مگر ہوش میں نہیں تھا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد ایک نیم پختہ سڑک آ گئی۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے مجھ سے کہا کہ میں جیپ کو بائیں ہاتھ کی طرف موڑ لوں۔

"یہاں سے کتنی دور ہے وہ جگہ؟"

اس نے کراہ کے کہا "نزدیک ہی ہے۔"

میں نے جیپ روک لی "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو سوال میں پوچھوں' اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ تم سب رب نواز کے کتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "کتے سے زیادہ ذلیل ہوں۔"

میں نے کہا "تم لوگ ہاکی پلیئروں کی وردی پہن کے پھرتے ہو؟"

وہ خاموش رہا تو میں نے اس کے منہ پر ریوالور کا دستہ مارا۔ وہ چلا چلا کے رونے لگا "پیٹ کی خاطر سب کرنا پڑتا ہے۔"

"ایک چھوٹے قد کے مرد اور عورت کو قتل کرنے والے تم بھی تھے۔ تم نے ہاکیاں مار مار کے انہیں ہلاک کیا تھا؟"

"میں۔ میں نے نہیں۔ ایک تو جانو تھا۔ جان محمد اور دوسرا باز۔ میں باہر بیٹھا تھا۔"

"جان محمد کون تھا؟"

"وہ..... جو باز کے ساتھ ہی لمبا پڑا تھا۔" وہ بولا۔

"اگر یہ جھوٹ ہوا تو میں پھر آؤں گا۔ مجھے جانتے ہو نا؟ تم مجھے ہی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔ میں رب نواز کی کوٹھی میں گھس کے اس کے بیٹے دلنواز کو اٹھا سکتا ہوں تو تم کیا چیز ہو۔ میرا نام ہے ڈاڑھی والا جن۔ رب نواز کو بتا دینا۔" میں نے کہا اور جیپ کو آگے بڑھا دیا۔

رب نواز کا ڈیرا وہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اتنے کم فاصلے کو مزید کم کرنے کے لیے شہباز نے شارٹ کٹ کیوں اختیار کیا۔ شاید اس کی قضا آئی تھی کہ وہ سیدھے راستے کو چھوڑ کے ادھر گیا جہاں فرشتہ اجل اس کے انتظار میں تھا۔

رب نواز کا ڈیرا ایک پھلوں کا باغ تھا۔ باہر سے میں نے اونچی فصیل دیکھی۔ دس فٹ اونچی دیوار کے اندر کہیں وہ عمارت ہوگی جس میں رب نواز نے ایک مفرور مجرم کی طرح خود کو چھپا رکھا تھا۔ اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن میں نے سامنے جانے سے گریز کیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دھکا دے کر نیچے گرایا۔ وہ ہائے ہائے کرنے لگا۔

"جا کے بتا دینا رب نواز کو۔ اس کے ہاکی پلیئر کہاں کہاں پڑے ہیں اور میرا نام بھی بتا دینا۔ ڈاڑھی والا جن۔ وہ جہاں چاہے چھپ جائے۔ میں اسے تلاش کر لوں گا اور اس مرتبہ خود رب نواز کو اٹھا کے لے جاؤں گا۔" میں نے کہا اور جیپ کو موڑ کے واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

جیپ کا ڈیزل انجن بہت طاقت ور تھا۔ اس کے فیول میٹر کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک تین چوتھائی سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ فوری طور پر مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ تعاقب کرنے والے مجھے پکڑ لیں گے۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ والے کے لیے گیٹ سے اندر تک جانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ فوری طور پر کسی نے باہر نکل کے اسے دیکھ لیا ہو اور اٹھا کے ملک صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا ہو کہ ہاکی ٹیم کا ایک ٹوٹا پھوٹا کھلاڑی آیا ہے۔ اس کی پوری بات سن کے رب نواز کسی کو حکم دے کہ جاؤ اس ڈاڑھی والے جن کا پیچھا کرو اور اسے پکڑ کے لاؤ۔ یہ بھی اسی صورت میں ممکن تھا جب ڈیرے پر دوسری گاڑی موجود ہو اور تعاقب کے ماہرین بھی دستیاب ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ دس بارہ کلومیٹر کے بعد پکی سڑک اور لاہور کی شہری آبادی شروع ہوئی تو میں نے جیپ کو روک لیا۔ پہلے میں نے اسے آگ لگانے کا سوچا پھر اسے نہر میں گرانے کا خیال آیا لیکن وقت کی کمی کے باعث میں یہ دلچسپ اور خطرناک گیم نہیں کھیل سکتا تھا۔ قذافی اسٹیڈیم کے پاس جیپ کو چھوڑنے سے پہلے میں نے اس کی تلاشی لی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کے نیچے ایک خفیہ خانے سے مجھے ایک اور ریوالور ملا۔ اس کے علاوہ کرنسی کی صورت میں دس ہزار ڈالر اور اتنی ہی مالیت کے برطانوی پاؤنڈ ہاتھ لگے۔

رقم جیب میں ٹھونس کے میں نے جیپ کو ایک سائڈ پر کھڑا کیا اور پیدل چل پڑا۔ مجھے اب شبنم کا خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے پہلے سڑک پر چھوڑا تھا۔ اس نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ہی میں چھلانگ مار کے جیپ کے میدان کارزار میں کود گیا تھا اور اتنا تو اس نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ ایک کا مقابلہ پانچ سے ہوگا اور وہ پانچ پیشہ ور بدمعاش ہیں جو مسلح بھی ہوں گے۔

میرے واپس نہ آنے کے بعد اس نے کتنی دیر وہاں رک کے انتظار کیا ہوگا؟ دس منٹ۔ بیس منٹ۔ آدھا گھنٹا لیکن ایک گھنٹے بعد وہ وہاں نہیں ہو سکتی۔ کہاں ہوگی وہ؟ میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔ ابھی تک کوئی رکشا' ٹیکسی خالی نظر نہیں آیا تھا اور میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی پھر مجھے سگریٹ پان اور کولڈ ڈرنکس کی ایک دکان نظر آئی جہاں ایک شخص بوتل پیتے ہوئے فون کا ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ دکان دار اپنے فون سے پبلک کال آفس چلا رہا تھا۔ پیاس سے میرا بھی برا حال تھا۔ ایک بوتل پیتے ہوئے میں نے پہلا فون فرید عباسی کو کیا۔ یہ اس کے نئے گھر کا نمبر تھا۔ وہاں رخشی نے فون اٹھایا۔

"فرید تو کہیں گئے ہیں۔" وہ بولی "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"یہ بتاؤ۔ شبنم کا فون آیا تھا؟"

"نہیں۔ میرے پاس تو نہیں آیا۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔" اور دوسرا نمبر رحیم کا ملایا۔ رحیم مجھے گالیاں دینے لگا "تو زندہ ہے؟ الو کے پٹھے۔"

میں نے کہا "شبنم کہاں ہے؟"

"وہ گئی ہے تیرے کفن دفن کا انتظام کرنے۔ قبر میں خود کھودوں گا تیری۔" اس نے مجھے کچھ اور گالیاں دیں۔

میں نے کہا "یار تو مجھے جوتے مار لینا بعد میں۔"

"ہاں پہلے تو وہ مارے گی؟"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"کہاں ہوگی۔ اپنے آفس میں بیٹھی تقدیر کو رو رہی ہے اور کیا۔"

میں نے ریسیور رکھا۔ دکان دار کو گڈی میں سے دو ڈالر کا ایک نوٹ نکال کے دیا تو وہ چکر میں پڑ گیا "دو ڈالر۔ مجھے سات روپے دو یار۔"

میں نے کہا "بھائی ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں۔ یہی ہیں میرے پاس اور اس سے چھوٹا نوٹ بھی نہیں ہے۔ تم رکھ لو سب۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "نقلی ہوگا تو کاغذ کا پرزہ ہے۔"

میں نے اسے سمجھایا "جعلی کرنسی چھاپنے والے اتنے چھوٹے نوٹ نہیں چھاپتے۔ دس بیس اور سو ڈالر چھاپتے ہیں۔" اور میری اس بات سے وہ قائل ہوا۔

بیس منٹ بعد میں نے شبنم کے آفس میں قدم رکھا تو وہ ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھی تھی اور میز پر سر رکھے انتظار کے پر اذیت خیالوں سے لڑ رہی تھی۔ میں خاموشی سے دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے آہستہ سے کہا "شبنم۔ شبو ڈارلنگ!"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور کچھ دیر بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے۔ میں میز کے گرد گھوم کے شبنم کے پاس گیا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"ایسا۔۔۔ ایسا کیوں کرتے ہو تم آخر۔"

میں نے کہا "تم بھی پاگل ہو۔ دیکھو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہ ایک گھنٹا میں نے کیسے گزارا؟ میری جان سولی پر اٹکی رہی۔"

اس وقت آفس میں سوائے کاتب جواہر رقم لال دین کے کوئی اور نہیں تھا۔ وہ آفس میں ہی رہتا تھا اور جب میں آیا تو اپنے تخت پر کھیس کی بکل مارے اونگھ رہا تھا۔ جب ایک جذباتی اور رومانی سین شروع ہوا تو اس نے کھسک جانے میں عافیت جانی۔ میں نے شبنم کے ہسٹریا کو بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ اس کا وجود میری آغوش میں یوں کانپتا رہا جیسے ملیریا کے بخار سے پہلے سردی سے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

مجھے اس سے بار بار معافی مانگنی پڑی اور کئی بار جھوٹے وعدے کرنے پڑے۔ اس کے سر کی قسمیں کھانی پڑیں کہ آئندہ میں ایسی جان لیوا حماقت نہیں کروں گا۔ بالآخر وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے واش روم میں جا کے منہ دھویا اور اپنا میک اپ درست کرنے لگی۔

میں نے کہا "تم مجھ سے نہیں پوچھو گی کہ میں کیا تیر مار کے آیا ہوں؟"

"نہیں۔ ہم کیا تیر مارنے نکلے تھے گھر سے؟ موڈ خراب کر دیا سارا۔۔۔"

میں نے کہا "موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تو چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔"

"نہیں۔ چائے یہیں بن جائے گی۔ میں بناتی ہوں۔"

پھر تخت پر بیٹھ جانے والے لال دین نے منمنا کے کہا "سر جی چائے ہم بنا دیتے ہیں۔"

"سر تھے آزاد صاحب۔ عورتوں کو میڈم کہا جاتا ہے۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "ہو جائے گی عادت سر جی۔"

شبنم ہنس پڑی "تم مجھے صرف شبنم کہو گے۔ اب تم جاؤ اور کسی نائی کو پکڑ لاؤ۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "نائی۔ آپ کا مطلب ہے۔۔۔"

"ہاں۔ حجام۔ ہیئر ڈریسر۔ زلف تراش۔ باربر۔ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہو یا دکان میں۔ بس تم لے آؤ۔ یہ جنگل صاف کرنا ہے اور آدمی کو باہر نکالنا ہے۔ صحیح سالم۔ ناک کان سلامت رہنے چاہئیں۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "یہ کیا ظلم کر رہی ہو۔"

"یہ سزا ہے تمہاری۔ ہم جا رہے تھے کسی اچھے ہیئر ڈریسر کے پاس۔ تم نے موقع گنوا دیا۔ اب پہلے تمہارا گیٹ اَپ بدلے گا پھر نکلیں گے ہم یہاں سے۔ لال دین۔ تم کیا سن رہے ہو۔ جاؤ۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "اچھا۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔"

میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اب داڑھی والے جن کا بہروپ ختم کردوں اور بالوں کے اس انبار کو صاف کرنے کے لیے کسی ماہرِ فن کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کوئی گھسیارا بھی یہ کام کر سکتا تھا۔

جب شبنم چائے بنا رہی تھی تو میں نے اسے رب نواز کی ہاکی ٹیم کے بارے میں بتایا۔ "میں ہرگز کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا مگر ان کے ہاتھوں مرنا بھی مجھے قبول نہیں تھا۔ اگر میں انہیں ذرا بھی رعایت دیتا تو مجھے مہنگی پڑتی۔"

"وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔"

"اصولی طور پر یہ غلط لگتا ہے۔" میں نے کہا "مگر مجھے نہ ندامت ہے اور نہ احساسِ جرم۔ انہیں سزا دینے کا مجھے کوئی اختیار نہ تھا مگر ایسا ہو گیا۔ قانون کی گرفت سے خود کو بالاتر سمجھنے والے اس انجام کو پہنچے جو ہونا چاہیے تھا۔ ایک قانونی عمل کا سلسلہ چلتا تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ یہ آج بھی غلط نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ دنیا اسی لیے چل رہی ہے کہ قدرت کہیں بے انصافی اور عدم توازن گوارا نہیں کرتی۔"

لال دین ایک دبلے سوکھے اور تاڑ جیسے لمبے شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹین کی صندوقچی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کی صورت پر ہی اس کا پیشہ اور تجربہ تحریر تھا۔

ابھی میں اس کے سامنے سرنگوں ہونے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ شبنم نے فون اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہاں فرید۔ ہاں ناصر ہے یہاں۔ بات کرو گے۔" اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا "کیا مسئلہ ہے؟"

وہ خفا ہونے لگا "مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلے تم دونوں پیدا کر رہے ہو۔ پہلے شبنم نے فون کر کے مجھ سے پوچھا کہ ناصر کا کچھ پتا ہے پھر تو نے رخشی سے شبنم کے بارے میں پوچھا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "وہ جدائی کا عارضی زمانہ گزر گیا۔ ہم بچھڑ کے مل گئے۔"

"مجھے رب نواز کا پیغام ملا ہے۔ اس کے وکیل کی معرفت۔"

"صلح کے لیے۔"

"ہاں۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے مگر میں نے انکار کر دیا۔ مجھے شک ہے کہ اس کے آدمی میرے آفس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس بلڈنگ میں موجود ہیں۔"

میں نے کہا "عزیز شبنم ہاشمی کو بتایا تو نے۔۔۔"

"وہ ابھی آئے نہیں۔ میں اکیلا ہوں آفس میں۔ ڈوگر صاحب نے فون پر مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مجھے بات ضرور کرنا چاہیے۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

لیکن دوسری طرف سے فرید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک دھماکا سنا اور کئی بار کہا "ہیلو۔۔۔" مگر اس کی آواز تو جیسے کسی نے اچانک بند کر دی تھی پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا گیا۔ لائن کٹ گئی۔

میں بے آواز ریسیور کو پکڑے کھڑا رہا۔ "یہ کیا ہوا؟" شبنم نے میری صورت دیکھی "کیا ہوا؟"

"فرید تھا۔ اچھا بھلا بات کرتے کرتے غائب ہوگیا۔"

"غائب ہوگیا یعنی جیسے جن بھوت غائب ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "مذاق کی بات نہیں' وہاں کچھ ہوا ہے۔"

"لائن کٹ گئی ہے تو ریسیور پکڑے مت کھڑے رہو۔ ادھر سے وہ پھر نمبر ملائے گا تو..."

میں نے خفگی سے کہا "لائن نہیں کٹی ہے۔ دیکھو۔"

شبنم نے ریسیور کان سے لگایا "ہاں... کچھ آوازیں تو ہیں بیک گراؤنڈ میں۔ فرید کہاں چلا گیا' بات ادھوری چھوڑ کر۔"

میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا منہ دبا دیا یا ریسیور چھین لیا۔"

کاتب کے ساتھ آنے والے خلیفہ نے تین کے ایک بکس پر مشتمل اپنی موبائل ورکشاپ کے سارے آلات ایڈیٹر کی میز پر سجا دیے تھے۔ ان میں شیو یا بال کاٹنے سے کسی نومولود کو مشرف بہ اسلام کرنے کے آلات بھی شامل تھے۔ خلیفہ بات کرتے ہوئے ہکلاتے تھے۔ انہوں نے لنگی کس کے آستین چڑھائی اور بولے "آ۔ آ۔ آ..... جاؤ صوفی۔ صا۔ صا۔ صاب۔ کیا۔ کا۔ کا کاٹنا ہے..... بولو... با... بال یا... دا۔ دا۔ دا۔"

وہ غالباً میری داڑھی کے بارے میں وضاحت چاہتے تھے۔

میں نے کہا "ذرا اپنی عمر پر غور فرمایئے۔ دادا تو آپ ہیں۔ مجھے دادا کہہ رہے ہیں۔"

شبنم نے مجھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔ "ایک وہ دادا گیری والے دادا بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ فرید کی طرف سے۔ آخر اس نے بات کیوں ادھوری چھوڑ دی۔ ایسی کیا آفت آرہی تھی۔"

شبنم نے کہا "ادھر چل کے بات کرتے ہیں۔ میرے کمرے میں بھی اس نمبر کی ایکس ٹینشن ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں میں پہلے بیٹھتی تھی۔"

خلیفہ نے بے چینی سے کہا "وہ... تا... تا... تا... تم... کم ہے۔ ہمارے... پا... پا... پاس..."

میں نے کہا "ابھی بہت دن جیئیں گے آپ۔ اطمینان سے تشریف رکھیے۔"

وہ کچھ بُرا مان کے کرسی پر بیٹھ گئے۔ "پھر ایک کپ... چا... چا... چا..."

شبنم کا کمرا ایک پارٹیشن سے بنا ہوا کیبن تھا۔ اس میں تین فٹ کی بلندی تک پالش کی ہوئی لکڑی کی دیواریں تھیں۔ اوپر کے چار فٹ حصے میں اندھا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میز کے پیچھے صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک کرسی کے ساتھ دفتری ضروریات کے لیے دو شیلف رکھے جاسکیں۔ ان ریکس پر بھی رسالے' اخبار اور تراشوں کے انبار تھے۔ میز کے سامنے دو کرسیوں کی جگہ تھی۔ میں ایک پر بیٹھ گیا۔ میں نے فرید کا دیا ہوا نمبر کئی بار ملایا مگر لائن بزی تھی۔

"اس بلڈنگ میں کسی اور کا نمبر بھی تو معلوم نہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "کیا اس آفس میں ایک ہی لائن ہے۔"

"مجھے فرید نے ایک ہی نمبر دیا تھا۔ کچھ دیر دیکھتے ہیں۔"

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو ہم ایک ساتھ اٹھے مگر ریسیور میرے ہاتھ میں آگیا۔ "کون... فرید..."

فرید نے کہا "ہاں یار..."

میں نے کہا "یار کے بچے' تو نے پریشان کردیا۔ کہاں مر گیا تھا بات کرتے کرتے۔ میں تو سمجھا کہ... وہ لے گئے تجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو نے غلط سمجھا مگر تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی سوچتا۔"

"پھر بھی اچانک کیا ہوگیا تھا۔ وہ دھماکا کیسا تھا؟"

"کچھ نہیں یار' دو بندے تھے۔ زبردستی اندر گھس آئے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز نے اٹھا کے باہر پھینک دیا۔"

میں نے کہا "میں واقعی یہ سمجھا کہ رب نواز کے بندے تجھے اٹھا کر لے گئے۔"

"خواہش تو یہی ہوگی اس کی کہ ہم سب کو ایک ساتھ اٹھوا لے اور پھر ہمارے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس کے باپ دادا کی ریت تھی۔ اپنے زرخرید غلاموں اور مجبور لوگوں کی طرح جوتے مار مار کے ہمارے سارے کس بل نکال دے مگر ایسے ہر جگہ ان کی بدمعاشی تو نہیں چل سکتی۔"

"تو نے اچھا کیا کہ کورٹ سے گارڈز مانگ لیا تھا۔"

"کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ ایک ڈھیلے خان اور دوسرا ڈھالے خان میرے ساتھ بیگار بھگت رہے ہیں۔ ملے گا کیا ہم سے۔ چائے بھی پلے سے پینی پڑ رہی ہے۔ نیچے بلڈنگ کے دروازے پر اونگھتے رہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آتے جاتے لوگوں سے پانچ دس وصول کر ہی لیتے ہوں گے۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ اس بلڈنگ میں تو دس مختلف دفاتر ہیں اور سو لوگ آتے جاتے ہیں۔ تم سب کو کیسے چیک کرو گے۔ میرے ساتھ اوپر چل کے بیٹھو تو کہنے لگے کہ ہر جگہ ہم آپ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ آپ کو تو جانا ہوگا باتھ روم بھی۔ باتھ روم میں بے شک بم رکھا ہو یا کوئی توپ لیے کھڑا ہو۔ ہم تو باہر ہی رہیں گے نا۔ ان کا اصولی موقف یہ ہے کہ وہ PREMISES کے اندر نہیں جاسکتے۔"

میں نے کہا "یہ جو رب نواز کے نامہ بر آتے ہیں۔ ان کی شکلوں پر غور کیا تھا تو نے؟"

"ہاں مگر کوئی صورت مجھے دیکھی ہوئی نہیں لگی۔"

"کیا وہ چلے گئے؟"

"پتا نہیں' ہوسکتا ہے نیچے کھڑے ہوں۔"

میں نے کہا "تو نے بتایا تھا کہ مشکوک قسم کے لوگ آفس کے آس پاس موجود ہیں۔"

"ہاں' اور میرا شک بے بنیاد نہیں تھا۔ میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں ہولڈ کیے نہ بیٹھا رہوں۔"

شبنم نے کہا "سیکیورٹی کے لیے ایک کیمرے کا ہونا بھی ضروری ہے جو ایسے لوگوں کی تصویر اتار لے۔ کوئی فون بھی کرے تو ہر بات ریکارڈ ہونی چاہیے۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہونا تو بہت کچھ چاہیے مگر ہوتا نہیں۔"

فرید نے کہا "وہ دونوں نیچے ایک گاڑی کے پاس کھڑے ہیں۔ گاڑی میں بھی دو افراد ہیں۔ ایک تو ڈرائیور ہوگا مگر کسی کی صورت یہاں سے صاف نظر نہیں آتی۔"

"کیا دوسرا خود ملک رب نواز ہوسکتا ہے؟"

"اس امکان کو مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ دونوں بالکل کے بیچ گاڑی کے پاس جھکے کچھ کہہ رہے ہیں یا سن رہے ہیں۔"

"مجھے بتا آخر انہوں نے کیا کہا تھا؟"

فرید نے کہا "کچھ نہیں۔ بس وہ سیدھے اندر آنا چاہتے تھے۔ گارڈ نے روکا تو بکواس کرنے لگے پھر میں اٹھ کے گیا۔ میں نے کہا کہ کیا چاہتے ہو آخر تم لوگ تو کہنے لگے کہ ہم کو ملک رب نواز نے بھیجا ہے۔ بات کرنے کے لیے۔ میں نے کہا کہ مجھے کوئی بات نہیں کرنی اور گارڈز سے کہا کہ باہر نکال دو انہیں۔"

میں نے کہا "بات سن لینے میں کیا حرج تھا؟"

"دیکھ یار' یہ وکیلوں کا دفتر ہے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے اور ہم سارے زمانے کی سنتے ہیں تو اپنے مطلب کی بات کیوں نہیں سنیں گے۔"

"رائٹ۔ جواب تو ہمارا وہی ہوگا جو ہونا چاہیے۔"

فرید نے کہا "مگر کوئی یہاں آکے ہم سے زبردستی اپنی بات منوانا چاہے' دھمکیاں دے کہ رب نواز کی بات نہیں مانی ہم نے تو اچھا نہیں ہوگا اور بدمعاشی دکھائے۔"

میں نے کہا "فرید صاحب وہ زمانے گئے جب لوگ شرافت پر ناز کرتے تھے۔ اب بدمعاشی پر کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں نے بھی بتا دیا کہ ہم بدمعاشوں سے کیسے ڈیل کرتے ہیں۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ رب نواز کی عقل ابھی تک ٹھکانے نہیں آئی ہے۔" میں نے کہا۔

فرید نے کہا "اس نے مجبور ہوکے ہی صلح کا جھنڈا لہرایا ہے مگر جو لوگ امن کے سفیر بن کر آئے تھے' وہ خاندانی احمق اور گدھے مونچھوں پر تاؤ دیتے آئے تھے حالانکہ شامت اعمال اور اپنی بے وقوفی کے باعث ان کے آقا اور ان داتا آج دنیا سے روپوش ہیں۔ کسی کو اپنی صورت دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہے نا مقام عبرت۔"

میں نے کہا "بالکل ہے مگر وہ کہتے ہیں نا کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر۔ رب نواز جیسے لوگوں کے اصل دشمن ہوتے ہیں ایسے ہی عاقبت نااندیش اور مطلبی مشیر۔ جو غرور کے غبارے میں خوشامد اور شیخی کی ہوا بھرتے ہیں اور وہ اونچی ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ ایسا ہی لگتا ہے کہ اسے صحیح مشورہ دینے والا مخلص دوست کوئی نہیں اور خود اسے احساس نہیں ہے کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ جو سر جھکا کے گالی سن لیتے تھے' وہ اب نظر اٹھا کے سوال کرتے ہیں۔ ہم جیسے بے نام و نسب لوگ بھی ان اونچے شملے والوں کو رکھتے ہیں جوتے کی نوک پر۔"

"ان کی ایک بات نے مجھے بہت زیادہ مشتعل کیا جو کچھ عجیب تھی۔"

"کون سی بات؟"

"وہ کسی داڑھی والے جن کا پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ بہت گالیاں دے رہے تھے کہ ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔"

میں نے چونک کے پوچھا "داڑھی والا جن ہی کہا تھا انہوں نے؟"

"ہاں۔ ظاہر ہے تجھے کہہ رہے تھے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے لیکن اب تو ایسا کر کسی طرح انہیں واپس بلا کے معلوم کر کہ یہ داڑھی والے جن کا کیا چکر ہے۔"

"اس میں کیا چکر ہے؟"

"ہے ایک چکر۔" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ رب نواز کو اپنی ہاکی ٹیم کی دردناک' عبرت ناک شکست کی خبر نے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔"

"ہاکی ٹیم ــ وہی ــ؟ قاتلوں کا ٹولہ ــ؟"

میں نے کہا "ہاں وہی ــ ایک پلیئر کو میں نے زندہ سلامت پہنچایا تھا رب نواز کے پاس کہ وہ ملک کو میچ کا آنکھوں دیکھا حال سنا سکے اور شاید ملک رب نواز پر ایسا اثر ہوا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔"

"یار' وہ اتنی آسانی سے حوصلہ ہارنے والا شخص نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ اس کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ پتا چل جائے گا۔"

"مگر ہوا کیا تھا۔ مجھے بھی تو بتا۔" فرید نے کہا۔

میں نے اسے مختصراً سب بتا دیا "قضا ہی کھینچ لائی تھی انہیں وہاں ورنہ ہم تو نکلے تھے کچھ اپنے کام سے ــ"

شبنم نے خفگی سے بڑبڑانا شروع کر دیا "اور وہ کام پتا نہیں کیسے ہوگا۔ یہاں تو شروع ہو گئی ہے ٹیلی فون پر الف لیلہ۔"

فرید نے کہا "تو نے وہ جگہ بھی دیکھی۔ جہاں آدم خور شیر کی طرح دندنانے والے ملک صاحب چوہے کی طرح بل میں چھپے بیٹھے ہیں؟"

"دیکھی تو ہے مگر جیسے ہی اسے معلوم ہوا ہوگا کہ میں اس کی جیپ میں ہاکی ٹیم کے ایک ٹوٹے پھوٹے پلیئر کو دروازے تک ڈراپ کرنے آیا تھا اور پھر جیپ لے کر فرار ہو گیا۔ وہ اس ٹھکانے پر رکے گا نہیں۔ اب تک وہ کسی اور محفوظ مقام پر منتقل ہو گیا ہوگا۔ اب تو ذرا ڈپلومیسی سے کام لے۔"

"کیسی ڈپلومیسی؟"

میں نے کہا "اگر گاڑی میں بیٹھے ہوئے دو افراد میں سے ایک خود رب نواز ہوا تو وہ ان دونوں کو سمجھا بجھا کے بلکہ جھاڑ لگا کے پھر تیرے پاس بھیجے گا۔ کیونکہ وہ خود بہرحال اوپر آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ انہیں بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

میں نے کہا "کہاں سے آئے گی تمیز؟ وہ کوئی سیاست یا سفارت کار نہیں ہیں کہ صورت حالات کے مطابق سارے مضمرات پر نظر رکھتے ہوئے اور مصلحت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بات کرنے کا سلیقہ اور تجربہ رکھتے ہوں۔ یہاں تو ہمارے ڈپلومیٹس کی اکثریت غیر ذمے دارانہ بیان دینے کی ماہر ہے۔ رب نواز کے بندے بنیادی طور پر جاہل ہیں اور بدمعاش ہیں۔ وہ عاجزی اور شرافت سے بات کرنا کیا جانیں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائیں۔"

میں نے کہا "فرید صاحب' غصے میں مت آئیں۔ اپنے دماغ کو ذرا ٹھنڈا رکھیں۔ ان کے ذہن پر بھی اپنے ساتھیوں کے مارے جانے کی خبر نے الٹا اثر کیا ہوگا۔ وہ مشتعل اور انتقامی ... جذبات سے مغلوب ہوں گے۔"

"مگر اب کیا بات کروں ان سے مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا کہیں گے۔ کیا مطالبہ کریں گے۔ ان حالات میں رب نواز کیا چاہے گا۔ یہی نا...... کہ ہم اس کے خلاف الزامات واپس لے لیں پھر ہم عدالت سے باہر دوستانہ طریقے پر تمام معاملات طے کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ذرا اندازہ کرو کہ اب ملک کی دماغی حالت کیا ہے۔ موڈ کیا ہے اس کا اور وہ کس مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہے اور کن شرائط پر۔"

فرید نے بگڑ کر کہا "ایسی کی تیسی شرائط پر بات کرنے والے کی۔"

میں نے کہا "یہی تو دیکھنا ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے برابری کی بنیاد پر اور کسی پیشگی شرط کے بغیر بات کرنے پر تیار ہو۔ یا صورت حال اس کے بالکل برعکس ہو۔ رسی جل گئی ہو مگر بل نہ گیا ہو۔"

"نہیں' وہ سخت دباؤ میں ہے اور اسے ہم دبانے کی پوزیشن میں ہیں۔ ہمیں کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ کمزوری نہیں یار۔ ڈپلومیسی ہے۔ مداری کا کھیل ہے۔ جو نہ ہو وہ نظر آئے اور جو نظر نہ آئے' وہ ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اسے ہماری طرف سے کوئی ضمانت حاصل ہو تو وہ زود سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آ جائے گا۔"

فرید نے کہا "میں سمجھا نہیں۔ تو کس ضمانت کی بات کر رہا ہے؟"

"یار یہی کہ اس کے خلاف فوری طور پر قانونی کارروائی کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

فرید نے بڑے دکھی لہجے میں کہا "یار' یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ میں یہ ضمانت کیسے دے سکتا ہوں اس حرام زادے کو۔

اور وہ بھی اس جگہ۔ اپنے آفس میں جہاں ہر بات قانون کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ میں خود قانون کی مٹی پلید کروں' ایک قاتل اور مفرور مجرم کو یہ خبر دوں کہ وہ بے خوفی سے آ جا سکے۔ میں پولیس کو اطلاع نہیں دوں گا کہ وہ یہاں موجود ہے۔ اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔"

میں نے کہا "تو جذباتی ہو رہا ہے۔"

وہ چلانے لگا "ہاں میں جذباتی احمق ہوں۔ تو چاہتا ہے کہ میں منافقت سے کام لوں۔ صرف نفع نقصان کو دیکھوں۔ جائز ناجائز کی بات نہ کروں۔ میں قانون اور اصول کو بھول جاؤں۔ کیسا کردار اور کہاں کا ضمیر۔ جس شخص سے بات کرنا بھی مجھے گوارا نہیں۔"

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

وہ بولا "ناصر صاحب' آدمی گناہ کر سکتا ہے ہر جگہ مگر مسجد میں نہیں۔"

میں نے کہا "چل تو بات مت کر' ان سے کہہ دے کہ رئیس سے بات کریں۔ بات تو کہیں بھی کی جا سکتی ہے۔ تیرے آفس میں نہ سہی۔"

"میں اگر بات کروں گا تو صرف رب نواز کے وکیل سے یا پھر کورٹ میں اور آپ کے لیے بھی میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔"

"فرمایئے۔"

"داڑھی والے جن کے اس تازہ کارنامے کے بعد تو بھی غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ہے تجھے۔ وہ دونوں ایس پی اور ایس ڈی ایم ابھی معطل ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس کا محکمہ اب پہلے سے زیادہ اس داڑھی والے جن کی تلاش میں ہے۔ رب نواز کے شکاری کتے الگ تیری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اگر تو پھر پکڑا گیا بیٹا تو تیری ایک نہیں سنے گا کوئی۔ کہ تو چراغ علی ولد باغ علی ہے۔ ناصر عظیم یا کچھ اور ــ"

شبنم نے میرے منہ کے پاس منہ لا کے کہا "بس کرو خدا کے لیے۔ کچھ اندازہ ہے وقت کا تمہیں۔"

فرید ہنسنے لگا "اسے بڑی پریشانی ہے ابھی سے۔ بعد میں کیا کرے گی یہ تیرا حال سب سے چھڑا دے گی تجھے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ' ہم خود چھوڑ دیں گے سب کو۔"

فرید نے کہا "ابھی تو میری صرف اتنی گزارش ... تھی کہ آپ اس داڑھی والے جن کو چھوڑ دیں۔ انسان کے بچے بن جائیں۔ یہ گیٹ اَپ اشتہاری۔ مجرم کے حلیے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "دراصل خاتون مجھے ری کنڈیشن کر کے ویسا ہی بنانے کے لیے لائی تھی یہاں۔ ایڈیٹر اور بار بر دونوں چشم براہ ہیں میرے لیے چنانچہ فی امان اللہ۔"

شبنم نے ناراضی کے ساتھ کہا "گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "جب تم سامنے ہو تو کسی اور کی طرف دیکھنے کا گناہ کر سکتا ہوں میں۔ گھڑی گھڑی بلکہ ہر گھڑی صرف تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"دس سیکنڈ اور نہ رکھتے ریسیور تو میں یہاں سے فون بند کر دیتی۔" اس نے کرسی کی سائیڈ پر نیچے لگے ہوئے پلگ کو نکال کر دکھایا۔

"یہ ایک ایڈیٹر کے لیے کتنے شرم کی بات ہے کہ وہ اظہار رائے پر ایسی ظالمانہ پابندی لگائے اور پھر ہم کوئی قابل اعتراض گفتگو تو نہیں کر رہے تھے۔"

"ذرا خیال نہیں تمہیں کہ کتنے کام نمٹانے تھے۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا صرف تمہاری وجہ سے یا جو ہوا غلط ہوا اور الٹا ہوا وقت برباد ہوا۔ نیلم کی گاڑی تباہ ہوئی۔"

میں نے احتجاج کیا "حادثہ کیا میری غلطی سے ہوا تھا؟"

"مگر اس کے بعد جو ہوا' آپ کی حماقت تھی جس کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑتا۔ وہاں ایک نہیں چار پانچ بیل تھے اور آپ پہنچ گئے سامنے کہ آ بیل مجھے مار۔" شبنم کا غصہ کم نہیں ہوا۔

میں نے کہا "بڑی غلط رپورٹنگ کر رہی ہو تم۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آ بیل مجھے مار کھا؟"

وہ مسکرانے پر مجبور ہو گئی "اچھا اب چلو' پانچ بجے سے یہاں اسٹاف کے لوگ آنے لگتے ہیں۔ آزاد صاحب بھی پہنچ جاتے ہیں سات بجے۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دکھائی "مگر سات بجنے میں تو ابھی تین گھنٹے باقی ہیں ایڈیٹر صاحب اور اتنا تو خیر مجھے بھی معلوم ہے کہ ایڈیٹر کا اصل کام رات کو دیر سے شروع ہوتا ہے۔ آزاد صاحب کی بات رہنے دو۔ ان کا بس چلتا تو وہ دفتر کو ہی گھر بنا لیتے۔ میری تو سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ آخر وہ گھر کیوں جاتے تھے۔"

شبنم نے ان کا کمزور سا دفاع کیا "جیسا بھی تھا ــ ان کا گھر تھا۔"

"خاک گھر تھا۔ وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا' والا گھر تھا ــ ارے گھر وہ ہوتا ہے جہاں کسی کو آپ کا انتظار ہو۔ کوئی آپ

کو دیکھ کے خوش ہونے والا ہو۔ کوئی آپ کو اہمیت دینے والا ہو۔ جس کے لیے آدمی جینا چاہتا ہو مرنا چاہتا ہو۔ مجبوریوں کی ساری زنجیریں توڑ کے خود بھاگتا ہو گھر کی طرف۔"

وہ مسکرائی "اچھا جی؟ تو آپ کا یہ گھر کہاں ہے؟"

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا "دیکھو' میری آنکھوں سے میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تمہیں میرا گھر نظر آئے گا۔"

"تمہاری آنکھیں کیا آبدوز کی پیرسکوپ ہیں؟" وہ شوخی سے بولی۔

میں نے اسے بازوؤں کے شکنجے میں دبالیا۔ "بولو نظر آیا۔ یہ میرا نہیں تمہارا گھر بھی ہے جو میرے تصور میں ہے۔ اس کی تصویر تمہیں میری آنکھوں میں دکھائی دے گی۔"

وہ کسمسانے لگی "میرا سانس رک جائے گا۔ ایسے تو ___ اور کیا ہے اس گھر میں؟"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی "تم ہو تو سب کچھ ہے۔ تم نہیں ہو تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنے خوابوں اور خیالوں کے اس گھر کی تکمیل میں کب سے کررہا ہوں مگر تمہارے بغیر یہ کیسے مکمل ہوتا۔"

اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا "مجھے اور بتاؤ اس گھر کے بارے میں۔"

میں نے کہا "اس میں سکون ہے اور راحت ہے۔ پیار ہے اور اعتماد ہے ۔ ہم ہیں اور ہمارے بچے ہیں۔"

وہ جیسے خواب دیکھنے لگی "ہمارے بچے؟"

"ہاں' بچے پہلے مسکرانا بھی نہیں جانتے پھر اچانک ایک دن مسکرانے لگتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ گھٹنوں کے بل اور پھر لڑکھڑا کے چلنے لگتے ہیں پھر اسکول جاتے ہیں۔ کسی دن صبح صبح بستہ اٹھا کے روتے بسورتے ___ پھر ایک دن گاؤن پہن کے کانووکیشن میں شریک ہوجاتے ہیں اور اتنے بڑے ہوجاتے ہیں کہ بیٹیوں کو دلہن بنا کے رخصت کرنا پڑتا ہے اور بیٹوں کے لیے چاند سی دلہن لانے کا وقت آجاتا ہے۔ اور ___ اور جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ گھر میں بہت سے شریر بدمعاش اور لڑاکا بچے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کاٹنے اور کھلکھلا کر ہنسنے والے' آرائشی اشیا اور شیشے توڑنے والے۔ نواسے نواسیاں۔ پوتے پوتیاں۔ تو پھر یہ گھر مکمل ہوتا ہے۔ یہ بڑا لمبا بہت صبر آزما اور طویل انتظار کا عمل ہے۔"

"مگر یہ خواب تو میرا تھا۔ اسے تم اپنا خواب کیوں کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کیوں نہ کہوں۔ کیا تم نے مجھے اس کا حق نہیں دیا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہ خواب کسی اور کے حوالے کردو یا اسے کسی اور خواب سے بدل ڈالو۔ میرے پاس پھر کچھ بھی نہیں رہے گا ناصر۔"

میں نے اس کے لبوں سے سرگوشی چرائی "میں ایک بہت لٹا پٹا مسافر ہوں۔ شبنم ___ میری ___ میرے خواب کی ___ میرے گھر کی حفاظت تم ہی کو کرنی ہے۔"

نہ جانے ہم اس کیفیت میں کب تک کھڑے رہتے مگر دوسرے کمرے میں خلیفہ کے انتظار کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ ان کے پُر احتجاج مطالبے پر کاتب جواہر رقم لال دین عرف جواہر لال نہرو نے دروازے پر دستک دیے بغیر اندر آکے ہمیں یاد دلانا چاہا کہ ___ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں نے کھلے دروازے سے ایک بہت بڑے آلو کو نمودار ہوتے دیکھا تو گھبرا کر شبنم کو چھوڑ دیا مگر اس وقت تک کاتب نے ایک بہت جذباتی رومانی منظر کا آخری سین اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ ہڑبڑا کے بولا "وہ ___ وہ ___ دراصل خلیفہ کو جلدی تھی۔"

شبنم نے بھی ہڑبڑا کے خود کو سنبھالا "ہاں ___ ہاں ___ مگر لال دین ___ یہ ___"

لال دین نے ایک شان بے نیازی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "او جی ___ اب اس خزاں دیدہ چمن میں بچا ہی کیا تھا جو خس و خاشاک تھے وہ صاف کرادیے' خلیفہ کی خواہش کے احترام میں۔ یہ فارغ البالی اچھی لگ رہی ہے۔"

معلوم ہوا کہ بے کار مباش کچھ کیا کر' کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے خلیفہ نے کہا کہ "میاں کام نہیں تھا تو ہمیں کیوں پکڑ لائے تھے اور اب تم بھی فارغ ہو ہم بھی فارغ ہیں تو کیوں نا تمہارا سر مونڈ دیں۔ لان پر گھاس نہ ہو تو اس سے صاف پکا فرش اچھا۔" اور لال دین نے جس کی اپنی نہ کوئی رائے تھی نہ خواہش' خلیفہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیا کہ یوں ہے تو یوں سہی۔ عقل کا بیج تو سر کے اندر ہوتا ہے۔"

خلیفہ نے ہکلاتے ہوئے مجھے ایڈیٹر کی کرسی پر ایسے بٹھایا جیسے ایک مجمع مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ اپنی "خلافت" سے جنہیں جادو کے کسی حیرت انگیز مظاہرے سے مداری کا کھیل دکھانے والے ہیں۔ دیکھئے ___ دیکھئے حضرات ___ غور سے دیکھئے اس مخلوق کا کیا نام ہے؟ یہ کیا جنگلی ریچھ ہے ___ جی نہیں ___ پھر یہ کیا ہے؟ بن مانس' جی نہیں یہ داڑھی والا جن ہے۔ اس کا

منہ کدھر ہے؟ ادھر؟ نہیں یہ تو اس کے کان ہیں اور یہ؟ ___ یہ اس کے کان نہیں اس کا منہ ہے۔ یہ اس کی داڑھی نہیں مونچھیں ہیں اور جسے آپ داڑھی سمجھ رہے ہیں' وہ اس کی زلفیں ہیں۔ ابھی اس میں سے ایک انسانی چہرہ برآمد ہوگا۔ داڑھی والا جن اپنا نام بتائے گا۔ ناصر عظیم مسکرائے گا۔

میں نے کہا "شبنم ___ یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے پھر کبھی داڑھی والا جن بننا پڑے۔ یہ ایک نیچرل گیٹ اپ ہے اور مجھے پسند ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔" اس نے مجھے ڈانٹا اور پھر خلیفہ کو "آپ میری صورت کیا دیکھ رہے ہیں۔ اپنا کام شروع کریں۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری شخصیت میں جو انفرادی شان پیدا ہوگئی تھی ___"

"چپ چاپ بیٹھے رہو اور دیکھو۔ میرے واپس آنے تک کہیں بھی نہیں جانا۔ قیامت بھی آجائے تو میرا انتظار کرنا۔"

میں نے کہا۔

ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک.
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

"لیکن میری شخصیت کی تخریب و تعمیر کے اس تاریخی لمحے میں تمہارا میرے قریب ہونا ازحد ضروری ہے ورنہ میں بھی خود کو کیسے پہچانوں گا۔ تمہاری نظر کی گواہی کے بغیر۔ تم کہاں جارہی ہو مجھے چھوڑ کے۔"

اس نے باہر سے ہنس کے کہا "میں یوں گئی اور یوں آئی۔ آدھے گھنٹے میں لیکن ایسا نہ ہو کہ میرے آنے سے پہلے آپ نکل جائیں کسی ایڈونچر پر۔ پنڈت جی ___ آپ خیال رکھنا۔ ہمارے صاحب باہر قدم نہ نکالیں اور کوئی یہاں سے انہیں لے جانا چاہے تو آپ گولی ماردیں۔ یہ ہمیں یہاں ملنے چاہئیں واپسی پر۔"

یہ آخری چند جملے کاتب لال دین سے مخاطب ہوکے کہے گئے تھے اور مذاق سے زیادہ کچھ نہیں تھے مگر ہمارے صاحب کہنے کے انداز میں بڑی رسانیت تھی' چاہت کی اجارہ داری تھی اور شان محبوبی تھی۔ شاید خلیفہ نے مجھے پرلے درجے کا کوئی زن مرید شوہر سمجھا ہوگا اور شبنم کو ایک حاکمانہ مزاج رکھنے والی بیوی۔ تاہم انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ میری تراش خراش کے عمل میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہوگئے تھے۔ ان کی زبان جتنا رک رک کے چلتی تھی' قینچی اتنی ہی برق رفتاری سے تان اسٹاپ میں دوڑتی۔

میں نے کچھ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ضروری کام کیا تھا جو شبنم کو اچانک یاد آگیا تھا اور وہ آدھے گھنٹے میں کہاں جاکے واپس آسکتی تھی مگر میں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اگر وہ مجھے سرپرائز دے کر خوش ہونا چاہتی تھی تو میں اس پیار بھری خواہش کو مجروح نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے حیران اور خوش ہوکے اس کی خوشی کے احساس کو دوچند کرنا بہتر سمجھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس کی پیاری سی چھوٹی سی کھٹارا کار نیچے "چلبلی" کے ساتھ موجود تھی۔ ان کی عمروں میں وہی فرق تھا جو ان کے مالکوں میں شاید ___ بلکہ یقیناً جب چلبلی ایک نئے ماڈل کے روپ میں متعارف کرائی گئی ہوگی تو اس کی چمک دمک نے بہت سی نظروں کو خیرہ کیا ہوگا۔ اس کی معشوقانہ نزاکت نے تو جانے کتنے دلوں کو تڑپایا ہوگا اور اس کی سبک خرامی نے شوقین مزاجوں کو دم بخود کردیا ہوگا۔ بڑی کاروں والے اور پیدل چلنے والے آزاد صاحب کی خوش قسمتی سے رشک اور حسد کرتے ہوں گے اور خود آزاد صاحب کے لیے اس کار کے احساس کیفیت میں فخر اور غرور کے جذبات شامل ہوں گے۔ آج آزاد صاحب آؤٹ آف ڈیٹ ہوگئے ہیں۔ چلبلی بھی چلتے چلتے تھک گئی ہے اور گزر جانے والے اچھے وقت کی ناکارہ نشانی بن کے رہ گئی ہے۔ کار اور اس کے مالک کے درمیان طویل رفاقت کے خیال میں بھی سکون اور انبساط کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔ بس ایک پُر افسوس ندامت ہے کہ زندگی کے ان سنہرے دنوں میں جو باقی بچے ہیں ہم ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کرسکتے۔

شاید بلکہ یقیناً ایک دن شبنم کی کار بھی ایسی ہی ہوجائے گی اور خود شبنم اور میں یا ہم میں سے کوئی ایک۔ ماضی کے مزاروں کا مجاور بن کے آج کے دن اور اس وقت کے خوب صورت روز و شب کی یادوں کو دہراتا رہے گا اور عمر کی ایک تاریک سے تاریک تر ہونے والی سرنگ میں تھکے قدموں سے چلتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کے اس روشنی کو دیکھتا جائے گا جو ساتھ چھوڑ گئی۔

ایسے ڈیپریس کرنے والے خیالوں کی یلغار نے مجھے پریشان کردیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کیا مسلسل دباؤ سے میرے اعصاب متاثر ہوئے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ مجھے ایک بریک کی ضرورت تھی۔ ماحول اور معمولات میں تبدیلی یا DIVERSION کی ضرورت تھی۔ فی الحال مجھے رب نواز کو بھول جانا چاہیے۔ اس کے نام سے وابستہ ہر ظلم اور ناخوش گوار یاد سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے اور ذہنی مصروفیت

کے ایسے سلسلے بنا لینے چاہئیں جن میں سکون و راحت' طمانیت اور مسرت کی شفا بخش' اعتماد پرور اور اندر کی توانائی کو بحال کرنے والے عناصر شامل ہوں۔ شاید ہمارے حواس اور اعصاب پر مسلط ROUTINE کی دشمن جاں MONOTONY کو توڑنا ہم سب کے لیے اتنا ہی ضروری تھا۔

میں اس وقت چونکا جب خلیفہ نے صفائی کا پہلا مرحلہ مکمل کرنے کا اعلان قینچی رکھ کے اور بال کاٹنے والی مشین اٹھا کے کیا۔ مشین نے دوسرے مرحلے میں بالوں کو یوں ہموار کردیا جیسے گھاس کاٹنے والی مشین لان کو برابر کرتی ہے۔ آخری مرحلے میں انہوں نے استرا سنبھالا اور میں نے اپنے چہرے کی جلد پر اس کی ٹھنڈی کاٹ رکھنے والے فولادی لمس کو محسوس کیا۔ میرے سامنے کوئی آئینہ نہیں تھا چنانچہ میں نے تصور کے آئینے میں اپنے پرانے چہرے کو یوں نمودار ہوتا دیکھا جیسے برسوں کس مپرسی کا شکار رہنے والے گھر میں گرد و غبار کی تہ ہٹانے سے جانے پہچانے موزیک کے فرش کا ڈیزائن ابھرتا جاتا ہے۔ آخری مرحلہ شیو کا تھا۔ خلیفہ نے ایک سستا سا شیونگ سوپ اٹھا کے برش سے جھاگ بنانے شروع کیے تو ایک پرانے خیال نے مجھے مسکرانے پر مجبور کردیا۔ یادوں کا ایک دریچہ کھل گیا۔ میں نے اس میں سے جھانک کر دیکھا۔

میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مسلسل ایک ہفتہ جاری رہنے والا ٹائیفائیڈ کا بخار بالآخر اتر گیا مگر اس نے مجھے اتنا کمزور کردیا تھا کہ اب اٹھتا تھا تو چکر آتے تھے۔ میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو رہا تھا۔ کھانے کے نام اور تصور سے مجھے متلی محسوس ہوتی تھی مگر شادو بضد تھی کہ اب ماسی ہیر کے خاندانی نسخۂ خاص کی ایجاد خالص دیسی گھی' دیسی مرغی کے انڈوں اور دودھ کے اس مرکب کو ضرور پی کے ختم کروں جو دراصل کھانے کی چیز بن گیا تھا کیونکہ اس میں ڈاکٹر رانجھا نے اپنی حکمت کے اصولوں کے مطابق مفید جڑی بوٹیاں اور مغزیات وغیرہ بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ صبح رخصت ہوتے وقت اس نے ایک تقریر دل پذیر سے مجھ پر یہ واضح کیا تھا کہ اس نسخۂ کیمیا کے خواص معجزہ نما ہیں اور اس کی توانائی بخش خوبیوں کا اندازہ مجھے شام تک بہ خوبی ہو جائے گا۔ طاقت مجھ میں ایسے بھر جائے گی جیسے گدھا گاڑی کے انجن میں چارے کے بجائے جیٹ طیارے کا ایندھن بھر دیا جائے۔

لیکن میرے لیے ایک گھونٹ کے بعد دوسرا گھونٹ پینا ہی ناممکن تھا۔ تنگ آ کے شادو نے وہ ایٹمی طاقت رکھنے والا محلول ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے روٹھ کر باہر چلی گئی پھر میں نے دوپہر تک اس کی صورت نہیں دیکھی تو مجھے وحشت اور ندامت ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ بیماری کو صرف دوا یا کم ہمتی سے بستر پر لیٹ کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اپنی جسمانی مشینری کو رواں دواں کرنے کے لیے قوت ارادی سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں نے آواز دے کر شادو کو بلایا اور اس سے شرط لگا کے محبت بھرے جذبات والے اس ٹانک کو ختم کردیا جس کا دوسرا گھونٹ پینا بھی مجھے محال نظر آتا تھا۔ شادو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے شرط تو فوراً پوری کردی۔ پھر میں نے آئینے میں صورت ملاحظہ کیے بغیر چہرے پر ہاتھ پھیر کے اپنی شیو کی فصل کا اندازہ کیا اور شیو کا سامان منگوا کے چہرے کی صفائی کرنے بیٹھ گیا مگر ناطاقتی کا یہ عالم تھا کہ صابن کے جھاگ بناتے ہوئے میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ ریزر پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا زیادہ مشکل مرحلہ بن گیا۔ میرے چہرے پر پہلا کٹ لگا تو شادو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے دبا کے خون روک دیا اور پھر ریزر سنبھال لیا۔

"تم شیو بناؤ گی میرا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم دیکھو۔۔۔"

میں نے ہاتھ جوڑے۔ "معاف کرو مس باربرہ شریر۔ میں باریش ہی بھلا۔ ابھی تو ایک کٹ ہی لگا ہے۔ تم تو گردن کاٹ دو گی۔"

"ہاں کاٹ دوں گی۔ قتل کروں گی اس ریزر سے۔ ویسے تو بڑے ڈائیلاگ بولتے تھے کہ تمہارے ایک اشارے پر جان دے سکتا ہوں۔ اس نے مجھ سے ریزر چھین لیا اور مجھے سیدھے لیٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا۔

"زندہ بدست مردہ۔" میں نے کہا "تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔"

اس نے میرے سر کو بڑی نزاکت سے ایسے پکڑا جیسے وہ شیشے کا نازک گولا ہے اور بائیں رخسار پر دوسرے ہاتھ سے ریزر چلانے لگی۔ آغاز سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انجام بخیر ہوگا۔ ایک طرف کی صفائی کا عمل مکمل ہوا تو اس نے مجھے مسکرا کے داد طلب نظروں سے دیکھا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر گھما دیا۔ آہستہ آہستہ' پیار' نزاکت' احتیاط اور توجہ کے پورے ارتکاز کے ساتھ اس نے شیو کا یہ عمل دس منٹ میں پورا کیا۔ یہی کام میرے تجربہ کار ہاتھ دو منٹ سے کم وقت میں کرسکتے تھے مگر شادو کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس کے کام کو پرفیکٹ نہیں سمجھا جا سکتا تھا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھوں سے میرے چہرے کی جلد پر ایک بھی

کٹ نہیں لگا تھا اور میرا چہرہ صاف ہو گیا تھا۔

میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی "تو نے کمال کردیا نائی کی بچی۔ یہ کام کہاں سے سیکھا تو نے۔"

وہ خوش ہو کے ہنسی "بس سیکھ لیا تمہارے لیے۔ تم زبانی دعوے کرتے رہے مگر جان دینا سیکھا نہیں۔"

میں نے اسے چوم لیا "وہ بھی سیکھ لوں گا تم سے۔"

ایسا ہی دوسرا موقع خان اعظم کے گھر میں آیا تھا۔ وجہ کوئی نہیں تھی۔ مصروفیت اور کاہلی کے باعث میں نے ایک دن شیو نہیں کیا۔ دوسرے دن میں مجذوب نظر آنے لگا پھر نہ جانے کیا ایسی بات ہوئی کہ شام ہوئی تو میں نے سوچا کہ ابھی کون سا مجھے بردکھوے میں یا کسی انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ رات تو ہو گئی ہے۔ اب صبح ہی شیو کروں گا مگر اتنی دیر میں چندا نمودار ہوئی۔ اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی اور میز پر بیٹھ کے ٹانگیں ہلانے لگی۔

میں نے کہا "بہتر ہے کہ آپ خود ہی میز خالی کردو۔ میں کام کر رہا ہوں۔ اٹھا کے پھینک دوں گا باہر۔"

اس نے میرے سامنے سے کاغذات اٹھا کے نیچے پھینک دیے۔ میرا پین' کتابیں' رجسٹر سب گرا دیے۔ "لیجیے' میز صاف ہو گئی۔ اتنی جگہ نکل آئی ہے کہ چاہیں تو آپ بھی میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔"

میں نے گرج کے کہا "پاگل کی بچی' پتا ہے یہ کتنے اہم کاغذات ہیں؟"

"کیا کہا؟۔۔۔ میرے ابا کو پاگل کہا۔" اس نے مجھے ایک لات ماری۔

میں جھک کے وہ کاغذات اٹھا رہا تھا۔ لات لگنے سے گر گیا۔ اس سے میز کو دھکا لگا اور چائے کا مگ میرے اوپر گرا۔ وہ چھلانگ لگا کے تیزی سے اتری اور غائب ہو گئی۔ اب میرے لیے کام پر لعنت بھیج کر خود کو صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ میں شیو کر رہا تھا کہ چندا پھر آ گئی۔

"سوری کہنے آئی تھی میں۔ تمہارے کپڑے خراب ہو گئے لیکن کپڑوں سے زیادہ تمہارا بوتھا خراب ہو رہا ہے۔ بوتھا بمعنی شکل' چہرہ' چوکھٹا۔ تم بہت زیادہ خفا معلوم ہوتے ہو۔ غصے میں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اس سے ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔ برین ہیمرج ہو سکتا ہے۔ تمہیں مسکرانا چاہیے۔"

میں نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بتیسی کی نمائش کی "لو۔۔۔ اب جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔"

وہ اندر آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا "لاؤ یہ مجھے دو میں بناتی ہوں تمہاری شیو۔"

معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنے دونوں بازو حائل کردیے اور اسے اپنے قریب کرلیا۔ شیونگ کریم کا سارا جھاگ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

"بناؤ شیو' نائی کی بچی۔"

باہر سے اچانک خان جی نے چندا کو پکارنا شروع کیا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاید گیٹ کھلا ہوا تھا کہ انہیں کال بیل نہیں بجانی پڑی اور وہ سیدھے اندر آ گئے۔ اس وقت میرے ہاتھ پاؤں زیادہ پھول گئے تھے۔ اگر خان جی ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے کہ صابن کا جھاگ دونوں کے چہروں پر پھیلا ہوا ہے تو وہ نہ جانے کیا سمجھتے۔

میں نے فوراً چندا کو دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کردیا اور منہ پر شیونگ کریم والا برش رگڑنے لگا۔

"یہ چندا کہاں ہے آخر۔" وہ سامنے آ کے بولے۔

میں نے سر گھما کے دیکھا "ادھر ہی ہوگی کہیں۔ یہاں تو نہیں آئی دوپہر سے۔"

جب وہ واپس چلے گئے تو چندا نے منہ پر پانی کا چھپکا مارا اور تولیہ پھیر کے بھاگی۔ چہرے پر شیونگ سوپ کے جھاگ کی خوشبو اور پھر ریزر کی دھار کے پھسلنے سے مجھے برسوں پرانے واقعات کی یاد آئی تو میں مسکرانے لگا۔ ہر یاد ایک متحرک فلم کی طرح تھی جس کا پرنٹ ہر عکس کی واضح اور مکمل تصویر پیش کرتا تھا اور اسے دیکھنے کے لیے وقت اور مقام کی کوئی شرط نہ تھی۔ دل کے آئینے میں ہے تصویر یار' جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ چند سیکنڈ میں ایک فلم گزر جاتی تھی۔ چند منٹ میں ماہ و سال بیت جاتے تھے۔

خلیفہ نے مجھے ہلا کے کہنا شروع کیا "کیا۔۔۔ سو۔۔۔ سو۔۔۔ سو گئے ہو۔۔۔ سر۔۔۔ سر۔۔۔ سرکار۔۔۔"

میں نے چونک کے سر اٹھایا اور اپنے گالوں پر ایک ملائم سی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ ایک پرانی' احساس کو معطر کردینے والی دلنواز خوشبو اپنے ریشمی لمس کے ساتھ میرے چہرے پر پھیلنے لگی۔ میں نے اپنے رخساروں کو چھونا چاہا اور میرے ہاتھوں میں شبنم کے ہاتھ آ گئے۔ وہ نہ جانے کب سے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ یہ میرے پسندیدہ آفٹر شیو لوشن "اولڈ اسپائس" کی ٹھنڈک اور خوشبو تھی جو شبنم کے ہاتھوں نے میرے چہرے پر پھیلا دی تھی۔

میں نے مسحور ہو کے اور پلٹ کے اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر کرسی کے پیچھے سے وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور خلیفہ کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھی۔ شاید خلیفہ کو بے شرمی کے اس مظاہرے کو دیکھ کر پسینے آ گئے ہوں گے۔ شبنم

کے بال میرے چہرے پر آ گئے پھر اس نے بہت آگے جھک کر میرے گالوں کو چوم لیا۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ کب آئیں تم۔۔۔؟"

شبنم میرے سامنے آ گئی "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جناب مراقبے کی کیفیت میں تھے۔ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔"

میں نے جھوٹ بولا "میرا خیال ہے کہ جھپکی آ گئی تھی مجھے۔ یہ آفٹر شیو لوشن تم لائی ہو؟"

"ہاں" کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"میں تو یہ پوچھنے والا تھا کہ تمہیں میری پسند کا کیسے اندازہ ہوا؟"

"یہ ایک فضول سوال ہے۔" وہ شرما کے بولی "اور کسے اندازہ ہوگا تمہاری پسند کا؟ میں تو سب کچھ تمہاری پسند کے مطابق لائی ہوں۔"

خلیفہ نے ہمت کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا "ہم ۔ جا۔ جا۔ جائیں اگر۔۔ اگر۔۔ اجا۔ جا۔ جا۔۔"

شبنم نے شرارت سے کہا "ارے؟ آپ ابھی تک گئے نہیں۔ یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

خلیفہ نے بوکھلا کے سو کا نوٹ پکڑا "بے۔۔ بے۔۔ بیگم صاحب۔۔ کوئی۔۔ چھو۔۔ چھو چھوٹا نو۔۔ نوٹ؟"

شبنم نے ہاتھ ہلایا "چلیے اب رکھ لیجیے' باقی آپ کا انعام"

خلیفہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بال کاٹنے اور شیو بنانے کا کیسا انعام۔ ان کا تو معاوضہ زیادہ سے زیادہ دس روپے بنتا ہوگا۔ واپس کرنے کے لیے ان کے پاس نوے روپے کہاں سے آتے۔ سو کے نوٹ کو واسکٹ کے اندر والی جیب میں رکھتے ہوئے خوشی سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دن بھر فٹ پاتھ کے آٹھ آنے میں شیو اور دو روپے میں حجامت بنانے والے غریب کاریگر کے لیے یہ ایک مہینے کی کمائی تھی۔

شبنم نے پھر گھڑی دیکھی اور مجھے ایک بنڈل تھمادیا "چلو تیار ہو جاؤ' جلدی سے۔۔ باتھ روم ادھر ہے۔"

"وہ تو معلوم ہے مجھے مگر اس میں کیا ہے؟"

"کپڑے ہیں اور کیا ہے۔" اس نے مجھے باہر دھکیل دیا۔

شبنم مجھے نظروں سے ناپ تول کر گئی تھی مگر میں نے نیلے رنگ کی جینز کو پہنا تو وہ مجھے ایسے فٹ آئی جیسے میں نے درزی سے آرڈر پر سلوائی ہو۔ نیلے رنگ کی میچ کرتی ہوئی ڈینم کی شرٹ نے مجھے اس کے حسنِ انتخاب کا قائل کر دیا۔ دونوں چیزیں امپورٹڈ اور بہت اعلیٰ معیار کی تھیں۔ جلدی کے باوجود وہ میری پسند کی دو چیزیں اضافی خرید لائی تھی۔ آفٹر شیو لوشن اس نے اپنے ہاتھوں سے مل دیا تھا۔ پرفیوم ایسا تھا جو میں ہمیشہ استعمال کرتا تھا اور اس کی مہک ایک طرح سے میری شخصیت کا حصہ اور شناخت بن گئی تھی۔

وہاں کوئی شیشہ نہیں تھا مگر غسل کے بعد لباس بدل کے میں نے نئی زندگی کی نئی سنسنی خیز مسرت کو اپنے وجود میں برقی رو کی طرح بھرتا ہوا محسوس کیا اور میرے جسم کا رُواں رُواں شبنم کے لیے اپنائیت اور شکر گزاری کے جذبات سے سرشار ہو گیا۔ زندگی کے راستوں پر کئی بار ٹھوکر کھا کے گرنے کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ اب اٹھنا میرے بس اور اختیار کی بات نہیں مگر ہر بار کسی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ پھر سرگرمِ عمل سفر کر دیا تھا۔ پہلی بار یہ ہاتھ شادو کا تھا۔ جب شادو نہ رہی تو مجھے چندا نے سنبھال لیا تھا۔ اب یہ ذمے داری شبنم نبھا رہی تھی۔ قدرت نے عورت کو زندگی کی تخلیق سے تکمیل تک کتنی اہم اور کتنی محترم ذمے داریاں سونپ دی ہیں۔ وہ ہر روپ میں ایک ماں ہے کیونکہ وہ پرورش کرتی ہے' سنبھالتی ہے' سنوارتی ہے۔ دیکھ بھال کرتی ہے اور نگرانی کرتی ہے۔ سلیقہ دیتی ہے اور سہارا دیتی ہے۔ سہولت اور تحفظ فراہم کرتی ہے اور خوشی دے کے خوش ہوتی ہے۔ پیار دے کے سمجھتی ہے کہ اس نے پیار پالیا۔

شبنم باہر میری منتظر تھی اور مجھے دیکھتے ہی جذبات سے بے قابو ہو گئی۔ اس کی چاہت میں ایک بے باک سچائی کا عنصر ہمیشہ سے غالب تھا۔ وہ مجھ سے یعنی شاہ عالم سے اور اب ناصر عظیم سے اعلانیہ محبت کرتی تھی اور اس معاملے میں کسی پر تصنع جھجک خوف یا شرمندگی کی قائل نہ تھی۔ نہ زبانِ خلق کی پروا کرتی تھی اور نہ دیکھنے والی نظروں کی اور بزبانِ فلمی شاعر "پیار کیا تو ڈرنا کیا" کے اصول پر پوری طرح عمل پیرا تھی۔

جب میں نے اسے اپنے سے الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ "بہت اچھے لگ رہے ہو تم۔"

میں نے اس کی آنکھوں کو نرمی سے صاف کیا "اچھی تم ہو جس نے مجھے اچھا بنا دیا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میری خاطر تم نے خود اپنی کیا حالت بنالی ہے۔"

وہ ہنسی "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"مجھے اچانک بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں نے تمہیں کتنا نظر انداز کیے رکھا۔ جتنی توجہ تم نے مجھے دی اس کا عشرِ عشیر بھی میں نے تمہیں نہیں دیا۔ تمہارا رنگ و روپ

کتنا دھندلا گیا ہے۔ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں تم نے۔ تم تو بڑی خوش لباس اور اتنا پُرکشش لڑکی تھیں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ناصر۔ سب پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ رہو گے تو۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "نہیں۔۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔ وعدہ کرو مجھ سے۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا "وعدہ کیا ہوتا ہے؟ چند الفاظ مگر اس کے پورے ہونے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔"

"سب نیت کی اور ارادے کی بات ہے۔"

"نہیں ناصر' شادو نے جب تمہارا ساتھ زندگی کی آخری سانس تک دینے کا عہد کیا ہوگا تو کیا اس کی نیت میں کھوٹ ہوگا یا اس کے ارادے کمزور ہوں گے۔ اس نے تو جان کی بازی لگا دی تھی اور بالآخر بازی ہار دی۔"

"خدا کے لیے' ایسی مایوس کرنے والی باتیں مت کرو۔ میں آج بہت خوش ہوں اور یہ خوشی بڑے عرصے تک آزمائش کے جان لیوا مرحلوں سے گزر کے ملی ہے۔"

"اچھا تو چلو۔"

میں نے کہا "کیا جوتے نہیں پہنوں؟"

وہ مسکرائی "یار' جوتے میں اندازے سے نہیں لے سکتی تھی۔ تم خود ہی ٹرائی کر کے لینا۔"

باہر سے کچھ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے پوچھا "کیا اسٹاف آ گیا ہے؟"

"ہاں ادھر نیوز ڈیسک پر دو رپورٹرز بیٹھے ہیں۔ صفائی کرنے والے بھی کام کر رہے ہیں۔ بس اب نکل چلو' ورنہ میں پھنس جاؤں گی۔"

"ایڈیٹر صاحب' تمہیں ماتحتوں کے سامنے اتنا مجبور اور بے اختیار تو نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی سے.... آ جا نہ سکو۔"

"پہلی بات تو یہ جناب۔" وہ کیبن سے باہر نکل کے بولی "کہ یہاں ماتحت یا افسر کا کوئی تصور نہیں۔ ہم ایک ٹیم کی طرح ہیں۔ ایڈیٹر کی حیثیت تجربے اور صلاحیت کی بنا پر کپتان جیسی ہوتی ہے اور اہمیت کسی کی کم نہیں ہوتی۔ نہ باؤلر کی' نہ بیٹس مین کی' نہ وکٹ کیپر کی اور نہ فیلڈر کی۔"

"عمران خان جیسا کپتان ہونا چاہیے تمہیں' اچھا ایڈمنسٹریٹر' مضبوط قوت ارادی' خود اعتمادی اور صحیح سوچ رکھنے والا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "سب عمران خان کیسے ہو سکتے ہیں اور پھر یہاں تو آزاد صاحب نے سب کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں۔ وہ ایک فیملی کے تصور کے قائل تھے مگر فیملی میں سب بگڑے ہوئے "بچے" تھے۔"

"تم سدھار سکتی ہو انہیں۔"

"ہاں مگر سختی سے نہیں اور یہ کام وقت طلب ہے۔ ابھی تو سب اپنے اپنے طور پر مجھے واچ کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایڈیٹر کی کرسی کو میں کیسے سنبھالتی ہوں۔ کچھ میرے خلاف ذہنی تعصب رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ آزاد صاحب کسی اور کو ایڈیٹر کیسے بنا سکتے تھے۔ یعنی اس میں صلاحیت کی نہیں حق وراثت کی بات ہے۔ کچھ تسلیم کرتے ہیں کہ مجھ میں صلاحیت ہے اور مجھے ان کی مورل سپورٹ پر زیادہ بھروسا ہے۔ اکثریت نیوٹرل ہے۔ خاموش تماشائی۔ میں کامیاب رہتی ہوں تو ان کے لیے خوشی کی کوئی بات نہیں اور میں ناکام ہو جاؤں تو انہیں دکھ نہیں ہوگا۔ تو بس مجھے سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ میرے صبر یا حوصلے سے زیادہ یہ پی آر کا معاملہ ہے۔"

ہم سیڑھیاں اتر کر احاطے کے آخری حصے تک پہنچے جہاں شبنم کی گاڑی کئی دن سے اپنی جگہ کھڑی تھی۔ شبنم نے مجھے ایک کپڑا دیا "ذرا باہر سے صاف کر دو۔"

میں نے کہا "اچھی عزت افزائی کی ہے تم نے۔ اچھے کپڑے پہنا کے لگا دیا گاڑی صاف کرنے کے کام پر۔"

وہ بولی "ابھی تو دھکا بھی لگاؤ گے تم۔ کھڑے کھڑے گاڑی کی بیٹری بھی بیٹھ گئی ہوگی۔"

میں نے ایک آہ بھری۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ تو کھوتا ہے کیا

شبنم ہنس پڑی "صحیح تو پوچھتے ہیں جو عشق میں روتا ہے' وہ کھوتا ہے۔"

شبنم نے چابی لگائی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے سے تھوڑا سا تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ پھر غرا کے رواں ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "مجنوں پر کبھی ایسا وقت آتا کہ ناقۂ لیلیٰ کو دھکا لگانا پڑتا۔ تو وہ کان پکڑ لیتا۔"

"کس کے؟ اونٹ کے یا لیلیٰ کے" اس نے ریورس گیئر میں تھوڑا سا چلا کے گاڑی کو گیٹ کی طرف بڑھایا "مجنوں تم پہلے بن گئے تھے۔"

"اور اب؟"

"اب تم شاہ عالم بن گئے ہو پھر اور یہ بڑی خطرناک بات

ہے۔ اس لیے بھی کہ تمہارے ساتھ میں ہوں۔"

"میں خود کو ناصر عظیم ثابت کرچکا ہوں۔"

"مگر تمہاری شناخت کی گواہ تھی۔ نیلم، شبنم کا کیا تعلق ناصر عظیم سے۔ تمہارے ساتھ چندا ہوتی یا قمر ہوتی تو کسی کا دھیان شاہ عالم کی طرف نہ جاتا مگر شاہ عالم کے سیکڑوں ہزاروں دوست دشمن اور شناسا مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے۔"

"دیکھو ایسے تو میرا بھی سڑک پر نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ ہم نے خود ہی یہ مشہور کر رکھا ہے کہ شاہ عالم لندن میں ہے اور اس کے بارے میں خبروں کی اشاعت کا مقصد بھی یہی تھا کہ ناصر عظیم کو یہاں کوئی پرابلم نہ ہو۔"

شبنم نے فکر مندی سے کہا "مگر ناصر عظیم کو ناصر عظیم نظر بھی آنا چاہیے۔ کیا ہے ابھی تمہارے پاس؟ نہ کوئی کاروبار، نہ کوئی آفس... نہ گھر نہ کسی کا ریفرنس۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "سب ہوجائے گا۔ چند روز میں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ میرا کوئی بزنس ایڈریس نہیں ہے۔ کوئی کاروباری ٹھکانا نہیں ہے لیکن میرے اکاؤنٹس ہیں اور مجھے حوالوں کی بھی کمی نہیں۔"

"کوئی پوچھ لے کہ ایسا کیوں ہے پھر...؟"

"کچھ عرصے مَیں کاروبار سے دور رہا۔ میں نے اتنا پیسہ کمالیا تھا کہ میں تھک گیا تھا۔ میں نے سب کچھ سمیٹ دیا اور دنیا دیکھنے نکل گیا۔ سیر تفریح میں وقت گزارتا رہا۔ سکون قلب کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہوجاتا۔"

"ویسے تو یہ بہانہ بھی چل جاتا۔ ہر شخص اپنے ذاتی معاملات اور کاروباری مسائل میں مبتلا ہے جیسے چاہے نمٹے لیکن تمہارے معاملے میں کچھ لوگ اتنے تجسس میں مبتلا ہوں گے کہ آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"ہاں تمہارے ساتھ آج کی یہ شام ایک خطرناک ایڈونچر ہے تو ہُوا کرے۔ آج کے بعد میں کسی سے بھی نہیں ملوں گا۔ کہیں بھی نظر نہیں آؤں گا۔ دن کے اجالے میں میری مصروفیات سے کسی کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ نہ تمہارا نہ فرید عباسی کا نہ رخشی کا۔ یہ ہم ڈسکس کرچکے ہیں پہلے بھی اور ایک لائن آف ایکشن پر ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے تھا کہ دن میں ہم سب اپنا اپنا کام کریں گے۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "تم نے جو اشتہار شائع کیا تھا۔ آفس اکوموڈیشن کے لیے اس کا کیا ہوا؟"

"اس کے جواب میں بہت فون آئے۔ پنڈت جی نے سب نوٹ کیے۔" شبنم نے اپنا ہینڈ بیگ میری گود میں رکھ دیا "اس میں ایک سلپ پر لکھے ہوئے ہیں۔ دیکھو۔"

میں نے کہا "ایک کاغذ کا پرزہ تلاش کروں میں... اس کباڑ میں جو تم نے جمع کر رکھا ہے۔ پتا نہیں تم کیسے نکال لیتی ہو اس میں سے اپنے مطلب کی چیز۔"

اس نے ہنس کے کہا "اچھا بیگ کھولو۔ یہ باہر والی زپ۔ اس میں ایک زرد رنگ کا کاغذ ہے۔"

میں نے زرد رنگ کا کاغذ نکالا۔ صورت۔ پک میرے ویری ڈی۔ مہاراج غلام حسین کتھک۔ لپ اسٹک اورنج۔ نیل پالش بلیک۔"

اس نے ہنستے ہوئے بیگ لے لیا اور دوسرے پاکٹ سے دوسرا پرزہ برآمد کیا "یہ لو۔"

میں نے کہا "خاتون۔ جسے آپ زرد سمجھتی ہیں وہ نیلا رنگ ہے۔ یہ آنکھوں کی کوئی بیماری حال ہی میں لاحق ہوئی ہے یا پیدائشی نقص ہے؟ میں کیسا نظر آرہا ہوں؟ ہرا یا جامنی۔"

وہ جھینپی "تم دیکھو اس پر کیا لکھا ہے۔ یہ سب بروکر کے فون نمبر ہیں۔ ان سے بات کرو کہ آفس کی جگہ کہاں ہے۔ خود جاکے دیکھو کہ جگہ کیسی ہے۔ کتنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال تمہارے دو آفس تو ہونے چاہئیں۔ کرائے میں کنجوسی کا مت سوچنا۔"

میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اس کی صورت دیکھتا رہا۔ وہ مجھے کاروباری معاملات کی سمجھ بوجھ ایسے دے رہی تھی جیسے میں عملی زندگی میں قدم رکھنے والا اور کالج سے حال ہی میں ڈگری لے کر فارغ ہونے والا نوجوان ہوں جسے زندگی کی اونچ نیچ اور دنیا داری کا کوئی تجربہ نہیں۔ یہ پھر وہی ایک ماں والا رویہ تھا۔ محتاط۔ پُرتشویش۔ جذباتی اور نیک خواہشات سے چھلکتا ہوا۔ وقت کے ساتھ گھر والی بھی یہی رویہ اپنا لیتی ہے اور شوہر اس کے نزدیک ایک ایسا نادان بچہ بن جاتا ہے جسے دنیاوی معاملات کا کچھ پتا نہ ہو۔ صورت حال کی مضحکہ خیزی یہ ہے کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے مگر بُرا ماننے اور چڑنے کے باوجود شوہر ایسی ہی بیوی کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکتے ہیں جو ان کا قدم قدم پر خیال رکھتی ہوں۔

ماہرین نفسیات کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شوہر اپنی بیوی میں اپنی ماں کا روپ دیکھنا چاہتا

ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اماں تو ایسے کرتی تھیں۔ اماں کا تو یہ دستور تھا۔ اماں یہ پکاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

اس کے برعکس بیٹیاں اپنے شوہر میں باپ کی شخصیت کا عکس دیکھنا چاہتی ہیں اور ازدواجی زندگی کے تضادات کا یہ فرق تمام سمجھوتوں کے باوجود بالکل ختم نہیں ہوتا۔ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں ہوتا۔

شبنم نے کہا "سن رہے ہو نا میری بات۔ کدھر دھیان ہے تمہارا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "سن رہا ہوں میری ماں۔ بڑے دھیان سے سن رہا ہوں۔"

"تمہیں بُرا لگتا ہے تو میں نہیں بولوں گی تمہارے معاملات میں۔ کوئی بھی مشورہ نہیں دوں گی۔" اس کا منہ پھول گیا۔

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤ۔ اگر ابھی میں تمہیں سمجھانے لگوں کہ آج فرنٹ پیج کی سرخیوں کا لے آؤٹ کیسے بنانا ہے۔ اداریتی نوٹ میں کیا لکھنا ہے اور فلاں معاملے میں کیا نقطۂ نظر رکھنا چاہیے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں، تم کہو گی کہ ناصر صاحب، تمہارے خاندان میں آج تک کسی نے ایک سطر کی خبر بنائی ہے! خود تم نے کبھی قلم پکڑا ہے ہاتھوں میں۔ یہ معلوم ہے کہ کالم کیسے لکھتے ہیں۔ اسکوپ کیا چیز ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود میں نے تمہاری بات کا بُرا نہیں مانا۔ مجھے اچھا لگا۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"نہیں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔ تم ابھی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی ہو اور تم نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا ہے۔"

وہ بولی "ابھی سے کا کیا مطلب ہے، آخر... گاڑی کیا تم چلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں ازدواجی زندگی کی اس گاڑی کی بات کررہا ہوں جس میں آخر ایک پہیا اسکوٹر کا ہوتا ہے تو دوسرا ٹریکٹر کا مگر وہ گاڑی کامیابی کی منزل کی طرف بڑی روانی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ بیویوں کو بڑا شوق ہوتا ہے شوہر کو نکیل ڈال کر رکھنے اور اپنی مرضی سے چلانے کا۔"

"وہ پھر بگڑ گئی۔ "میں نہیں دوں گی آئندہ کوئی مشورہ۔ چلو اترو۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی زیادتی بلکہ بے عزتی کی بات ہے۔"

"بابا جوتے نہیں لینے؟" اس نے اُٹھ کے گاڑی کے گیٹ کو لاک کیا۔

جب میں جوتے ٹرائی کررہا تھا تب بھی شبنم کا منہ سوجا ہوا تھا اور وہ جانتے بوجھتے باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ اسے میری پسند سے کوئی سروکار نہیں اور میں جوتا خریدوں یا سینڈل پہن لوں اس کی بلا سے۔ میں نے ایک بار اس کی رائے لینا چاہی تو اس نے اپنی ناراضی کا اظہار "مجھے کیا پتا" کہہ کے کیا۔

بالآخر میں نے کہا "بیگم، تمہیں ہمارے ہونے والے اگلے بچے کی قسم کچھ تو بولو۔ اگر تم نے اپنی پسند نہ بتائی تو بخدا ہم ایک جوتا براؤن اور ایک سفید پہن لیں گے۔"

شبنم نے گھبرا کے مجھے دیکھا اور منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔ سیلزمین بھی مسکرانے لگا۔ چلئے بیگم صاحبہ، آپ بتا دیجئے۔"

شبنم نے آنکھیں نکالیں "تم بدتمیزی مت کرو۔"

میں نے کہا "رہنے دو یار، تم سستے والے جوتے لاؤ۔ یہ ناراض ہیں کہ میں اتنے مہنگے جوتے کیوں دیکھ رہا ہوں کوئی چپل دے دو۔"

سیلزمین نے غور سے میری صورت کو اور میرے لباس کو دیکھا۔ سیلزمین خریدار کے معاملے میں کسی ماہر نفسیات سے کم نہیں ہوتے اور اس کے حلیے، اس کے اطوار اور طلب کے سہارے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے۔ وہ سر کھجاتا اٹھا ہی تھا کہ شبنم نے پھر اسے ڈانٹا۔ "کہاں جارہے ہو۔ یہ دونوں پیک کردو۔"

سیلزمین کی مسکراہٹ بدل گئی۔ اب شاید وہ اپنے اندازے کی درستگی پر مسکرا رہا تھا۔ شبنم نے پسند بتائے بغیر ثابت کردیا تھا کہ اسے کیا پسند ہے۔

میں نے خوش ہو کے کہا "اللہ تم جیسی بیوی سب کو دے۔ تم اتنی اچھی ہو کہ جی چاہتا ہے کہیں تم جیسی ایک اور ملے تو کرلیں۔"

شبنم کو روٹھنا اور غصہ کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے یک طرفہ طور پر محبت میں نازبرداری کے خفا ہونے اور اپنی بات منوانے کے سارے حقوق شاہ عالم کو اور اب مجھے دے رکھے تھے اور اس کا انداز خود سپردگی اس حد تک غیر مشروط تھا کہ وہ معاملات محبت میں اپنی ذات کی نفی کرسکتی تھی۔ شاید ایسا شبنم کے لاشعور میں موجود رہنے والے احساس عدم تحفظ کے باعث تھا۔ کہیں اس کا محبوب نظریں نہ بدل لے۔ اسے EXPIRE ہوجانے والے گارنٹی کارڈ کی طرح اپنی زندگی

سے خارج نہ کردے۔ اس کی جگہ کوئی اور نہ لے لے ایک ہوس شیوہ اور حسن پرست مرد کی نظر نہ جانے کب کس پر جا ٹھہرے۔

لیکن اب وہ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اس کا مجھ سے روٹھنا اور خفا ہونا اس حقیقت کی غمازی کرتا تھا کہ اسے مجھ پر کتنا اعتماد ہے۔ کتنا مان ہے اور محبت بھرا اس غرور نے ہی اسے یہ حوصلہ دیا تھا کہ وہ ناز اٹھانے کے بجائے اپنی ادائے محبوبی سے ناز اٹھوانے کا چلن آزمائے اور پھر یہ توقع رکھے کہ میں اسے مناؤں گا۔ یہ امید کرے کہ اس کی ناراضی میرے لئے جذباتی مسئلہ بن جائے گی۔

میں نے اسے مایوس نہیں کیا اور جب میں نے آداب عاشقی کے پرانے نصاب کے مطابق اسے منانے کے لئے جذباتی اپیل، دلجوئی، خوشامد اور تعریف کے رواجی طریقے استعمال کئے تو وہ روٹھنے کا کھیل جاری نہ رکھ سکی۔ وہ اپنی فتح پر بہت خوش ہوئی اور نتیجہ یہ کہ پہلے سے زیادہ مجھ پر رُعب جھاڑنے لگی۔

سات بجے کے بجائے وہ ساڑھے آٹھ بجے واپس اپنے آفس گئی۔ یہ تین گھنٹے اس نے میرے ساتھ بڑی بے خوفی سے شاپنگ کرتے ہوئے گزارے۔ پہلے دو گھنٹوں میں اس نے میرے لئے اپنی پسند کے کپڑے خریدے لیکن دراصل اس نے میری پسند کو ملحوظ رکھا۔ لباس کے معاملے میں وہ میرے ذوق اور معیار کو بہت کم وقت میں سمجھ گئی تھی تو یہ اس کی قوت مشاہدہ، ذہانت اور دلچسپی کا ثبوت تھا ورنہ کچھ بیویاں ساری عمر شوہر کے ساتھ رہ کے بھی کچھ نہیں جان پاتیں۔ شاید اس کی بنیادی وجہ عدم دلچسپی ہوتی ہے۔

دو گھنٹے بعد میں نے اسے روک دیا۔ "اب میری باری ہے۔"

میں نے کہا "اب میں تمہارے لئے شاپنگ کروں گا اور تم کچھ نہیں بولوگی۔ اگر میری پسند پر ناک بھوں چڑھائی نا۔۔۔ تو۔"

وہ ہنسنے لگی "تو کیا کروگے؟"

میں نے کہا "میں بھی روٹھ جاؤں گا۔ تم نے روٹھنا سکھا دیا ہے مجھے۔"

میں چاہتا تھا کہ ہم کھانا بھی باہر کھالیں مگر شبنم پر ایڈیٹری کا بھوت سوار تھا۔ وہ جلد سے جلد آفس پہنچ کے ایک معمول کے مطابق اور خودکار عمل کے ذریعے ہونے والے کام کو ذاتی نگرانی میں کرانا چاہتی تھی۔ اس نے کھانے کی دعوت مسترد کردی۔ "مجھے پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"فرض کرو آج تم کسی وجہ سے نہ پہنچ پاتیں۔"

"کیوں نہ پہنچ پاتیں۔ بلاوجہ۔۔۔"

میں نے کہا۔۔۔ ایک وجہ تو میں ہوں۔ میں روک لوں تمہیں اپنی قسم دے کر۔ یا اچانک عقد ہوجائے تمہارا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "میں مری نہیں جارہی ہوں تم سے شادی کے لئے۔"

"شادی کے لئے مری جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی ہوجائے گا۔"

"آئی ایم سوری ناصر۔ آج میں بالکل نہیں رک سکتی۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ تم مجھے اپنی اہمیت کے احساس سے مرعوب کرنا چاہتی ہو ورنہ کیا ہوتا ہے ایڈیٹر ہے اور کون پوچھتا ہے ایڈیٹر کو۔ اخبار اس کے بغیر بھی نکل سکتا ہے۔"

"ٹیم کھیل سکتی ہے کپتان کے بغیر؟"

"ہاں۔ بارھواں کھلاڑی آجاتا ہے گراؤنڈ پر۔ اخبار کا معاملہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ رپورٹر لاتے ہیں خبریں ہر روز۔ ہر نیوز ایجنسی اپنا کام کرتی ہے۔ کسی کو ایڈیٹر کے نام سے کیا۔ شرط لگالو کہ اخبار وقت پر شائع ہوجائے گا۔۔۔ تم نہ جاؤ تب بھی۔"

وہ مسکرانے لگی "ہاں مگر کیا شائع ہوجائے گا۔ یہ ہے میرا رسک اور میرا کام ہے یہ دیکھنا کہ ایک جملہ بھی ایسا شائع نہ ہو جو کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کو یا معاشرے کے کسی بھی طبقے کی دل آزاری کا سبب بنے اور اخبار کی نیک نامی پر حرف آئے۔"

"فضول۔ بکواس۔ صحافی بھی اپنا قلم اور ضمیر بیچ چکے۔ اب صرف کاروباری مفاد کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور کچھ نہیں۔ یہ صحافت نہیں تجارت ہے جو تم کررہی ہو۔ جرنلزم کسی اصول پالیسی یا مشن کا نام نہیں۔ یہ بھی ایک بزنس ہے جو کم بدنام نہیں۔ بلیک میلر ہیں صحافی۔"

"سب کو ایک لاٹھی سے مت ہانکو۔" وہ برہم ہوکے بولی "آزاد صاحب کا اخبار اسی لئے خسارے میں جارہا تھا کہ وہ صحافت کو کاروبار نہیں بنانا چاہتے تھے۔ یہ کام میں کروں گی۔ یہ بزنس ہو تو کیا برائی ہے اس میں۔ خبریں بیچنا ہیروئن بیچنے یا اسلحہ بیچنے سے تو بہتر ہے۔ یہاں تو دین کی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں لوگ۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "معاف کرنا۔ میں تمہاری قوت برداشت آزما رہا تھا۔ شب بخیر۔ میں یہ گاڑی لے جارہا

ہوں۔"

وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تو میں نے گاڑی کو واپس موڑا اور سوچا کہ اب مجھے شب بسری کے لیے کس ٹھکانے کا رخ کرنا چاہئے۔ دل کی خواہش تھی کہ سیدھا نیلم کے پاس چلا جاؤں۔ اس کے گھر کا پر طمانیت، پُرسکون اور پُرآسائش ماحول بڑی کشش رکھتا تھا اور پھر وہاں سونی بھی تھی۔ میں وہاں جاتا تو انہیں بڑی خوشی ہوتی لیکن مصلحت کے تقاضے اس خواہش کی راہ میں دیوار بن گئے۔

پھر مجھے رحیم کا خیال آیا۔ کیا وہ ابھی تک سمن آباد کے اسی گھر میں اکیلا بیٹھا میری واپسی کا انتظار کررہا ہوگا۔ فرنیچر اور کارپٹ لانے والے تو اپنا کام ختم کرکے کب کے واپس جاچکے ہوں گے۔ ایک کیمسٹ کی شاپ سے میں نے اسے فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ آخر وہ کہاں جاسکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ سونی کے شوق دیدار میں نیلم کی طرف یا فرید عباسی کے گھر۔

نیلم کے تین فون نمبر تھے۔ دو کی حیثیت سرکاری تھی۔ کوئی بھی یہ نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری سے لے سکتا تھا یا انکوائری سے معلوم کرسکتا تھا۔ صبح نو بجے سے رات نو بجے تک ان نمبروں پر نیلم کا سیکریٹری عبدالرحمان اور اس کی سیکریٹری امبر کالیں ریسیو۔۔۔کرتے تھے۔ کال کرنے والوں میں جتنی تعداد فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کی ہوتی تھی۔ اس سے کئی گناہ نیلم کے پرستار لڑکے اور لڑکیاں ہوتے تھے۔ ان میں بھی اکثریت نوجوانوں کی تھی جو نیلم سے صرف بات کرنے کے متمنی تھے لیکن عمر رسیدہ اور شادی شدہ۔ بعض اوقات نانا اور دادا کے مرتبے پر فائز ہوجانے والے بھی کم نہ تھے۔ جو نیلم کو چاہتے تھے۔ چاہنے کی حد تک کسی کے جذبات پر قدغن نہ تھی مگر وہ سب چاہت کا ایک ہی مطلب سمجھتے تھے چنانچہ انہیں بڑی شرافت سے ٹال دیتی تھی۔ کوئی بھی بہانہ کرکے۔ وہ موجود نہیں ہیں۔ شوٹنگ کے لئے گئی ہوئی ہیں۔ سو رہی ہیں۔ دن کے مختلف اوقات کے حساب سے بہانے بھی الگ تھے۔ تاہم امبر کو ہدایت تھی کہ وہ کسی بدتمیز کے ساتھ بھی بدتمیزی سے پیش نہ آئے۔ وہ فون بند کردے۔ انہیں بتادے کہ یہ لائن آبزرویشن پر ہے۔ یا ان کا پیغام نوٹ کرلے اور فون نمبر لکھ لے۔ بعض فون ایسے بھی آجاتے تھے کہ نیلم بعد میں خود ان سے بات کرتی تھی۔ مثلاً اردو کے ایک مشہور اور صاحب دیوان شاعر نے نیلم پر ایک غزل کہی تھی۔ وہ اسے خود سنانا چاہتے تھے۔ نیلم نے انہیں بلالیا۔ عزت سے بٹھایا اور بہت خاطر تواضع کی اور شکریہ ادا کرکے رخصت کرنا چاہا تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ غزل وہ فلاں اخبار میں شائع کرانا چاہتے ہیں مگر ایڈیٹر راضی نہیں کیونکہ اخبار کا ہفتے میں ایک بار شائع ہونے والا ادبی صفحہ سفارشی لوگوں کی تخلیقات سے بھر جاتا ہے۔ چنانچہ نیلم اگر خود ایڈیٹر سے کہے تو۔۔۔ نیلم نے غزل رکھ کے اس کی حامی بھرلی تو شاعر صاحب نے مزید فرمائش کی۔ اخبار والے ایک غزل کی اشاعت پر پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ اگر نیلم یہ رقم انہیں دے دے، انہیں جب اخبار سے ادائیگی ہوگی تو۔۔۔ نیلم سمجھ گئی کہ وہ ضرورت مند ہیں۔ اس نے انہیں پانچ سو روپے بھی دے دیئے۔ چند دن گزرے تھے کہ ان کا پھر فون آگیا "میں نے ایک اور غزل لکھی ہے۔ نیلم نے پانچ سو روپے بجھوا دیئے۔ امبر کی ایک مشکل یہ تھی کہ کچھ ضدی اور بدتمیز نوجوان اسے ہی نیلم سمجھ لیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ جھوٹ نہ بولے۔ مان لے کہ وہ نیلم ہے۔ کاروباری فون کال رحمان لے لیتا تھا اور ضروری سمجھتا تھا تو نیلم کو پاس کردیتا تھا اور یہ سلسلہ ایسے ہی چل رہا تھا۔

صرف ایک فون نمبر ایسا تھا جو نیلم کا پرائیویٹ نمبر تھا۔ دو چار کھوجنے والوں نے اس کا سراغ بھی لگالیا تھا۔ نیلم نے نمبر بدلوالیا۔ اب ٹیلی فون ڈائریکٹری میں یہ فون خالہ کے نام پر تھا اور جو پتا لکھا ہوا تھا وہ نامکمل تھا۔ اس فون پر آنے والی ہر کال خود خالہ ریسیو۔ کرتی تھیں اور صحیح صورت حال بتادیتی تھیں کہ نیلم کہاں ہے اور کیا کررہی ہے۔ یہ فون نمبر گنے چنے چند انتہائی قابل اعتماد لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔

میری کال بھی خالہ نے ریسیو کی "نیلم ہاؤس۔"

میں نے کہا "خالہ میں ناصر بول رہا ہوں۔"

غالباً جانتے بوجھتے انہوں نے کہا "ناصر۔ کون ناصر۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم۔ اب بھی یاد نہیں آیا تو نیلم سے پوچھئے۔"

"میاں ناصر۔ وہ تو ابھی شوٹنگ سے واپس نہیں آئیں۔ صبح کی گئی ہوئی۔۔۔ کہہ رہی تھیں رات کو اسے دیر ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "کیا رئیس آیا تھا۔"

انہوں نے پھر تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا "کون رئیس؟"

میں نے کہا "اچھا سونی کو بلایئے۔ اب یہ مت پوچھئے گا کہ کون سونی۔"

"سونی کو کیسے بلاؤں؟ وہ تو خود بھی نیلم کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔"

میں نے پریشانی سے کہا "سونی۔۔۔ سونی بھی شوٹنگ پر گئی ہے دماغ خراب ہے اس کا۔"

"ایسا ویسا؟ وہ تو میاں بالکل ہی پاگل ہے۔"

میں نے کہا "آپ کو تو ہم سب ہی پاگل لگتے ہوں گے۔"

جتنی دیر میں فون کرتا رہا' میں نے یہ محسوس کیا کہ کیسٹ شاپ میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص کی نظریں میرے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ چالیس پینتالیس سال کا سنجیدہ صورت آدمی تھا غالباً اس دکان کا مالک تھا۔ میں نے دس کا نوٹ دیا کہ وہ اپنے حساب سے جتنے پیسے چاہے کاٹ لے۔ لوکل کال پر کوئی سارا دن بات کرتا رہے۔ تب بھی ایک ہی کال شمار ہوتی تھی مگر جو لوگ اپنے فون کو پی سی او کے طور پر استعمال کر رہے تھے' وہ ہر تین منٹ کے بعد دوسری کال لگا کے فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس نے کہا "تین کالیں ہو گئیں آپ کی۔"

میں نے باقی پیسے لے کے کہا "تھینکس۔ آپ نے مجھے کال کی اجازت دی۔"

وہ بولا۔ "برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں" ابھی گفتگو کے دوران میں آپ نے اپنا نام ناصر عظیم بتایا تھا۔"

میں نے کہا "جی بتایا تھا۔"

"پوچھنا یہ تھا مجھے۔" اس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا "کہ آپ کا یہی نام ہے؟ میرا خیال ہے۔"

"کیا خیال ہے آپ کا؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا "کیا آپ شاہ عالم نہیں ہیں؟"

مجھے چند سیکنڈ کی مہلت مل گئی تھی' ذہنی طور پر اس سوال کا جواب دینے کے لیے۔ میں تیار تھا۔ میں نے ہنس کے کہا "کون شاہ عالم۔۔۔ وہ فراڈیا لیڈر۔ ڈرامے باز۔ کبھی کہتا تھا' مر گیا ہوں کبھی کہتا تھا زندہ ہوں۔"

دکان دار چکر میں پڑ گیا "معاف کیجئے گا' آپ کی صورت۔۔۔"

"اس بدمعاش سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ میں تو عاجز آگیا ہوں لوگوں کے ایسے سوالات سے۔ وہ خود تو کہیں بھاگ گیا ملک چھوڑ کے اور اب تو سنا ہے کہ مر کھپ گیا وہیں کہیں۔ یہاں میں وضاحتیں کرتا پھرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اپنا حلیہ کچھ بدل لینا چاہیے۔" میں نے دکان سے نکلتے ہوئے کہا۔

دکان دار کو میری وضاحت نے اس حد تک مطمئن کر دیا تھا کہ وہ اپنے سوال پر شرمندہ نظر آتا تھا مگر میرا اپنا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ یہ خطرے کا پہلا سگنل تھا۔ یہ صورت حال کہیں بھی کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ اس سے میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہونے کے امکانات بھی سامنے آگئے تھے۔ شاہ عالم کی پی جے ایف پارٹی کے پرانے کارکن اور عہدیدار ناموافق حالات کے باعث پس منظر میں چلے گئے تھے اور اس حد تک غیر فعال ہو گئے تھے کہ اب پارٹی کا نام بھی خبروں میں بہت کم نظر آتا تھا اور سازشوں سے پارٹی کے چیئرمین اور صدر کے عہدے ہتھیانے والے اگر اپنے طور پر بیان بازی کے سہارے جی رہے تھے تو میری نظر سے ایسی کوئی بھی ہیڈ لائن نہیں گزری تھی۔

ایک بار پھر مجھے سوچنا پڑا کہ کیا میرا فرید عباسی کے گھر جانا ٹھیک ہوگا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ آج شام ہی رب نواز کی طرف سے اسے صلح کی دھمکی والی پیش کش بھی کی جا چکی تھی۔ اسے عدالت کے حکم پر گارڈ فراہم کیے گئے تھے اور خود اس نے بھی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کر لی تھیں مگر ان سارے انتظامات کو تحفظ کی ضمانت نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ آفس سے فرید عباسی کا تعاقب کرنے والے بہ آسانی اس کے گھر پہنچ سکتے تھے۔ اسے یا رخشی کو اغوا کرنا مشکل ضرور تھا' ناممکن نہیں۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتے تو سامنے آئے بغیر بھی کر سکتے تھے۔ دہشت گردی کے اس دور میں ہلاکت خیزی کے طریقے بھی کہیں زیادہ موثر ہو گئے تھے۔ زمانہ ٹائم بم یا ریموٹ کنٹرول بم کے بغیر بھی ایک آدمی کو لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹا سکتا تھا۔

فرید عباسی نے جب سے میرا ساتھ دیا تھا' دربدر ہو گیا تھا۔ شاید اس کی اپنی فطرت اور زندگی کے نظریات بھی اس کے ذمے دار تھے۔ اگر اس کی یہ سوچ نہ ہوتی تو وہ پولیس کی نوکری سے ہی کیوں نکالا جاتا۔ آج بھی وردی پہنے سرکاری اختیار کے بلینک چیک کو کیش کرا رہا ہوتا اور عیش کر رہا ہوتا۔ ایک اتفاق نے اس کے اور میرے راستے ایک کر دیے تھے اور وہیں سے اس کی خانہ بربادی کی داستان شروع ہوئی تھی۔ تاہم تصویر کا دوسرا روشن پہلو بھی تھا کہ اسی اتفاق نے اس کی خانہ آبادی کے خواب کو ایک من پسند تعبیر عطا کر دی تھی۔

میں نے اس کا نیا گھر دیکھا نہیں تھا مگر اس کا بتایا ہوا پتا ہی میرے ذہن میں محفوظ تھا اور ٹیلی فون نمبر بھی۔ پرانے گلوب سینما سے آگے آرام باغ بازار کے قریب میں نے آدھے گھنٹے کی جستجو کے بعد اچانک وہ گھر دیکھ لیا۔ فرید نے اس کی پہچان کی بہت واضح نشانیاں بیان کی تھیں۔ وہ سب

صحیح پتے کی تصدیق کرتی تھیں۔

یہ نسبتاً چھوٹا گھر تھا جس کے باہر کوئی لان یا باغ نہیں تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی جس کی اوپر والی منزل تعمیر کے اعتبار سے نئی لگتی تھی مگر تاریک پڑی تھی۔ نیچے والے حصے میں بھی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے اندھیرا تھا۔ حفاظت کے خیال سے کھڑکیوں کے اندر لوہے کی سلاخوں والی گرل لگائی گئی تھی۔

سو فیصد رہائشی علاقے کی اس گلی میں کوئی دکان بھی نہیں تھی۔ گھروں کے دروازے بند تھے اور گلی کی واحد اسٹریٹ لائٹ آخری حصے میں سو گز دور چمک رہی تھی مگر اس کا اجالا یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ گلی میں جو تھوڑی بہت روشنی تھی' وہ چھجوں کے نیچے جلنے والی لائٹس کی وجہ سے تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک مسجد کے مینار بھی باہر کی تاریکی کو مٹانے کی کوشش کرتے نظر آتے تھے مگر آبادی کے اندر کا اندھیرا ویسے ہی بڑا ڈراؤنا تھا۔

ابھی میں نے کال بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اوپر سے کسی نے غرا کے کہا "اسٹاپ۔"

میرا ہاتھ واپس آگیا اور میں نے اوپر دیکھا تو اچانک ایک سرچ لائٹ روشن ہو گئی جس نے مجھے اندھا کر دیا۔

"کون ہو تم؟"

"یہ تم بتاؤ گے۔ کس سے ملنے آئے ہو یہاں؟"

میں سمجھ گیا کہ اوپر چھت پر کوئی سیکیورٹی گارڈ مجھے اپنی کلاشنکوف کی زد میں لیے بیٹھا ہے۔ "مجھے مسز عباسی سے ملنا ہے۔ ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

"او کے۔ کال بیل دباؤ اور بالکل سیدھے کھڑے رہو۔"

میں نے کال بیل دبائی تو انٹرکام کے اسپیکر پر کوئی گھنٹی بجنے لگی پھر رخشی کی آواز آئی "ہیلو۔"

میں نے کہا "رخشی۔۔۔"

اس نے آواز پہچان کے کہا "اچھا اچھا۔۔۔ میں گارڈ سے کہتی ہوں۔ گیٹ کھولنے والے سوئچ کا کنٹرول اسی کے پاس ہے۔"

دروازہ کھل گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو رخشی سامنے آگئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار ایک چیخ ماری "تم۔۔۔" ایک لمحے کے لیے اس کی وہ حالت ہوئی جیسے اس نے اپنے سامنے شاہ عالم کے بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

اس کا ردعمل بالکل غیر اختیاری اور کہیں لاشعور کی تہ میں بیٹھے ہوئے خوف کا نتیجہ تھا۔ میں نے کہا "رخشی۔۔۔ یہ میں ہوں۔ ناصر۔۔۔"

مگر اس وقت تک رخشی نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا اور اب اپنی حالت پر خود ہی شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کا زرد ہو جانے والا رنگ رفتہ رفتہ بحال ہونے لگا اور اس نے دوپٹے کے پلو سے ماتھے پر آجانے والا پسینہ صاف کیا۔

"آئی۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ "واٹ از دس رخشی۔۔۔ دنیا میں ایک تم ہی تو جانتی ہو یہ بات کہ حقیقت کیا ہے۔"

اس نے شرمندگی سے سر ہلایا۔ "میں گھبرا گئی۔۔۔ اچانک تمہیں ایسے دیکھا تو۔۔۔"

میں اس کے ساتھ اندر جا کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس ڈرائنگ روم پر ڈالی جسے بہت سادگی سے فرنشڈ کیا گیا تھا لیکن اسباب آرائش سے خریدار کے حسن ذوق کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ یہ سب نیا سامان تھا۔

"فرید کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے حیرانی سے نظریں اٹھائیں "تمہیں نہیں معلوم؟"

میں نے کہا "شام کو فون کیا تھا اس نے بتانے کے لیے کہ ملک رب نواز نے مصالحت کی بات کرنے کے لیے دو افراد کو بھیجا تھا مگر ان کے تیور جارحانہ تھے اور انہوں نے بدمعاشی دکھائی تو فرید نے انہیں دفتر سے نکال دیا۔"

"اس کے بعد تم سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں' ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں شبنم کے ساتھ چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے بتایا کہ ملک رب نواز کے ساتھ میٹنگ طے پا گئی ہے اور یہ ملاقات شبنم کے آفس میں ہوگی۔ آزاد صاحب کی موجودگی میں۔"

"لیکن آزاد صاحب تو آفس ہی نہیں آ رہے ہیں۔ انہوں نے شبنم کو چارج دے دیا ہے۔ اب عملی طور پر وہی ایڈیٹر ہے۔"

"وہ تو معلوم ہے مجھے مگر آزاد صاحب سے گھر پر بات کی تھی ملک رب نواز نے تو وہ دفتر آنے پر راضی ہو گئے تھے اور انہوں نے رب نواز کو یہ ضمانت بھی دے دی تھی کہ اخبار کے دفتر میں یہ ملاقات باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہوگی۔ اس میٹنگ کے بارے میں کسی تیسرے فریق کو علم نہیں ہونا چاہیے اور بعد میں بھی اس کی خبر کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔"

"آزاد صاحب کیسے مان گئے؟"

"بس۔ میرا خیال ہے وہ ہم سب کے انٹرسٹ میں مان گئے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ میں نے شبنم کو آفس میں نیچے چھوڑ دیا تھا۔ اوپر جاتا تو شاید سب ہی مل جاتے۔ بڑی گڑبڑ ہوجاتی۔"

"گڑبڑ کیوں ہوجاتی؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم کا شبنم کے ساتھ نظر آنا چہ معنی دارد۔ دیکھنے والے تو مجھے شاہ عالم ہی سمجھتے۔"

اس نے سر ہلایا "خود مجھے شاک لگا تھا تمہارا اصل روپ دیکھ کر۔ پریشانی میں پتا نہیں کیا ہوگیا تھا۔"

"قصور تمہارا نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک شخص نے سوال کیا تھا مجھ سے کہ میں شاہ عالم تو نہیں۔ شبنم اور شاہ عالم کے مراسم کے قصے تو دنیا جانتی ہے۔ میں اس کے ساتھ ہوتا تو میری تردید بھی کام نہ آتی۔ اب خیال آرہا ہے کہ میں تین گھنٹے سے زیادہ اس کے ساتھ رہا اور ہم پتا نہیں کہاں کہاں گئے۔"

"کہاں کہاں گئے؟"

"اِدھر اُدھر۔ اسے بھی شاپنگ کرنا تھی مجھے بھی۔ ڈھنگ کے کپڑے نہ اس کے پاس تھے اور نہ میرے پاس۔ وہ آج سارا دن شاپنگ ہی کرتی رہی۔ گھر کو نئے سرے سے سجانے کے لیے ہر چیز نئی خریدی ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

"تم اسی حلیے میں اس کے ساتھ میں تھے؟"

"ہاں' بڑی بے وقوفی کی ہم نے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے دیکھا ہوگا ہمیں۔ ہم تو خیر کسی کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔"

وہ پیر کے انگوٹھے سے قالین کریدنے لگی۔ "یہاں آکے کون سی عقل مندی کی ہے تم نے۔ کسی اخبار کا شکی مزاج رپورٹر تمہارے پیچھے لگ جاتا اور یہاں آجاتا تو بڑی سنسنی خیز سرخیاں بن جاتیں۔ شاہ عالم کی لندن سے واپسی' شاہ عالم زندہ ہے۔ وہ اپنی سابقہ بیوی سے چوری چھپے ملنے گیا تھا جو اب ایڈووکیٹ فرید عباسی کی بیوی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ یہاں تک کسی نے بھی میرا تعاقب نہیں کیا لیکن یو آر رائٹ۔ اس سے تمہاری بدنامی ہوتی اور میری مشکلات میں اضافہ ہوجاتا۔ بہت عذاب جھیلے تھے میں نے شاہ عالم بن کے اور دوبارہ ناصر عظیم کی زندگی تو ابھی تک پوری طرح اختیار ہی نہیں کی ہے۔ ابھی میں واپسی کے مرحلے میں ہوں۔ اس مقام تک نہیں پہنچا ہوں جہاں حالات نے میرے سامنے ایک دوراہا کھول دیا تھا اور میں شامت اعمال کے باعث بھٹک کے شاہ عالم کی زندگی کے راستے پر چل پڑا تھا۔"

"لوگ ناصر عظیم کو اتنی جلدی بھول نہیں سکتے۔"

"اس کا اندازہ ہوگیا ہے مجھے۔"

"آخر کیا ضرورت تھی تمہیں خود کو اس حد تک بدلنے کی؟"

"یہ شبنم کی خواہش تھی اور یہ بات نہیں کہ جذبات سے مغلوب ہوکے میں نے عقل سے کام نہیں لیا۔ ایک تو میرا حلیہ ناقابل برداشت حد تک مضحکہ خیز ہوگیا تھا۔ چہرے اور سر پر بالوں کے اس جنگل کے ساتھ میں ایک جنگلی ریچھ نظر آنے لگا تھا۔ شاید کچھ لوگ مجھے سادھو' درویش یا ڈاکو ہی سمجھتے ہوں گے پھر کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ میرا وہ حلیہ کسی اشتہاری مجرم کے حلیے سے زیادہ بدنام ہوگیا تھا۔ میں شبنم کے ساتھ ڈرائیور بن کے پھرتا رہا پھر سونی کے ساتھ رب نواز کے بیٹے کے اغوا میں ملوث ہوا۔ رب نواز میری جان کا دشمن تھا۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ کل میں نے ایک کارنامہ اور کیا۔ سڑک پر اتفاق سے مجھے وہ قاتلوں کا ٹولہ نظر آگیا۔ وہ خود مجھ سے آٹکرائے۔"

"کون۔ کس کی بات کررہے ہو تم؟"

میں نے کہا "تیس مار خان اور چھوٹی کے قاتل۔ وہ میری اور شبنم کی گاڑی کو مستی میں ٹکر مار کے نکل گئے تھے۔ پھر ایک جگہ میں نے انہیں غنڈا گردی کرتے دیکھ لیا اور بس۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ انجام یہ ہوا کہ ان میں سے دو یا تین نے مقابلہ کیا اور اپنی بدمعاشی کے زعم میں مارے گئے۔ وہ ملک رب نواز کے خاص بندے تھے۔ جو بچ گئے انہوں نے رب نواز کو بتادیا کہ ان کی یہ حالت اس داڑھی والے جن نے کی۔"

"داڑھی والا جن کیسے ہوگیا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"بس ایسے ہی میں نے اپنی دہشت بٹھانے کے لیے ان سے کہا کہ رب نواز کو بتادینا کہ وہ داڑھی والا تو جن ہے۔ کسی کو چھوڑے گا نہیں اور میں کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ رب نواز نے اس کے بعد ہی صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے صلح کی ضرورت کو محسوس کیا۔ یہی اس کی شکست کا آغاز ہے اور اگر وہ دھوکا دے رہا ہے تو معلوم ہوجائے گا۔ داڑھی والے جن کا خوف اس کے اعصاب پر سوار رہے گا۔ میں نے ناصر عظیم کی شناخت قائم کرنے کے لیے اپنی اصل پرانی زندگی کے ساتھ وہی صورت بھی اختیار کی تو میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ کہیں لوگ مجھے شاہ عالم نہ سمجھ لیں۔ ناصر عظیم ایک گمنام آدمی تھا۔ ان لوگوں کے سوا جن سے اس کے کاروباری مراسم ہیں' اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ شاہ عالم کی ایک پبلک لائف تھی۔"

"اس مشکل کا کوئی حل بھی ہوگا تمہارے ذہن میں؟"

میں نے کہا "ہاں' ناصر عظیم ایک REALITY ہے۔ وہ اس مشکل کا سامنا کرے گا کیونکہ وہ حلیے بدل بدل کے مصنوعی زندگی نہیں جی سکتا خواہ اس کے لیے مجھے کوئی پی آر او رکھنا پڑے یا اشتہار دینے پڑیں۔ میں سب کی غلط فہمی دور کردوں گا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور مجھے شاہ عالم سمجھنے والے اپنی نظر کا اور عقل کا علاج کرائیں۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہیں رہے گا کیونکہ مسئلہ عام آدمی کا نہیں۔ کچھ خاص لوگوں کا ہوگا جو شاہ عالم سے خصوصی تعلقات رکھتے تھے۔ سیاسی یا کاروباری طور پر اس کے حریف یا حلیف تھے۔ جب وہ قائل ہوجائیں گے کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو پھر اتنا مسئلہ نہیں رہے گا۔"

"تم نے بہت پہلے ایک مہم چلائی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ شاہ عالم فرار ہوکے لندن چلا گیا ہے۔ خبریں بھی لگوائی تھیں کہ وہ لندن میں عیش کررہا ہے۔ اس نے کسی ماڈل سے شادی کرلی ہے۔" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "ہاں' اس ماڈل کے ساتھ شادی کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں پھر یہ خبر آئی تھی کہ وہ ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ یہ سب شبنم کے صحافتی تعلقات اور اس کی لابی کا کارنامہ تھا۔"

رخشی نے کہا "مگر رب نواز نے اس پر یقین نہیں کیا تھا اور اس نے اپنے ذرائع سے تصدیق بھی کرائی تھی جس ماڈل کے ساتھ شاہ عالم کی شادی والے پوز یا تصویر شائع ہوئی تھی' اس نے اخبار کے خلاف ہرجانے کا کیس کردیا تھا جو اخبار کے معافی مانگ لینے سے ختم ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں' رب نواز جانتا ہے کہ وہ خبریں جھوٹی تھیں اور شبنم نے لگوائی تھیں۔ اس نے شبنم اور خود تم سے شاہ عالم کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اگر وہ مجھے یہاں یا شبنم کے ساتھ دیکھ لے تو سب سے پہلے مجھے شاہ عالم قرار دینے والا شخص وہی ہوگا اور اس کے یقین کو ختم کرنا میرے لیے بہت مشکل شاید ناممکن ہوگا۔ وہ پرانا حساب برابر کرنے کے لیے پھر میرے پیچھے پڑ جائے گا اور اپنی بدمعاشی کی ساری طاقت آزما کے مجھ سے تسلیم کرانے کی کوشش کرے گا کہ میں نے ہی شاہ عالم کا ڈبل رول کیا تھا۔"

رخشی کچھ فکر مند ہوگئی "پھر۔ تم کیا کرو گے؟ کیسے منواؤ گے خود کو ناصر عظیم۔ کیسے اسے غلط ثابت کرو گے؟"

"ایک طریقہ تو ہے مقابلے کا۔ بدمعاشی ہے تو بدمعاشی سہی۔ نہ میں کبھی شاہ عالم تھا اور نہ ہوں۔ رب نواز کے یا چند اور لوگوں کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ثبوت گواہ سب ہیں لیکن بدمعاشی میں رسک ہے۔ اس میں جان بھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ میرے ذہن میں ایک اور پلان ہے جس پر میں ساتھ ساتھ عمل کروں گا۔"

"وہ کیا؟"

"میرے پاس شاہ عالم کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر دستاویزات موجود ہیں۔ اس کا برٹش پاسپورٹ بھی ہے۔ اس میں کچھ خرچہ ضرور ہوگا مگر میں دو چار بار شاہ عالم بن کے لندن جاؤں گا۔ وہاں اپنی موجودگی کا ثبوت چھوڑ دوں گا۔ ممکن ہوا تو ایک کاغذی شادی بھی کرلوں۔"

"پیپر میرج جو لوگ شہرت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔" رخشی نے کہا۔

"ہاں' امریکا میں رسک زیادہ ہوتا ہے کہ کوئی گلے نہ پڑجائے۔ برطانیہ میں اپنے پاکستان' بھارت' سری لنکا اور بنگلہ دیش کے علاوہ فلپائن اور ملائیشیا کی ہزاروں عورتیں پہنچ گئی ہیں جو وہاں کے لاکھوں ایشیائی باشندوں کی ہر ضرورت پوری کررہی ہیں۔ وہ عارضی یا مستقل بیوی بن سکتی ہیں۔ اگر انہیں اس کام کا معقول معاوضہ ملے۔ ایک ساتھ میں یہاں ناصر عظیم اور وہاں شاہ عالم بن کے رہ سکتا ہوں۔ دو چار دن یہاں' دو چار دن وہاں لیکن یہ سلسلہ غیر معینہ مدت تک نہیں چل سکتا۔ یہ میرے لیے ایک تھکا دینے والا اعصاب شکن اور خطرناک کام ہوگا مگر مجھے اس کھیل کو منطقی انجام تک لے جانے کے لیے یہ کرنا پڑے گا۔"

رخشی نے متاثر ہوکے کہا "اور وہ قطعی انجام کیا ہوگا؟"

"وہی جو پہلے ادھورا رہ گیا تھا شاہ عالم کی موت۔ جس کا دستاویزی ثبوت ہو۔ لندن میں یہ کام مشکل ہے۔ انڈیا پاکستان کی پولیس کی مدد سے یہ کام ہوسکتا ہے۔ کراچی میں شاہ عالم کے قتل یا حادثاتی موت کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ سے پوسٹ مارٹم رپورٹ تک کسی بھی لاوارث کو شاہ عالم قرار دے دیا جائے اور اس کے پاس سے شناخت کی ہر دستاویز برآمد ہونے کے بعد شک کی گنجائش نہ رہے۔ یہ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ کے ثبوت مسترد نہیں کیے

جاسکتے۔ مرحوم کی بیوہ بھی۔"

"بیوہ؟"

"ہاں جو بیوی کا رول کرے گی۔ لندن سے کراچی تک۔ اس سے بیان بھی دلوائے جاسکتے ہیں۔ اس کی سوگوار تصویریں شائع کرائی جاسکتی ہیں۔"

رخشی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا عجیب قسمت کا کھیل ہے۔ اس کی بیوی اور بیوہ اور طلاق حاصل کرنے والی سابق بیوی۔ سب میرے علاوہ کون ہے۔"

میں نے کہا "کھیل تو قسمت نے میرے ساتھ کھیلا تھا کہ مجھے شاہ عالم بننا پڑا اور اس کے مرجانے کے باوجود زندہ رہنا پڑا۔ عذاب میرے لیے ہے جسے ناصر عظیم کی زندگی کی طرف لوٹنے کے لیے سارے جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں اور سوانگ بدلنے پڑ رہے ہیں۔"

"اس کے عذاب کا بھی تو سوچو جو مر کے بھی کبھی جیتا ہے تو کبھی پھر مارا جاتا ہے۔ خیر۔ تمہارا یہ پلان خدا کرے کامیاب ہو۔"

"پلان کامیاب ہوگا۔ جب تک ملک رب نواز کو معلوم ہوگا کسی نام کے شاہ عالم کی تدفین کراچی میں ہوجائے گی۔ اس کی بیوی غائب ہوجائے گی۔ رب نواز چاہے تو پولیس ریکارڈ سے تصدیق کرے۔ اسپتال جاکے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ لے۔ ناصر عظیم یہاں لاہور میں معمول کے مطابق اپنے کاروباری امور انجام دیتا پایا جائے گا تو اسے یقین کرنا ہی پڑے گا۔"

رخشی نے پھر آہ بھری "پتا نہیں یہ سب کیوں ہوا لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا ناصر۔"

"کیا برا ہوا۔ اس ایک برائی کے بطن سے کتنی اچھائی کو نسبت ملی۔ شاہ عالم کی برائی بھلائی بھی اس کے ساتھ گئی مگر یہ حقیقت بدل نہیں سکتی تھی کہ نہ وہ اچھا آدمی تھا نہ اچھا سیاست داں۔ نہ اچھا شوہر اور نہ اچھا پاکستانی۔ اس کے دم سے خرابیوں کے کتنے سلسلے وابستہ تھے۔ اس نے لالچ' ترغیب' دھمکی اور بلیک میلنگ کے بل پر مجھ سے میری زندگی چھینی اور مجھے دھوبی کا کتا بنا دیا۔ اس نے تمہیں عذاب کے سوا کیا دیا۔ کیا آج تم خوش نہیں ہو؟ تمہیں فرید جیسا فرشتہ صفت شوہر ملا۔ شاہ عالم کے برعکس ایک کامل انسان۔ ایک مثالی شوہر۔ شاہ عالم کے ساتھ جو ہوا اس کے اعمال کی سزا تھی۔ جو اسے مرنے کے بعد بھی مل رہی ہے اور ملتی رہے گی لیکن اس کے اعمال کا عکس جن کی زندگی پر پڑا' وہ بھی سکون سے نہیں ہیں مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

رخشی نے وال کلاک کی طرف دیکھا "فرید کو اب آجانا چاہیے۔ بہت دیر ہوگئی۔"

میں نے کہا "کیا اس نے کچھ بتایا تھا؟"

"نہیں' آفس سے جانے کے بعد اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ میں نے کوشش کی تھی مگر اخبار کے دفتر کا فون بھی نہیں ملا۔"

میں نے کہا "شام کے بعد ایکس چینج بہت بزی ہوجاتا ہے۔ ہر جگہ سے اخباری نمائندے فون کرتے ہیں لیکن آزاد صاحب کا ایک ڈائریکٹ نمبر ہے۔"

"وہ بھی بزی ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ بہت اچھا ہوا کہ تم ادھر آگئے۔ باتوں میں کچھ وقت گزر گیا۔"

میں نے ہنس کے کہا "ابھی تم کچھ اور کہہ رہی تھیں کہ مجھے ادھر نہیں آنا چاہیے تھا اور میں واقعی نہ آتا لیکن ادھر دوسرے گھر میں رئیس نہیں تھا۔ فون کسی نے نہیں اٹھایا پھر میں نے نیلم کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی تک شوٹنگ سے واپس نہیں لوٹی اور وہ خاتون ــ سونی ــ آج وہ بھی نکل کھڑی ہوئیں شوٹنگ دیکھنے کے لیے۔ نیلم کے ساتھ ہی چلی گئی اسٹوڈیو۔ کتنا سمجھایا تھا اسے کہ گھر سے باہر قدم مت نکالنا ابھی کچھ عرصہ۔"

"نیلم بھی کچھ سوچ کے ہی ساتھ لے گئی ہوگی کہ وہاں سونی کو پہچاننے والا کون ہوگا۔"

میں نے کہا "کمال کرتی ہو تم بھی۔ سونی کی اتنی بڑی بڑی تصویریں اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ حکومت کی طرف سے انعام ہے اس کی گرفتاری پر اور اس کے پرانے ڈاکو ساتھی' سب اشتہاری مجرم ہیں۔"

"اب غصہ کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ نیا گھر کیسا لگا؟"

میں نے کہا "گھر؟ گھر تو ایسا ہی ہوتا ہے اور تمہارا گھر تو بڑا گھر ہے۔ تم مجھ سے میرے گھر کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔"

"یہ سب میں نے اپنی پسند سے خریدا ہے۔" وہ بولی۔

"تمہاری اور شبنم کی پسند کا فرق میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا "تمہیں سادگی پسند ہے۔ اسے پرکاری۔ دونوں کا اپنا انداز حسن ہے مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ تم نے تو چائے کا بھی نہیں پوچھا۔"

"کیا؟ کھانا نہیں کھایا؟ اور ایسے چپ بیٹھے ہو اتنی دیر سے۔ تکلف برت رہے ہو۔" وہ فوراً اٹھی "میں سمجھی باہر سے کھانا کھا کے آئے ہو۔"

"کھا کے ہی آتا مگر ایڈیٹر صاحب کو فرصت نہیں تھی۔ اخبار کی فکر کھائے جارہی تھی۔ دیر ہوگئی دیر ہوگئی کی رٹ لگا رکھی تھی۔"

"فرید تو اب کھا کے آئیں گے۔ میں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا ابھی تک' میں کھانا گرم کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "اور وہ بھی بھوکا آیا تو؟"

وہ ہنسنے لگی "اسے اور پکادوں گی۔"

میں نے آزاد صاحب کا ذاتی نمبر اور اخبار کے ایکس چینج کو مسلسل ٹرائی کیا مگر جواب میں مجھے وہی ٹوں ٹوں سنائی دی جو ظاہر کرتی تھی کہ فون بزی ہے۔ آخر اتنی دیر تک آزاد صاحب' ملک رب نواز اور فرید عباسی کے درمیان کیا بات چل رہی ہے۔ یہ کون سا انڈیا پاکستان کے سربراہ کی ملاقات کا مشترکہ اعلامیہ ہے جس کے ایک ایک لفظ پر بحث ہو۔

میرے خیال میں تو یہ بات چیت آگے چل ہی نہیں سکتی تھی۔ فرید اپنے قانونی موقف میں رعایت کرنے پر یا تبدیلی پر کسی کا دباؤ قبول کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس کا کوئی مسئلہ ذاتی نہیں تھا۔ رب نواز کے سارے مسائل لاقانونیت کے تھے اور آزاد صاحب نہ رب نواز کو مجبور کرسکتے تھے کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کردے اور نہ فرید کو قائل کرسکتے تھے کہ وہ ملک صاحب کے خلاف مقدمات کی پیروی سے دست بردار ہوجائے۔

میں نے ناکام ہوکے ریسیور رکھا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھانے کے بعد یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ رخشی کے گھر سے مجھے "ہیلو" کہنا چاہیے۔ فون شبنم یا فرید عباسی اور رئیس کے علاوہ بھی کسی کا ہوسکتا تھا جسے یہاں میری موجودگی ناگوار گزرتی پھر میں نے آواز بدل کے "ہیلو" کہا مگر دوسری طرف شبنم تھی۔

"آپ یہاں تشریف فرما ہیں؟" وہ خفگی سے بولی۔

"جی نہیں' میں کھڑا ہوا ہوں۔" میں نے کہا "اور تشریف میری ہے۔ میں جہاں چاہوں رکھوں۔"

"میں وہاں فون کررہی ہوں کب سے۔ تمہاری نیلم کے گھر۔"

میں نے کہا "میری نیلم کے گھر کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ نیلم نہ سونی اور اتنی دیر سے میں جھک مار رہا ہوں۔ سارے فون خراب ہوگئے ایک ساتھ۔ کوئی بھی لائن نہیں مل رہی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا فون پہلے تو مل جاتا تھا۔"

"لائنیں واقعی خراب تھیں۔ ایک گھنٹے کوشش کی ہر جگہ۔ اوپر ڈائریکٹر جنرل سے بھی بات کی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ایک کمپلین پر دوڑے چلے آتے تھے ٹیلی فون والے مگر اب حالات روز بہ روز خراب ہی ہوتے جارہے ہیں۔ بس پیسہ چلتا ہے۔"

میں نے کہا "رخشی بھی پریشان تھی کہ میٹنگ نہ ہوئی کابینہ کا اجلاس ہوگیا۔"

"میٹنگ! کیسی میٹنگ؟"

میں نے کہا "وہ جس کی صدارت آزاد صاحب کرنے والے تھے۔ متحارب فوجوں کے درمیان۔ سیز فائر ایگری منٹ کے لیے۔"

"مگر وہ میٹنگ کہاں ہوئی؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"ہاں' رب نواز نے کہا تھا کہ وہ آفس پہنچ جائے گا پھر نہ جانے کیوں وہ ڈر گیا یا اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اخبار کے آفس میں اس کے خلاف صحافی برادری کسی سازش کے تحت اکٹھی نہ ہوجائے۔ اس نے دوبارہ آزاد صاحب کو فون کیا کہ میں آپ کے گھر آجاتا ہوں۔ آزاد صاحب نے کہا کہ چلو یوں سہی۔ ہم جیسے وہاں ویسے یہاں۔ فرید یہاں پہنچا تو میں نے اسے کہا کہ آزاد صاحب کے پاس چلے جاؤ۔"

"پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ وہ آزاد صاحب کے پاس بیٹھا ان کی لن ترانیاں سنتا رہا۔ ایک گھنٹے تک ــ رب نواز نہیں آیا اور آتا تب بھی کیا ہوتا۔ فرید اس پر بھی اپنے آپ سے خفا تھا کہ وہ ایک مفرور مجرم سے چوری چھپے ملے گا۔ وہ اپنے قانونی موقف سے ایک انچ تو کیا ایک سوت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "یار لعنت بھیجو قانونی موقف پر۔ یہ بتاؤ کہ وہ آزاد صاحب کے پاس کس وقت پہنچا تھا۔ رات کے دس بجے ہیں اس وقت۔ ایک گھنٹا ان کے پاس بیٹھ کے وہ کہاں گیا؟"

"کیا؟ وہ گھر نہیں آیا؟"

"لاحول ولا قوۃ اور پریشانی کیا ہے مجھے۔ کیا وہ اکیلا گیا تھا آزاد صاحب کے پاس۔"

"نہیں' سیکیورٹی گارڈ اس کے ساتھ تھے۔"

"کون سے گارڈ۔ سرکاری؟ سوتے خاں اونگھتے خاں؟"

"نہیں بھئی' وہ اپنی سیکیورٹی ایجنسی کے دو بندے لے گیا تھا ساتھ۔ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ ایک اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ دوسرا ساتھ میں تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ ان کی موجودگی میں فرید کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ رخشی سے کہو کہ

پریشان نہ ہو۔ وہ آجائے گا۔ ابھی دس ہی تو بجے ہیں۔"

میں نے کہا "اور دیکھتے ہیں تھوڑی دیر مگر تم کو میری تلاش کیوں تھی۔ صرف یہ جاننا چاہتی تھیں کہ میں اپنی نیلم کے پاس ہوں یا کسی اور کے ساتھ۔"

"مجھے کیا تم کسی چڑیل کے ساتھ ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "تمہارے جلنے کی بو فون میں آرہی ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ جلتی ہے میری جوتی۔"

"میرے پاس ایک غیر مصدقہ اطلاع ہے۔"

"اسے عرفِ عام میں افواہ کہتے ہیں۔ کس نے دی ایک اخبار کی توپ ایڈیٹر کو یہ غلط اطلاع؟"

"میرے پاس فائر اسٹیشن سے فائر آفیسر کا فون آیا تھا۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے کسی نے وہاں فون کرکے آگ لگنے کی اطلاع دی۔ اس نے معمول کے مطابق انٹری کی اور ایک فائر انجن بھیج دیا۔ وہاں اس وقت ایک ہی گاڑی تھی اور حسن اتفاق سے ڈرائیور بھی حاضر تھا۔ فائر مین موجود تھے۔ گاڑی میں پیٹرول، ٹائروں میں ہوا تھی اور انجن بھی اسٹارٹ ہوگیا چنانچہ وہ گھنٹی بجاتے ہٹو بچو کا اعلان کرتے روانہ ہوگئے۔ وہ مشکل سے دو کلو میٹر دور گئے تھے کہ ایک ٹرک نے انہیں اوور ٹیک کیا اور ان کے سامنے آگیا۔"

میں نے کہا "فائر بریگیڈ والے تو بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ ٹریفک جام سے' سگنل توڑتے ہوئے ون وے ٹریفک کے خلاف ہر جگہ سے راستہ بنالیتے ہیں۔"

"ہاں مشہور یہی ہے۔ اس ٹرک نے راستہ بلاک کیا اور فائر انجن کو روک دیا۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ ایک مسلح تھا۔ اس نے ریوالور کے اشارے سے ڈرائیور کو نیچے اتارا۔ دوسرے نے فائر مینوں سے کہا کہ چپ چاپ کھڑے رہیں اور گھنٹی بجاتے رہیں پھر وہ گاڑی لے گئے۔ ایک جگہ انہوں نے گن پوائنٹ پر فائر مینوں سے ان کی وردی اتروائی۔"

"فائر پروف ڈانگری؟"

"بس غالباً اس کی ضرورت تھی انہیں۔ فائر مین صرف انڈر ویئر میں پولیس اسٹیشن پہنچے تو پہلے انہیں سیدھا حوالات میں بند کردیا گیا۔ کوئی سوال کیے بغیر کچھ پوچھے بغیر۔ جب انہوں نے واویلا کیا اور بتایا کہ وہ گاڑی کے چھینے جانے کی رپورٹ لکھوانے آئے ہیں تو انہیں ڈیوٹی افسر کی جگہ ڈیوٹی دینے والے کے سامنے لے جایا گیا۔ ڈیوٹی افسر ڈنر نوش فرمانے کسی سائل کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ جب وہ پیٹ کے دوزخ میں جہنم کا ایندھن ڈال کے لوٹے تو بہت خفا ہوئے کہ یہ پاگل کیوں بٹھا رکھے ہیں معززین کی کرسی پر۔ تاہم فائر مینوں کی فریاد پر انہوں نے ساری بات سنی اور پھر فرمایا کہ ان کے جسم پر جتنا لباس رہ گیا ہے' وہ بھی اتارلو اور ان کے لگاؤ سو سو جوتے۔"

"پھر کھلاؤ انہیں سو سو پیاز مگر کس جرم میں۔"

"کیا تم پولیس کے اختیار کو چیلنج کررہے ہو؟ وہ کسی جرم کے بغیر کسی کے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ڈیوٹی افسر نے فائر انجن چھینے جانے کی واردات کو جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ یہ فائر مین نہیں۔ شرابی ہیں۔ نشے میں بکواس کررہے ہیں۔ بھلا آج تک کسی نے فائر بریگیڈ کی گاڑی چھینی ہے؟ سڑک پر دس بیس گاڑیاں روز چھینی جاتی ہیں تو کسی کام آتی ہیں۔ کسی واردات میں یا سیر تفریح کے لیے۔ تھانے میں بیچنے کے لیے یا تحفے میں دینے کے لیے مگر فائر انجن کا کوئی کیا کرے گا۔ فائر مینوں کے انڈر ویئر بھی اتر ہی جاتے مگر ان میں سے ایک ذرا بہادر تھا۔ اس نے کہا کہ ہم جارہے تھے۔ آگ بجھانے اور یہاں تم سے مدد مانگنے آئے تھے۔ تم وقت ضائع کررہے ہو۔ ہمیں یہاں تفتیش میں روک کے۔ افسرانِ بالا اور اخبار والوں کو پتا چلا تو سوچ لو تمہاری ہی پیٹیاں اتر جائیں گی۔ اسی وقت وہاں کوئی سمجھدار بندہ آگیا اور اس نے کہا کہ اچھا ہم روزنامچے میں اندراج کرلیتے ہیں کیونکہ ایف آئی آر تو ہے اوپر کا معاملہ۔ ایس ایچ او صاحب کے آرڈر کے بغیر نہیں کرسکتے۔ نکالو سو روپے۔"

"سو روپے؟ کس بات کے۔؟"

"پولیس روزنامچے میں واردات کی اندراج فیس۔"

"ایسی کوئی فیس نہیں ہوتی۔"

شبنم نے کہا "ہاں نہیں ہوتی۔ فائر مینوں نے بھی یہی کہا۔ وہ سو روپے کیوں دیتے' اور کہاں سے دیتے۔ جسم پر تو لنگوٹی رہ گئی تھی۔ وہ اسی کو بچا کے بھاگے تو باہر کہیں سے فائر اسٹیشن پر اپنے افسرِ اعلیٰ کو مطلع کیا اور افسر اتنا سیانا تھا کہ اس نے اخبار والوں کو بتادیا تاکہ اس کی جان بچ جائے اور الزام آئے پولیس پر کہ اس نے بروقت کچھ نہیں کیا۔ جب اس نے مجھے پتا بتایا کہ آگ وہاں لگی تھی تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔"

"ماشاء اللہ' بڑے اچھے کان ہیں۔ خود کھڑے ہوگئے۔ اب کیا صورت حال ہے۔ کھڑے ہیں کہ بیٹھے ہیں؟"

دوسرے کمرے سے رخشی نے تیسری بار یاد دہانی کے بعد چلانا شروع کیا "ارے بھئی کھانا کھالو خدا کے لیے۔ بعد میں باتیں کرتے رہنا رات بھر۔ شبنم کہیں بھاگی جارہی ہے۔"

میں نے کہا "ایسی لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں رخشی۔"

"کیا بک رہے ہو؟ یہ لڑکیاں کہاں سے آگئیں بیچ میں۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ وہ رخشی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ کون ہے۔ میں نے تمہارا بتایا تو کہنے لگی کہ ایڈیٹر کو فضول باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اپنا تو وقت خراب کرلی ہے' دوسروں کا بھی کرلی ہے اور بھی بہت کچھ بول رہی ہے مگر تم چھوڑو۔"

شبنم ہنسنے لگی "اسے کیا معلوم کہ تمہارے دماغ میں پیدائشی خرابی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔"

"خلاصہ یہ کہ کسی نے جھوٹ بول کے فائر انجن منگوایا اور ہائی جیک کرلیا لیکن اس نے رئیس خان کے رئیس خانے کا پتا کیوں دیا؟"

"یہی سوال میرے ذہن میں بھی اٹھا تھا چنانچہ میں نے فائر آفیسر کو تسلی دی کہ اس معاملے میں پولیس کی خیر نہیں۔ صبح دیکھنا خبر پہلے صفحے پر اور ایک رپورٹر کو فوراً بھیج دیا۔ بیس منٹ بعد اس نے کہیں سے فون کیا اور یہ بتایا کہ اس علاقے میں آتش زدگی کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے جو پتا سمجھایا تھا۔ اس نے وہاں ہر طرف گھوم پھر کے دیکھا اور لوگوں سے بھی پوچھا مگر سب ٹھیک تھا چنانچہ وہ واپس آگیا۔"

"مجھے دال میں کچھ کالا پھر بھی نظر آرہا ہے۔"

"میں نے بھی اسی لیے فون کیا ہے تمہیں۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تو ہوسکتا ہے۔۔۔" شبنم نے کہا۔

"دیکھو۔۔۔ میں بقلم خود وہاں جانے سے قاصر ہوں۔ فرید ہوتا تو میں اسے بھیج دیتا۔ رئیس کا پتا مل جائے تو وہ خود جاکے دیکھے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیا دیکھے؟ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر تم کھانا کھاؤ۔ میں رئیس کا پتا چلاتی ہوں۔ تم بھی دیکھو۔"

رخشی نے گفتگو کا وہ قصہ نہیں سنا تھا جس کا تعلق فرید سے تھا۔ چنانچہ وہ بیزاری سے کھانے کی میز پر میری منتظر تھی۔ "کیا ہوگیا؟ کہاں آگ لگ گئی؟"

میں نے کہا "رپورٹ تو بہت لمبی دی شبنم نے مگر کچھ پتا نہیں چلا کہ آگ لگی ہے یا نہیں۔"

کھانے کے دوران میں' میں نے اسے فائر بریگیڈ کی گاڑی کے چھینے جانے کی دلچسپ واردات کے بارے میں بتایا تو وہ ہنس دی۔ میری بھوک ختم ہوگئی تھی اور مجھے رہ رہ کے یہ خیال آرہا تھا کہ رئیس خانے میں آگ لگنے کی غلط اطلاع محض ایک اتفاق تھا یا اس کے پیچھے کوئی سازش ہوسکتی ہے۔ اتفاق کی بات دل کو نہیں لگی تھی۔ سیکڑوں ہزاروں ایڈریس اور بھی تھے۔ جھوٹی اطلاع دینے والے کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ صحیح پتا لکھوائے۔ وہ کچھ بھی بتا سکتا تھا۔ فائر بریگیڈ والے تو مجبور لوگ ہیں۔ کوئی مذاق کرے تب ہی کہتے ہیں کہ کہیں ان کی غفلت سے جان و مال کا نقصان نہ ہوجائے۔ وہ جھک مار کے واپس لوٹ جاتے اور مقصد اگر فائر انجن یا فائر پروف وردی حاصل کرنا تھا تو اس کے لیے رئیس خانے کا پتا کیوں لکھوایا گیا؟ مقصد یقیناً کچھ اور تھا مگر کیا؟

اس "کیا" کے سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ رخشی نے مجھے متفکر دیکھا اور میرا بے دلی سے کھانا دیکھا تو نروس ہوگئی۔ "کیا بات ہے۔ بھوک بھوک شور مچا رکھا تھا اور کھانا سامنے ہے تو ایسے کھارہے ہو جیسے زبردستی ہورہی ہے تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "تمہارا دل رکھنے کے لیے رغبت سے کھانا کی اداکاری کیسے کروں۔ ٹنڈے دیکھ کر میری بھوک کا فوراً انتقال ہوجاتا ہے۔"

"تو اور بھی چیزیں ہیں سامنے۔ آلو قیمہ کھالو۔ چنے کی دال اچھی پکی ہے۔ ٹنڈے فرید کو پسند ہیں۔"

"میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "ہاں اس کی صورت سے پتا چلتا ہے۔ منہ ٹنڈے جیسے ہوگیا ہے اس کا۔"

"آخر کیا بات ہے؟ فرید تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے حیرانی سے کہا "فرید؟ ہاں ٹھیک ہی ہوگا۔ تمہیں شک کیوں ہے آخر؟"

"شبنم نے کچھ نہیں بتایا؟"

"یہ بتایا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ آزاد صاحب سے فسانہ آزاد سنتا رہا۔ وہاں سے جان چھڑا کے اٹھتے وقت اس نے یہ دردناک بیان دیا کہ اب مجھے گھر جاکے ٹنڈے کھانے ہیں اور تعریف بھی کرنی ہے بیوی کی۔"

"مذاق مت کرو۔" "اب تو ساڑھے دس ہورہے ہیں۔"

میں نے کہا "آج تم تختی سے پوچھنا۔ ڈھیل دی جائے تو شوہر بگڑ جاتے ہیں اور فرید ہے میری طرح خوب صورت اور خوب صورتی کا شیدائی۔ دہرا خطرہ ہے تمہارے لیے۔"

میری بات پوری ہونے سے قبل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رخشی بڑی بے تابی سے دوڑی۔ میں نے اس کی آواز سنی "ہاں۔۔۔ کون رئیس۔ ہاں ہاں۔" پھر اس نے مجھے آواز دی مگر میں اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔

"کہاں ہے تو پیارے' کیا کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹنڈے نہ کھانے کی کوشش۔ کامیاب کوشش ۔۔۔ مگر تو خود کہاں بھٹک رہا ہے۔ میں نے سب جگہ فون کیے۔"

"یار میں ادھر آیا تھا کام سے۔ اپنے رئیس خانے کی طرف۔ سوچا تھا کہ اپنے شہ زوروں کو آج ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ روز روز ان کا دانہ پانی دیکھنے کے لیے آنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کی طرف توجہ بھی نہیں تھی۔"

"اس سے مرغوں کے نفسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہوں گے۔ ان کی شخصیت میں یاس اور احساس محرومی کے منفی رجحانات غالب آ رہے ہوں گے۔"

وہ پر تفکر انداز میں بولا "یہاں کچھ گڑبڑ ہے یار۔"

میں چونکا "گڑبڑ کیسی گڑبڑ۔ اتنی دیر بعد بتا رہا ہے۔ تو رئیس خانے میں ہے نا؟"

"نہیں پیارے' باہر کھڑا ہوں۔" اندر شاید آگ لگی ہے۔"

میں نے کہا "شاید کا کیا مطلب ہے اُلو کے پٹھے۔"

"یار' آگ بجھانے والی گاڑی کھڑی ہے دروازے کے سامنے۔ وہ آگ لگانے تو نہیں آئے ہوں گے۔"

ایک دم وہ مقصد میری سمجھ میں آ گیا جو فائر انجن اور فائر مینوں کی گاڑی چھیننے والوں کے ذہن میں تھا۔ میں نے چلا کے کہا "رئیس تو باہر ہی انتظار کر میرا۔ میں ابھی آیا اور دیکھ ۔۔۔ ان کو جانے مت دینا۔"

"کس کو نہ جانے دوں؟"

"یہی جو آگ لگانے ۔۔۔ میرا مطلب ہے آگ بجھانے والی گاڑی لے کر آئے ہیں۔"

رئیس بولا "مگر میں انہیں کیسے روکوں گا اور کیوں؟"

"رئیس یہ فائر مین نہیں ہیں۔ یہ گاڑی چھین کے لائے ہیں۔ تیرے پاس ریوالور نہیں ہے کیا۔"

"ریوالور تو ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

رئیس اچانک چلانے لگا "اے انہوں نے واقعی آگ لگا دی ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے' اندر سے۔ یار میرے مرغے۔"

"مرغے کے بچے۔ آگ بجھانے والی گاڑی نہ ہوتی تو میں کہتا ٹائر پھاڑ دے۔ تو بیٹری کا تار الگ کر دے۔ ڈسٹری بیوٹر کا بیچ والا تار کھینچ لے۔ بونٹ کھول کے دیکھ۔"

وہ گالیاں بکنے لگا "میں انہیں گولی مار دوں گا۔ سالوں کی لاشیں بھی اندر جل کے کوئلہ ہو جائیں گی۔"

فون بند ہو گیا۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ رخشی نے گیٹ تک میرا ساتھ دیا اور میں نے اسے چند لفظوں میں بات سمجھا دی۔ ابھی میں گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ مخالف سمت سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے گلی روشن ہو گئی۔

"شاید فرید آ گیا۔" رخشی نے پر امید لہجے میں کہا۔

میں رک گیا۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی میرے قریب آ کے رکی۔ رخشی کا اندازہ درست تھا۔ میں نے فرید کا متوحش چہرہ دیکھا مگر میرے پاس اس سے کچھ پوچھنے کے لیے وقت نہیں تھا "فرید' میں جا رہا ہوں رئیس خانے۔"

فرید نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسے کیوں بھاگ رہا ہے مجھے دیکھتے ہی۔"

"رخشی سے پوچھ لے۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نکل گیا۔ وہ سات کلومیٹر کا فاصلہ میں نے دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ دن کے وقت شاید مجھے آدھا گھنٹا لگ جاتا لیکن رات کے پونے گیارہ بجے سڑکوں پر گاڑی کو اپنی مرضی سے دوڑانے کے لیے جگہ تھی۔ گاڑی چھوٹی تھی اور اس کی ظاہری حالت بھی بہت اچھی نہیں تھی مگر انجن نے میرے خیالوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دیا۔ گاڑی اچھلتی پھاندتی' غراتی لہراتی منزل کی طرف دوڑتی رہی۔ میں نے اس میں پانی نہیں ڈالا تھا۔ آدھے راستے میں انجن کو بخار ہونے لگا اور تھرمومیٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں انجن جواب ہی نہ دے جائے مگر انجن ایک ہچکی لے کر اس وقت بند ہوا جب رئیس خانے سے اٹھنے والے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل مجھے نظر آنے لگے تھے۔

میں نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے لیے دوڑ لگانے ہی والا تھا کہ میرے قریب رکنے والی گاڑی سے سر نکال کے فرید نے کہا "بیٹھ۔" اور میں کھلے دروازے سے اندر گر گیا۔ گاڑی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ پھر چل پڑی۔

"مجھے رخشی نے بتایا ۔۔۔ اب تو یہاں گاڑی میں بیٹھ۔" وہ بولا۔

"رئیس نظر نہیں آ رہا ہے مجھے۔ وہ اندر گھس گیا ہوگا۔"

فرید نے پھر چلا کے کہا "تو بیٹھ گاڑی میں۔ ریوالور ہے؟"

میں نے کہا "ہے ۔۔۔ مگر میں ۔۔۔"

وہ گاڑی روک کے باہر نکلا۔ "اندر مت آنا۔ گاڑی سے باہر ہی مت نکلنا۔ میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا اور تیز تیز قدموں سے چلتا آگے بڑھ گیا۔

باہر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آگ نیچے والی منزل پر نہیں ہے۔ دور سے جو شعلے اٹھتے نظر آ رہے تھے وہ چھت پر لگی ہوئی آگ تھی۔ دھواں بھی اوپر سے اٹھ رہا تھا چنانچہ ادھر سے دیکھنے والے کو ایسا ہی لگتا کہ عمارت میں آگ نیچے سے اوپر تک پھیل چکی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ سب ڈراما تھا۔ اصل کارروائی نیچے ہو رہی تھی۔

میں فرید کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی سے اترا اور آگے بڑھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی مین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی مگر اسے کوئی آگ بجھانے کے لیے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ جہاں آگ لگی ہوئی ہو' وہاں تربیت یافتہ اور تجربہ کار فائر مین ایک خاص ڈسپلن کا اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ تیزی سے پائپ کھولتے ہیں اور جتنا پانی ان کے پاس ہو وہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اضافی پانی کی فراہمی کا سورس تلاش کرتے ہیں۔ لوگوں کو دور ہٹاتے ہیں اور آگ کو آس پاس کے گھروں تک پھیلنے سے روکنے کی کارروائی کرتے ہیں۔

یہاں کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا چنانچہ لوگ بھی حیران کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ فائر مین اندر کیا کر رہے ہیں۔ رئیس خانے کے گیٹ پر جا کے میں نے ایک شخص سے رئیس کے بارے میں پوچھا۔

"رئیس تو سب ہیں یہاں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں اس گھر کے مالک رئیس خاں کی بات کر رہا تھا۔"

کسی اور نے کہا "وہ ۔۔۔ وہ تو شاید اندر گیا۔"

اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور لوگ گھبرا کے دور بھاگے۔ میں نے اندر سے آگ اور دھوئیں کا ایک مرغولہ سا بلند ہوتا دیکھا۔ یہ کسی بم کا دھماکا نہیں تھا لیکن اس سے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ میں ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر گھس گیا۔ رئیس خاں کے بیڈ روم میں ہر چیز نے آگ پکڑلی تھی۔ شاید وہاں بوتل سے بنایا ہوا پیٹرول بم استعمال کیا گیا تھا کہ آگ ہر طرف ایک ساتھ بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے چلا کے رئیس کو اور پھر فرید کو آواز دی مگر مجھے کسی نے جواب نہیں دیا۔ اندر اب ایسی دھما دھم ہو رہی تھی جیسے کوئی بھاری ہتھوڑے سے دیوار توڑ رہا ہو۔

اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ چھت پر آگ لگانے کا مقصد فائر انجن کی موجودگی کو جائز ثابت کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ سامنے والے کمرے میں آگ اس لیے لگائی گئی تھی کہ اندر کوئی نہ آئے۔ فائر مین بن کر آنے والوں نے یہ خانے کا راستہ تلاش کر لیا تھا اور اب وہ درمیان کی دیوار توڑ کے پچھلی طرف کے گھر میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کارروائی کا مقصد اس منحوس مورتی کے سر کو حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو حادثاتی طور پر میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس وقت مجھے ملک رب نواز کے کسی غیر قانونی کاروبار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے مورتی کے اس سر کے بارے میں تاریخی نوعیت کی ریسرچ کی تھی اور شبنم کی مدد سے کوشش کی تھی کہ اس مجسمے کے بارے میں کوئی کار آمد بات معلوم ہو جائے مگر یہ مورتی کا سر ہر لحاظ سے ایک بے قیمت اور غیر اہم چیز ثابت ہوا تھا۔ یہ کسی مشہور شخص کے مجسمے کا سر نہیں تھا۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں تھی اور یہ کسی معروف مجسمہ ساز کے فن کا شاہ کار نہیں تھا۔ اس کے باوجود کچھ لوگوں نے اسے واپس حاصل کرنے کے لیے ہماری اور اپنی جان کی بازی لگا دی تو ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس مورتی کے سر کی قیمت انسانی جان سے بہت زیادہ ہے۔ ہم نے اس کی حفاظت جان سے بڑھ کر نہیں کی مگر رئیس خان کے خفیہ زیر زمین گھر میں یہ محفوظ رہی اور اس کی بازیابی کے سلسلے میں کی جانے والی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی۔ رفتہ رفتہ دیگر انکشافات ہوتے رہے۔ یہ پتا چلا کہ اس کے حصول کو ملک رب نواز نے فتح و شکست کا مسئلہ بنا لیا ہے پھر معلوم ہوا کہ اس کی قیمت لاکھوں میں ہے پھر پتا چلا کہ لاکھوں والی بات دھوکا تھی۔ اصل قیمت کروڑوں میں ہے۔ ایک بار پھر ہم نے اس کی قدر و قیمت کا راز جاننے کی کوشش تیز کی۔ اس وقت تک یہ معلوم ہو گیا تھا کہ رب نواز ملک کے ۔۔۔ عجائب خانوں سے نوادرات اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کو بیرون ملک اسمگل کر رہا ہے مگر وہ کھوپڑی پلاسٹر آف پیرس کی بنی ہوئی تھی اور کسی فنکار سے زیادہ کسی کمہار کے ہاتھوں کی تخلیق تھی۔ بالآخر شبنم نے یہ راز معلوم کر لیا کہ پلاسٹر آف پیرس کی تہ کے نیچے ہیروئن پاؤڈر کی تہ ہے اور ایک تہ کے نیچے دوسری تہ جما کے یہ مورتی کا سر در اصل ہیروئن اسمگل کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری دلچسپی تقریباً ختم ہو گئی کیونکہ ہم رب نواز کے اس کاروبار کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اسے معاشی یا سیاسی طور پر تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم صرف ایک معاملے میں اس کے ساتھ دشمنی

کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان کے تاریخی اور تہذیبی اثاثے ڈالر کمانے کے لیے باہر بھیج رہا تھا اور یہ ہمارے نقطۂ نظر سے وطن دشمنی تھی لیکن رب نواز دوسرے معاملات میں ملوث ہونے کے باوجود اس مورتی کے سر کو بھولا نہیں تھا۔ کچھ لوگ مسلسل اس کا سراغ لگانے کی فکر میں تھے اور ایسا لگتا تھا کہ بالآخر ان کی کوشش بار آور ہوئی ہیں۔ ہم رئیس خانے سے نکل گئے تھے تو وہ رئیس خانے میں پہنچ گئے تھے اور وہ مورتی کا سر حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکے تھے۔

تہ خانے کا اندر والا حصہ آگ سے محفوظ تھا۔ میں نے اندھیرے میں راستہ تلاش کیا کیونکہ بجلی کے تار آگ لگنے سے شارٹ ہوگئے تھے۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں نے جھک کر دیکھا تو ایک شخص فرش پر چت پڑا نظر آیا۔ یہ رئیس تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے آہستہ سے آواز دی پھر اس کے سینے پر سر رکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نبض کو محسوس کیا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔

میں نے اندر سے کسی کو پکارتے سنا "اے ادھر آجا۔"

کسی اور نے کہا "ہم واپس کیسے جائیں گے؟"

"چلے جائیں گے جیسے آئے تھے۔ آجا میرے ساتھ۔"

میں نے رئیس کو وہیں لٹا دیا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی اور میں نے فوراً ریوالور کو مضبوطی سے پکڑا۔ اندھیرے سے فرید نمودار ہوا۔

میں نے کہا "فرید یہ لوگ مورتی کا سر لے جانے آئے ہیں۔"

فرید نے کہا "پاگل کے بچے اس کے لیے اتنا جنجال پھیلانے کی کیا ضرورت تھی مگر میں نے تجھے منع کیا تھا۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کردیا "وہ آگے پہنچ گئے ہیں۔"

"دفع کر انہیں اس مورتی کے سر کو لے جانے دے۔"

میں نے کہا "یہ رئیس لیٹا ہوا ہے یہاں۔"

"اسے کیا ہوا ہے؟" فرید نے پریشانی سے کہا۔

"پتا نہیں' تو اسے باہر لے جا ورنہ اندر دھواں بھرنے لگا ہے۔ آگ بھی پھیل چکی ہے۔"

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چل۔"

فرید نے جھک کر رئیس کو اٹھالیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے کہا "میں دوسری طرف سے نکلوں گا۔ پیچھے سے تو رئیس کو اپنی گاڑی میں لے جا۔ میرے پاس شبنم کی گاڑی ہے۔"

"مگر وہ خراب ہے۔"

"خراب نہیں گرم ہو کے بند ہوگئی تھی۔ ٹھنڈی ہوجائے گی تھوڑی دیر میں۔ پانی ڈالوں گا میں تو چل پڑے گی۔ تو جا۔" میں پلٹ کے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر دیوار توڑنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس طرف کی الماری کا پچھلا دروازہ نہیں دیکھا تھا جو دوسری طرف کی الماری میں کھلتا تھا۔ وہ مشکل طریقے سے پیچھے والے گھر میں داخل ہوگئے تھے۔ شاید ان پر ہمارے ایک طرف سے آنے اور دوسری طرف سے نکل جانے کا راز فاش ہوگیا تھا۔ انہوں نے رئیس خانے کے سامنے والے مین گیٹ پر نظر رکھی ہوگی اور لوگوں کو اندر جاتے دیکھا ہوگا مگر جو اندر گئے تھے' وہ لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ان پر نظر رکھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کسی اور طرف سے نکل گئے۔ رب نواز نے گیراج والا راستہ دیکھا ضرور تھا۔ دو اور دو چار کرکے اس نے نقشے کو سمجھ لیا ہوگا۔ رئیس خانے اور گیراج والا مکان آگے پیچھے تھا۔ یقیناً ان دونوں کے درمیان کوئی خفیہ گزرگاہ تھی۔ اصل راستہ بڑی مہارت سے بنایا اور چھپایا گیا تھا چنانچہ اسے دریافت کرنا ممکن نہ ہوا تو انہوں نے اندازے سے ایک دیوار میں شگاف بنا کے گزرنے کا راستہ نکال لیا اور اب وہ دوسری طرف پہنچ چکے تھے۔

میں نے رئیس خان کی انجینئرنگ والا محفوظ راستہ استعمال کیا اور احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا مین سوئچ تک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لائٹ جلاتے' میں نے سوئچ آف کردیا۔

ہلکے سے کھٹکے پر ان میں سے ایک بولا "ارے یہ کیسی آواز تھی۔"

دوسرے نے کہا "میں نے تو کچھ نہیں سنا۔ تو لائٹ جلا۔"

"لائٹ ۔۔۔ کدھر ہے لائٹ ۔۔۔ ٹارچ تیرے پاس ہے جلدی کر۔"

دوسرا بولا "یہ ۔۔۔ ادھر سوئچ لگے ہیں۔"

"لائٹ تو بند ہے۔ چل دفع کر۔ ٹٹول کر دیکھ الماری میں۔ آگ ادھر نہ آجائے۔"

دوسرا گھبراہٹ میں بولا "تو نے ہی پھیلائی ہے آگ۔"

"اوئے پاگل خانے' آگ نہ لگاتے تو سارے اندر آجاتے۔ کسی نے انہیں فون کرکے ضرور بتا دیا ہوگا اور آگ کیا ہم نے اپنی مرضی سے لگائی ہے۔ ملک صاحب نے

کہا تھا کہ سب جلا کے رکھ کردو ان ۔۔۔ کے بچوں کا۔"

وہ چیزوں کو اٹھا کر پٹخ رہے تھے اور کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ جس کمرے میں حرکت کررہا تھا' وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ ان میں ایک نیا اور اناڑی لگتا تھا۔ وہ زیادہ نروس تھا اور جل کر مرجانے کے خیال سے خائف تھا۔ دوسرا گالیاں زیادہ بکتا تھا اور صورت حال پر کنٹرول کررہا تھا۔

نو آموز نے چند منٹ بعد کہا "استاد یہ کیا کررہے ہو؟ شراب پی رہے ہو۔ نشہ نہ ہوجائے۔"

استاد ہنسا "ارے پاگل۔ کبھی پی ہے تو نے۔ نہیں پی نا اسی لیے گھبرا رہا ہے۔ اپنے لیے تو یہ ٹانک ہے ٹانک۔"

"استاد ادھر تو بہت شور ہورہا ہے۔ لگتا ہے لوگ اندر آگئے ہیں۔ آگ بہت بھڑک گئی ہے۔"

"پھر لوگ کیا جلنے کے لیے اندر آئیں گے؟"

"آگ بجھانے کے لیے بھی تو آسکتے ہیں اور کہیں کسی نے فون کرکے دوسرے آگ بجھانے والوں کو بلا لیا پھر۔"

"اتنی جلدی کوئی نہیں سکتا اور آتا ہے تو آجائے۔ ہم بھی وردی میں ہیں۔ آگ میں سے گزر جائیں گے۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔"

"استاد پکا پتا ہے تجھے۔ اس کپڑے میں آگ نہیں لگتی؟ آنکھوں کا کیا ہوگا۔ منہ تو کھلا ہے سامنے سے۔ کہیں آنکھیں نہ ضائع ہوجائیں میری۔ اندھا ہوجاؤں شادی سے پہلے ہی۔"

استاد نے اسے ایک شاندار گالی دی اور کہا "اوئے آگے مر۔ یہاں تو نہیں ہے وہ مورتی۔"

یقین مجھے پہلے بھی تھا کہ اس دہشت گردی کا مقصد اس مورتی کے سر کا حصول ہی ہے۔ اب شبہے کی گنجائش بھی نہ رہی۔ رب نواز نے بہت تنگ آکے اور مشتعل ہوکے اس کارروائی کا حکم دیا تھا۔ رئیس خانے کے پُراسرار حفاظتی انتظامات نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا کہ ہونہ ہو مال مسروقہ اسی جگہ سے برآمد ہوگا۔ اس کے بندوں نے شبنم کو بھی یہاں آتے جاتے دیکھا تھا اور فرید عباسی کو بھی۔ خود کو داڑھی والا جن بتانے والا پہلے تو شبنم کا ڈرائیور بن کے ساتھ پھرتا تھا پھر غائب ہوگیا تھا اور دوبارہ نظر ۔۔۔۔ آیا تو چراغ علی ولد باغ علی کے روپ میں۔ اگر اس کا رئیس یا فرید عباسی اور شبنم سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ ان کے ساتھ قبرستان میں کیا کررہا تھا۔ جہاں وہ سب چار فٹ کے تیس مار خاں اور اس سے بھی چار انچ کم چھوٹی کو دفنانے گئے تھے اور اگر وہ ناصر عظیم تھا تو عدالت میں کیا لینے آیا تھا۔ جہاں فرید عباسی یا رئیس کی موجودگی تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ داڑھی والا جن دوست تھا رئیس کا اور صاف انکار کرتا تھا کہ وہ کسی فرید' شبنم یا رخشی کو نہیں جانتا اور صرف رئیس کا دوست ہے مگر فرید اور شبنم کا رئیس خانے میں آنا جانا ثابت تھا۔ چنانچہ رب نواز کے لیے یہ معاملات بہت الجھن والے تھے اور ایک احمقانہ کمانڈو ایکشن کے ذریعے رئیس خانے کو تہس نہس کرانے اور جلا کر راکھ کرنے کا فیصلہ رب نواز کے غصے اور جھنجلاہٹ کی انتہا کو ظاہر کرتا تھا۔

ٹارچ کی روشنی دروازے سے اس کمرے میں آئی جہاں میں ان کے لیے چشم براہ تھا۔ ٹارچ پکڑنے والا پیچھے تھا۔ آگے خود استاد محترم تھے اور وہ اس شان سے تشریف لائے کہ ان کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور دوسرے میں سگریٹ۔ چھوٹی سی پتلی بوتل کو اس نے اوپر اٹھا کے آخری گھونٹ لیا اور خالی بوتل کو غصے میں دیوار پر کھینچ مارا۔

"کہاں گیا' آخر لعنتی مورتی کا سر۔"

شاگرد نے کہا "استاد۔ میں تو کہتا ہوں دفع کر۔"

استاد ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے دیوار کے سائے سے آگے آکے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ تیورا کے گرا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے کو میں نے کالر کے پاس سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور آگے کھینچا۔ وہ استاد کو سیکیورٹی کور بھی فراہم کررہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جو گرتے وقت اس کے منہ پر لگا۔ وہ بلبلایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے دہرا ہوگیا۔ اس کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے اسے ٹھوکر مار کے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ کانپتا ہوا کھڑا ہوگیا "او جی مجھے مت مارو۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "اتنا ڈرپوک ہے تو ایسے کام کیوں کرتا ہے۔ تجھے تو پھانسی کے تختے تک جانا ہے ایک دن پتر۔"

وہ زاروقطار رونے لگا۔ "میری تو شادی ہے اگلے مہینے۔ مجھے اس نے کہا تھا کہ سب بندوبست ہوجائے گا۔"

میں نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا "دانت ٹوٹ گئے تیرے۔ آنکھیں ایسے ضائع نہ ہوں تو میں چھوڑ دوں گا۔ تیری لاش جل کے کوئلہ ہوجائے گی یہاں۔ چل اتار یہ کپڑے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے اور دہاڑیں مار مار کے رونے لگا "مجھے معاف کردو۔ میری ماں مرجائے گی۔ وہ بیمار ہے۔ کہتی تھی

میرے مرنے سے پہلے شادی کرلے۔"

"اور شادی کے لیے پیسہ نہیں تھا تو یہ کام کیا تو نے۔ چل اس کے کپڑے اتار استاد کے کیا نام ہے اس کا؟"

"باز۔۔۔ شہباز۔۔۔"

میں نے چونک کے نیچے پڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ فائر مین کی وردی میں اس کو پہچاننا مشکل تھا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی آواز سن کے بھی میرا دھیان شہباز کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس سے میری دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی اور ایک ملاقات تو بالکل حالیہ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کے میں نے اس شخص کے خلاف سخت نفرت اور عداوت محسوس کی۔ ذرا سی دیر میں وہ ننگا ہو گیا اور میں نے فائر مینوں والی وردی اپنے جسم پر چڑھالی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی پلاسٹک جیسے کپڑے کی ڈانگری تھی جس نے سر سے پیروں تک مجھے ڈھانپ لیا۔

ایک پرانے اخباروں بھرے ڈھیر کے نیچے سے میں نے وہ مورتی کا سر نکالا اور کہا "اس کی تلاش میں تھے نا تم؟"

بلکتے ہوئے اور خون تھوکتے نوجوان نے سر ہلایا۔ وقت کم تھا پھر بھی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے سنگ مرمر یعنی ONAX کا پیڈسٹل لیمپ نظر آگیا۔ میں نے اسے زمین پر مار کے توڑا اور اس کے BASE کو الگ کرلیا۔ اسے میں نے اخباروں میں لپیٹا اور تھیلے میں ڈال دیا۔ وہ بولا "تم بھی چور ہو؟"

"ہاں۔" میں نے کہا "اب ہم سامنے سے نہیں جاسکتے۔"

اس نے سر ہلایا "آگ۔۔۔ بہت ہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی نے فائر بریگیڈ کی دوسری گاڑی منگوائی ہے۔ وہ آگ بجھا رہے ہیں۔ تم یہ تھیلا اٹھا کے چلو۔"

اس نے تعمیل کی۔ میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ دروازے اندر باہر سے مقفل تھے مگر کھڑکیوں کے راستے باہر نکلنا ممکن تھا۔ میں نے چٹخنی ہٹا کے ایک کمرے سے دوسرے میں قدم رکھا۔ مورتی کا سر میں نے ایک اخبار میں لپیٹ کر بغل میں دبالیا تھا۔ کراہتا ہوا نوجوان میرے پیچھے آرہا تھا۔

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"دیدار شاہ۔ دادو کہتے ہیں سب۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"تمہیں یہ مورتی ملک رب نواز کو دینی تھی۔"

دادو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ۔ استاد۔۔۔ باز مر جائے گا۔"

میں نے کہا "مر جانے دو۔ تمہیں بہت خیال ہے اس کا تو میں تمہیں بھی اس کے ساتھ ہی لٹا دوں؟ ایک ساتھ پہنچ جاؤ گے جہنم میں۔ یہ کھڑکی کھولو۔"

اس نے کچن کی کھڑکی کھولی "ادھر۔۔۔ یہ پیچھے والا راستہ ہے۔" میں نے کہا "تم جانتے ہو یہ بات۔"

"باز۔۔۔ نے بتایا تھا۔۔۔ کہ ملک صاحب ادھر ہوں گے۔"

میں چونک پڑا "ملک رب نواز؟ ادھر کہاں ہوگا؟"

"ہاں جی۔ اپنی گاڑی میں۔"

میں نے ایک لمحہ سوچا "کون سی گاڑی میں۔ بڑی گاڑی یا جیپ میں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم جی۔"

میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو مجھے سڑک کے دوسرے کنارے پر ملک رب نواز کی سیاہ شیشوں والی پجیرو نظر آئی۔ اس کا رخ واپسی والے راستے کی طرف تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ادھر سے نہیں جاسکتے۔" میں نے کچن کی کھڑکی بند کی اور ہم الٹے قدموں واپس گئے۔

باز وہیں بے ہوش پڑا تھا۔ اسے اٹھا کے لے جانے میں رسک تھا کہ اس کا جسم آگ کے شعلوں سے جھلس جائے۔ اس کے باوجود میں نے اسے کندھے پر ڈال لیا۔ دادو نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور آگے آگے چلنے لگا۔ الٹے ہاتھ کی طرف والے کمرے میں آگ بھر گئی تھی اور دھوئیں کے مرغولے ہر طرف پھیلتے جارہے تھے۔ مجھے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ میں رئیس خانے کے جغرافیے سے زیادہ واقف تھا۔ دادو نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہم رئیس خانے کے پیچھے والے حصے کے باتھ روم سے سائڈ کی گیلری میں نکل آئے۔ ساٹھ ستر فٹ کی لمبی گیلری میں گملے رکھے ہوئے تھے۔ آگے راستہ صاف تھا۔ میں نے کہا "اگر تم ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوئے تو میں پیچھے سے گولی مار دوں گا۔ سیدھے باہر چلو۔"

دادو تھیلا اٹھا کے دوڑنے لگا۔ گیلری سے مجھے وہ سب لوگ نظر آرہے تھے جو آگ کو پھیلتا دیکھ رہے تھے لیکن بجھانے کے کام میں کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک ایسا سنسنی خیز تماشا تھا جو زندگی میں ہر روز دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ایسے فل آف ایکشن مناظر فلموں میں البتہ نظر آتے ہیں۔ یہ تماشائی آگ بجھانے والوں کی راہ میں رکاوٹ ضرور بن رہے تھے اور بلاشبہ مستحق تھے کہ پولیس انہیں ڈنڈے

اور لاٹھیاں مار کے بھگائے۔

"اوئے دادو۔ اس گاڑی کی چابی کس کے پاس ہے جس میں تم آئے تھے۔" میں نے چلّا کے پوچھا "آگ بجھانے والی گاڑی۔"

دادو نے پلٹ کے کہا "استاد کے پاس ہوگی۔"

میں نے فرض کیا کہ چابی فائر پروف وردی کی کسی جیب میں ہوگی اور شور مچاتا باہر لپکا "ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ بندہ مر جائے گا۔ راستہ دے دو۔" میں نے چیخ کے کہا۔

گیٹ سے کچھ فاصلے پر پہلی گاڑی کے ساتھ ہی دوسری آگ بجھانے والی گاڑی موجود تھی۔ اس میں سے لمبے لمبے پائپ اندر تک جارہے تھے۔ میں کم سے کم دو افراد کو آگ کے شعلوں کو پانی کے پریشر والی دھار کا نشانہ بناتا دیکھ سکتا تھا۔ لوگوں نے مجھے راستہ دے دیا۔ میں نے باز کو آگے والے کیبن میں ڈالا اور پلٹ کے دیکھا تو دادو غائب تھا۔ وہ موقع پاتے ہی جان بچا کے فرار ہو گیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑی پریشانی کی بات تھی مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے میں نے وردی کی اِدھر اُدھر جیبوں کو ٹٹولا۔ ایک جیب میں چابی موجود تھی۔

جب میں نے فائر انجن کو اسٹارٹ کیا تو لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ایک پولیس مین نے دوڑتے ہوئے سیٹی بجا کے اپنے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو ہٹ جانے کے لیے کہا اور مجھے سگنل دیا کہ میں بے خوفی سے لوگوں کو روندتا ہوا بھی نکلنا چاہوں تو تذبذب نہ کروں۔ ٹرک کو پیچھے لے جاکر موڑنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ میں سیدھا گیا اور فائر انجن کو آگے ایک بنگلے کے گیٹ سے اندر لے گیا پھر ریورس گیئر میں واپس لایا اور پلٹ کر اسی راستے پر گیا جدھر سے آیا تھا۔

لوگ پھر سڑک پر آگئے تھے مگر میں نے فائر انجن کو تیزی سے آگے بڑھایا تو وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے۔ دوسرے فائر انجن کے مستعد کارکنوں نے آگ پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا مگر شاید ان کے ٹینک کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ ایک فائر مین نے ہاتھ ہلا کے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کا پانی بالکل استعمال نہیں ہوا۔ اس کے دونوں فائر مین سیدھے اندر چلے گئے تھے اور لوٹ کے نہیں آئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پہلی گاڑی آگ لگنے سے قبل پہنچ گئی تھی مگر اس میں آنے والے فائر مینوں نے آگ لگنے کے بعد اسے پھیلنے سے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا حالانکہ وہ چاہتے تو آگ کو ابتدا ہی میں کنٹرول کرسکتے تھے۔

میں نے فائر مین کے اشارے کی پروا نہیں کی۔ وہ بروقت چھلانگ مار کے ایک طرف نہ ہوتا تو کچلا جاتا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی نے دو سو گز کا فاصلہ دو منٹ سے بھی کم وقت میں طے کرلیا۔ جب میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا تو فرید عباسی اپنی شیراڈ کو پیچھے پیچھے دوڑاتا آرہا تھا۔ اس نے مجھے فائر انجن کے ڈرائیور کی جگہ پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔

شبنم کی گاڑی گلی کے شروع میں ہی ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ محفوظ کھڑی تھی۔ میں نے موڑ پر ایک منٹ کے لیے ٹرک کو روکا۔ شیراڈ میرے ساتھ آرکی۔ میں نے اور فرید نے باز کو گھسیٹ کر شیراڈ کی پچھلی سیٹ پر ڈالا... جہاں رئیس خان اب یوں بیٹھے خالی خالی نظروں سے دنیا کو دیکھ رہا تھا جیسے صدمے یا چوٹ سے اس کی یادداشت جاچکی ہے۔

میرے بیٹھتے ہی فرید عباسی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "یہ کیا مصیبت اٹھالی تو نے؟ پھر مورتی کا سر کیوں ساتھ لے آیا اور یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ شہباز ہے۔ باز کہتے ہیں اسے۔ ملک رب نواز کا پرسنل اسسٹنٹ بلکہ چیف سیکریٹری۔"

"چھوڑ دیتا اسے وہیں مرنے کے لیے۔"

میں نے پلٹ کر رئیس کو دیکھا "کیا حال ہے تیرا بیٹے۔ ایسے کیا دیکھ رہا ہے۔ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔ تیرا یار داڑھی والا جن۔ داڑھی کے بغیر۔"

رئیس خان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "یار ان سؤر کے بچوں نے میرے سارے شہ زوروں کو شہید کر دیا۔"

میں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے "اللہ ان سب کی مغفرت کرے مگر یہ حرام موت کہلائے گی۔ حلال ہو کے کسی کا پیٹ بھر سکتے تھے۔"

"ایسا مت کہہ۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔" اس نے رقت بھرے لہجے میں شکایت کی "میرے نازوں کے پالے مرغے تھے۔"

"چل صبر کر یار۔ اللہ تجھے ان کا نعم البدل عطا کرے گا۔"

"قسم اللہ کی پیارے۔ میں چھوڑوں گا نہیں ان۔۔۔ کو۔۔۔" اس نے قاتلوں کو ایک لاجواب گالی دی۔ "کیسے کیسے شاندار مرغے تھے میرے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کیا بانکے جوان تھے۔ ایک تو مستقبل کا عمران خان تھا۔ اس کی جگہ اب کون لڑے گا؟"

میں نے ہمدردی سے کہا "تو خود لڑ سکتا ہے۔"

وہ بدستور غمگین تھا "مذاق کر کے میرے زخموں پر نمک

پوشی مت کر۔"

"نمک پوشی نہیں۔ نمک پاشی جاہل کی اولاد۔۔۔"

"ابے ہاں وہی۔" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

فرید عباسی نے گاڑی روک دی "شبنم کی گاڑی کون لائے گا؟"

میں نے چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ "جو بولے وہی دروازہ کھولے۔ یہ نیک کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔"

وہ نیچے اتر گیا۔ "چل تو آجا میری جگہ مگر یہ تحفے لے کر تو جائے گا کہاں؟ اور اس حلیے میں۔"

میں نے کہا "حلیہ بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔" اور فائر مینوں والی وردی اتار کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ باز کو۔۔ کہاں رکھوں۔"

فرید خفا ہونے لگا "آخر ضرورت کیا تھی اس کو ساتھ لانے کی۔"

"میرا خیال تھا کہ اس سے کچھ پوچھیں گے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اسے میں اپنا پتا ٹھکانا نہیں دکھا سکتا۔ تیرے گھر نہیں لے جاسکتا۔ نیلم کے گھر جانے کا تو سوال ہی نہیں۔ کیوں نا اسی حالت میں ملک صاحب کے حوالے کردیا جائے۔"

"مگر کیسے؟ کیا تو خود جائے گا؟"

میں نے کہا "گزرتے گزرتے گرا جاتے ہیں دروازے پر۔ تو جا سیدھا اپنے گھر اور آرام سے بے فکر ہو کے سو جا۔ رخشی کو سنبھال، وہ بت اپ سیٹ تھی مگر تو واپس کیسے جائے گا؟"

"چلا جاؤں گا۔" وہ بیزاری سے بولا۔

آدھی رات کے وقت سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ ہم ابھی ملک ہاؤس سے کچھ فاصلے پر تھے کہ باز نے پھڑپھڑانا شروع کیا۔ اس پر چوٹ کے ساتھ نشے کا اثر بھی تھا۔ اسے سلطان راہی کے انداز میں بولنے کا شوق تھا۔ نیم بے ہوشی میں ہی وہ بڑکیں مارنے کی کوشش کرتا رہا۔

"اڑے۔۔۔ باز نام ہے۔۔ میرا۔۔۔ شہباز۔۔۔"

رئیس خان نے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے بال پکڑ کے اس کا سر کئی بار دروازے کے اوپر مارا۔ باز پھر بے حس و حرکت ہوگیا۔ "جی تو چاہتا ہے اسی وقت آپریشن کردوں سالے کا۔ ساری عمر سرا باندھ کے گھوڑی چڑھنے کے قابل نہ رہے۔"

میں نے کہا "ایسے لوگ یوں بھی پھانسی زیادہ چڑھتے ہیں۔"

"پھر حساب برابر کردیں گے کبھی۔" رئیس خان نے کہا "یار زندہ محبت باقی۔"

میں نے کہا "محبت نہیں۔ صحبت۔۔ جاہل کی اولاد۔"

رئیس بگڑ گیا۔ "ابے چل رہنے دے۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ صحبت تو بڑا شرمناک فعل ہے۔ محبت ٹھیک ہے۔"

باز کو ہم نے گزرتے ہوئے ملک ہاؤس کے گیٹ کے بالکل سامنے گرا دیا۔ گیٹ بند تھا اور سڑک پر بھی دور دور تک دیکھنے والا کوئی نہیں تھا چنانچہ ہم سیدھے نکل گئے۔ رئیس نے شام سے کچھ نہیں کھایا تھا مگر اس کا دل اپنے مرغوں کی اجتماعی وفات پر غم سے بوجھل تھا۔ ہم نے ایک جگہ رک کے چائے پی اور میں نے شبنم کو فون پر اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

رئیس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ مسکرانے لگا "قسم اللہ کی بڑا چکنا لگ رہا ہے تو۔ شبنم کا دل تو پھسل گیا ہوگا۔"

"ہاں، پھسل کے گرا اور ٹوٹ گیا۔ نازک دل تھا بہت لیکن مجھے آثار کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "رخشی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ سمجھی شاہ عالم کا بھوت آگیا۔۔۔ پاگل۔"

"یہ تو ہوگا۔ جو لوگ یہ نہیں جانتے یا نہیں مانتے کہ وہ مرچکا ہے۔ ان کو قائل کرنا مشکل ہوگا۔"

میں نے کہا "آسان زندگی راس کب آتی ہے ہمیں۔ میں ایک جگہ فون کرنے رکا تو دکاندار نے بھی یہی سوال کیا مجھ سے کہ آپ شاہ عالم تو نہیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسا اکثر ہوگا۔ ناصر عظیم کو کتنے لوگ جانتے تھے؟ گنے چنے چند لوگ۔ شاہ عالم کے دوست اور دشمن بہت ہیں۔"

"اس کا دوست کوئی نہیں تھا۔"

"میری مراد ان سے تھی جو دوست بن کے دشمنی کرتے تھے۔ میں کس کس کے سامنے وضاحت کروں گا اور سب سے بڑا مسئلہ تو ہوگا رب نواز کا۔"

رئیس سوچ کے بولا "تو پھر حلیہ بدل لے۔"

میں نے کہا "نہیں یار، ایک اور حل سوچا ہے میں نے اس مسئلے کا۔ گھر چل کے بتادوں گا۔"

ہم ایک بجے گن آباد پہنچے۔ نئے گھر میں ہر خوشبو نئی تھی۔ اس پر نیا پینٹ ہوا تھا۔ دروازوں کے نئے روغن کی بو کے ساتھ نئے فرنیچر، نئے قالینوں اور نئے پردوں کی مہک نے گھر کو بھر دیا تھا ورنہ گھر خالی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم اپنے گھر میں نہیں کسی فرنیچر کے شو روم میں لیٹے ہوئے ہیں۔ کسی

آباد گھر کی مانوس فضا میں زندگی کی مہک ہوتی ہے۔ بہت سی چیزوں کی ملی جلی بو انسانوں کے وجود کی خبر دیتی ہے۔ اس کھانے کی خوشبو جو رات کو کھایا گیا تھا۔ کچن میں پکایا گیا تھا اور ٹیبل پر بچھا ہوا تھا۔ دودھ کی بو جو صبح جل گیا تھا۔ مرچ مسالے اور پیاز لہسن کے ساتھ نیل پالش اور ٹالکم پاؤڈر کی خوشبو، بوٹ پالش کی مخصوص بو جو کسی بچے نے فرش پر لیپ دی ہو اور اس بچے کے گندے کپڑے کی بو جو باتھ روم میں بغیر دھلے پڑے ہوں۔

گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے مگر یہ سناٹا برقرار رہا کیونکہ اجنبی فضا میں ابھی تک نہ ہنسی کی جلترنگ تھی نہ چوڑیوں کی کھنک۔ نہ کسی بچے کے رونے کی آواز تھی نہ برتن ٹوٹنے اور گرنے کی۔ نہ یہاں ٹی وی تھا اور نہ ریڈیو۔ باتھ روم میں کوئی نل نہیں ٹپک رہا تھا۔ پنکھے کی حرکت میں صرف خاموشی تھی۔ دیواروں پر کوئی کلاک نہیں تھا کہ اس کی ٹک ٹک سنائی دیتی۔ آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے آس پاس بستی نہیں، شہرِ خموشاں ہے۔ ہم مرچکے ہیں اور یہ بیڈ نہیں ہماری قبریں ہیں۔"

رئیس اٹھ بیٹھا۔ "ایسی ڈراؤنی باتیں مت کر۔ مجھے ویسے ہی نیند نہیں آرہی ہے۔"

میں اسے گزرے ہوئے دن کے بارے میں بتاتا رہا جس کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ ایک ساتھ اتنے عظیم الشان مرغوں کی دردناک ہلاکت اس کی زندگی کا سب سے زیادہ دل فگار سانحہ ہے اور آج کا دن اس کے لیے اتنا ہی منحوس تھا جتنا ناگاساکی والوں کے لیے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کا وہ دن جب لذتِ خوابِ سحر کے تمام ہونے سے پہلے ایٹم بم نے ان کی نیند کو موت میں بدل دیا تھا۔

میں سونے کی کوشش میں نیند کے بے سکون وقفوں سے گزرا۔ پہلی بار فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل کے بیٹھ گیا جیسے یہ گھنٹی کی نہیں، کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز ہو۔ اس سے مجھے اپنے اعصاب کی شکستگی کا اندازہ ہوا۔ فون شبنم نے صرف یہ پوچھنے کے لیے کیا تھا کہ کیا سو رہے ہو؟

میں نے بھنا کے کہا "میں سو رہا۔۔۔ تھا۔ اب بتاؤ کیا کروں۔ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

وہ ہنسی "کچھ نہیں۔ بس سوجاؤ۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ آج میں نیند پوری کرلوں۔ اس وقت گھر جانا بھی مشکل ہے۔"

میں نے کہا "تم یہاں آجاؤ۔ تمہاری قسم یہاں بڑی خوفناک تنہائی ہے۔ پُرآسیب قسم کی۔ ہم دونوں بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

"میں آسکتی ہوں مگر کیسے آؤں۔ گاڑی تمہارے پاس ہے۔"

"گاڑی اب نہیں ہے میرے پاس۔ پولیس نے لے لی۔"

"پول۔۔۔ پولیس نے کیوں لے لی۔ کس تھانے میں ہے مجھے بتاؤ۔"

میں نے کہا "تھانے میں تو نہیں۔ ایک سابق پولیس افسر ہے۔ فرید عباسی۔۔۔ وہ لے گیا۔"

شبنم ہنسنے لگی "پھر تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ جدائی کی یہ رات رہے گی۔ رو کے گزار دیا اسے سو کے گزار دے۔"

میں نے کہا "سونا تو اب ممکن نہیں۔ میں آتا ہوں تمہیں لینے کے لیے۔"

"تم کیسے آؤ گے؟" میں نے اس کا چہرہ امید، اشتیاق اور مسرت کے جذبات سے دمکتا دیکھا۔

"اس کی گاڑی ہے نا میرے پاس۔" میں نے کہا اور خاموشی سے باہر سٹک گیا۔ کپڑے میں نے وہی پہن رکھے تھے جو شبنم نے بڑے چاؤ سے خریدے تھے۔ مجھے تھکن اور کاہلی کے باعث سونے سے پہلے لباس بدلنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے کپڑوں میں بدنمائی پیدا نہیں ہوئی۔ جینز کی شرٹ اور پینٹ کریز RESISTANT تھے۔ رئیس خان بالآخر پرسکون ہو کے خراٹوں والی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے باہر سے دروازے کو مقفل کیا اور گاڑی لے کر نکل گیا۔

اس وقت رات کے یا صبح کے تین بجے تھے۔ تھوڑی دیر لیٹنے سے بھی کافی فرق پڑا تھا اور میں نے خالی سڑک پر گاڑی کو طوفانی رفتار سے دوڑا کے چہرے پر لگنے والی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھایا۔ اس سے مجھے فرحت ملی اور جب بالآخر میں نے دفتر کی عمارت کے سامنے گاڑی روکی تو شبنم کو پہلے سے محوِ انتظار دیکھ کے میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔

"تم پہلے ہی اتر کے نیچے آگئی تھیں۔ اگر میں نہ آتا پھر؟"

وہ بڑی ادا سے بولی "کیسے نہ آتے جناب۔ ہم بلائیں اور آپ نہ آئیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "نہیں فرض کرو۔ میرا چالان یا ایکسی ڈنٹ ہوجاتا۔"

"میں نے کہہ دیا نا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا تمہیں۔ میری محبت لائی ہے یہاں۔ تمہیں تحفظ کی پوری ضمانت حاصل ہے۔"

میں نے کہا "اچھا چلو بیٹھو اور بتاؤ کہاں چلیں۔"

"کہیں نہیں' سیدھے گھر چلو شرافت سے۔" وہ بولی۔

میں نے اپیل کی "دیکھو ذرا اس رات کو۔ یہ کیا کہتی ہے۔"

"مجھے جا کے گھر کو دیکھنا ہے پہلے۔ تم بتاؤ یہ رئیس خانے میں آگ کیسے لگی۔ کس نے لگائی اور کیوں لگائی؟"

"بھاڑ میں گیا رئیس خانہ۔ آگ میرے دل میں لگی ہے۔ تم اسے کیوں نہیں دیکھ رہی ہو۔" میں نے کہا "اسے کون بجھائے گا؟"

"یہ مقدس آگ ہے۔ اسے جلتے رہنا چاہیے۔ بجھانے کی بات کیوں کرتے ہو۔" اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ "چلو مجھے نیند آرہی ہے۔"

لیکن وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ گھر پہنچ کے اس نے سارے کمروں میں جھانک کے دیکھا۔ فرنیچر اور کارپٹس کا معائنہ کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کے انتخاب کی داد دوں اور کچن میں جا کے چائے بنانے لگی۔ وہاں بہت کچھ آگیا تھا لیکن شبنم کے خیال میں ابھی کچھ نہیں آیا تھا۔ رئیس خان ہر اپنے شہ زوروں کی ناز برداری کے لیے جاتے تھے تو ضروری چیزیں اٹھا کے لاتے رہتے تھے۔ آگ لگنے سے نقصان ان چیزوں کا ہوا تھا جو لائی نہیں جاسکتی تھیں۔ مثلاً فرنیچر' بھاری سامان۔ ٹی وی فریج اور اے سی۔ قالین اور پردے۔ میرے اندازے کے مطابق کھڑکیوں اور دروازوں کے ساتھ اندر جو بھی چیز جلنے کے قابل تھی' جل گئی تھی یا خراب ہوگئی تھی۔ نقصان لاکھوں کا ہوا تھا مگر رئیس کو غم تھا تو بس اپنے مرغوں کا جو باجماعت روسٹ ہوگئے تھے۔ اس کی برسوں کی محنت پر پانی پھر گیا تھا اور مستقبل تاریک ہوگیا تھا۔ اب وہ کم سے کم ایک سال تک مرغ بازی کے کسی قومی ٹورنامنٹ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

اچھی بات یہ تھی کہ آگ محدود رہی تھی۔ اس سے ساتھ والے گھروں کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اسے مورتی کا سر دکھایا تو اس نے عام جاہل عورتوں کی طرح خوف زدہ ہو کے کہا "ہٹاؤ اسے' یہ منحوس چیز یہاں بھی آگئی۔ خدا ہی خیر کرے۔"

میں نے کہا "یہ تمہارے خوش حال اور تابناک مستقبل کی ضمانت ہو سکتی ہے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "خاک دھول۔"

میں نے کہا "دروغ برگردن راوی۔ اس کی قیمت عالمی منڈی میں تین کروڑ بتائی جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ تم سے دو کروڑ میں خریدے۔ ایک کروڑ میں تو احسان مند ہو کے لے گا۔ تو سوچو تم کیا کر سکتی ہو۔ تم اپنے اخبار کو انیسویں صدی کا اخبار بنا سکتی ہو۔ نئی کمپوزنگ' کمپیوٹرائزڈ پیج میکنگ۔ اسکیننگ۔ جدید ترین کیمرے اور فلم پروسیسنگ اور آف کورس۔ خبر رسانی کے سیٹلائٹ رابطے۔ ماڈرن لک والا آفس۔ نیا عملہ' ذرا توجہ فرماؤ۔ اس اخبار کی ایڈیٹر بن کے تمہیں کیسا لگے گا۔ اس وقت تم آزاد صاحب کی چلبلی پر سوار ہو اور تمہیں اپنی کھٹارا سوزوکی بری سی لگتی ہے مگر اچانک تم ڈرائیو کرنے لگو لیٹسٹ ماڈل کی آٹومیٹک مرسیڈیز۔"

وہ جیسے خواب سے چونکی "یہ۔۔۔ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے۔ ہمت نہیں ہے تم میں یہ سب کرنے کی یا صلاحیت نہیں ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ میری AMBITIONS بہت ہائی ہیں لیکن یہ سب کرنے کے لیے سرمایہ چاہیے۔ بہت سرمایہ۔ بہت محنت' بہت ٹیلنٹ اور بہت بہت ہمت۔ پلس بہت سی خوش قسمتی۔ جو کسی بھی کاروبار میں کامیابی کے لیے چاہیے۔"

"ایمانداری سے بتاؤ۔ کمی کس چیز کی ہے تمہارے پاس؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھا۔

وہ خالی مگ کو انگلیوں میں گھماتی رہی۔ "سرمایہ۔ بس۔ مگر ناصر۔۔۔ یہ طریقہ جو تم بتا رہے ہو' اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ میں اسے FAIR نہیں سمجھتی۔"

میں نے کہا "بی بی۔ کاروبار اور محبت میں کیا فیئر اور کیا ان فیئر۔ کیپٹل کبھی دودھ کا دھلا اور سو فیصد حلال کا پیسہ نہیں ہوتا۔ خواہ تم کہیں سے بھی حاصل کرو۔ اس میں بلیک منی اور سود جیسی حرام شے کا عنصر بہر حال شامل رہتا ہے۔ بینک سے لو یا کسی INVESTOR سے۔ کیا تم ڈرتی ہو؟"

"ہاں میں ڈرتی ہوں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"او کے۔ میں خریدتا ہوں تم سے تین کروڑ کا مال ایک کروڑ پچاس لاکھ میں۔ سارے رسک پر ہے۔ تم سمجھو کہ میں ایک سرمایہ کار ہوں۔ میں تمہیں اپنے پاس سے سرمایہ فراہم کروں گا۔"

"کیا کیا کرو گے آخر تم۔ یتیم خانے کا پروجیکٹ تم شروع کر رہے ہو۔ کمالی کے اسپتال کو تم نے لیبارٹری اور ایکوپمنٹ دینے کی ذمے داری قبول کر لی ہے اور تمہارے پاس جو

ہے وہی ہے' تمہاری آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟"

میں نے کہا "فارگٹ دی آمدنی۔ اب میں پھر بزنس کے پرانے فیلڈ میں کودنے والا ہوں تو آمدنی کوئی مسئلہ نہیں ہوگی۔ پہلے ہی میں نے تھک کے سب چھوڑ دیا تھا کہ آخر میں کیا کروں گا اتنی دولت کا۔ کب تک جمع کروں گا اور کس نے کس کے لیے۔ کوئی ٹارگٹ کوئی مقصد ہی نہیں تھا میرے سامنے جواب ہے بلکہ ایک ساتھ کئی مقاصد ہیں۔ تین تم نے گنا دیے۔ چوتھا سب سے آخری اور سب سے بڑا۔"

اس نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے نظریں اٹھائیں "وہ کیا ہے؟"

"وہی جو تمہارا ہے۔ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ہے۔" میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے کچھ دیر بعد کہا "ناصر یہ سب میں کر سکتی ہوں۔ مگر کروں گی نہیں۔ میں کرنا نہیں چاہتی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے کہا "جب تک یہ شوق ہے' ٹھیک ہے مگر اسے بزنس بنانا اور پھیلانا فل ٹائم جاب ہے۔ میری زندگی گزر جائے گی اس میں۔"

"تو گزر جانے دو۔ زندگی گزارنے کے لیے ہے۔"

"نہیں ناصر' مجھے زندگی اپنے گھر میں گزارنی ہے۔ تمہارے ساتھ۔ اپنے بچوں کے ساتھ۔ اپنے خوابوں کے ساتھ۔ یہ نام' شہرت' پیسہ۔ سب تم کماؤ۔ ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گی مگر مجھے باہر کی دنیا سے کچھ نہیں لینا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد کسی دلیل کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ سحر کے آثار نمودار ہونے لگے تو اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ میں نے آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا اور خود صوفے پر لیٹ گیا۔ اب میں اتنا پُرسکون تھا کہ مجھے گہری نیند نے فوراً آغوش میں لے لیا۔ میں صبح گیارہ بجے تک بے سدھ پڑا رہا اور اس وقت جاگا جب شبنم نے جگا کے مجھے فون تھمایا۔

"تمہاری نیلم بات کر رہی ہے۔" اس نے شوخی سے بالوں کو برش کرتے ہوئے کہا۔ وہ نہا کے نکلی تھی اور تولیا اس کے شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔

فون نیلم نے نہیں سونی نے کیا تھا "رئیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ نہ سلام نہ دعا۔ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے کیا؟"

وہ شرمندہ ہوگئی۔ "سوری۔۔۔ تم غصے میں مت آؤ۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ کل کیا ہوا۔ رئیس خانے میں آگ لگ گئی کیسے؟"

میں نے کہا "یہ خبر کس نے دی تمہیں؟"

وہ ہنسی "ایک اخبار کی ایڈیٹر نے جو شاید تمہارے پاس ہی موجود ہوگی۔"

میں نے کہا "پھر تو اندازہ ہونا چاہیے تمہیں کہ رئیس پر کس قدر ڈیپریشن طاری ہے۔ ممکن ہے وہ شہیدوں کے سوئم وغیرہ کے انتظامات کر رہا ہو مگر تمہیں کیا۔ تم سب کی ہدایات اور مرضی کے خلاف شوٹنگ دیکھتی پھر رہی ہو۔ بڑی بے وقوف لڑکی ہو تم۔ کیا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری گرفتاری پر انعام ہے اور تمہاری تصویریں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔"

"میں نے کہا تھا نیلم سے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ سب ناراض ہوں گے۔"

"ارے گولی مارو ناراضگی کو۔ تم بتاؤ یہ ہم سب کی محنت کی ایسی تیسی کرنے والی بات ہے یا نہیں۔ اتنی محنت کر رہے ہیں ہم تمہیں بچانے کے لیے اور تم خودکشی پر آمادہ ہو۔"

وہ بولی "نیلم نے کہا تھا کہ وہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے اسٹوڈیو کے اندر نیلم کی دھونس چلتی ہے۔ پولیس بھی کچھ نہیں کرے گی مگر باہر تو ایسا نہیں ہے۔ تمہاری جان کا سب سے بڑا دشمن کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اسے اڑتی اڑتی بھی پہنچ گئی کہ تم یہاں ہو تو وہ تصدیق کرا لے گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ نیلم کے گھر چھاپا بھی پڑ سکتا ہے اور تمہیں برآمد کر لیا گیا وہاں سے تو پھر سمجھو نیلم بھی ہم سب کے ساتھ دلدل میں۔ تمہارا تو پھر اللہ ہی حافظ ہوگا۔ ہم ساری دنیا کے وکیل کر لیں اور اقوام متحدہ سے بھی اپیل کر لیں تو تمہیں بچا نہیں سکتے۔"

وہ ڈر گئی "پھر۔۔۔ کیا کروں میں؟"

"تم ابھی اور اسی وقت نیلم کا گھر چھوڑ دو۔"

وہ بولی "چھوڑ کے کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں واقعی بہت غصے میں تھا۔ نیلم ہمارے ساتھ بہت مخلص تھی اور اسے ہم اپنے ساتھ خوار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی نیک نامی' اس کا کیریئر اور اس کی زندگی سب کو داؤ پر لگانا بڑی احسان فراموشی ہوتی۔

میں اور شبنم آدھے گھنٹے بعد نیلم کے گھر پہنچے تو وہ بھی جاگ گئی تھی اور سونی اسے بتا چکی تھی کہ ایک دن گھر سے باہر قدم نکالنے پر میں نے اس کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔

اس نے سونی کی حمایت میں وکالت کرنے کی کوشش کی۔

"ناصر' تم بلاوجہ اتنے سیریس ہو رہے ہو۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا سونی کے میرے ساتھ جانے سے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ کچھ ہوا ہے مگر ہو سکتا ہے نیلم۔ ہر شخص کے دوست دشمن ہوتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم اسٹوڈیو کے اندر سیکڑوں لوگوں میں سے کسی کی نظر نے سونی کو دیکھ کے پہچان لیا اور کسی کو انعام کا لالچ مجبور کر دے کہ وہ خاموشی سے مخبری کر دے۔ فوراً کچھ نہیں ہوا تو یہ خوش قسمتی ہے تمہاری اور سونی کی مگر آج کل میں پولیس آگئی چھاپا مارنے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یار کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ مانا کہ تمہارے پرستار ہیں ڈی آئی جی صاحب بھی مگر انہیں خبر ہونے سے پہلے ہی کارروائی ہو گئی تو وہ کیا کرلیں گے۔ کوئی بھی مجسٹریٹ یہ چانس لینے پر راضی ہو سکتا ہے اور وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے چھاپا مارے تو اس کے خلاف کیا تادیبی کارروائی ہو سکتی ہے۔ سونی یہاں سے برآمد نہ ہو تو تم زیادہ سے زیادہ پولیس کے خلاف ہتکِ عزت اور ہرجانے کا کیس کرو گی۔ آج تک کسی کی شنوائی ہوئی ہے پولیس کے خلاف یا کسی کو ہرجانے کا ایک پیسہ بھی ملا ہے۔ کون پڑتا ہے اس چکر میں۔"

شبنم نے میری بات آگے بڑھائی "لیکن سونی برآمد ہو گئی تو اس مجسٹریٹ یا پولیس افسر کی تو سمجھو گڈی چڑھ گئی۔"

"تمہارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا اور تمہارے بڑے بڑے پرستار بھی تمہیں بچا نہیں پائیں گے۔ بعد میں سیریس ہو کے پچھتانے سے ابھی کچھ کرنا بہتر ہے۔ میں تمہارے ساتھ بددیانتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا نیلم۔"

"بددیانتی کیسی؟"

"یہ بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے کہ تمہارے آج تک کی ساری نیکیوں اور مہربانیوں کا صلہ میں یہ دوں کہ تمہیں خطرے میں دیکھ کے بھی کچھ نہ کروں اور یہ فرض کرکے مطمئن ہو جاؤں کہ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔"

"اچھا بابا' مجھ سے غلطی ہوئی۔" نیلم ناراضی سے بولی۔

میں نے اس کی ناراضی کی پروا نہیں کی "کوئی بات نہیں۔ ہماری غلطیوں کی تم نے پردہ پوشی کی۔ ہم تمہاری غلطی پر تمہیں نقصان سے بچائیں گے۔ اول تو یہ تمہاری نہیں ہماری غلطی تھی کہ سونی کو یہاں لا کے رکھا۔"

سونی رونے کے قریب ہو گئی "غلطی تو سب میری ہے۔"

"ٹھیک ہے تو اس کی سزا بھی تم بھگتو۔ یہاں مزے سے رہتی تھیں۔ اب چلو ہمارے ساتھ اور قیدِ تنہائی کاٹو۔" میں نے کہا۔

نیلم نے کہا "آخر کہاں لے جاؤ گے تم اسے؟"

"کہیں بھی لے جائیں مگر فی الحال اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ چلو اٹھو سونی۔"

"افوہ' ایسی بھی کیا آفت آرہی ہے۔ چائے تو پی لو۔"

میں نے کہا "ویسے تو ہم نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے ابھی تک لیکن تم خود سوچو۔ خدا نخواستہ چھاپا پڑ گیا تو اس وقت تمہارے میرے اور شبنم کے لیے کتنے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس رسک کے مقابلے میں چائے کیا ہے؟ پھر پی لیں گے۔ پیتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنا گھر ہے۔ پہلے اس کو بچانا ہم سب کا فرض بنتا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ سیلاب کا تباہ کن ریلا آرہا ہو اور خطرہ ہو کہ بہا لے جائے گا تو کوئی دیر کرتا ہے کہ اچھا چلتے ہیں۔ چائے پی لیں یا ٹی وی پروگرام ختم ہو جائے۔"

نیلم مسکرانے لگی "ایک تو تمہارے دلائل۔ تم وکیل کیوں نہیں بنے۔"

میں نے کہا "ایک وعدہ ہے میرا البتہ۔ اگر ایک دو روز خیریت سے گزر گئے۔ تم ایک ہفتہ سمجھ لو۔ کچھ نہ ہوا تو سونی واپس آجائے گی۔"

میرے اس وعدے نے ساری شرمندگی اور ساری ناراضی دور کر دی۔ سونی کا چہرہ کھل اٹھا اور نیلم بھی خوش ہو گئی "پھر ٹھیک ہے۔"

شبنم نے کہا "چلو پھر دیر مت کرو۔"

لیکن آدمی تقدیر کے لکھے سے بے خبر اپنی تدبیر کا کھیل امید کے داؤ پر جاری رکھتا ہے۔ دیر ہو چکی تھی۔ شبنم کے لبوں سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ عبدالرحمان کا متفکر چہرہ نمودار ہوا "میڈم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

مگر اس کی صورت دیکھنے کے بعد مجھے اس کی پریشانی اور تذبذب کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جس بات کا ڈر تھا وہ ہو گئی ہے۔

"کیا ہے رحمان صاحب۔ چپ کیوں ہو گئے آپ؟" نیلم نے کہا۔

"پولیس آئی ہے میڈم۔ ان کے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ ہے اور گرفتاری کا بھی۔" رحمان نے صرف ایک نظر سونی کی طرف دیکھنا کافی سمجھا۔

نیلم نے خلافِ توقع بڑے صبر و سکون اور ضبط و تحمل کا

مظاہرہ کیا "ٹھیک ہے رحمان صاحب۔ گارڈ سے کہو کہ میڈم آرہی ہیں۔"

"آپ۔۔۔ خود جائیں گی۔ میں بات کر لیتا ہوں۔"

"نہیں رحمان۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔" نیلم نے سختی سے کہا۔

میں نے کہا "تم نے دیکھا۔۔۔"

"ہاں اور اب تم دیکھو۔" اس نے میری بات کاٹ دی "خالہ کو بلاؤ رحمان اور سیکیورٹی کے انچارج کو۔ حوالدار کو۔"

"میں تو کھڑی ہوں یہاں بیٹا۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں۔۔۔"

نیلم نے انہیں بھی ڈانٹ دیا "فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ان دونوں کو لے جائیں کچن میں۔"

خالہ نے کینہ توز نظروں سے مجھے اور سونی کو دیکھا۔ انہوں نے روزِ اول سے ہی میری اور سونی کی اس گھر میں پذیرائی اور مہمان سے بلائے جان بن جانے کی ڈھٹائی کو سخت ناپسند کیا تھا۔ ان کا یہ رویہ غلط بھی نہ تھا۔ وہ نیلم کی پروا اپنی بیٹی کی طرح کرتی تھیں اور یہ کیسے گوارا کر سکتی تھیں کہ دو خطرناک اور بدنام قسم کے اجنبی اس گھر میں گھر والوں کی طرح رہنے لگیں مگر نیلم کی وجہ سے وہ پیٹھ پیچھے بولنے اور چپکے چپکے ہمارے خلاف بے دخلی کی پروپیگنڈا مہم چلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

"کچن میں۔۔۔ اور وہ موئے پولیس والے مونچھیں اور ڈنڈے چلاتے گھس آئے کچن میں پھر۔"

نیلم نے احکامات کا سلسلہ جاری رکھا "فرج خالی کریں بالکل۔ سب چیزیں باہر نکال دیں۔ شیلف بھی ہٹا دیں اور فرج بند کرکے اس میں سونی کو بٹھا دیں۔ ایک کمبل بھی دے دو ورنہ یہ ٹھٹھر کر مر جائے گی۔"

خالہ نے برا سا منہ بنا کے سونی کی طرف دیکھا تو ان کے دلی جذبات کا عکس ان کے چہرے پر نظر آیا۔ خاموشی کی زبان میں انہوں نے کہہ دیا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

"پوری بات سنو خالہ۔ ابھی سیکیورٹی گارڈ بنارس خاں بھی آئے گا کچن میں۔"

"ہائے اللہ۔" خالہ نے سینے پر ہاتھ رکھا "اسے بھی سونی کے ساتھ فرج میں بند کر دوں۔ اس مشٹنڈے کو۔۔۔"

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود ہم سب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ نیلم نے کہا "ناصر اس کے ساتھ لباس بدلے گا اور سیکیورٹی گارڈ کی جگہ ڈیوٹی دینے کھڑا ہو جائے گا پیچھے کی طرف۔ بنارس خاں کو خانساماں کے کپڑے دے کر۔

یا ایسا کرو۔ ڈرائیور کی وردی دے دو اور گاڑی چمکانے کا کہہ دو۔ بس اب جاؤ۔ ناصر صاحب۔ سونی۔ گھبرانا نہیں۔ فرج آف ہو جائے گا تو زیادہ ٹھنڈ نہیں رہے گی اندر۔"

خالہ نے بہت کچھ بڑبڑاتے ہوئے فرج خالی کیا۔ یہ چودہ کیوبک فٹ کا فرج تھا جس میں اوپر والا خانہ فریزر کا تھا۔ نیچے والا حصہ پانچ فٹ لمبا۔ دو سوا دو فٹ گہرا اور شاید اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس میں صرف سونی جیسی مختصر وجود رکھنے والی لڑکی ہی سمٹ کر سما سکتی تھی۔ خالہ نے نیلم کے احکامات کی تعمیل میں پانچ منٹ بھی نہیں لگائے۔ سونی بڑی محفوظ جگہ میں غائب ہو گئی۔

حوالدار بنارس خاں اس کے بعد نمودار ہوا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنی وردی اور مشین گن میرے حوالے کر دی۔ وہ ڈرائیور کی سفید یونی فارم اور پی کیپ لگا کے آیا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھ کے کہا "تھینک یو حوالدار بنارس خاں۔"

وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میں نے اس کے لبوں کو عجیب سے انداز میں لرزتا دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہ بھی کہ "سر جی یہ تو فرض ہے ہمارا۔" یا "شکریہ کیسا سر جی۔" یا کوئی ایسی بات مگر الفاظ اس کے لبوں تک آکے بے بس ہو گئے۔ حوالدار قوتِ گویائی سے محروم تھا۔

خالہ باہر نکل گئیں تو میں نے اپنے کپڑوں کو اتار کے سیکیورٹی گارڈ کی یونی فارم پہن لی اور باہر آگیا۔ بنارس خاں نے مجھے اشارے سے وہ جگہ دکھائی جہاں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یہ پچھلے حصے میں باغ کا آخری کونا تھا جہاں چار گھروں کی دیواریں ملتی تھیں۔

اس وقت تک پولیس اندر آگئی تھی۔ اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر پہنچ کے میں نے دیکھا تو مجھے ڈی ایس پی خورشید کیانی کو دیکھ کے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ واضح عدالتی احکامات کے باوجود وہ معطل نہیں ہوا تھا اور ایس ڈی ایم صمد خاں کے ساتھ ایک غیر قانونی کارروائی میں شریک تھا جو انتقام کے ذاتی جذبات' عناد اور ضمیر فروشی کی آئینہ دار تھی۔ غیر قانونی اس لیے کہ نہ یہ علاقہ ڈی ایس پی خورشید کیانی کے دائرۂ اختیار میں تھا اور نہ صمد خاں کی انتظامی حدود میں لیکن قانون تو ان کی نظر میں ان کا خادم تھا اور ان کا ہتھیار تھا جس کے استعمال کے لیے انہیں کسی لائسنس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

نیلم بڑی ادا سے ایک ہاتھ کمر پر رکھے پولیس فورس کے کمانڈر سے کچھ بات کر رہی تھی۔ کچن کی طرف سے خالہ کی نشریات جاری تھیں۔ وہ انہیں اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے ایسی بے نقط سنا رہی تھیں جو کوئی اور سناتا تو پولیس اس کے بتیس دانت الگ کر کے زبان کھینچ لیتی۔

پولیس کے آٹھ جوان جو نیلم کو بڑی بھوکی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وفورِ اشتیاق سے اس کا فرادا دلربا سیمیں بدن پردۂ سیمیں پر اپنے حسن کی جلوہ آفرینی سے زمانے کو دیوانہ کرنے والی سپر اسٹار کی خواب گاہِ ناز میں داخل ہو گئے جس میں قدم رکھنے کا وہ خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ شاید وہ اس گھر کے دروازے پر اس کی ایک جھلک دیکھنے کی التجا لے کر بھی آتے تو روٹی مانگنے والے فقیر کو روٹی مل جاتی انہیں دھتکار کے سوا کچھ نہ ملتا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں شبنم نے سونی اور نیلم نے فرسٹ ہینڈ رپورٹ میں بتایا۔ صمد خاں کسی حد تک محتاط تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے اپنے قانونی اختیار سے تجاوز کیا ہے اور ہائی کورٹ میں اس کے خلاف درخواست پر اسے کسی غیر پیداواری غیر منافع بخش اور غیر علاقے جیسی جگہ بھی بھیجا جا سکتا ہے اور کی پر یعنی واپس اپنے گھر بھی مگر کیانی پولیس افسری کو اتنا غیر محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ اسے ملک رب نواز کی پوری اخلاقی اور مالی سپورٹ حاصل تھی چنانچہ وہ ہر قیمت پر سونی کو وہاں سے برآمد کرنا چاہتا تھا۔ میری وہاں موجودگی کی طرف اس کا ذہن ہی نہیں گیا مگر شبنم کو دیکھ کے وہ کچھ اپ سیٹ ہوا۔

"THINK OF THE DEVIL" اس نے کہا۔

"AND THERE HE IS" شبنم نے اس کی طرف اشارے سے جملہ پورا کر کے جملہ لوٹا دیا "میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔"

"اچھا جی۔ آپ بھی سوچتی ہو ہمارے بارے میں۔ خیر سے اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

شبنم نے کہا "میری سوچ کا آئینہ میرا اخبار ہے۔ کل دیکھ لینا۔"

کیانی نے اس دھمکی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ذاتی طور پر تلاشی کے عمل کی نگرانی میں مستعد ہو گیا۔ وہ ہر کانسٹیبل کو گالیوں کے ساتھ چلا چلا کے ہدایات دیتا رہا "اوئے کھوتے۔ آنکھیں کھول کے کام کر۔ اوئے تیری ماں نے جنا تھا تو عقل اندر ہی روک لی تھی۔ کیا خالی سر تھا تیرا بیج بونے والے کا!"

وہ بکواس کرتا رہا اور ایک ایک کمرے میں الماریاں۔ کونے کھدرے۔ بکس اور سوٹ کیس تک کھلوا کے دیکھتا رہا۔ کسی خفیہ خانے یا تہ خانے کی جستجو میں دیواریں اپنی چھڑی سے بجاتا رہا اور کمے مار مار کے دیکھتا رہا۔ اس نے باتھ روم جھانکے۔ بیڈ کے نیچے دیکھا اور صوفے ہٹوائے۔ اس سے نیلم پریشان ہو گئی تھی کہ شاید وہ کچن کے مرچ مسالے کے ڈبے بھی کھول کے دیکھے گا کہ سونی کو کسی جادو منتر سے مکھی بنا کے تو نہیں چھپا دیا گیا ہے۔ فرج اور ڈیپ فریزر کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

لیکن سارے بیڈ رومز، اسٹور، ڈرائنگ روم اور لاؤنج میں بہت کچھ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کیانی کے ہاتھ سوائے خفت اور جھنجلاہٹ کے کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اس پر مستزاد شبنم کا تبصرہ تھا اور خالہ کی حوصلہ شکنی براڈ کاسٹ بھی جو کچن سے برابر جاری تھی۔ نتیجہ یہ کہ کچن تک جاتے جاتے کیانی کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور مورال اتنا ڈاؤن تھا کہ اس نے ماتحتوں کو گالیوں سے نوازنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

یہ خالہ نے بتایا کہ ایک ٹنڈ کرا کے گنجا ہونے والا اور ایک طبعی گنجا کچن میں پہنچے تو خالہ بارڈر فورس کے کمانڈر کی طرح تیار کھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دوسرے میں گز بھر کا کفگیر اٹھائے اور ان کے تیور دیکھ کے لگتا بھی تھا کہ وہ دونوں صاف سر درمیان سے پھاڑ دیں گی۔ تاہم انہوں نے قانون کا احترام کرنے والے شہری کی طرح مزاحمت نہیں کی مگر نامراد بد خواہوں اور حرام خور پولیس والوں کے خلاف ایسی تقریر کی کہ ان دونوں نے کچن میں ایک سرسری نگاہ ڈال کے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ خالہ کی حکمتِ عملی کامیاب رہی۔

لیکن کیانی اتنی جلدی حوصلہ ہارنے والا شخص نہیں تھا۔ شبنم نے اس کا مقابلہ "مردانہ وار" کیا۔ وہ اب صرف رپورٹر نہیں تھی۔ اس کو ایڈیٹری کی طاقت حاصل ہوگئی تھی اور وہ ڈی ایس پی جیسے "معمولی" افسروں سے ایسے بات کرتی تھی جیسے ڈی ایس پی کسی کانسٹیبل سے مخاطب ہوتا تھا۔

"چلیں مل گئی آپ کو سونی۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ یہاں جو توڑ پھوڑ کی ہے آپ نے اس کے نقصانات کی تلافی کون کرے گا۔"

کیانی خباثت سے مسکرایا "ہم نے تو بس جھانکا ہے اندر۔ مجال ہے جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا ہو۔"

"میں نے بلوایا تھا فوٹو گرافر کو مگر انے دیر ہوگئی کچھ۔ میں خود ٹھیک ٹھاک تصویریں بنا لیتی ہوں اور میرے بیگ میں رہتی ہیں یہ چیزیں۔ میرے ہتھیار۔ کیمرا بھی لوڈڈ رہتا ہے اور ٹیپ ریکارڈر بھی۔ اس طرح عکس اور آواز۔ دونوں کو محفوظ کر لیا ہے میں نے۔"

کیانی کے چہرے پر اور درشتی آگئی۔ اس نے اپنے نائب انسپکٹر کو حکم دیا "اس عورت سے دونوں چیزیں لے لو۔ اس نے کس کی اجازت سے تصویریں اتاریں اور ٹیپ ریکارڈر چلایا۔ یہ قانونی فرائض کی ادائیگی میں مداخلت کے برابر ہے۔"

شبنم فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ ڈی ایس پی۔ تم کو اپنے ساتھ لیڈی پولیس بھی لانا چاہیے۔"

کیانی نے گالی دے کے کہا "اوئے وہ کنجری باہر بیٹھی ہے گاڑی میں۔ بلا لو اسے اندر۔"

لیکن اس سے پہلے نیلم نے عبدالرحمان کو اشارہ کیا "سیکیورٹی انچارج کو بلا لو۔ اپنے مہمان کی حفاظت ہم ہر قیمت پر کریں گے۔"

ایک لمبا تڑنگا سابق فوجی گارڈ کی وردی اور اسلحے کے ساتھ شبنم کے سامنے آکھڑا ہوا۔ کیانی نے اسے حکم دیا "تم مت آؤ بیچ میں۔"

گارڈ بت بنا کھڑا رہا "ہم میڈم کا حکم مانتا ہے۔"

"میں گولی مار دوں گا۔" انسپکٹر دہاڑ کے بولا۔

نیلم نے کہا "گارڈ۔ تم جوابی کارروائی کے لیے تیار رہو۔"

کیانی کی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس کی افسری کا غبارہ پھولنے...... سے پہلے ہی پھٹ گیا تھا مگر صمد خان نے صورتِ حال کو فوراً سنبھال لیا "ٹیک اٹ ایزی۔ ہم یہاں خون خرابا کرنے نہیں آئے ہیں۔ خانہ تلاشی مکمل ہو گئی۔ چلو تم لوگ۔"

"نہیں۔ میں گھر کے ملازموں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔" کیانی غصے کے زہر کو پی کے پھنکارا "سب کو بلا لو۔"

یہ اپنی خفت کو چھپانے کی ایک آخری لاحاصل کوشش تھی۔ خالہ کی باری پہلے آئی۔ انہوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

کیانی نے کہا "یہ بتاؤ یہاں کون کون رہتا ہے۔"

"یہاں انسان رہتے ہیں اور کون۔ جن بھوت تو میں نے دیکھے نہیں۔ جتنے ہیں سب تو کھڑے ہیں تیرے سامنے۔ اب کیا گھر کے کیڑے مکوڑوں کو بھی حاضر کریں؟ کچن میں لال بیگ بھی بہت رہتے ہیں۔"

شامتِ اعمال کے باعث ایک کانسٹیبل ہنسی نہ روک سکا۔ کیانی کا بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا "لائن حاضر کر دو اسے پیٹی اتار کے۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔"



"آپ فکر ہی مت کرو جناب۔" انسپکٹر نے مونچھوں کو تاؤ دیا "پکا بندوبست ہو جائے گا۔"

کیانی نے دوسرا سوال آنے جانے والوں کے بارے میں کیا تو خالہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا "ارے انسان رہتے ہیں جہاں وہاں انسان ہی آتے ہیں۔ گدھے گھوڑے تو پہلے کبھی دیکھے نہیں ایسے اندر دولتیاں جھاڑتے ہوئے اور تو کیسا پولیس کا افسر ہے۔ نیلم جیسی اسٹار کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ اس سے کون ملنے آتا ہے۔ زمانہ ملنے آتا ہے اس سے۔ تیرے بڑے بڑے افسر۔ ڈی آئی جی جیسے۔ کتوں کی طرح دُم ہلاتے آتے ہیں۔ اسمبلی کے ممبر اور وزیر آتے ہیں۔"

کیانی نے اپنی ہار مان لی۔ وہ شبنم کی موجودگی میں خالہ کو نہ گالی دے سکتا تھا نہ زدوکوب کر سکتا تھا اور نہ گرفتار۔ سیکیورٹی گارڈز کے سوا جن کے بارے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے رعب میں نہیں آئیں گے، اس نے سب سے آنے جانے اور یہاں رہنے والوں کے بارے میں پوچھا تو اسے تقریباً وہی جواب ملا جو خالہ دے چکی تھیں مگر باقی لوگوں نے اپنا رویہ شریفانہ رکھا۔ ایک گھنٹے بعد کیانی اپنی حملہ آور فوج کے ساتھ شکست خوردہ جرنیل کی طرح لوٹ گیا مگر جاتے جاتے اس نے ایک عقل مندی کی۔ اس نے نیلم سے اس "تکلیف" پر معافی مانگ لی جو خانہ تلاشی کی وجہ سے اس کو اٹھانی پڑی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "کیا کریں۔ اوپر سے حکم ملتا ہے تو تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ آپ کے کسی بد خواہ نے جھوٹی اطلاع دی تھی۔"

نیلم نے تلخی سے کہا "پھر کبھی ایسا معاملہ ہو تو فون پر مجھ سے یا میرے سیکریٹری سے تصدیق کے بعد تشریف لائیں

کیانی صاحب!"

نیلم اور شبنم کے ساتھ خالہ کے جارحانہ رویے نے کیانی کی پریشانی میں بہت اضافہ کیا تھا۔ شبنم کا ملنا تو اس کے نزدیک بدقسمتی کی انتہا تھی۔ اب اسے فکر یہ تھی کہ اس چھاپا مار کارروائی کا قانونی دفاع کیسے ہوگا۔ خانہ تلاشی سے سونی تو نہیں ملی تھی لیکن اس ناکامی سے کیانی کا حوصلہ پست نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ نیلم کے ساتھ سونی کے اسٹوڈیو میں فلم سیٹ پر نظر آنے کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ وہاں ایک نہیں سیکڑوں گواہ ہوں گے مگر اب وہ سارے مکر جائیں گے۔ ان کا مفاد نیلم کے ساتھ وابستہ تھا۔ وہ وہی کہیں گے جو نیلم کہلوائے گی۔ ڈی ایس پی کو یہ شک بھی ہوگا کہ اس چھاپے کی اطلاع پولیس فورس میں کسی نیلم کے پرستار نے قبل از وقت دے دی اور نیلم کو اشارہ مل گیا کہ وہ سونی کو کہیں اور پہنچا دے اور گھر کے سب ملازموں کو ہر سوال کا مناسب جواب دینے کے لیے تیار کر دے۔

نیلم نے یہ عقل مندی کی کہ ڈی ایس پی کو چیلنج نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ "کیانی صاحب۔ کیا میں سمجھوں کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا یا مجھے آئندہ کے لیے پہلے سے کوئی قدم اٹھا لینا چاہیے۔"

کیانی کی پولیس فورس باہر جا چکی تھی۔ شبنم اور ایس ڈی ایم صمد خاں کے سامنے اس نے اپنی خودی کو نیچا کر کے نیلم کے قدموں میں ڈال دینے میں بھی حرج نہ سمجھا "دیکھیے مس نیلم۔ میں معافی مانگ چکا ہوں۔ اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔ ہم تو خود آپ کے قدرداں اور پرستار ہیں۔ آپ فنکار ہیں۔ بڑی عزت ہے آپ کی۔ اوپر تک پہنچ ہے۔"

صمد خاں نے بات آگے بڑھائی "مطلب یہ کہ دشمنی کا کیا سوال۔ یہ بات بالکل ہمیشہ کے لیے ختم۔ نہ آپ کو گلہ ہونا چاہیے نہ ہمیں۔ یہ قانونی کارروائی تھی۔"

"یہ ایک غیر قانونی کارروائی تھی مجسٹریٹ صاحب۔" شبنم نے کہا۔

"ایڈیٹر صاحبہ میں سارے نقصان کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔ آپ بھی غصے کو تھوک دیں۔" کیانی منت سماجت پر اتر آیا۔

شبنم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ کتے کی طرح دُم دبا کے بھاگ گیا۔ نیلم کے سیکریٹری عبدالرحمان نے اسے باہر تک سی آف کیا اور اس وقت تک واپس نہیں آیا جب تک سرکاری گاڑیاں نظر سے اوجھل نہیں ہو گئیں۔

صورتِ حال کے معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا۔ سب سے پہلے خالہ نے سونی کو فریج سے نکالا۔ گھبراہٹ اور عجلت میں وہ فریج کو آف کرنا بھول گئی تھیں۔ آدھے گھنٹے میں سونی کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اسے فوراً لحاف گدوں میں دبا کے گرم کیا گیا اور گرم کافی پلائی گئی۔ اندیشہ یہ تھا کہ اسے نمونیہ نہ ہو جائے۔ خالہ نے کچن کو سمیٹا جس کی حالت دیکھ کے ایسا لگتا تھا کہ وہاں بھونچال آیا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دوسرے کمروں کی تھی۔ خالہ نے ملازمین کی کمان سنبھالی اور گھر کی صفائی میں لگ گئیں۔ پولیس کی شان میں ان کی پُرمذمت براڈکاسٹ مسلسل سنائی دیتی رہی۔

میں نے سیکیورٹی گارڈ بنارس خاں کو اس کی وردی واپس کی مزید اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ پھر اپنی بے زبانی سے بولا "اٹ از آل رائٹ سر۔" مگر یہ الفاظ میرے تھے۔ بنارس خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ صرف فرض شناسی جانتا تھا۔ جاں نثاری جانتا تھا اور حق نمک ادا کرنے کے اصول کو سمجھتا تھا۔ وہ اپنی وردی پہن کے پھر اپنی جگہ پر ڈیوٹی دینے لگا۔

میں نے نیلم کے کمرے میں پہنچ کے خدا کا شکر ادا کیا "مانتا ہوں میں تمہاری ذہانت کو اور حاضر دماغی کو۔"

نیلم نے مسکرا کے کہا "تم ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے۔ چلو اچھا ہوا کہ چھاپا تمہارے سامنے ہی پڑ گیا۔"

"فارسی میں کہتے ہیں۔ رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت۔"

"ہاں۔ چھاپے کا ڈر بھی ختم ہوا۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "لیکن سونی بدستور غیر محفوظ ہے۔ اسے نیلم کے ساتھ بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا۔"

"سونی میرے گھر میں اس سے زیادہ محفوظ ہے۔ جتنی تمہارے ساتھ۔ تم اب جا سکتے ہو۔" نیلم نے کہا۔

"ایسے ہی۔ ناشتا کیے بغیر؟" میں نے فریاد کی۔

"اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ میرا شیڈول بھی دو بجے کا ہے۔ چلو بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیا کرتے رہے دو دن۔" نیلم بولی۔

سونی نے مجھ سے پوچھا "رئیس کا بھی کچھ پتا ہے۔ اس کا بہت نقصان ہوا ہے۔ کتنے شوق سے بنوایا تھا اس نے رئیس خانہ۔ اس کے مرغے سب مر گئے۔"

"مر گئے نہیں، شہید ہو گئے۔" میں نے کہا۔

فی الحال سونی کو شفٹ کرنے کا مسئلہ غیر اہم ہو گیا تھا اور ٹل گیا تھا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو رئیس کا فون آیا۔ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔

میں نے رئیس کی بات سنی مگر میرے ذہن نے اسے کچھ دیر بعد سمجھا لیکن پھر بھی قبول نہیں کیا "قتل کا الزام ہے تجھ پر۔"

"دہرے قتل کا۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔ کسے قتل کر دیا ہے تو نے؟"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

سونی نے اور نیلم نے ایک ساتھ چلا کے پوچھا "کس کا فون ہے؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا "یار رئیس، آخر الزام کس کے قتل کا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا پیارے۔ شاید الزام لگانے والے بھی نہیں جانتے ہوں گے۔"

میں نے جھنجلا کے کہا "یار، اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ راہ چلتے کسی کو پکڑ لیا جائے اور زبردستی اس کے سر قتل کا جرم تھوپ دیا جائے۔"

وہ مایوسی سے بولا "ابے ہوتا ہے۔ سب ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ہوا ہے تو کسی دن تیرے ساتھ بھی ہوگا۔ پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔"

میں نے کہا "پولیس کو الزام مت دے وہ محض آلۂ کار ہوتی ہے۔ کسی کے کہنے پر سب کرتی ہے۔"

"تو اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ حرامی پن کس کا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

سونی نے میرا بازو پکڑ لیا "مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

میں نے غصے سے اپنا بازو چھڑا لیا "ذرا صبر کرو۔ میں پوچھے بغیر کیا بتاؤں۔"

رئیس نے کہا "کون ہے یار، سونی!"

میں نے کہا "ہاں۔ تو بتا آخر تو کیسے پکڑا گیا۔ صبح صبح کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر کہاں نکل گیا تھا تو۔"

وہ بولا "ہم ۔۔۔ یار، میں گیا تھا ۔۔۔ رئیس خانے۔"

"اپنے شہیدوں کی فاتحہ خوانی کے لیے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ کیا پولیس وہاں تجھے گرفتار کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھی؟"

"پہلے سے تو نہیں تھی۔ میں اندر گیا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے وہ بھی آ گئے" وہ بولا۔

"کیا وہ بھی ساتھ تھا۔ کیانی؟"

"نہیں۔ ایک سب انسپکٹر تھا۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا مگر میں نے اس سے پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ میں نے پوچھا تھا کہ کس کے حکم پر آئے ہو تم؟ ڈی ایس پی کیانی نے کہا ہے تم سے یا رب نواز نے۔ اس نے کہا کہ ہم افسرانِ بالا کے حکم پر آئے ہیں۔"

"اور اس نے گرفتار کر لیا تجھے؟"

"ہاں۔ اس کے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ تھا۔ میں نے پوچھا کہ اب کیا لینے آئے ہو۔ کل آگ لگنے کے بعد یہاں کیا بچا ہے۔ کیا آگ لگانے والوں کو کچھ نہیں ملا تھا؟ وہ کہنے لگا کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ تم ہمیں تلاشی لینے دو۔"

"ابے تو نے پوچھا نہیں کیوں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"پوچھا تھا یار ۔۔۔ کہ تلاشی کس بات کی۔ کیا میں نے یہاں کسی مفرور مجرم کو چھپا رکھا ہے۔ کسے تلاش کر رہے ہو تم۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ سونی کا نام لے یا اسی داڑھی والے جن کا۔ مگر وہ بولا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں منشیات کا دھندا ہوتا ہے۔"

"ویری گڈ۔ منشیات وہ لے کر آئے ہوں گے برآمدگی دکھانے کے لیے۔"

"یہی میں نے بھی کہا تھا کہ کتنی ہیروئن لائے ہو اپنے ساتھ۔ ایک کلو یا زیادہ۔"

"تو نے کہا نہیں کہ مجسٹریٹ کا موجود ہونا ضروری ہے۔"

"سب کہا تھا میں نے پیارے۔ اتنا قانون تو جانتے ہیں ہم بھی مگر وہ پکا کام کر کے آئے تھے۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ مجسٹریٹ صاحب بیٹھے ہیں باہر گاڑی میں۔ وہاں صمد خاں تھا سؤر کا بچہ۔ میں نے کہا کہ اچھا دیکھ لو۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ اسی چیز کے لیے آئے تھے وہ۔ مگر مورتی کا سر تو میں اٹھا لایا تھا۔"

"ابے یار، میں بھی اسی لیے مطمئن تھا۔ مگر وہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ اندر سے دو لاشیں برآمد ہو گئیں۔"

"کیا؟ دو لاشیں؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں۔ جلی ہوئی لاشیں تھیں۔"

میں نے نیلم اور سونی کے فق چہرے دیکھے اور سونی کی آنکھوں میں دہشت کے آثار دیکھے۔ رئیس کے ساتھ میری گفتگو سن کے انہوں نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ رئیس کو قتل کے جھوٹے الزام میں پکڑ لیا گیا ہے اور اب وہ باقی تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھیں۔ یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ میں نے اپنے ردِعمل کو کنٹرول میں نہیں رکھا تھا اور احتیاط سے کام نہیں لیا تھا ورنہ گول مول لفظوں میں یک طرفہ گفتگو سے میں

اس سنگین صورت حال کی کچھ پردہ پوشی کرسکتا تھا۔
میں نے کہا "کس کی لاشیں تھیں' وہاں کیسے آئیں؟"
"دیکھ یار۔ فون پر سب نہیں بتا سکتا میں۔ یہ تو بس قسمت اچھی تھی کہ مجھے فون کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ انچارج صاحب کے کمرے میں تالا پڑا ہوا ہے اور وہ جاتے وقت سب کو بڑی سختی سے منع کرگیا تھا کہ مجھے کسی سے بھی رابطہ نہ کرنے دیا جائے۔"
میں نے کہا "چل ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ بتا' کس تھانے میں ہے تو؟"
"سچی بات یہ ہے پیارے کہ مجھے نہیں معلوم۔"
"کیوں؟"
"مجھے یہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لائے تھے یہ لوگ۔ ایک بندے نے بتایا ہے کہ تھانہ سنت نگر کا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ بھی جھوٹ ہو۔"
میں نے کہا "تو فکر مت کر۔"
"ابے فکر کیسی۔ اپنے لیے تھانہ کون سی نئی جگہ ہے اور جس کے اتنے والی وارث ہوں اسے کیا ضرورت ہے فکر کرنے کی لیکن وہ ضرور پریشان ہوگی' سونی ۔۔۔ اسے سنبھالینا۔"
"یار' شام تک گھر آجائے گا تو۔ اپنی ایڈیٹر صاحب بھی موجود ہیں یہاں اور نیلم کو کیا سمجھتا ہے تو۔ اس کے ایک اشارے پر افسران اعلیٰ و بالا کتے کی طرح دم ہلاتے آتے ہیں۔ یہ بتا' پیسے ہیں تیرے پاس؟"
"تھے تھوڑے بہت' خرچ ہوگئے۔"
"چل میرے آنے تک تو پیرا میسری نوٹ چلا۔ وعدوں کے بینک چیک جاری کر۔ ہم آکے کلیئر کردیں گے' ٹھیک۔"
"تو خود آئے گا؟"
"نہیں۔ میرا ہمزاد بھی ساتھ ہوگا۔"
"میرا مطلب تھا ۔۔۔ تو فرید کو بھیج دے۔ یا اپنے یار انسپکٹر نذیر عرف جیرے بلیڈ کی ڈیوٹی لگادے ورنہ اپنے مرحوم خدا بخش مندرال کا بڑا بیٹا ہے۔"
میں نے کہا "بکواس بند کرکے آرام سے بیٹھ۔ ہمارا کام ہم کرلیں گے ہدایت اللہ ولد تلقین شاہ۔"
میری شگفتہ مزاجی کا ڈراما فلاپ ہوگیا کیونکہ اس میں تصنع تھا۔ اسکرپٹ' اداکاری اور ڈائریکشن سب بے جان تھے اور میرے سامنے تھی نیلم جیسی فنکارہ۔ شبنم جیسی صحافی اور سونی جیسی چالاک اور جاندیدہ لڑکی۔ ایک عام گھریلو عورت سو سال کی عمر میں بھی زندگی کے اتنے تجربات سے [illegible] گزری اور شب و روز اور ماہ و سال کے آئینے میں حقائق کے اتنے چشم کشا عکس نہیں دیکھ سکتی جتنے انہوں نے اس کم عمری میں دیکھ لیے تھے۔ انہیں براہ راست گھر سے باہر کی دنیا کو اس کے اصل روپ میں دیکھنا پڑا تھا اور مخالف حالات کی سختی کا خود مقابلہ کرنا پڑا اور تمام سفاک رویے جھیلنے پڑے تھے کیونکہ انہیں سکون' عافیت اور پناہ فراہم کرنے والے رشتوں کی دیوار میسر نہ تھی۔
میں انہیں جھوٹی تسلی اور مکر والی باتوں سے مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ انہوں نے چند منٹ میں اصل سچائی جان لی۔
شبنم رات بھر کی جاگی ہوئی تھی مگر اس نے سونے کا پروگرام ملتوی کردیا "میں تمہیں اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔"
"کیوں؟ میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں یا فاترالعقل۔"
"تم خود بھی پھنس جاؤ گے۔ پھانس لیے جاؤ گے اور پھر یک نہ شد دو شد والی صورت حال ہوجائے گی۔"
"صاف کہو ناکہ تم ایڈیٹر ہو۔ بڑی توپ سمجھتی ہو خود کو۔"
وہ بولی "یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ توپ تو رہے گی توپ۔ تم مانو یا نہ مانو۔"
نیلم نے کہا "اچھا' اب آپس میں مت لڑو۔ جاؤ' میں بھی بات کرتی ہوں کسی سے۔"
"دیکھو نیلم! میں تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن خلوص میں اتنا آگے مت جاؤ کہ پھر مجھے پیچھے ہٹنا پڑے۔"
"اس فضول بات کا مطلب بھی سمجھادو مجھے۔"
میں نے کہا "آج جو کچھ یہاں میری وجہ سے ہوا۔"
"تمہاری وجہ سے کیسے ہوا؟" سونی نے کہا۔
"بیچ میں مت بولو" میں نے برہمی سے کہا "تمہیں یہاں لانے کی غلطی میں نے کی تھی۔"
نیلم نے دل زدہ لہجے میں کہا "اسے غلطی سمجھتے ہو تم۔ واقعی؟"
میں نے کہا "اب احساس ہونے لگا ہے کہ وہ غلطی تھی اور تم پر جتنی بار کوئی شک کی نظر ڈالے گا یا میری وجہ سے انگلی اٹھا کے تمہیں الزام دے گا میرا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جائے گا۔ میں تمہارا اور اس گھر کا دوست ہوں۔ مگر یہ دوستی اگر دشمنی سے مہنگی پڑنے لگی تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔"

[illegible] میں ہوں۔
میں نے کہا "مشکل میرے لیے ہوگی۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو ہمارے لیے خطرے میں مت ڈالو۔ کوئی ایسا کام مت کرو جس سے تم غیر محفوظ ہوجاؤ۔"
"جانتے بوجھتے ایسا کون سا کام کیا ہے میں نے؟"
میں نے کہا "کیوں' کل سونی کو اپنے ساتھ لے جاکے تم نے کوئی عقلمندی کی تھی۔ خود سونی تم سے کہتی تو تمہارا فرض بنتا تھا کہ اسے سختی سے ڈانٹ دو کہ تمہیں باہر جانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"
وہ بولی "چلو وہ بات تو ختم ہوگئی۔"
میں نے کہا "نہیں۔ ایسا سمجھنا پھر غلطی ہوگی۔ کیانی بہت کینہ پرور اور عیار آدمی ہے۔ اسے بے وقوف بنا کے خوش ہونا بے وقوفی ہے۔ یہاں وہ یقیناً مخبری پر آرہا تھا۔ کسی نے انعام کے لالچ میں پولیس کو اطلاع دی ہوگی کہ وہ لڑکی جس کی گرفتاری پر لاکھوں کا انعام ہے' نیلم کے ساتھ فلم کے سیٹ پر آئی تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو اس ایک ناکامی کے بعد وہ سمجھ لے گا کہ اطلاع غلط تھی؟ نہیں' وہ سمجھے گا کہ تمہیں کسی نے پہلے سے چھاپے کی خبر دے دی ہوگی اور تم نے سونی کو غائب کردیا۔ جتنے پولیس کے مخبر ہیں اس سے ہزار گنا زیادہ تعداد میں تمہارے خیر خواہ اور پرستار ہیں۔ آج کی چھاپا مار کارروائی ناکام ہوگئی مگر اطلاع ایسے غلط ثابت نہیں ہوئی' مجھے یقین ہے کہ وہ پھر چھاپا مارے گا۔ ممکن ہے اگلی بار وہ تمہارے دفاعی حصار میں چوروں کی طرح داخل ہوجائے یا تمہارے حفاظتی انتظامات کو ناکارہ بنادے۔ اسے کوئی نہ روک سکے اور اس سے پہلے کہ تم سونی کو چھپاؤ۔ وہ اس کے اور تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دے گا۔ وہ ایک بار نہیں' بار بار اور ہر جگہ آسکتا ہے۔"
"چلو اب وقت مت ضائع کرو۔ اگلی بار کی فکر میں پڑگئے ہو ابھی سے۔ جو کام ہے پہلے وہ کرو۔"
میں نے کہا "وہ تو میں کررہا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ میں رئیس کو مصیبت سے بچانے جاؤں تو معلوم ہو کہ اب تم مصیبت میں پڑگئی ہو اور تمہیں بچانے کی کوشش کامیاب ہونے سے پہلے مزید کہیں پھنس جائے۔ یہ سلسلہ رکنا چاہیے اور ایسا صرف احتیاط کرنے سے ہوگا۔"
"اوکے بابا۔ میں احتیاط کروں گی" نیلم نے ہاتھ جوڑے۔
سونی نے رونی شکل بنالی تھی "میں اب نہیں جاؤں گی کہیں بھی۔ مرجاؤں گی تب بھی نہیں۔ گاڑ دینا مجھے یہیں۔"
میں نے ہنس کے کہا "مرنے کون دے گا تجھے یہاں۔ [illegible]"
شبنم نہ جانے کہاں فون گھمانے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے نیلم سے کہا "تمہاری ایک گاڑی تو کل ہم نے ورکشاپ پہنچادی۔"
وہ بولی "وہ میری کہاں تھی' ابھی تم کیسے جاؤ گے؟"
شبنم نے کہا "بڑی گاڑی ہے نا۔"
میں نے کہا "اسے گاڑی کہنا محض جذباتیت کی دلیل ہے ورنہ وہ چار پہیوں والا ایک چوہے دان ہے۔ چلبلی کی نسل کا ایک جانور۔"
شبنم نے جزبز ہوکے کہا "شرم آنی چاہیے تمہیں۔"
میں نے کہا "ہاں۔ بڑی شرم آتی ہے مجھے اس میں بیٹھ کے۔ مگر کیا کروں؟"
"جہنم میں جاؤ تم۔ میں تو اسی میں جاؤں گی۔" شبنم واک آؤٹ کرگئی۔
میں نے کہا "ہاں' وہ چلتی ہی جہنم کے روٹ پر ہے اور کہیں جا بھی نہیں سکتی۔"
نیلم ہنسنے لگی "چلو' تم میری گاڑی لے جاؤ۔"
میں نے کہا "وہ شاہی سواری والا ہاتھی' نہ بابا۔"
"بھئی ایک شریفانہ کار بھی ہے۔ نوکر استعمال کرتے ہیں۔" وہ بولی۔
میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی تو خادم ہیں تمہارے۔ میں شبنم کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔"
"وہ میں سمجھ گئی تھی۔۔۔ اور ناصر۔۔۔!"
میں جاتے جاتے رک گیا "کیا۔ تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں؟"
"وہ۔۔۔ تمہیں پیسے لے جانے چاہئیں اپنے ساتھ۔"
میں نے کہا "بینک سے لے لوں گا میں۔"
اس نے کہا "چلو چیک مجھے دے دو۔ اگر تمہاری ناک کا سوال ہے تو۔ مگر مجھ سے کیش لے جاؤ۔ جتنا چاہیے۔"
میں نے کہا "اچھا! کتنا دے سکتی ہو تم۔"
وہ سوچ کے بولی "دس بارہ لاکھ تک۔ آؤ میرے ساتھ۔"
میں نے بے یقینی سے کہا "دس بارہ لاکھ۔ اتنا کیش رکھتی ہو تم گھر میں۔ مائی گاڈ! تم جانتی ہو' زمانہ کیسا ہے۔"
"یہ بلیک منی ہے۔" وہ بولی "ایسے ہی رکھنی پڑتی ہے۔ سب رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکو کیش اور جیولری کو بہت پسند کرتے ہیں۔"
"شاید تمہیں اپنے سیکیورٹی گارڈز پر بہت بھروسا ہے۔"
وہ بولی "بھروسا تو بس خدا پر ہے۔ اور غرور نہ سمجھو تو

نوکروں کے زیر استعمال گاڑی سوزوکی خیبر تھی جو کوئی بہت پرانا ماڈل نہیں تھا مگر نوکروں کی دولت مشترکہ ہونے کی وجہ سے اس کا حال ٹیکسی سے بدتر ہو رہا تھا۔ ٹیکسی کو چلانے والے پھر بھی اس کو ذریعۂ معاش جان کے اس کا خیال رکھتے ہیں۔ اس گاڑی میں ہر طرف ڈینٹ تھے اور خراشیں تھیں۔ پلیٹ کے اکھڑنے سے جو دھبے نمودار ہوئے تھے' وہ کسی صحت مند جلد پر زخموں کی طرح نظر آتے تھے۔ اس کا پیچھے والا بمپر ٹوٹ گیا تھا چنانچہ اسے تار سے باندھ کے رکھا گیا تھا۔ آگے کی ایک ہیڈ لائٹ غائب تھی۔ رات کے وقت یہ گاڑی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھی۔

گاڑی کی اندر کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسے مسافر بردار گاڑی سے زیادہ مال گاڑی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ نوکر اس میں روزمرہ کی ضرورت کا سامان اور مہینے کا راشن لاتے ہوں گے۔ اگر سیٹ کور استعمال کیے جاتے تو سبزی گوشت اور آٹے دال کے دھبے نظر نہ آتے اور سیٹیں بھی پھٹنے سے بچ جاتیں مگر یہ مالِ مفت دلِ بے رحم والا معاملہ تھا۔ خود نیلم کو ایسے کاموں کے لیے فرصت کہاں تھی۔ بانو خالہ ان معاملات کو سمجھتی نہیں تھیں اور نیلم کے سیکریٹری عبدالرحمٰن کا امورِ خانہ داری سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تاہم گاڑی دیکھنے میں جتنی خراب تھی' چلنے میں اتنی ہی اچھی تھی۔ اس کی چال اور رفتار سے ثابت ہوتا تھا کہ آدمی کو صورت کے حسن سے زیادہ سیرت کو اہمیت دینی چاہیے۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے چنانچہ سائڈ سے دیکھ کے کوئی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ نیلم نے مجھے براؤن پیپر کے لفافوں میں چھوٹے بڑے نوٹوں کی صورت میں دس لاکھ کی رقم دے دی تھی۔

شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا۔ یقینِ محکم' عمل پیہم' محبت فاتحِ عالم اور انہیں جہادِ زندگانی میں مردوں کی شمشیریں قرار دیا تھا۔ کچھ لوگ پہلے آدمی کے علم و فضل اور ہنر کو زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کا ضامن سمجھتے تھے مگر اب وقت کے ساتھ سارے پیمانے بدل گئے تھے۔ مقصد میں کامیابی کے لیے میری طاقت کا پہلا سرچشمہ وہ دولت تھی جسے میں رشوت دینے کے لیے پانی کی طرح بہا سکتا تھا۔ میری دوسری طاقت اسلحے کی ہلاکت خیزی تھی جسے میں ہوش مندی اور مہارت کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر تھا۔ تیسری طاقت زورِ بازو کی تھی۔ مارشل آرٹ میں ایسی مہارت اور تجربہ کاری کے باعث میں خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع بھی کر سکتا تھا اور اپنے

دس لاکھ روپے نقد' ایک بھرا ہوا خودکار جدید ترین قسم کا ریوالور' اور اپنی ذات پر اعتماد۔ جہادِ زندگانی کی ان شمشیروں کے ساتھ رئیس کو پولیس کی حراست سے آزاد کرانا میرے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کم سے کم سنت نگر تھانے کے باہر گاڑی روکنے تک میرا یہی خیال تھا۔

نیلم کے گھر سے میرے اور شبنم کی روانگی کے وقت میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ غصے میں اپنی گاڑی لے کر پہلے نکل گئی تھی مگر خلافِ امید مجھے تھانے کے باہر اس کی گاڑی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ گیٹ کے باہر والی دیوار کے ساتھ ایک ضبط شدہ کار اور ایک ٹیکسی کے تباہ حال ڈھانچے تصویرِ عبرت بنے قانون کی دہائی دیتے نظر آتے تھے۔ کار کے ڈھانچے پر مہینوں کے گرد و غبار میں اس کا اصل رنگ غائب ہو گیا تھا۔ اس کے اندر سے ریڈیو ٹیپ ریکارڈر یا گھڑی جیسی ہر فالتو چیز تو پہلے ہی دن نکال لی گئی ہوگی۔ اب یقین سے کہنا مشکل تھا کہ انجن کے کتنے پرزے پولیس کی یا افسران کی ذاتی کاروں میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں ٹائر ناکارہ۔ گھسے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے جو شاید پنکچر لگانے والوں کی دکان کے سامنے سے بلامعاوضہ اٹھائے گئے تھے۔ ان کی قدر و قیمت صرف ہنگامہ آرائی میں سڑک پر آگ لگانے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ کار عملاً اب پہیوں پر نہیں کھڑی تھی۔ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال ٹیکسی کا تھا۔ اس میں کسی فقیر نے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ وہ فقیر بھی پولیس کے لیے مخبری کرتا ہوگا ورنہ مالِ مسروقہ پر قبضے کے جرم میں اندر کر دیا جاتا۔ ٹیکسی کی سیٹوں پر اس کا بوریا بستر اور گدڑے ایک لوٹا اور کچھ برتن پڑے تھے۔

چھاپا مار کارروائی اور معرکشت میں استعمال ہونے والی ایک موبائل میں کچھ مجرم لائے گئے تھے۔ وہ نوجوان لڑکے تھے جو صورت سے ہی اوباش نظر آتے تھے مگر تھانے میں جاتے ہوئے ان کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی اور بہت جلد ہونے والی خاطر تواضع کے خیال سے ان کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

ہر تھانے کا منظر اور ماحول یہی ہوتا ہے۔ پرانی خستہ حال عمارتوں میں ایک سوگوار دہشت اور آسیب زدہ نحوست کے سائے ہر جگہ منڈلاتے محسوس ہوتے ہیں۔ فلموں میں باہر کے ملکوں خصوصاً یورپ اور امریکا کے پولیس اسٹیشن کی خوبصورت صاف ستھری اور نفاست سے آراستہ شاندار

کمپیوٹرز اور نئی نئی چمکتی دمکتی کاروں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تھانے ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔

چق پڑے ہوئے کمرے کے باہر تھانہ انچارج کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی اور ایک خالی بینچ پر کوئی ملازم ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی فراغت سے بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں مطلع کیا کہ ایس ایچ او صاحب گشت پر ہیں اور پھر میٹنگ کے لیے ڈی ایس پی صاحب کے آفس جائیں گے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب واپس آئیں گے۔

میں نے ڈیوٹی افسر سے رجوع کیا جو نوواردان کے بارے میں احکامات صادر فرما چکا تھا کہ انہیں گرد جھاڑنے کے بعد اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ اندر مختلف آلات کی مدد سے ان کی صفائی شروع ہو چکی تھی۔ اپنے مسائل لے کر حاضر ہونے والے دو سائل بڑی مظلوم صورت بنائے ایک بینچ پر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ صاحب و افسر کی نظرِ کرم ان پر ہو تو ان کی فریاد سنی جائے اور شکایت لکھی جائے۔

میرے سوال پر ڈیوٹی افسر نے مجھے ایسی پُرتمسخر نظروں سے دیکھا جیسے میں اپنے انسانی جسم پر گدھے کا سر لگا کے آ گیا ہوں۔

"خیر سے آپ بھی اخبار والے ہو" اس نے بالآخر قلم رکھ کے پوچھا۔

میں نے ایک بارعب متانت کے ساتھ کہا "کیا یہ سوال تم ہر تھانے آنے والے سے ضرور کرتے ہو۔"

وہ پیر پھیلا کے اور کرسی کی پشت کا سہارا لے کر سگریٹ جلانے لگا۔ ایک کش کا دھواں چھت کی طرف اڑا کے اس نے کہا "دراصل ابھی ابھی ایک خوبصورت بلا سے جان چھڑائی ہے کہ تم آ گئے۔ بولتی تھی میں اخبار کی ایڈیٹر ہوں۔ تم کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں اے پی پی کا بیورو چیف ہوں۔"

وہ میرے جھوٹ سے متاثر نہیں ہوا "یہ کون سا محکمہ ہے؟"

میں نے کہا "میں ایک خبررساں ایجنسی سے آیا ہوں۔ جو دنیا بھر کے اخباروں کو ریڈیو اور ٹی وی کی خبریں دیتی ہے۔"

اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا "اوئے چل' آلو بخارے۔ صاحب کو جگہ دے۔"

جسے آلو بخارا کہا گیا تھا' وہ بارہ چودہ سال کا گول مٹول لڑکا تھا جو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ بینچ کے آخری

رپورٹ کیوں نہیں لکھتا میری۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے چیزیں اٹھاتے ہوئے۔ میں بولی تو دوڑ گیا۔"

"مائی! کچھ گیا تو نہیں تیرا؟"

"گیا نہیں کا کیا مطلب۔ وہ مزے سے باہر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس نے بولا ہے میرے کو کہ پھر آؤں گا۔ بلا اسے ذرا میرے سامنے۔"

ڈیوٹی افسر ہنسنے لگا "او مائی' اسی تھانے کا بندہ ہے۔ وہ ڈیوٹی پر تھا رات بھر۔ تجھے پہچاننے میں غلطی لگی ہے۔ دن میں ٹھیک دکھائی نہیں دیتا ہوگا تجھے۔ رات کے اندھیرے میں کیسے دیکھا تو نے؟"

"لے' کیسی باتیں کرتا ہے تو۔ میری فریدہ نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بھی پہچان لے گی" برقع پوش عورت اپنی بات پر اڑی رہی۔

"یہ۔۔۔ فریدہ کون ہے؟"

"بیٹی ہے میری اور کون۔ دس جماعت پاس ہے۔ بڑی سیانی ہے۔"

ڈیوٹی افسر پھر ہنسنے لگا "اماں۔ پہلے فریدہ سے پوچھ لے۔ کہیں اس نے تو نہیں بلایا تھا کسی کو۔ یہ تو ہے بھی بڑا حرامی عشق باز۔"

بڑھیا چلانے لگی "اوئے' کچھ شرم حیا کرو۔ تمہارے گھر میں نہیں ہیں جوان بہنیں اور بیٹیاں۔ میرا گھر والا اسی تھانے میں سب انسپکٹر تھا۔ تمہارا ساتھی تھا۔ ڈیوٹی دیتے ہوئے شہید ہوا۔ ابھی تک پنشن نہیں ملی مجھے' سال ہو گیا۔ الٹا تم لوگ کوارٹر خالی کرانے کے لیے مجھے پریشان کر رہے ہو۔ دھمکیاں دیتے ہو' ڈراتے ہو۔"

ڈیوٹی افسر کچھ سیریس ہوا "اچھا مائی' تو ادھر محرر کے کمرے میں بیٹھ۔ انچارج صاحب آ جائیں۔"

عورت رونے لگی "روز خوار کرتے ہو مجھے۔ میں کہاں جاؤں۔ میرا گھر والا جس افسر کی جان بچاتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ وہ بھی میری نہیں سنتا۔ گولی اسے لگنی تھی اگر میرا گھر والا سامنے نہ آتا۔"

ڈیوٹی افسر گرم ہو گیا "پھر ہم کیا کریں۔ یہاں اخبار والے کو دیکھ کے شور کر رہی ہے۔"

عورت میری طرف متوجہ ہو گئی "بھائی اخبار والے۔ تم ہی انصاف کرو۔ جوان بیٹی کو ساتھ لے کر میں کہاں جاؤں۔ اکیلا گھر پر چھوڑ کے آتی ہوں تو الگ ڈر لگتا ہے۔"

عورت کی ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی اور اس

کی بات سن کے مجھے واقعی دکھ ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک کاغذ کے پرزے پر شبنم کا نام اور پتا لکھ دیا "تم ان کے پاس چلی جاؤ' شام کے بعد۔"

اس نے ممنونیت کے ساتھ کاغذ لے لیا "اللہ تیرا بھلا کرے' کیا نام بتاؤں اسے تیرا؟"

میں نے کہا "نام بھی لکھا ہوا ہے میرا۔ وہ تحریر سے بھی پہچان لے گی۔ موقع ملا تو میں کسی رپورٹر کو بھیجوں گا تمہارے گھر۔"

"تونے گھر دیکھا ہے میرا' گوارٹر ہے۔"

میں نے کہا "رپورٹر سب معلوم کرلے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

برقع پوش عورت اپنے بیٹے کے ساتھ ایسے فاتحانہ انداز میں گئی جیسے وہ کاغذ کا پرزہ نہیں' اس کے سارے مسائل کے حل کی ضمانت ہے۔ وہ اسم اعظم ہے جو اس کی ساری مشکلات اور اس کے سارے مسائل کو چٹکی بجاتے میں حل کردے گا۔ وہ طلسم ہے جو بدبختی کے عفریت کو جلاکے راکھ کرسکتا ہے۔ الہ دین کا چراغ ہے جو خوش قسمتی کے ہر خواب کو تعبیر دے سکتا ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اب اسم اعظم کسی وی وی آئی پی کی سفارش ہو سکتی ہے۔ طلسم کی طاقت سکہ رائج الوقت کے پاس ہے اور الہ دین کا چراغ قصے کہانیوں کی بات ہے۔

وقتی طور پر ڈیوٹی افسر کے کمرے کا ماحول کچھ زیادہ ہی حوصلہ افزا اور باغیانہ ہوگیا تھا۔ ڈیوٹی افسر کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ بھی مجھے پُرتوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے ناانصافی کے خلاف بولنے لگے تھے۔ ڈیوٹی افسر کے لیے یہ صورتِ حال بالکل ناپسندیدہ تھی۔

"دیکھو سرجی! ابھی وہ جو ایڈیٹر صاحب بڑے غصے میں آئی تھیں' ان کو ہم بتا چکے ہیں۔ آپ بھی دیکھ لو' بے شک اندر جاکے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ رئیس خان نام کے کسی ملزم کا یہاں اندراج نہیں ہے" میں نے کہا "مگر اندراج کے بغیر بھی تو بندے ملتے ہیں تھانوں میں بند۔"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ جی۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ آپ بھی روزنامچہ دیکھ لو۔ حوالات میں بندے گن لو۔"

میں نے کہا "لیکن رئیس نے فون کرکے بتایا تھا۔"

"سرجی' ہم جو بکواس فرمارہے ہیں اس پر بھی غور فرماؤ۔ ادھر سے کسی رئیس غریب نے کسی کو بھی فون نہیں کیا۔

تھانے کا فون تو دو دن سے بند ہے۔ بل نہیں دیا تھا' کٹ گیا"

اس نے ریسیور اٹھاکے مجھے چیک کرنے کے لیے تھمادیا "کل کو پبلک آپ سے شکایت کرے گی کہ تھانے کا فون نہیں ملتا اور آپ چھاپ دوگے۔"

میں نے ریسیور کان سے لگاکے دیکھا۔ اس میں ٹون تھی ڈیوٹی افسر نے اس یقین کے ساتھ ریسیور میری طرف بڑھایا تھا کہ میں اس پر اعتبار کرتے ہوئے ریسیور ہی نہیں پکڑوں گا مگر اس کی بلف کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

"فون تو ٹھیک ہے" میں نے طنز سے کہا۔

اس نے حیرت انگیز ڈھٹائی کے ساتھ ریسیور واپس لیا۔ "ٹھیک ہوگیا؟ کدھر ٹھیک ہوگیا' ہم کوئی جھوٹ بولتے ہیں؟"

اس نے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ریسیور ایک سائل کی طرف بڑھادیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوکے بولا "فون تو واقعی ڈیڈ ہے۔"

میں ڈیوٹی افسر کی چال کی سمجھ گیا۔ پہلی بار اس نے واقعی مجھے بلف کرنا چاہا تھا مگر پھر اس نے میز کے نیچے یا پیچھے کوئی بٹن دباکے لائن کاٹ دی اور مجھے جھوٹا ثابت کردیا۔ اسے چیلنج کرکے مجھے کیا ملتا۔ میں نے اپنی غلطی کا اعتراف ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کرلیا جس کا مطلب ڈیوٹی افسر نے بھی یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ چلو تم سچے اور ہم جھوٹے

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "مس شبنم نے سب دیکھ لیا تھا۔ تو پھر ٹھیک ہے جی۔"

وہ بولا "انہوں نے بتایا نہیں ہمیں۔ آخر یہ رئیس کون ہے' کتنا بڑا رئیس ہے' کہاں کا رئیس ہے؟"

"معلوم ہوجائے گا تمہیں بہت جلد۔"

میری تشویش اب بڑھ گئی تھی۔ رئیس کو قانونی حراست سے چھڑایا جاسکتا تھا مگر پولیس کسی کو ایسے ہی اٹھالے اور غائب کردے تو مسئلہ بہت سنگین ہوجاتا ہے۔ کچھ عرصے سے ایک اصطلاح عام طور پر استعمال ہونے لگی ہے جو بے معنی' گمراہ کن اور خطرناک ہے۔ اس میں پولیس' سی آئی اے یا ایف آئی اے کے علاوہ نیم فوجی و فوجی' انٹیلی جینس کے سب لوگوں کو شامل کرلیا گیا ہے جو قانونی یا غیر قانونی اختیار کے بغیر کسی کو بھی گرفتار کرنے کا اختیار رکھتے ہیں یا اس کے دعوے دار ہیں۔ وہ وردی میں ہوتے ہیں یا بغیر وردی کے' عام آدمی مجبور اور بے بس ہے۔ وہ اپنی شناخت یا کوئی وارنٹ دکھائے بغیر کسی بھی گھر کے کسی بھی فرد کو کسی بھی وقت کوئی جرم بتائے بغیر اٹھاکے لے جاسکتے ہیں اور کچھ نہیں بتاتے کہ کہاں لے جارہے ہیں؟

یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہوتی ہے کیونکہ بعض اوقات ان قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نام پر پیشہ ور مجرم اور قاتل بھی کارروائی کرلیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو گھر والی وارث تھانے تھانے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ خود ان کے سوا اس اغوا بالجبر کا کوئی گواہ نہیں ہوتا اور ان کی گواہی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سب تھانے چھان کے وہ عدالت سے رجوع کرنے کی ہمت رکھتے ہوں تو رپورٹ بھی لکھ لی جاتی ہے مگر اس سے غائب ہوجانے والے آدمی کے بارے میں پھر بھی پتا نہیں چلتا۔

ایسے واقعات بھی ریکارڈ پر ہیں جب عدالتِ عالیہ میں حاضر ہوکے ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے بیان داخل کردیا کہ اس نام کا کوئی شخص سرکاری تحویل میں نہیں جبکہ اصل صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ قسمت اچھی ہو تو بندہ کبھی نہ کبھی خود ہی گھر پہنچ جاتا ہے ورنہ میدانِ حشر میں ملتا ہے یا پھر اس کی لاش ملتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں اپنے دشمنوں' سیاسی حریفوں اور حکومت کے مخالفین کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

رئیس کے معاملے میں ابھی سے اتنا مایوس ہونا قبل از وقت تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور تھانے میں مل جائے۔ فون کرتے وقت خود اسے یقین نہیں تھا کہ وہ سنت نگر کا تھانہ ہے۔ امید افزا بات یہ تھی کہ اسے پولیس نے گرفتار کیا تھا اور کسی تھانے میں لے گئے تھے۔ اگر وہ اسے نامعلوم مقام پر منتقل کردیتے تو اس کا سراغ لگانا زیادہ مشکل ہوجاتا۔ اس کو فون کرنے کی زرخرید سہولت فراہم کرنے والا بھی ایک سپاہی تھا۔ اس کا سراغ یقیناً لگایا جاسکتا تھا۔ رئیس خانے کی خانہ تلاشی میں پولیس شریک تھی۔ اب یہ جھوٹ تھا یا غلط مگر رئیس کے سوال پر انہوں نے بتایا تھا کہ ایس ڈی ایم صمد خان باہر گاڑی میں موجود ہے۔ چنانچہ رئیس کا اغوا بھی ایک طرح سے پولیس کے ہاتھوں گرفتاری ہی تھی۔ گرفتاری کے بعد وہ اسے اوپر والوں کے یا پیسے کے دباؤ میں کہیں بھی بند کرسکتے تھے اور غیر معینہ مدت تک یا اپنا مقصد حاصل ہونے تک زیرِ تفتیش بھی رکھ سکتے تھے مگر درجواب آں غزل۔ ہم بھی پیسے کے اور افسرانِ بالا کے دباؤ سے اس کی رہائی کے لیے اپنی کوشش جاری رکھ سکتے تھے۔ اب یہ قانون کی نہیں لاقانونیت کے وسائل کی جنگ تھی۔

یہ میرے قیاس یا شک کی بات نہیں تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رئیس کو رب نواز کے ایما پر اٹھایا گیا ہے اور اس کے لیے ملک نے اپنی دولت کی قوتِ خرید کا اور اپنے اثر و رسوخ کا پورا استعمال کیا ہے۔ ڈی ایس پی کیانی اور ایس ڈی ایم صمد خان کا دائرۂ اختیار اپنے اپنے علاقے تک محدود تھا۔ وہ سارے شہر کے ملک و حاکم نہیں تھے کہ جہاں چاہیں پہنچ جائیں مگر یہ بات تھی قانون کی۔ لاقانونیت کا راج شہر ہی میں نہیں' پورے ملک میں ایک جیسا تھا۔ کوئی بھی ڈی ایس پی کی وردی پہن کے اور پولیس فورس کے ساتھ سندھ' پنجاب' سرحد یا بلوچستان کے کسی گاؤں قصبے اور شہر میں جاکے کسی کو گرفتار کرلے تو کس کی ہمت ہے کہ اس کی راہ میں حائل ہو یا اس سے قانونی اختیار کا سوال کرے۔

اگر ہم اپنی قانونی کوشش سے رئیس کو بازیاب کرانے میں ناکام رہتے تو پھر ہمارے پاس بھی لاقانونیت کے راستے تھے۔ ہم کسی ذریعے سے رب نواز تک رسائی حاصل کرکے سودا کرسکتے تھے ورنہ رئیس کو حراست میں لینے والوں یا رکھنے والوں کا سودا کرسکتے تھے۔ کیانی ایک خود فروش شخص تھا۔ اس کا کیا ایمان اور کیا ضمیر۔ اچھی قیمت ملتی ہو تو وہ رب نواز کے اعتماد کو بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

شام سے رات ہوگئی۔ ایک ایک کرکے میں نے سارے تھانے چھان مارے۔ اس تلاش میں فرید بھی میرے ساتھ رہا۔ یہ شبنم کا مشورہ تھا کہ ایک معتبر گواہ کو ساتھ رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رئیس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے غریب بھی گم ہوجائے۔ کسی تھانے میں مجھے بھی ڈک دیا جائے کہ این ہم بچۂ شتراست۔ نو دس تھانوں میں پولیس حکام کا رویہ ایک جیسا بے نیازی' بے رخی اور بے گانگی کا تھا۔ وہ سب ایسے بن جاتے تھے جیسے یہ نام پہلی بار سنا ہو۔ میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ فرید عباسی وکیل تھا۔ اس کے سامنے وہ قانون کی بات کرتے تھے یا بات کرنے سے ہی انکار کردیتے تھے۔

ہر جگہ ہمارے اور ڈیوٹی افسر کے درمیان ہونے والی گفتگو کچھ یوں ہوتی تھی۔

"رئیس خان۔ کیا جرم کیا ہے اس نے؟"

"جرم کوئی نہیں کیا۔ اس پر دہرے قتل کا جھوٹا الزام لگاکے گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"یہ تو سب کہتے ہیں کہ جھوٹا الزام ہے۔ اور آپ تو وکیل ہو اس کے۔"

"میں اس کا دوست ہوں۔"

"آپ گھر پر تو ایسا ہی کہوگے نا۔ گرفتار کہاں سے کیا گیا بندے کو؟"

"فلاں جگہ سے۔"

"تو پھر آپ ادھر کیا ہمارا ٹائم ضائع کرنے آئے ہو۔ علاقہ تھانے سے معلوم کرو جاکے۔"

"وہ کرلیا۔ بندہ وہاں نہیں ہے۔"

"وہ بندہ یہاں بھی نہیں ہے۔ اب جاؤ کام کرنے دو ہمیں۔"

"کیا ہم روزنامچہ یا حوالات میں دیکھ سکتے ہیں۔"

"انچارج صاحب سے بات کرکے دیکھ لو۔"

"وہ کہاں ملیں گے؟"

"ادھر ہی ملیں گے۔"

"کب ملیں گے؟"

"یہ تو پتا نہیں۔"

اس مرحلے پر گفتگو میں ڈیڈ لاک آجاتا تھا۔ بات ختم ہوجاتی تھی اور ہم بند گلی کے آخری موڑ پر کھڑے یہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ کیا اب واپسی اختیار کی جائے؟ مگر واپس ہونے سے پہلے ہم بند گلی میں راستہ بنانے کے لیے رشوت کا چور دروازہ استعمال کرتے تھے۔ تھانے کے کسی اہلکار کے ذریعے ڈیوٹی افسر تک نذرانہ پہنچا کے ہم روزنامچہ ملاحظہ کرنے کا اختیار حاصل کرلیتے تھے اور ہمیں ملاقات کے بہانے حوالاتیوں کا دیدار بھی کرادیا جاتا تھا۔ اس چکر میں ہم پانچ گھنٹے اور دس ہزار روپے ضائع کرچکے تھے مگر ابھی تک نتیجہ صفر تھا۔

غیر مصدقہ ذرائع سے ہم یہ معلومات بھی حاصل کرچکے تھے کہ آج سارا دن آنے جانے اور لائے جانے والوں میں رئیس کے نام اور حلیے کا کوئی بھی بندہ نہیں تھا۔ تھانے سے کسی کو "نامعلوم" جگہ نہیں بھیجا گیا اور ڈی ایس پی کیانی یا انسپکٹر راؤ انور کے حکم پر کسی کی گرفتاری کے لیے نفری نہیں گئی۔

فرید عباسی وکیل تھا اور اندر کی بات کا پتا کرنے کے خفیہ طریقوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے پولیس کے مصدقہ مخبروں سے بھی پوچھا اور ہر غلط یا صحیح اطلاع کا معاوضہ مارکیٹ ریٹ سے بڑھ کر ہی رہا مگر رئیس کا پتا نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس دوران میں شبنم اور نیلم نے اپنے اپنے تعلقات اور اثر و رسوخ کی ڈوریاں بھی ہلائیں اور افسرانِ بالا سے ہر تھانے میں فون بھی کرڈالے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔

رات ہوئی تو تھکن اور مایوسی سے بے حال ہوکے میں اور فرید عباسی ایک جگہ چائے پینے اور اس بہانے دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ فرید عباسی کو اب یقین آچکا تھا کہ گرفتاری کی ساری کارروائی بوگس تھی اور رئیس کو اغوا کرایا گیا تھا۔ مگر اس اغوا کی واردات میں پولیس کو استعمال کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "مگر یار۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رئیس خانے سے دو لاشیں ملی ہیں، جلی ہوئی۔"

"ہاں، یہ معاملہ عجیب ہے۔"

میں نے کہا "وہ لاشیں کہاں گئیں آخر۔ رئیس تو خیر جہاں گیا۔"

فرید سوچ میں پڑا رہا "وہ کس کی لاشیں ہوسکتی ہیں۔ رئیس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ایک مرد کی لاش تھی دوسری عورت کی۔"

"ہاں۔ اور اگر وہ رئیس خانے میں جل کر مرے تھے تو وہ کون تھے اور رئیس خانے میں کیا کررہے تھے؟ کسی نے انہیں دیکھا کیوں نہیں؟"

فرید چونکا "یہ نکتہ اہم ہے۔ اگر۔۔۔ اگر کا لفظ بے حد اہم بھی ہوسکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ وہاں جل کر نہ مرے ہوں۔ ایک کیس بنانے کے لیے دو سوختہ لاشیں وہاں لاکے ڈال دی گئی ہوں" فرید بولا۔

"VERY INTELLIGENT"

وہ جوش سے بولا "اب یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ اس روز شہر میں آگ کہاں لگی تھی۔ کہیں لوگ جل کر مرے تھے تو کتنے اور وہ کون تھے؟ ان کے نام معلوم ہوجائیں گے۔ جلی ہوئی لاشیں ایک دو روز پرانی ہوسکتی ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ لاشوں کو پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی کے لیے لے جایا گیا ہوگا اور پولیس ضرورت پوری کرنے کے لیے لاشیں اٹھا لائی ہوگی۔"

میں نے کہا "مگر فرید صاحب۔ لواحقین پوسٹ مارٹم کے بعد لاشیں مانگتے ہیں۔ تدفین کے لیے۔"

"تو لاشیں انہیں واپس مل گئی ہوں گی۔"

"ایسی صورت میں رئیس پر دوہرے قتل کا کیس نہیں بن سکتا۔"

"ہاں۔ اگر یہ ثابت ہوجائے۔"

میں نے کہا "یار کیا یہ ناممکن ہے؟"

فرید نے میری صورت غور سے دیکھی۔ "ناممکن کچھ بھی نہیں دنیا میں اور خصوصاً جرائم کی دنیا میں۔ تو کیا سوچ رہا ہے؟"

"فرض کرو آگ لگانے والوں نے ایک گڑھے دو ... کیے ہوں۔ رب نواز نے دو نمک حراموں کو یوں سزائے موت دی ہو یا مار کے ان کی لاشیں وہاں ڈلوا دی ہوں کہ آگ میں جل کے ناقابلِ شناخت ہوجائیں، الزام آجائے خود بہ خود رئیس پر۔"

فرید نے سر ہلایا "یہ ہوسکتا ہے، بالکل ہوسکتا ہے جبکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ لاشوں کو کہیں اور آگ لگا کے وہاں ڈال دیا گیا ہو۔ آج صبح یا گزشتہ رات یہ کارروائی کی گئی ہو۔"

"پھر کیسے پتا چلے گا۔"

فرید نے اپنا سر تھام لیا "پتا نہیں۔ کچھ پتا نہیں کیا ہوا، کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔ ہم ان لاشوں کا پتا چلائیں یا رئیس کا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ ہماری کوششوں کی خبر بھی رب نواز تک پہنچ گئی ہے۔ کہیں سے کچھ نہ معلوم ہونے سے یہی ثابت ہوتا ہے۔"

"یہ انتظام تو رب نواز نے پہلے کیا ہوگا۔ اس نے سمجھادیا ہوگا کہ رئیس خود ہی سیاسی تعلقات رکھتا ہے اور اس کے دوست ہیں اثر رسوخ والے۔ ایک وکیل، ایک اخبار کی ایڈیٹر، ایک ہیروئن۔ ڈاکٹر کمال اور ناصر عظیم۔ زمین آسمان ایک کردیں گے سب مل کے۔ بندہ غائب ہو تو ایسے کہ اس کا سراغ فرشتوں کو بھی نہ ملے۔ اور کیانی نے یقیناً پکا کام کیا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی دیوار ناقابلِ شکست نہیں ہوتی اور ابھی تو بہت تھانے باقی ہیں۔"

فرید نے مایوسی سے سر ہلایا "سب کی ایک ہی اسٹوری ہوگی۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا کیونکہ وہ رئیس کو کسی تھانے میں نہیں لے گئے ہوں گے۔ میں نے جن لوگوں کو اس کام پر لگایا تھا۔ وہ تھانے میں لائے جانے والے ہر مجرم سے رابطہ کرانے کے ماہر ہیں اور اسی کی کمائی کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم بھی کوشش کررہی ہے۔"

"اس کے رپورٹر تھانے ہی جائیں گے نا اور تھانے سے کیا معلوم ہوگا؟ کچھ نہیں۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لمبی تان کے آرام سے سوجانا چاہیے۔"

فرید نے میرے طنز پر غور ہی نہیں کیا "رئیس ہے رب نواز کے پاس۔ اس کی نجی جیل میں۔ وہ رئیس سے پوچھے گا کہ اس داڑھی والے جن کا کیا چکر ہے۔ کیا چراغ علی ولد باغ علی ہی شبنم کا شوفر تھا؟ اور وہی ناصر عظیم ہے؟ رئیس ہے۔"

میں نے کہا "رئیس بھی کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں اسے بچپن سے۔ وہ کتنی بار تھانوں میں بند رہا۔ کتنی مار کھائی۔ پولیس کبھی اس کی زبان نہیں کھلوا سکی۔ وہ مرجائے گا مگر کچھ بتائے گا نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔"

"تجھے یہ نہیں معلوم کہ کیانی کتنا بے رحم اور سفاک آدمی ہے۔ وہ ایک نفسیاتی مریض ہے جسے لوگوں پر جسمانی تشدد کے نت نئے طریقے آزما کے اور انہیں تڑپتا دیکھ کے تسکین ملتی ہے۔"

دکھ مایوسی اور افسردگی نے میرے دل کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا "رب نواز یہ بھی پوچھے گا کہ سونی کہاں ہے۔ کیا وہ نیلم کے گھر میں ہے؟"

"میرا دل کہتا ہے کہ رب نواز نے رابطے کے لیے رئیس کو اٹھوایا ہے۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے ہم سے مگر میں نے انکار کردیا تھا" فرید بولا۔

میں نے کہا "شاید وہ مورتی کا سر واپس مانگے۔"

"ایک تو وہ منحوس مورتی کا سر جو ہمارے کسی کام کا نہیں۔" فرید نے بھنا کے کہا۔

"میرا خیال اب یہ ہے کہ اس کا سودا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ماہرین نے دعویٰ کیا ہے۔ اس کی مالیت ہے تین کروڑ۔ رب نواز یا کوئی آدھی قیمت پر خریدلے مجھ سے۔ ایک کروڑ دے دے۔"

"تو پاگل ہوگیا ہے۔ اب یہ دھندا بھی لکھا جائے گا تیرے نامۂ اعمال میں" فرید بولا۔

"یہ جرمانہ ہے جو رب نواز سے وصول کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس کے خلاف منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتے۔ انسدادِ منشیات کے محکمے کو نہیں بتاسکتے۔ اگر یہ مورتی کا سر ہم ان کے حوالے کردیں تو کیا ہوگا؟ ہم سے پوچھا جائے گا کہ یہ ہمیں کہاں سے ملا۔ فرض کرلو ہم نے کہہ دیا کہ سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔ جو سو فیصد سچ ہے تو مزید تفتیش کا سلسلہ ہوگا کہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں پلاسٹر آف پیرس کے ساتھ ہیروئن شامل ہے۔ اور مزید فرض کرکہ ہم سے کوئی سوال نہ کیا گیا۔ تھینکس اور ویری گڈ کہہ کے رخصت کردیا گیا اور ہم سے کہا گیا کہ اسے جلادیا جائے گا سب کے سامنے۔۔۔ پھر؟"

"پھر کیا" فرید تلخی سے بولا "ہر سال ہزاروں من چرس اور ہیروئن کو سب کے سامنے جلادیا جاتا ہے۔ اخبارات میں

تصویریں بھی لگتی ہیں۔"

"مگر کیا وہ ہیروئن ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہوتی ہے تھوڑی بہت جو موقع پر موجود صحافیوں کو اور معززین کو دکھائی جاتی ہے۔ باقی سب آٹا ہوتا ہے اور الا بلا' کوڑا کچرا۔"

"تو کیا فائدہ ڈاکو سے مال لے کر چور کے حوالے کرنے کا۔ اس ایک کروڑ سے بہت سے نیک کام کیے جاسکتے ہیں۔ سرسید کے بارے میں مشہور ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی بنانے کے لیے سب سے چندہ جمع کرنے نکلے تو طوائفوں کے پاس بھی پہنچ گئے اور انہوں نے دوسروں سے زیادہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس پر علما کو اعتراض ہوا کہ جسم فروشی کی کمائی حرام ہے اور تعلیم و تدریس پر نہیں خرچ کی جاسکتی۔ سرسید نے جواب دیا کہ آخر ہم بیت الخلا بھی تو بنوائیں گے یونیورسٹی میں۔"

"تو ایک کروڑ لگائے گا یتیم خانے کی تعمیر میں؟"

"ہاں۔ جتنا ثواب طوائفوں نے حاصل کیا تھا اتنا ہی رب نواز کے کھاتے میں بھی لکھا جائے گا۔ حالانکہ یہ چندہ نہیں ہے۔"

ہم چائے پی کر نکلے تو تلاش کا بے سمت سفر پھر شروع ہوا۔ فرید نے پولیس کے کچھ نامی گرامی مخبروں سے رابطہ کیا اور مزید تھانوں کی خاک چھانی۔ اس وقت تک شبنم اور نیلم کی کوشش کے باعث اعلیٰ افسران کے فون کئی بار آچکے تھے۔ تجربہ کار تھانہ انچارج جانتے ہیں کہ اوپر والے زیادہ تر فون مروت میں کرتے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی دباؤ کے علاوہ ان پر تعلقات کا دباؤ ہوتا ہے۔ وہ انکار کسی کو نہیں کرسکتے لیکن جہاں دیدہ ایس ایچ او افسر کے لہجے الفاظ اور اندازِ تخاطب سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ اس فون کو کس حد تک اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس پر ایکشن لینا چاہیے یا اسے نظرانداز کردینا چاہیے۔ خود افسرانِ بالا اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے صحیح الفاظ اور جملے استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات "دیکھو بھئی' خیال رکھنا۔ اپنا ہی بندہ ہے" کا مطلب اس کے برعکس یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے چھوڑنا مت "اسے کوئی تکلیف نہ ہو" کا مطلب الٹا یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی خوب چھیتی لگاؤ۔

لیکن بعض اوقات ان کے الفاظ کا مطلب وہی ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ فرق صرف لہجے اور انداز کا ہوتا ہے اور تھانے دار سمجھ جاتا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس کی نوکری بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔ رئیس کی حراست اور بازیابی کے معاملے میں افسرانِ اعلیٰ نے تھانوں پر جو دباؤ ڈالا وہ حقیقی تھا چنانچہ تھانے دار بوکھلائے پھرتے تھے۔ افسران بہت برہم تھے کہ یہ بوگس کارروائی کرنے والوں کا ابھی تک پتا کیوں نہیں چلا اور وارننگ دے چکے تھے کہ رئیس کو اغوا کرنے والوں نے اسے فوراً رہا نہ کیا تو بعد میں ان کے خلاف سخت ترین کارروائی ہوگی۔ ملازمت سے برطرفی تو یقینی۔ حبسِ بے جا اور اغوا وغیرہ کے جرم میں ضابطۂ فوجداری کے تحت کارروائی بھی ممکن ہے۔

رات کو ہم جہاں گئے' ہمارے ساتھ تھانے کے سارے عملے کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہم سے رئیس کے بارے میں پوچھتے رہے اور واردات کی تفصیل معلوم کرتے رہے۔ ہماری خاطر تواضع بھی ہوئی اور ہمیں روزنامچہ اور حوالات میں موجود ہر قیدی کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ بعض جگہ ہم نے ملزمان سے بھی پوچھا مگر کسی نے بھی رئیس کے نام یا حلیے کے کسی قیدی کو دیکھنے کا اعتراف نہیں کیا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ رئیس کو کسی تھانے میں لے جایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ بات اب ثبوت یا تصدیق کی محتاج نہیں رہی تھی۔

رات دس بجے فرید نے فون کرکے رخشی کو مطلع کیا کہ ابھی تک رئیس کا پتا نہیں چلا ہے اس لیے وہ دیر سے گھر آئے گا اور نہ آئے تو رخشی پریشان نہ ہو' وہ آرام سے سوجائے۔

"میں سونی کو کیا بتاؤں؟" میں نے کہا "سب سے زیادہ وہی پریشان ہوگی۔"

"اس سے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں" فرید بولا۔

سونی میری آواز سنتے ہی ناراض ہونے لگی "یہ کیا مصیبت ہے۔ دوپہر سے اب تک کسی کی کوئی خبر نہیں' کوئی اطلاع نہیں۔ پریشانی میں کبھی رخشی سے پوچھتی رہی کبھی شبنم سے۔ وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "انہیں کچھ معلوم ہوگا تو بتائیں گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ فرید تمہارے ساتھ ہے اور رخشی کو کچھ پتا نہیں۔ شبنم اخبار کے دفتر میں اپنا کام کررہی ہے۔ کسی کو میرا خیال نہیں کہ میں سوچ سوچ کے پاگل ہورہی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کدھر جاؤں' کس سے معلوم کروں؟" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

"ہم بھی آرام سے نہیں بیٹھے تھے۔ خوار ہورہے تھے تھانوں میں۔"

"ایک فون کرنے کا خیال بھی نہیں آیا تمہیں" اس نے

میری بات کاٹ دی "رئیس سے ملاقات ہوئی۔"

میں نے بڑے سکون سے کہا "ہاں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو نیلم باجی نے پھر فون کیا تھا کسی ڈی آئی جی کو اور اس نے کہا کہ جیسے ہی رئیس کا پتا چلا' میں خود آپ کو اطلاع دوں گا۔"

میں نے کہا "ہم بھی کچھ دیر پہلے ہی مل کے آئے ہیں۔ نیلم کی بات کس وقت ہوئی تھی۔"

"آٹھ بجے۔ ہاں' آٹھ ہی بجے تھے۔"

"اور تم کہہ رہی ہو کچھ دیر پہلے۔ یہ ڈھائی گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ ہم اسے سارا دن ڈھونڈتے رہے۔ فرید نے پولیس کے مخبر اس کام پر لگادیے تھے۔ شبنم نے اپنے رپورٹر۔ وہ خود بھی فون کرتی رہی اور نیلم نے بھی خاصی کوشش کی۔ ساڑھے نو بجے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔"

"پھر تم ملے اس سے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا" سونی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ پولیس اسے جانتی ہے۔"

"اور اس پر جو دوہرے قتل کا الزام تھا۔" سونی نے پوچھا۔

"وہ ایسے ہی رئیس کو پھانسنے کی ایک گھٹیا کوشش تھی۔ یہ معلوم ہوگیا ہے کہ وہ لاشیں کہیں اور سے لا کے رئیس خانے میں ڈالی گئی تھیں۔ اب یہ پتا چلانا رہ گیا ہے کہ لاشیں کس کی تھیں اور کہاں سے آئی تھیں۔"

"کب تک آجائے گا وہ گھر۔۔۔"

میں نے کہا "یہ کہنا مشکل ہے۔ دراصل جلدی میں اس کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی کاٹ دی گئی۔ اب پہلے تو اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوشش کریں گے۔ ضمانت ہوجائے گی انشاء اللہ۔ بوگس کیس ہے۔ بہت جلد ختم ہوجائے گا۔"

"اسے ۔۔۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے' پولیس نے مارا ہوگا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ مانا کہ رب نواز کی طرف سے دباؤ ہے مگر اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم جو ہیں۔ شبنم نے اور آزاد صاحب نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا۔ نیلم نے پوری کوشش کی اور پھر پولیس کو تو چاہیے پیسہ' یوں سمجھ لو کہ وہ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہے۔"

"تم مجھے تسلی دینے کے لیے کہہ رہے ہو۔ وہ حوالات میں ہوگا۔"

میں نے کہا "حوالات میں؟ اگر ممکن ہوتا تو میں تمہیں لے جاکے اس سے ملوادیتا۔ پولیس اسٹیشن میں ایک بیڈ لگادیا گیا ہے اس کے لیے۔ پیچھے رہائشی کمرا ہے۔ کھانا ہم لے گئے تھے۔"

"پھر میری بات کرادو اس سے۔"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ اتنی سہولتوں کا ذکر کرنا میری غلطی تھی "نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"اس لیے کہ نیلم کے فون کا کچھ پتا نہیں۔ ٹیپ کیا جارہا ہو یا آبزرویشن پر ہو۔ یہ مت بھولو کہ آج ہی صبح پولیس نے وہاں چھاپا مارا تھا تمہاری تلاش میں۔ ابھی شک دور نہیں ہوا ہے پولیس کا" میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بروقت ایک قائل کرنے والا جواب سوجھ گیا۔

مگر سونی نے فوراً اعتراض کردیا "تم بھی تو بات کررہے ہو۔"

میں نے کہا "بہت رسک لیا ہے میں نے۔ اب نہیں کروں گا۔ میں پی سی او سے بات کررہا ہوں اور یہ نیلم کا پرائیویٹ نمبر ہے جو کسی کو معلوم نہیں۔ تھانے والوں کو کیسے بتایا جاسکتا ہے۔ نیلم کہاں ہے؟"

"وہ گئی ہیں کسی کام سے۔" سونی مایوس ہوگئی۔

"اچھا دیکھو۔ اب پریشان ہوکے ہمیں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جو کررہے ہیں' اچھا کررہے ہیں اور فکر کی بالکل کوئی بات نہیں۔ جو ہوگا اپنے وقت پر ہوگا۔ کوشش سے ہوگا مگر ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی امید مت رکھنا۔ نیلم کو بھی سمجھادینا یہ بات۔ ہوسکتا ہے ہم لیٹ نائٹ میں پھر فون کریں۔"

"ابھی کہاں ہو تم؟"

"کھانا کھارہے ہیں۔ تم بھی کھالو اور سوجاؤ آرام سے۔"

میں نے فون بند کرکے سکون کا سانس لیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھے اتنا جھوٹ بولنا پڑے گا۔

ہماری جدوجہد ایک دائرے میں تمام ہوگئی تھی اور اب کسی پیش رفت کا امکان اسی دائرے میں گردش تک محدود تھا مگر امکانات کے دیگر بہت سے افق کھلے ہوئے تھے جہاں امید کی پرواز ہر سمت میں جاری تھی۔ فرید نے اور شبنم کے رپورٹرز نے ہر تھانے میں اپنے جاسوس مامور کردیے تھے۔ یہ اندر کے لوگ تھے جن کے ذمے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ ڈی ایس پی کیانی کے حکم پر آج کسی کی گرفتاری کے لیے کوئی

پولیس پارٹی گئی تھی تو اس میں کون لوگ شامل تھے۔ وہ پارٹی کہاں گئی تھی۔ انہوں نے کسے گرفتار کیا تھا اور جسے گرفتار کیا تھا اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ اگر صرف یہ معلوم ہو جاتا کہ چھاپا مار کارروائی میں کون لوگ شریک تھے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ باقی معلومات ہم خود ان سے براہِ راست لے سکتے تھے۔

ہم نے باہر کے کچھ لوگ بھی لیے تھے جو سب دیکھنے میں معمولی حیثیت رکھنے والے گمنام سے اور بظاہر بے ضرر لوگ تھے جن کا پولیس کے معاملات سے دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا تھا مگر وہ پولیس کے مخبر تھے۔ ان میں فقیر' باربر' عوامی ہوٹلوں کے ویٹر' بس کنڈیکٹر' پان سگریٹ والے۔ آئس کریم وینڈر' سابق سزا یافتہ مجرم اور ہیروئنچی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد سیکڑوں میں نہیں ہزاروں میں تھی اور ظاہر ہے اتنے کم وقت میں سب سے رابطہ مشکل تھا چنانچہ فرید نے اچھی شہرت کے حامل' پرانے اور بھروسے کے قابل پچیس تیس لوگوں سے بات کی تھی اور تھوڑی سی ایڈوانس ادائیگی کے بعد کام ہونے کی صورت میں معقول انعام کا وعدہ کیا تھا۔ فرید کا خیال تھا کہ اب انعام کے لالچ میں ہر ایک آگے بات کرے گا اور مخبروں کے پورے نیٹ ورک تک یہ بات پھیل جائے گی۔ جو پولیس کے لیے مخبری کرتے تھے' وہ پولیس کے سارے معاملات سے بھی باخبر ہوتے تھے اور اسے امید تھی کہ رات تک یا صبح تک ان میں سے کسی کی کوشش ضرور بار آور ہوگی۔

فرید اس مہم میں اکیلا ہی میرے ساتھ شریک تھا۔ اس نے سرکاری گارڈ تو شکریے کے ساتھ واپس کر دیے تھے۔ ان کی موجودگی فرید کے لیے اضافی مسائل پیدا کر رہی تھی۔ حفاظت وہ خاک کرتے' الٹا فرید پر احسان کرتے تھے کہ وہ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ فرید کے اپنے پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز میں سے ایک اس کی گاڑی کا ڈرائیور تھا مگر فرید میرے ساتھ نیلم کی گاڑی میں پھر رہا تھا۔

رات بارہ بجے سے پہلے شبنم کے فارغ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اور فرید کچھ دیر سکون سے بیٹھ کے صورتِ حال پر غور کرنے اور کھانا کھانے کے لیے گلبرگ کے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ صبح سے رات ہو گئی تھی مگر ابھی تک کہیں بھی کسی نے مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شک نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ہمارا زیادہ وقت گاڑی میں گھومتے پھرتے گزرا تھا اور گاڑی کے سیاہ شیشے بند تھے۔ ہماری نقل و

حرکت بھی پولیس اور تھانوں تک محدود رہی تھی۔

اگر ہم اچھے ہوٹلوں یا پوش علاقے کے بازاروں میں پھرتے تو یقیناً بہت لوگ مجھے شاہ عالم سمجھ کے میرا راستہ روکتے۔ فرید کا خیال تھا کہ لوگ شاہ عالم کو بھول گئے ہیں۔

"یہ بڑی مشہور بات ہے کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "لوگ ابھی تک ایوب خان' بھٹو اور ضیاء الحق کو نہیں بھولے۔"

"وہ اور بات ہے۔ آج کتنے لوگ جانتے ہیں سردار نشتر' محمد علی بوگرہ یا شیر بنگال فضل حق کو۔ کالج یونیورسٹی کے لڑکوں سے پوچھ کے دیکھ لو۔"

"مگر یار' وہ سب چوتھائی صدی پہلے کے لوگ تھے۔ مجھے مرحوم ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

"شاہ عالم ایک تیسرے درجے کا لیڈر تھا۔ شاید اس سے بھی نیچے کا۔"

اسی وقت ہماری میز کے قریب سے گزرنے والی ایک لڑکی ٹھٹک کر رکی اور اس نے تقریباً چیخ مارنے کے انداز میں ہکلا کے کہا "سر۔۔۔ آپ؟"

میں نے چونک کے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس لڑکی نے شاہ عالم کو پہچان لیا ہے۔ وہ خاصی خوبصورت اور پُرشباب لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ شلوار قمیص پہنے ایک اسمارٹ سا جوان آدمی بھی مجھے دیکھ کے بڑی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر اس کی شکل پر شدید فدویانہ حماقت برس رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا "ہاں بھئی کیا حال ہے تمہارا؟"

"سر۔۔۔ کیا میں چند منٹ کے لیے بیٹھ سکتی ہوں آپ کے ساتھ۔" لڑکی اچانک سخت جذباتی ہو گئی تھی۔

شاہ عالم رنگین طبیعت رکھنے والا شوقین مزاج آدمی تھا اور اس کے آس پاس نہ جانے کتنی خوبصورت لڑکیاں جمع رہتی تھیں۔ کچھ ملازم' کچھ کارکن تو کچھ پرستار۔ یہ بھی انہی میں سے ایک تھی مگر مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

میں نے کہا "بیٹھو۔ آپ بھی بیٹھیے" میں نے لڑکی کے ساتھی سے کہا۔

"سر۔۔۔ آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟" وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ نام یاد نہیں آ رہا ہے اس وقت۔ بہت دن بعد دیکھا ہے تمہیں کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"تین سال سے بھی کم۔ میں فرزانہ ہوں' فرزانہ علی۔

آپ کی پبلسٹی سیکریٹری تھی مگر اس سے پہلے ٹیلی فون آپریٹر رہی تھی شاہ عالم ہاؤس میں۔"

میں نے خوش ہو کے کہا "ارے تم فرزانہ ہو' بھئی کمال ہے۔۔۔ بہت بدل گئی ہو۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "ایسی تو کوئی بات نہیں سر۔ آپ خود ذرا نہیں بدلے۔"

میں نے کہا "اچھا خیر۔۔۔ یہ تمہارے ساتھی۔۔۔؟"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی "یہ میرے شوہر ہیں' علی عظمت۔ آپ کے لیے الیکشن میں بہت کام کیا تھا۔ آپ ہی نے ہماری شادی کرائی تھی ورنہ ہمارے گھر والے کہاں مانتے تھے۔"

میں نے قہقہہ لگا کے کہا "تم کیا سمجھتی ہو مجھے یاد نہیں' میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارے جیون ساتھی کیا کر رہے ہیں؟"

علی عظمت نے کہا "سر' میں ایک ایمپلائمنٹ ایجنسی چلا رہا ہوں۔ آپ لندن سے کب آئے' آپ کے بارے میں تو دشمنوں نے مشہور کر دیا تھا کہ خدانخواستہ۔۔۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "میں آج آیا ہوں چند دن کے لیے اور ابھی کسی کو بھی معلوم نہیں۔ دراصل میں پھر کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سیاست تو چھوڑ دی تھی میں نے' بالکل سیکرٹ وزٹ ہے۔"

فرزانہ نے بے تابی سے پوچھا "سر۔ عجیب و غریب باتیں سنی تھیں آپ کے بارے میں۔ کسی ماڈل سے شادی کی تھی آپ نے؟"

میں نے خفت سے کہا "ہاں بھئی۔ عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی میری۔ بہت مہنگا پڑا ہے وہ کھیل۔"

علی عظمت بولا "آپ کی پہلی وائف نے تو ڈائی ورس لے لی تھی۔"

"ہاں۔ لیکن خدا کا شکر ہے اب میں ایک پُرسکون اور مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں لندن میں۔ بالآخر مجھے ایک لڑکی مل گئی ہے۔ ایک مثالی بیوی۔" میں نے کہا "اور وہ میم نہیں' ایک پاکستانی خاتون ہے۔"

"کیا وہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"نہیں۔ میں کچھ کاروباری معاملات کو سمیٹنے آیا ہوں خاموشی سے۔"

وہ بولی "لندن میں کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"اِدھر اُدھر کے کچھ کام کیے تھے پہلے۔ اب ہوٹل سروس میں کار ہائر ایجنسی چلا رہا ہوں۔ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس کا حیرانی سے برا حال ہو گیا "میں وہیں ہوں سر۔

اسی اخبار میں جہاں مجھے مس شبنم نے بھیجا تھا۔ آپ نے ہی سفارش کی تھی۔"

میں چکرا گیا۔۔۔ مظہر العجائب۔ یہ لڑکی بھی صحافی ہے۔ اب یہ کس اخبار میں ہے؟ یہ کیسے معلوم ہوگا۔

"شبنم تو بہت بڑی صحافی ہو گئی ہیں۔ ایڈیٹر ہیں اسی اخبار کی جہاں وہ رپورٹر تھیں۔ دراصل اخبار ان کے والد کا تھا۔"

"والد۔۔۔ شبنم کے ماں باپ نہیں تھے۔"

اس نے فوراً اپنی غلط بیانی تسلیم کر لی "جی۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ وہ لے پالک تھی آزاد صاحب کی۔ ورنہ تو لاوارث تھی۔"

میں نے اس کے طنز کے جواب میں کہا "گویا اسی استحقاق کی بنا پر ایڈیٹر بنی ہے وہ۔ قابلیت کی بنیاد پر نہیں۔"

اس نے خفت سے کہا "نہیں سر۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ بڑی خوشی ہوئی آج اچانک آپ کو دیکھ کے۔ آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ابھی کچھ طے نہیں کیا اس بارے میں۔ یہ میرے دوست ہیں۔ کرنل غلام مصطفیٰ ربانی۔ ان کی بات نہیں مانی میں نے۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آمد کی خبر میں سیاسی حلقے بلاوجہ دلچسپی لیں۔ اخبارات میں کوئی ایشو بن جائے۔ تم تو جانتی ہو' میری ساری زندگی ایک ایشو بنی رہی۔ یہاں تک کہ میری موت بھی۔ تم نے اچانک دیکھ لیا مجھے اور پہچان لیا۔"

"کیا میں آپ سے پھر فرصت میں مل سکتی ہوں" اس نے مجھے مسحور کر دینے والی پُرتوقع نظروں سے دیکھا۔

"فرصت بالکل نہیں ہے مجھے۔ کل صبح گیارہ بجے اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ دو دن کراچی میں رہوں گا۔ پھر شاید ایک دن کے لیے لاہور آؤں گا تو تمہیں فون کر دوں گا۔ اپنا کارڈ دے دو مجھے۔"

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کے مجھے دینے کے لیے کارڈ نکالا اور پھر بال پوائنٹ سے اس پر کچھ لکھنے لگی "اپنے گھر کا فون نمبر بھی لکھ دیا ہے میں نے۔ یہ نمبر بدل چکا ہے۔ وہ نہیں جہاں آپ دن رات فون کرتے تھے۔"

یہ بات اس نے بڑی ادائے دلبری کے ساتھ کہی۔ اس کے انداز میں واضح طور پر "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" والی بات تھی۔ وہ یقیناً شاہ عالم کے بہت قریب رہ چکی تھی۔ پھر شاید شاہ عالم کا اس سے دل بھر گیا یا اس کی جگہ شبنم آ گئی۔ شبنم سے اس کے حاسدانہ رویے سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا کہ

شبنم نے اس کو باعزت طور پر رخصت کردیا تھا۔

کسی وجہ کے بغیر میں نے اخلاقاً ایک سوال کرلیا "اور کیسی گزر رہی ہے' بچے کتنے ہیں؟"

اس کی نظر جیسے مجھ پر جم سی گئی "وہی ایک ہے.... ہو بہو تمہاری تصویر۔ یہی آنکھیں' یہی ماتھا' یہی ناک نقشہ...."

اس کی بے باک بلکہ بے شرم الزام لگاتی اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتی نظر۔ اس کا مطعون کرنے والا لہجہ اور اس کا تجدید محبت کی دعوت دینے والا والہانہ پن دیکھ کے مجھے پسینہ آگیا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ ایک اجنبی صورت والی لڑکی تھی جس کا میں نام تک نہیں جانتا تھا مگر چند منٹ میں اس کی کتاب زندگی کا وہ باب پوری طرح کھل گیا تھا جس کا عنوان شاہ عالم تھا۔ وہ ایک حسن پرست اور ہوس پیشہ اور عیاش شخص تھا۔ اس کے پاس دولت' شہرت اور وجاہت کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی۔ ایک شیطانی ذہانت' کوئی حیوانی کشش' کوئی طلسماتی طاقت' سیکس اپیل یا کچھ اور ___ کہ لڑکیاں اس کی طرف یوں کھنچی چلی آتی تھیں جیسے طاقتور مقناطیس کی طرف لوہے کی کیلیں خود بڑھتی ہیں اور اس سے چپک کے رہ جاتی ہیں۔ وہ راسپوتین جیسا کردار تھا جو عورتوں سے سب کچھ لے سکتا تھا۔ انہیں دیوانہ بنا کے عقل و ہوش' مال و دولت اور جسم و آبرو سب چھین لیتا تھا اور بعد میں ان عورتوں کو استعمال شدہ بال پوائنٹ یا میلی چادر کی طرح بدل دیتا تھا' وہ اس سے تعلق کے زمانے پر ندامت نہیں مسرت محسوس کرتی تھیں اور اس سے تعلق کی یادوں کو اپنی کامیابی اور فتوحات کی شیلڈ کی طرح سجا کے رکھتی تھیں۔

ابھی تک میں نے شاہ عالم کے لیے صرف شبنم کی مکمل اور غیر مشروط دیوانگی دیکھی تھی۔ یہ دوسری شبنم تھی جو مجھے بتا رہی تھی کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ اور اس چاہ کا تحفہ ایک بچہ تھا جو تم نے مجھے وداع کرتے وقت دیا تھا۔ افشائے راز سے پہلے تم نے اس بچے کی ولدیت کی ذمے داری ایک کاٹھ کے الو کو سونپ دی تھی جو مجھ سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتا تھا لیکن مجھے پانے کی تمنا اس کے لیے دیوانے کا خواب تھی جس کی تعبیر اسے خیرات میں ملی۔

کاٹھ کا الو فرزانہ کا نام نہاد شوہر نامدار میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا اور اپنی ہونہار بیوی کی دانش وری پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ اسے علم نہیں تھا یا احساس نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم کے بچے کو پال رہا ہے اور وہ شاہ عالم جس نے اسے اپنے پاؤں کی اتری ہوئی جوتی دے کر اس پر بڑا احسان کیا تھا پھر اس کے سامنے موجود ہے اور اس کی عشوہ طراز بیوی پھر اسے مدعو کر رہی ہے کہ دل کا دروازہ کھول کے جب چاہو اس کے جسم کی مہرباں مسافتوں کو پھر طے کرلو جن پر آج بھی تمہاری محبت کے نقش قدم زندہ و تابندہ ہیں۔

میں نے گھبرا کے کارڈ رکھ لیا "میں کچھ کاروباری گفتگو کر رہا تھا۔"

اس کا چہرہ بجھ گیا "اچھا ایک وعدہ کریں۔ آپ پھر آئیں گے ___ تو مجھے فون کریں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وعدہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ میرا لوٹ کے آنا ہی غیر یقینی ہے۔ اب اگر تم برا نہ مانو تو ___"

وہ جلدی سے بولی "میں ایک انٹرویو کرنا چاہتی تھی' ایکس کلوسیو۔"

"وہ تو کرلیا تم نے" میں نے کہا "جو پوچھنا تھا پوچھ لیا۔ اس سے زیادہ بتانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے اچانک اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور کھڑی ہوگئی "سوری سر' میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ سوری کرنل!"

"اگر ہم ایک نجی نوعیت کی کاروباری میٹنگ میں مصروف نہ ہوتے تو آپ جیسی حسین خاتون کی کمپنی کو ویلکم کرتے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔" فرید نے سپاٹ مگر شائستہ لہجے میں کہا۔

اس نے اپنے شوہر کو اشارہ کیا "کم آن۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے' چلو اٹھو۔"

"کیا؟" شوہر کا چہرہ نقش فریادی بن گیا "مگر ہم یہاں ڈنر کے لیے آئے تھے۔"

اس نے شوہر کو ایک سخت گیر جیلر کی نظر سے گھورا "کرلیں گے ڈنر بھی بعد میں۔ ذرا سی دیر میں تم بھوک سے مر نہیں جاؤ گے۔"

شوہر نے نافرمان قیدی کی طرح سہم کے سر ہلایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ ریسٹورنٹ میں جگہ کی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتی تو کسی اور ٹیبل پر جا کے بیٹھ سکتی تھی۔ اس کے اچانک چلے جانے کے دو اسباب ہوسکتے تھے۔ ایک تو اس نے میرے ناآشنائی اور سرد مہری کے رویے پر اپنی بے عزتی محسوس کی تھی اور اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔

دوسرا سب زیادہ اہم اور قرین قیاس تھا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ ابھی تک شاہ عالم کی آمد ایک راز ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے بہت سی باتیں پوچھ لی تھیں اور اب وہ صحافتی اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سارے زمانے کو

بتانا چاہتی تھی کہ شاہ عالم زندہ ہے اور پاکستان میں ہے۔ وہ اس سے مل چکی ہے اور اس کا انٹرویو بھی لے چکی ہے۔ اس کی دانست میں یہ انکشاف ایک تہلکہ خیز دھماکا ثابت ہوسکتا تھا اور وہ اپنے انٹرویو کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کے صبح کے اخبار میں فرنٹ پیج پر لگوانا چاہتی تھی۔ شاید ابھی وقت تھا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد میں نے فرزانہ کا دیا ہوا کارڈ دیکھا تو میرا خیال بدل گیا۔ وہ ایک شام کے اخبار میں کام کر رہی تھی۔ گنتی کے ایک دو اخبارات کو چھوڑ کے عام طور پر شام کے اخبارات اپنی کوئی CREDIBILITY نہیں رکھتے یعنی معتبر نہیں سمجھے جاتے۔ سنجیدہ مزاج رکھنے والے قاری انہیں زرد صحافت کا علمبردار' چیتھڑا اخبار سمجھتے ہیں' جو دنیا بھر میں TABLOIDS کے نام سے مشہور ہیں۔ ایسے اخبارات افواہوں کو تصدیق کیے بغیر خبر کا درجہ عطا کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ معمولی جرائم کی خبروں کو بھی نمک مرچ لگا کے چھاپتے ہیں اور زیب داستان کے لیے ایسی رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ حقیقت بھی فسانہ بن جائے۔ سیاست داں' شوبزنس کے لوگ اسپورٹس مین اور کسی بھی حوالے سے اچھی بری شہرت رکھنے والے اہم افراد کی نجی زندگی کے معاملات کو انکشاف کی سنسنی خیزی عطا کرکے اسکینڈل بنا دیتے ہیں اور دروغ برگردن راوی۔ جہاں ممکن ہو وہاں راز کو افشا نہ کرنے اور خاموش رہنے کی قیمت وصول کرکے بلیک میلنگ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔

میں نے روزنامہ "خبردار" کو بس کے اڈوں' غریب نواز قسم کے عوامی ہوٹلوں' باربر شاپس' ٹریفک سگنلز اور فٹ پاتھوں پر ایک ایک روپے میں بکتے دیکھا تھا۔ شام کے وقت بسوں میں بچے آواز لگا کے بیچ جانے والے اخبار آٹھ آٹھ آنے میں فروخت کرتے نظر آتے تھے۔ فقیروں کے لیے ایسے اخبار باعزت طور پر بھیک مانگنے کا وسیلہ بن گئے تھے "صبح سے بچے بھوکے ہیں۔ اللہ کے نام پر ایک اخبار لے لو" ٹریفک سگنل پر یہ دکھی آواز سنائی دیتی ہے تو بھیک نہ دینے والا بھی ایک روپیہ نکالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سارے دن بھر میں سو اخبار اللہ کے نام پر بیچنے والے کو تیس پینتیس روپے کی اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔

روزنامہ "خبردار" کی لوح پر نام سے پہلے لکھا ہوتا تھا "ملک و قوم اور اسلام کے دشمنو' خبردار!" اس طرح خود اخبار کو حب الوطنی' خدمت خلق اور دینداری کی سند مل جاتی تھی اور ان کے نام میں کھلی دھمکی اور وارننگ کا انداز بھی سامنے آجاتا تھا۔

فرید نے مجھ سے کارڈ لے کر دیکھا "تو نے واقعی اس مصیبت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؟ جو اچانک نازل ہوگئی؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس کی بے تکلفی نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کہ بی بی' تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"وہی جو میں چاہتا تھا۔ صبح دس بجے روزنامہ خبردار کے ذریعے دوستوں دشمنوں سب کو خبردار کردیا جائے گا کہ شاہ عالم لاہور میں ہے۔ فرزانہ علی اس سے ریسٹورنٹ میں ملاقات کی چٹخارے دار تفصیل اور انٹرویو کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کو صفحۂ اول پر شائع کرائے گی۔ اس کی ذیلی سرخی ہوگی۔ مردہ پھر زندہ ہوگیا۔"

"تو اس کو بڑی غیر سنجیدگی سے لے رہا ہے۔ حالانکہ اس سے تیرے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "مسائل پیدا ہوں گے فرزانہ علی کے لیے۔"

"یعنی اس کی خبر اور انٹرویو جھوٹ سمجھے جائیں گے۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہوگا اس کے پاس۔ اچھے صحافی اپنی عزت بچانے کے لیے پکا کام کرتے ہیں۔ وہ انٹرویو کو ٹیپ پر ریکارڈ کرتے ہیں اور تصویریں بنا لیتے ہیں۔ فرید صاحب' میں اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ آپ دیکھتے جایئے' مداری کا کھیل۔"

وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگا "ذرا وضاحت فرمایئے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ابھی وقت نہیں ہے۔ تو بیٹھ یہاں کچھ دیر میں چلتا ہوں۔ باہر انتظار کروں گا تیرا۔"

"یار' یہ کیا ڈراما کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو فرزانہ پھر آئے گی۔ کسی فوٹو گرافر کے ساتھ۔ اس کے پاس کیمرا ہوتا تو وہ خود تصویریں بنا لیتی مگر وہ آئی تھی یہاں ڈنر کے لیے۔ ہر صحافی شبنم نہیں ہوتی کہ ہر جگہ' ہر وقت ہر چیز ساتھ لیے پھرتی رہے۔"

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ میں ریسٹورنٹ کے باہر ایک ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ کسی کے مجھ پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ریسٹورنٹ کے باہر کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ فرزانہ تیزی سے اپنی گاڑی میں آئی۔ اس نے گاڑی کو عین

ریسٹورنٹ کی انٹرنس پر کھڑا کردیا تھا۔ دربان نے مؤدبانہ انداز میں اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کی مگر وہ سیدھی گزر گئی۔ شاید جاتے جاتے اس نے کہہ دیا کہ وہ ایک منٹ میں واپس آرہی ہے۔ گاڑی میں اس کا شوہر نظر نہیں آرہا تھا۔ معلوم نہیں پندرہ بیس منٹ میں وہ اسے کہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا عمر رسیدہ اور سیاہ رو شخص خالص پیشہ ورانہ انداز میں کیمرا لیے چل رہا تھا۔

حسبِ توقع وہ چند منٹ بعد مایوس اور جھنجلائی ہوئی واپس آئی۔ اس نے ریسٹورنٹ کے باہر چاروں طرف نظر ڈالی مگر میں بہت محفوظ مقام پر تھا۔ اس کی نظر مجھے نہیں دیکھ پائی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی گاڑی تک گئی اور کچھ سوچتی رہی۔ پھر فوٹوگرافر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور وہ سیدھی نکل گئی۔

کچھ دیر بعد فرید نمودار ہوا "عجیب پاگل لڑکی ہے۔ مجھ پر ایسے خفا ہو رہی تھی جیسے شاہ عالم کو میں نے فرار کرا دیا۔ کہنے لگی کہ وہ ابھی تو یہاں تھے۔ اتنی جلدی کہاں چلے گئے۔ میں نے کہا کہ خاتون' ایک منٹ میں آدمی دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کس دنیا میں رہتی ہیں آپ۔ پھر وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ شاہ عالم کا قیام کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ اول تو مجھے معلوم نہیں اور معلوم ہوتا تب بھی میں آپ کو نہ بتاتا۔ شاہ عالم نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اس کا دورہ خالص نجی نوعیت کا اور سیکرٹ ہے۔"

میں نے کہا "وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ جائے گی شبنم کے پاس۔"

"جانا تو اب ہمیں بھی وہیں ہے" فرید بولا۔

شبنم آخری کاپی یعنی اخبار کے ان صفحات کو دیکھ رہی تھی جو آخر میں پریس جاتے ہیں۔ عموماً یہ سب سے اوپر والے صفحات ہوتے ہیں جو ملکی اور غیر ملکی خبروں کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ سب ایڈیٹرز اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے' میز پر جھکے جھکے اس نے نظر اٹھا کے ہمیں دیکھا۔ تم میرے آفس میں چل کے بیٹھو۔"

میں اور فرید وہیں کرسیوں پر جم گئے "بیٹھنے کی جگہ یہاں بھی ہے۔"

"دیکھو میں یہاں کام کر رہی ہوں۔ مصروف ہوں اس وقت۔"

"ہم اچھے بچوں کی طرح چپ بیٹھے رہیں گے۔ تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کریں گے" میں نے کہا۔

اس نے چند منٹ میں ایک سرسری نظر سرخیوں پر ڈالی اور کاپی سب ایڈیٹرز کے حوالے کردی۔ "پلیز' ایک بار تم خود پھر دیکھ لو اور بھیج دو۔"

انہوں نے سرہلایا اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائے۔ ایک نے مجھے غور سے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ دوسرے نے جاتے جاتے کہا "صرف اداریہ رہ گیا ہے تمہارا۔"

شبنم نے بہت سے بکھرے ہوئے کاغذات میں سے ایک کاغذ نکال کے بڑھایا "یہ دیکھو۔ پورا ہو گیا ہے ویسے تو مگر آخری پیراگراف کو بدلنا چاہتی تھی میں۔ اگر ٹھیک لگے تمہیں تو ایسے ہی جانے دو۔"

میں نے کہا "یہ تم اخبار کے دفتر میں کام کرنے آئی ہو یا کسی فیشن پریڈ میں حصہ لینے؟"

فرید نے کہا "ہاں۔ کچھ تو فرق ہونا چاہیے ایک ایڈیٹر میں اور ایک ماڈل میں؟"

اس نے خفگی کا اظہار کیا "آپ نے ہی فرمایا تھا کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم تو بڑی اسٹائلش لڑکی تھیں۔"

میں نے کہا "اچھا؟ اگر میں نے فرمایا تھا تو پھر ماشاء اللہ' چشم بددور۔ بہت حسین لگ رہی ہو۔"

"اور ایسا ہی لگنا چاہیے تمہیں ہر روز' ہر جگہ' ہر وقت۔"

وہ ہنسنے لگی "چائے پیو گے۔ پہلے یہ بتاؤ کیا خبر ہے؟ رئیس کا کچھ پتا چلا؟ کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟"

میں نے کہا "ترتیب وار جوابات عرض کرتا ہوں۔ ہم آرہے ہیں دن بھر جھک مار کے اور خوار ہو کے۔ رئیس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک اہم خبر ہے جس کا تعلق میری ذات سے ہے مگر وہ تمہارے اخبار کے لیے نہیں۔"

فرید بولا "چائے ہم ضرور پئیں گے مگر پہلے تم بتاؤ کہ سارے دن میں تمہارے رپورٹرز نے کیا پہاڑ کھودا۔ اور کھودا تو کیا نکلا۔ چوہا؟"

میں نے کہا "لیکن اس سے بھی پہلے ایک بات یہ بتاؤ کہ کیا آج دن میں یا ابھی کسی نے تم سے شاہ عالم کے بارے میں پوچھا؟"

"ابھی تک تو نہیں۔ کیا تمہیں کوئی پرابلم ہوئی۔ کسی نے پہچان لیا؟"

میں نے کہا "دن بھر میں ہم کئی جگہ گئے مگر خوش قسمتی کہو یا اتفاق کہ آج کسی نے مجھے شاہ عالم سمجھ کے نہیں روکا

اور کوئی سوال نہیں کیا مگر جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو فرزانہ مل گئی۔"

اس نے ٹھٹک کے کہا "کون فرزانہ؟"

میں نے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔ اپنی ہم پیشہ فرزانہ علی کو نہیں جانتیں؟"

وہ مسکرانے لگی "وہ... روزنامہ خبردار کی ڈھولکی؟"

"وہ ڈھولکی ہے تو ڈھول کون ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈھول ہے اس کا ایڈیٹر اور مالک۔ علی عظمت ڈھول۔ وہ بے چارہ تک بندی کرتا ہے تو اپنا تخلص ڈھول استعمال کرتا ہے۔"

میں نے کہا "فرزانہ کا شوہر۔ وہ احمق شاعری بھی کرتا ہے۔ مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایجنسی چلا رہا ہوں۔"

"اس کی ایجنسی کی بھی رہنے دو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کیسے کام دلاتا ہے اور وہ کیسا کام ہوتا ہے۔ میں نے خود اس ایجنسی کے معاملات کی تفتیش کی تھی۔ اس کے بارے میں بہت رپورٹیں مل رہی تھیں کہ وہاں یہ ہوتا ہے' وہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے میرے تجسس کو بیدار کردیا ہے۔ اب کھل کے اخباری زبان میں بتادو کہ یہ اور وہ سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"یہ معلوم ہوا تھا کہ روزگار فراہم کرنے کے بہانے وہاں لڑکے اور لڑکیاں ہی نہیں' ہر عمر کے مرد عورت جاتے ہیں۔ اس کا اشتہار آتا ہے اخبار میں کہ میٹرک' انٹر اور فریش گریجویٹ درکار ہیں۔ تنخواہ پانچ سے دس ہزار کے درمیان۔ تجربہ ضروری نہیں۔"

"اور کام؟"

"کام بالکل غیر واضح۔ کلائنٹ سروس کے لیے پرسنل اسٹاف۔ اور فیلڈ اسٹاف برائے پبلک ڈیلنگ' رجسٹریشن فارم کی قیمت ہے سو روپے۔ ہزاروں افراد سے لاکھوں تو ایسے ہی مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو واقعی روزگار فراہم کردیا جاتا ہے۔ بہت سے ادارے فون پر اپنی ضرورت بتادیتے ہیں۔ باقی فرزانہ علی اپنے ذاتی تعلقات کی مدد سے کام لیتی ہے اور دو بڑے اخباروں کے جمعے والے ایڈیشن میں شائع ہونے والے "ضرورت ہے" کے کالم والا صفحہ بدھ یا جمعرات کو حاصل کرلیتی ہے۔ یہ کلاسیفائڈ اشتہاروں والے صفحات' ایک دو دن پہلے چھاپ لیے جاتے ہیں۔ اب اخبار کے اندر کوئی جاننے والا ہو تو وہ آپ کو جمعے سے پہلے ہی وہ

صفحات اسمگل کرکے دے دیتا ہے۔"

"یہ تو عجیب بات بتائی تم نے؟"

"ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ کارڈیلر اور اسٹیٹ ایجنٹ باقاعدہ رشوت دیتے ہیں' نچلے درجے کے ملازموں کو جو پریس میں سرکولیشن کے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے پہلے جاکے کار دیکھ لیتے ہیں اور مکان پلاٹ وغیرہ کا جائزہ لے کر جمعے سے پہلے ہی فائدے کا سودا کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ اب جسے کار یا گھر کا سازوسامان بیچنا ہو یا مکان کرائے پر اٹھانا ہو وہ جمعے کا سارا دن لوگوں کے ساتھ سرکھپانے پر قبل ازوقت سودا کرکے جان چھڑانے کو ترجیح دیتا ہے۔"

"وہ میں سمجھ گیا۔ فرزانہ کیا کرتی ہے؟"

"وہ "ضرورت ہے" کے کالم سے چند جاب منتخب کرتی ہے۔ پھر اپنی ذاتی پی آر کی مدد سے کسی کی سفارش تلاش کرتی ہے۔ ضرورت مند کو فون کرکے بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ کام ہے اور ابھی چلے جاؤ تو مل جائے گا مگر اس کے لیے فوراً پانچ ہزار کا بندوبست کرو۔ وہ بے چارہ بے روزگار پریشانی میں دوڑدھوپ کرکے پانچ ہزار جمع کرتا ہے کہیں سے اور فرزانہ اسے سفارش کے ساتھ وہاں بھیج دیتی ہے جہاں ملازمت ہو۔ عام طور پر سفارش کام کرجاتی ہے کیونکہ کام کا آدمی تلاش کرنے والا بھی درخواستوں کے رش سے جان چھڑاتا ہے۔ فرزانہ کا بھیجا ہوا آدمی ٹھیک ہو تو رکھ لیا جاتا ہے لیکن یہ چند کیس اسے قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اس کی نیک نامی کا حوالہ بن جاتے ہیں۔ اصل دھندا کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں میٹرک' بی اے' ایم اے پاس لڑکیوں تک کے نام' پتے اور فون نمبر ہوتے ہیں۔ ضرورت مند عورتوں میں غریب اور مجبور بھی بہت ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے اور حالات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کون پیسے کے لیے کس حد تک جاسکتی ہے اور پھر اسی کے مطابق انہیں اِدھراُدھر بھیج دیا جاتا ہے۔"

"کلائنٹ سروس اور پبلک ڈیلنگ کے لیے؟"

"ہاں۔ کہیں اندازہ غلط ہوجائے تو قصوروار کام دینے والا۔ فرزانہ کیا جانے وہ کیسا آدمی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ فرزانہ اور اس کے شوہر کے خلاف ثبوت گواہ کوئی نہیں۔ شریف عورت بدنامی سے ڈرتی ہے اور غلط قسم کی عورت افشائے راز سے چنانچہ فرزانہ لاکھوں کمارہی ہے۔"

میں نے کہا "وہ خود بھی۔۔؟"

"ظاہر ہے کوئی شریف عورت یہ کام نہیں کرسکتی۔"

"اور اس کا شوہر؟" فرید بولا۔

"وہ خاک شوہر ہے اس کا' پکا دلال ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔"

"یہ غلط فہمی ہے آپ کی یا جانتے بوجھتے آپ انجان بننے کی کوشش فرمارہے ہیں۔ اس نے تو جکڑ رکھا تھا آپ کو اپنے چنگل میں۔"

میں نے ہنس کے کہا "میری جان تمہی نے چھڑائی تھی۔ مجھے معلوم ہے مگر وہ صحافی کیسے بن گئی؟"

"بدقسمتی صحافت کی اور کیا۔ اسے شوق تھا صحافی بننے کا اور تم نے کہا تو میں نے بھیج دیا ایک جگہ۔ وہ قابلیت کی بنا پر نہیں' ذاتی تعلقات سے صحافی بن گئی۔"

"اب تو وہ باقاعدہ بلیک میلر ہے۔ روزنامہ "خبردار" اس کے شوہر کا ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

شبنم بولی "اس نے بعد میں نکالا۔ جب پیسہ آگیا۔ اب اخبار سب سے بڑا ذریعہ ہے کمائی کا۔ اس کی بدنامی کو چھپانے کا اور نیک نامی کی پبلسٹی کا۔ مگر فرزانہ سے کیا بات ہوئی تمہاری؟"

میں نے اسے بتادیا "یہ سب کل شائع ہوجائے گا۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "یہ کیا حرکت فرمائی آپ نے؟"

میں نے کہا "کل بہت لوگ شاہ عالم کو تلاش کریں گے۔ تمہیں بھی فون آئیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ مچھلی کہاں ملے گی' پانی میں۔ شاہ عالم پاکستان آئے گا تو کس کے پاس جائے گا۔ اپنی بیوی تو رہی نہیں۔"

"میں کیا کہوں ان سے؟"

"وہی جو حقیقت ہے۔ شاہ عالم ایک بار آگیا تھا دوسری دنیا سے۔ باربار کیسے آسکتا ہے۔ وہ سچ مچ مرچکا ہے لندن میں۔ فرزانہ بکواس کرتی ہے اور اس کا اخبار جھوٹ کا پلندا ہے' چیتھڑا۔"

اس نے اپنا سر پکڑلیا "یہ کیا مصیبت کھڑی ہوگئی؟"

میں نے کہا "یہ تو ہونا تھا۔ EXPECTED تھا اور میں نے اپنی لائن آف ایکشن بھی بتادی تھی۔ فرزانہ کے پاس میری آواز کا ٹیپ تک نہیں۔ کوئی تصویر نہیں' وہ کیسے ثابت کرے گی۔"

"فرزانہ کو مارو گولی۔ تم کیا کروگے؟"

میں نے کہا "ویری گڈ سوال۔ میں دو دن روپوش رہوں گا۔ صرف دو دن۔۔ کیا یہ ناممکن ہے؟"

"نہیں" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "کل سب سے زیادہ فون کرنے والے ہوں

گے شاہ عالم کے پرانے ساتھی۔ جو اس کے زیادہ قریب تھے۔ انہیں تم آسانی سے مطمئن کرسکتی ہو انکار سے۔ زیادہ مشکل ہوگا اس کے مخالفین کو قائل کرنا جن کی سیاسی ساکھ تو خیر کچھ نہیں' مگر پھر بھی انہیں شاک ضرور لگے گا۔ ممکن ہے وہ تمہاری نگرانی کرائیں' یہ دیکھنے کے لیے کہ تم شاہ عالم سے ملنے جاتی ہو یا وہ تم سے ملنے آتا ہے۔ تم نارمل طریقے پر اپنا کام کرو۔ چاہو تو فرید کی طرح سیکیورٹی لے لو۔"

"اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "ہوجائے گا۔ اصل خطرہ ہوگا رب نواز کی طرف سے۔ میں ابھی بکنگ لیتا ہوں ہالیڈے ان میں۔ شاہ عالم کے نام سے۔ اس کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ سب ہے میرے پاس۔ انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس EXPIRE ہوگیا ہے مگر VALID ڈاکومینٹ ہے۔ آج رات ہی کسی وقت میں اسے فون کروں گا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے بتاؤں گا کہ میں آج ہی لندن سے پاکستان آیا ہوں لیکن میری آمد خفیہ ہے۔ میں صرف اس سے کاروباری معاملات پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"اور تم اس سے کہاں ملوگے' ہوٹل میں؟"

"نہیں۔ یا اسے کچھ نہیں بتاؤں گا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ خود سارے ہوٹل چیک کرائے گا اور اسے پتا چل جائے گا کہ شاہ عالم کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ملاقات کے لیے میں اسے باہر بلاؤں گا' کسی خفیہ جگہ پر۔"

"یہ خطرناک کام ہوگا۔"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو خطرناک نہ ہو۔ اور ہم سب خطرناک انداز میں ہر لمحہ خطرے کے ساتھ جیتے ہیں خاتون۔ سانس لینے میں یہ خطرہ ہروقت موجود رہتا ہے کہ کسی مہلک بیماری کے جراثیم آپ کے خون میں شامل نہ ہوجائیں۔ سڑک پر چلنے میں خطرہ ہے کہ آپ کو کوئی گاڑی نہ کچل دے۔ کار میں خطرہ ہے کہ الٹ نہ جائے۔ گھر میں خطرہ ہے کہ چھت نہ گرجائے۔ آگ نہ لگ جائے' جہاز میں۔"

"بس بس۔۔۔ تمہاری حفاظت کرلیں گے ہم۔ اس سے مل کے کیا کروگے تم' کیا کہوگے؟" فرید بولا۔

"میں کہوں گا کہ میں پھر اس کے ساتھ بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ پرانا حساب جو بھی ہے SETTLE کیا جاسکتا ہے۔ گلے شکوے دور ہوسکتے ہیں اور پرانے پارٹنرز پھر پہلے کی طرح ہر کام کرسکتے ہیں۔"

"تم سمجھتے ہو' وہ آسانی سے مان جائے گا؟" شبنم سوچ میں پڑگئی۔

"ہاں' اسے شاہ عالم کا SUBSTITUTE ابھی تک نہیں ملا۔ میں اسے بتادوں گا کہ سیاست سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا مگر میرے پرانے کاروباری رشتے قائم ہیں۔ میں لندن سے اسی لیے آیا ہوں۔ مگر ایک کم بخت اخبار کی رپورٹر نے مجھے دیکھ لیا اور میرے گلے پڑگئی۔ جب صبح دس گیارہ بجے روزنامہ "خبردار" اپنے ملک رب نواز صاحب کو خبردار کرے گا کہ شاہ عالم لاہور میں ہے اور وہ فرزانہ کے انٹرویو کی تفصیل پڑھے گا تو اسے یقین آجائے گا کہ یہ حقیقت ہے۔ اس کے بعد وہ فرزانہ سے پوچھے گا۔ پھر تم سے' اور پارٹی کے لوگوں سے۔ سوائے فرزانہ کے سب ایک ہی بات کہیں گے۔ شاہ عالم تو لندن میں مرکھپ گیا۔ اس کا اب میدان حشر کے علاوہ کہیں نظر آنا ناممکن ہے۔ پھر اسے میرے فون پر یقین آجائے گا کہ میں واقعی خفیہ طور پر پاکستان آیا ہوں اور تھوڑا بہت شک ہوگا تو مجھ سے مل کے دور ہوجائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

"اور اس کے بعد پھر شروع ہوگا تمہارا ڈبل رول؟"

"رائٹ۔ دشمن کے قلعے کی فصیل بہت مضبوط ہے۔ اس میں داخل ہونے کا یہی ایک چور دروازہ ہے۔ میں اس کے بزنس میں شریک ہوکے اندر کے سارے راز جان سکتا ہوں اور ناصر عظیم کو بتا سکتا ہوں۔"

"آئیڈیا بہت شاندار ہے۔ مگر۔" فرید بولا۔

"مگر کیا؟" میں نے کہا۔

"عملی طور پر آگ اور پیٹرول سے ایک ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ بہت جان لیوا ہے ڈبل رول نبھانا تیرے لیے ناممکن ہوگا۔"

میں نے کہا "مداری کا کھیل بھی دیکھنے والوں کو ناممکن لگتا ہے۔"

"مگر یہ موت کا کھیل ہے' تو مارا جائے گا کسی دن۔"

میں نے کہا "اس دن کے آنے سے پہلے میں ڈگڈگی بجاکے پھر کھیل ختم کردوں گا۔"

رات کا ایک بج گیا تھا۔ آخری کاپی پریس میں بھیجنے کے بعد ادارتی عملے کے ارکان رخصت ہورہے تھے۔ اچانک فون بجنے لگا۔

"ہیلو!" شبنم نے ریسیور اٹھالیا "ہاں' تم کون۔۔؟ فرزانہ ۔۔ فرزانہ علی' اوہ ڈیئر۔ واٹ اے سرپرائز۔ کہاں ہو تم بھئی' ہاں یہ تو پتا ہے مجھے کہ تم ملک و قوم اور دین کے دشمنوں کو خبردار کررہی ہو۔ مگر ملاقات نہیں ہوئی بہت عرصے سے۔

ابھی‘ کیوں خیریت ہے نا...؟ ہاں ہاں‘ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں فارغ ہوں اور اکیلی بیٹھی تھی۔ گھر جانے کا سوچ رہی تھی‘ آجاؤ۔ اوہ نو‘ رات تو ہمارے لیے بنی ہی نہیں سونے کے لیے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا "فرزانہ نے بتایا کچھ نہیں مگر وہ آرہی ہے مجھ سے تصدیق کے لیے۔ تم کیا کرو گے؟"

"ہم ساتھ والے آفس میں بیٹھ کے تمہاری باتیں سنیں گے۔"

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس بار فون نیلم کا تھا۔ شبنم نے دو چار رسمی جملے بول کے اسے تسلی دی کہ رئیس کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر فون مجھے تھما دیا۔

"میں ابھی ابھی شوٹنگ سے آئی ہوں۔ سونی نے مجھے بتایا۔"

میں نے کہا "اس نے جو تمہیں بتایا وہی صحیح ہے۔ میں نے جھوٹ بولا تھا اس سے۔ تم بھی بولو۔"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی "اچھا۔ تم اب کہاں ہو؟"

"جہاں تم نے فون کیا ہے۔ اور اب اس کے سوا کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ فرید نے جتنے لوگ اس کام پر لگائے ہیں‘ ان سب کو شبنم کا فون نمبر ہی دیا ہے۔ انفارمیشن یہاں آئے گی۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں۔ فرید کو بھی یقین ہے کہ رئیس خود رابطہ کرے گا یا اسے اغوا کر کے لے جانے والے جب اس سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام ہوں گے تو وہ بھی شبنم سے ہی رابطہ کریں گے۔ بارگین کرنے کے لیے۔"

"بارگین! تمہارے پاس کیا ہے‘ وہی مورتی کا سر؟"

"ہاں۔ تین کروڑ مالیت کا۔"

"آخر تم انتظار کس بات کا کر رہے ہو؟ اگر خدانخواستہ..."

میں نے کہا "نہیں۔ رئیس کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم سونی کو مطمئن رکھو اور ہم پر بھروسا رکھو۔ اس کی گرفتاری کا ڈراما بوگس تھا۔ وہرے قتل کا الزام بھی بوگس تھا۔ ہم معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس کارروائی میں کون شریک تھا۔ اگر الزام لگانا مقصود ہوتا تو اب تک رئیس کے خلاف ایف آئی آر درج کی جا چکی ہوتی۔"

"وہ تفتیش بھی تو کرتے ہیں‘ غیر قانونی حراست میں رکھ کے پھر جسمانی ریمانڈ لے لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ ایسی صورت میں تھانوں سے معلوم ہو جاتا۔ ہم یہ پتا چلانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں کہ وہ لاشیں کس کی تھیں؟"

ابوبکر آزاد صاحب مرد قلندر واقعی آزاد تھے۔ وہ پرانے وقتوں کے آدمی تھے جو دل سے اس عقیدے پر قائم تھے کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست ہے چنانچہ ان کے دورِ ادارت میں اخبار کے دفتر میں کسی قسم کی سیکیورٹی کے انتظامات نہیں تھے حالانکہ وقت بہت بدل گیا تھا۔ معاشرے میں عدم تحفظ کے احساس نے ہر طبقے کے لوگوں کو مغلوب کر رکھا تھا۔ اخبارات اور صحافی بھی ہر طرف سے دباؤ کا شکار تھے۔ آئے دن کی دھمکیوں‘ اخبارات کے دفاتر پر حملوں اور سیاست سے مذہب تک ہر جگہ پُرتشدد رجحانات رکھنے والوں کے رویے نے سب کو مجبور کر دیا تھا کہ آنے جانے والوں پر نظر رکھی جائے۔

شبنم نے کچھ انتظامی تبدیلیاں کی تھیں اوپر والا حصہ اب صرف ادارتی عملے کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ عام لوگوں کو اپنی شناخت اور کام بتائے بغیر اوپر جانے کی اجازت نہ رہی تھی۔ سرکولیشن اور مارکیٹنگ کے شعبوں میں جانے کے لیے بھی استقبالیہ سے پرچی بنوانا لازمی ہو گیا تھا۔ استقبالیہ پر ابھی ٹیلی فون ایکسچینج کی تنصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لیے تمام کمروں میں اور ہر ٹیبل تک ٹیلی فون لائن بچھائی جا رہی تھی۔ گیٹ پر اب دن رات مسلح سیکیورٹی گارڈ موجود رہتا تھا۔ اخبار کی آخری کاپی پریس میں چلی جاتی تھی تو شعبۂ ادارت میں کوئی نہیں رہتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب فرزانہ علی نے اوپر آنا چاہا تو سیکیورٹی گارڈز نے اس کی اطلاع شبنم کو پہلے دی۔ اس کے اوپر آنے سے پہلے میں اور فرید ساتھ والے کیبن میں جا بیٹھے۔ درمیان میں چھ سات فٹ کی پارٹیشن تھی جو نگاہ کی راہ میں حائل تھی مگر آواز کو نہیں روک سکتی تھی۔

فرزانہ نے بڑی پُرتکلف تمہید باندھی۔ شبنم کو اخبار کی ادارت اور انتظام سنبھالنے پر مبارک باد دی۔ یہ امید ظاہر کی کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت سے اخبار کو بہت اوپر لے جائے گی اور پھر مطلب کی بات بھی بڑے سرسری انداز میں کی۔ جیسے اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ اور وہ محض تصدیق چاہتی ہے کہ شاہ عالم صاحب پاکستان تشریف لائے ہیں۔

شبنم نے بڑی حیرانی کا اظہار کیا "اچھا! کس نے بتایا تمہیں؟"

وہ بولی "ہیں انہی کی پارٹی کے ایک صاحب!"

"میں جانتی ہوں‘ سب کو تم نام بتاؤ۔ ابھی معلوم

ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ سنا ہے وہ اپنی آمد کو خفیہ رکھ رہے ہیں۔"

شبنم نے کہا "مگر تمہیں معلوم ہو گئی تو بات خفیہ کہاں رہی۔ کل تم سب کو خبردار کر دو گی۔"

فرزانہ نے کہا "آپ کو نہیں معلوم؟"

"ابھی تم نے بتایا تو پتا چلا۔"

فرزانہ نے تکلف اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں علم نہ ہو؟"

"باہر سے آنے جانے والے سب لوگوں کے بارے میں تو امیگریشن والے بھی نہیں جانتے جو ائرپورٹ پر بیٹھے ہیں۔ پھر مجھے کیسے معلوم ہوگا۔ اخبار کے دفتر میں کسی نے اطلاع نہیں دی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہارا اس سے بہت قریبی تعلق تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پاکستان آئے اور تمہیں معلوم نہ ہو۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔"

شبنم نے اس کے جارحانہ رویے اور لہجے کو بالکل اہمیت نہیں دی "تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ تمہاری اطلاع کا ذریعہ معتبر ہے تو چھاپ دو یہ خبر۔"

"کسی نے نہیں بتائی مجھے یہ بات۔ میں نے خود دیکھا ہے شاہ عالم کو۔ میں نے اسے ایک ریسٹورنٹ میں کسی کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں وہاں عظمت کے ساتھ ڈنر کے لیے گئی تھی۔ میری بات بھی ہوئی اس سے۔"

"پھر مجھ سے تصدیق کا کیا مطلب؟ کیا تمہیں اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں یا اپنے حواسِ خمسہ پر اعتبار نہیں۔ تمہیں کیا شک ہے کہ ریسٹورنٹ میں ملاقات خواب اور سراب تھی؟ تم نشے میں تھیں اس وقت۔ یا اس وقت نشے میں ہو؟ تمہاری باتوں کا کوئی سر پیر نہیں۔"

وہ مشتعل ہو گئی "تم میری بے عزتی کر رہی ہو۔"

"بے عزتی تم نے کی ہے میری یہاں آ کے" شبنم نے کہا "تمہاری عزت ہے کہاں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ اس طرح تم حقیقت کو چھپا سکتی ہو۔ شاہ عالم دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کے رہ سکتا ہے۔ میں اس کا اور تمہارا سارا کچا چٹھا چھاپ دوں گی" وہ شاید کھڑی ہو گئی تھی۔

"شاہ عالم کی طرف سے میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن اگر میرے بارے میں ایک بھی غلط لفظ لکھا تم نے۔"

"تو تم کیا کرو گی‘ کیس کر دو گی مجھ پر؟"

"نہیں۔ میں اتنی کمزور نہیں کہ قانون کی مدد پر انحصار کروں۔ تم جانتی ہو نا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ شریفوں اور بدمعاشوں سے ایک جیسے مراسم ہیں میرے۔ میں تمہاری یا تمہارے نام نہاد شوہر کی ہڈیاں تڑوا دوں گی۔ تمہیں اٹھوا بھی سکتی ہوں میں۔ بدمعاشی تم بھی کرتی ہو مگر کبھی میرے مقابلے پر مت آنا۔ بہت نقصان میں رہو گی‘ اب تم جا سکتی ہو۔"

فرزانہ غصے میں شوں شوں کرتی نکل گئی تو ہم پھر شبنم کے کمرے میں چلے گئے "تم نے صحیح بدمعاشوں کے لہجے میں بات کی۔"

وہ ہنسنے لگی "جیسے کو تیسا۔ ہر جگہ شرافت نہیں چلتی۔"

فرید بولا "تم نے اسے چیلنج کر دیا ہے۔ وہ تمہیں جھوٹا ثابت کر کے رہے گی۔"

"ہاں۔ شاید وہ میرا پیچھا بھی کرے۔"

میں نے روڈ سائڈ کی کھڑکی کھول کے جھانکا "یو آر رائٹ۔ اس کی گاڑی دیکھی تھی میں نے۔ وہ موجود ہے اس وقت بھی۔"

"کیا وہ اتنی بے وقوف ہے کہ سامنے ہی گاڑی میں بیٹھ کے انتظار کر رہی ہے؟" فرید بولا۔

"سامنے کس نے کہا۔ گیٹ سے کافی پیچھے مجھے ایک گاڑی نظر آرہی ہے‘ جس کا میک ماڈل اور رنگ سب وہی ہے۔"

"اوکے۔ پھر میں چلتی ہوں۔ میں اسے تعاقب کا پورا موقع دوں گی گھر تک۔"

"تم اب گھر جاؤ گی؟"

"اور کیا تمہارے ساتھ ہالیڈے اِن جاؤں؟" وہ بولی "آزاد صاحب کی طبیعت بھی خراب چل رہی ہے۔ گھر میں کوئی ان کو ATTEND کرنے والا نہیں۔ سوچتی ہوں کوئی نرس ہائر کرلوں۔ چوبیس گھنٹے کا معاملہ ہے۔ دن رات کو الگ ہوگی لیکن اول تو آزاد صاحب ایسی خدمت گزاری قبول نہیں کریں گے۔"

"نوکری اور خدمت گزاری میں فرق ضرور ہوتا ہے۔" میں نے کہا "شبنم۔ کیوں نہ سونی کو وہاں شفٹ کروایا جائے۔"

"اگر وہ مانے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔"

میں نے کہا "اس کا باپ بھی مانے گا۔ کل وہ آجائے گی۔ تم اسے سب سمجھا دینا۔"

فرید نے جماہی لی "میں بھی جاتا ہوں اپنے گھر۔ میری بیوی بہت پریشان ہوگی۔"

میں نے کہا "سارا دن گزر گیا۔ رئیس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس ایک اطلاع کے بعد جو خود اس نے دی تھی۔ کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اچھی بری کوئی خبر نہیں۔"

"یہ بڑی حیرانی کی بات ہے۔ ہم سب نے اپنے سارے وسائل استعمال کرلیے۔ اسے یقیناً کسی خفیہ مقام پر رکھا گیا ہے جہاں سے اس کے لیے ہم سے رابطہ کرنا ممکن نہیں۔"

فرید بولا "مگر مجھے یقین ہے کہ چوبیس گھنٹے میں اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی اطلاع ملے گی۔"

"یہ تو میرا دل بھی کہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ وہ لوگ رئیس کو مار نہیں سکتے۔ مارنا ہوتا تو وہیں مار جاتے جہاں سے گرفتار کرکے لے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے رب نواز سے مل کے کچھ پتا چلے۔"

ہم نے اوپر سے شبنم کی گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے فرزانہ کی گاڑی حرکت میں آئی۔ اب ہمارا یہاں ٹھہرنا بے سود تھا۔ شبنم نے کال ٹرانسفر کی سہولت لے رکھی تھی۔ اگر بعد میں کوئی فون آتا تو گھنٹی پانچ بار بجتی۔ پھر کال آزاد صاحب کے فون پر چلی جاتی۔

ہالیڈے اِن کی طرف جاتے ہوئے فرید نے کہا "تو نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کھیل میں کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے کہا "جب تک رب نواز کو یقین نہیں آجاتا کہ شاہ عالم الگ شخصیت ہے جس کا ناصر عظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تھا نہ ہے۔ ایک لندن میں ہے دوسرا لاہور میں۔ اس وقت تک میں یہ ڈبل گیم کھیلوں گا۔ رہی خطرے کی بات تو میں سمجھتا ہوں کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ رب نواز کے لیے شاہ عالم کی مصالحت کی پیشکش کو ٹھکرانا مشکل ہوگا۔ اسے کسی ساتھی اور سہارے کی ضرورت ہے اور شاہ عالم اس کا بھروسے کے قابل دوست اور بزنس پارٹنر تھا۔ وہ سمجھے گا کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا تو اسے ویلکم کرنا چاہیے۔ میں اس سے لندن میں شاہ عالم اور لاہور میں ناصر عظیم بن کے ملتا رہوں گا۔"

"ایک ہی حلیے اور گیٹ اَپ میں؟"

"نہیں۔ تھوڑا بہت فرق تو رکھنا پڑے گا۔ جو بعد میں ختم ہوجائے گا۔ اب یہ ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم نظر آئے شلوار قمیص، پشاوری چپل اور سندھی ٹوپی میں۔ شاہ عالم نے یہ لباس کبھی نہیں پہنا۔ وہ ہمیشہ سوٹ پہنتا تھا۔ شاہ عالم کے پاس حلیہ بدلنے کا جواز ہے۔ وہ کنٹیکٹ لینز استعمال کرسکتا ہے اور وگ لگا سکتا ہے۔ اور یہ رب نواز کو بھی بتا سکتا ہے۔ ناصر عظیم سوٹ بوٹ میں نظر آئے گا۔ اس کی شناخت پکی ہے اور اس کے گواہ بھی پکے ہیں۔ رب نواز اسے کاروباری حلقوں میں دیکھے گا۔ نیلم کے ساتھ اور کمال اسپتال میں نظر آئے گا، اپنے آفس میں۔"

میں فرید کے ساتھ سمن آباد والے گھر گیا۔ وہاں سے میں نے ایک سوٹ کیس پیک کیا۔ میں خالی ہاتھ ہالیڈے اِن جاکے کہتا کہ ابھی لندن سے آیا ہوں تو مشکوک نظر آتا۔ رات کے دو بجے فرید مجھے ہوٹل کے گیٹ پر چھوڑ کے رخصت ہوا۔ میں نے کہا کہ رات بھر میں کوئی نئی بات معلوم ہو تو وہ مجھے فون کرکے بتادے۔

ہوٹل کے لاؤنج میں رات کے وقت بھی روشنیوں کی چکاچوند میں دن کا سماں تھا۔ استقبالیہ پر ایک پاکستانی اور ایک غیر ملکی پہلے سے موجود تھے۔ غیر ملکی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ انگلش نہیں جانتا تھا چنانچہ پاکستانی اس کی مدد کررہا تھا۔ اور مضحکہ خیز انگریزی بول رہا تھا۔

استقبالیہ پر موجود اسٹاف نوجوان تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں بڑی خوش اخلاقی اور مستعدی کے ساتھ معزز مہمانوں کو اٹینڈ کررہے تھے مگر شاید ان میں سے کوئی بھی سیاست میں اس حد تک دلچسپی نہیں رکھتا تھا کہ مجھے صورت دیکھتے ہی چونک پڑتا۔

مجھ سے بات کرنے والا اسمارٹ نوجوان خاصا تعلیم یافتہ اور مہذب تھا۔ وہ خالص کانونٹ کے لہجے میں بہت اچھی

انگریزی بولتا تھا مگر وہ بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا نام سن کے بھی اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یہ میرے لیے بڑی اچھی بات تھی۔ پھر اچانک اندر سے اسسٹنٹ منیجر ٹائپ کا نسبتاً سنجیدہ عمر کا ایک خوش پوش شخص برآمد ہوا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ سے اسٹاف کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ لیا اور پھر آہستہ آہستہ راؤنڈ لگانے کے انداز میں آگے بڑھا۔

اس نے مجھے پہچان لیا۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ چونکا اور پھر بڑی خوش دلی سے مسکراتا ہوا میرے سامنے آکے رک گیا۔ "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ شاہ عالم ہیں سر!"

میں نے ایک بے بسی کی آہ بھری "میرا خیال تھا کہ اب تک لوگ مجھے بھول چکے ہیں۔ لیکن ائرپورٹ پر ہی میری یہ غلط فہمی رفع ہوگئی تھی۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "میں سیاست میں عملی دلچسپی تو نہیں رکھتا مگر اخبار کی حد تک اپنے آپ کو باخبر رکھتا ہوں۔ آپ غالباً لندن میں تھے۔"

"کیا آپ بھی سمجھتے ہیں کہ میں فوت ہوگیا تھا؟"

وہ حیرانی سے بولا "یعنی دوبارہ۔؟ نہیں سر!"

"خیر۔ یہاں میرے بعد ایسی افواہ بھی پھیلی تھی کہ ایکسی ڈنٹ میں میری موت واقع ہوگئی۔"

میری گفتگو سے اس کا حوصلہ بڑھا "آپ کی زندگی اور موت بڑا متنازعہ مسئلہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے سر!"

میں نے کہا "پرانی بات پر تو حیرانی ہوئی۔ مگر اب میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے اسی لیے جلاوطنی اختیار کرلی ہے کہ میں سکون سے جینا اور مرنا چاہتا تھا جو یہاں ممکن نہیں تھا۔ اب میری ایک درخواست ہے آپ سے۔"

"پلیز۔ آپ حکم کیجیے، میرا نام محمد اصغر ہے۔"

میں نے اپنا پاسپورٹ سامنے رکھ دیا "میں آج ہی لندن سے کراچی پہنچا تھا اور نائٹ کوچ سے آیا ہوں۔ میں نے اسی لیے بہتر سمجھا کہ دن میں مجھے پہچاننے والے زیادہ ملتے۔ آدھی رات کے وقت تعداد دو تک محدود رہی۔ خدا کا شکر ہے۔ یو سی، میرا یہ وزٹ بہت نجی نوعیت کا ہے جس کی خبر کسی کو بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات چھپے اور مجھے اخبار والے اور پرانے ساتھی گھیرلیں۔ میں اپنا کام کرکے خاموشی سے واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔"

"یس سر۔ اور ہم اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ سوائے ایک مسٹر فرید عباسی کے مجھے کسی کا فون نہ دیا جائے اور اس کا مطلب ہے کسی کا بھی نہیں خواہ کوئی کچھ بھی کہے۔ خود کو گورنر بتائے یا میرا سالا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں سر۔ میں ہدایات جاری کرتا ہوں ابھی۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا "دو دن بعد میری واپسی کی فلائٹ ہے۔ آپ یہ ایڈوانس رکھ لیں۔"

میرا سامان کمرے میں پہنچ گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ہوٹل کے ریکارڈ پر شاہ عالم کا نام آگیا تھا۔ محمد اصغر کی صورت میں مجھے ایک معتبر گواہ مل گیا تھا۔ اگرچہ اس نے پاسپورٹ پر کوئی ویزا اسٹیمپ یا تاریخ نہیں دیکھی تھی مگر شاہ عالم کے نام اور تصویر کو ضرور دیکھا تھا۔ میں نے مانگے بغیر شاہ عالم کا شناختی کارڈ بھی سامنے رکھ دیا تھا لیکن اس نے کاؤنٹر کلرک سے چھین لے کر خود سارے اندراجات کیے اور شناخت کی دستاویزات مجھے واپس کردیں۔ ظاہر ہے اسے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے عملے کو ضروری ہدایات فوراً جاری کردی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ دل کی بات لبوں پر آجائے تو نشر ہوجاتی ہے اور راز نہیں رہتی۔ میرا نام پتا تو تحریری صورت میں ہوٹل کے رجسٹر میں آگیا تھا۔ پھر یہ راز کیسے رہ سکتا تھا۔

کمرا انتہائی آرام دہ تھا میں اتنا تھکا ہوا اور DEPRESSED تھا کہ جوتے اتارے بغیر ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ خواہش ہونے کے باوجود مجھے باتھ روم جاکے گرم پانی سے غسل کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں نے بھی گزشتہ رات جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ یہ دوسری رات ذہنی پریشانی سے زیادہ جان لیوا اسباب لے کر آئی تھی۔ میں رئیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا۔ تصور نے اس کے بڑے ڈراؤنے روپ پیش کیے ہاتھ پولیس کا ہو یا رب نواز کا۔ تشدد میں ایک جیسا سفاک ہوگا۔ تفتیش کے سارے عذاب میں نے بھی جھیلے تھے اور رئیس بھی بھگت چکا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ تفتیش میں جسمانی تشدد کے نت نئے طریقے متعارف کرائے جارہے تھے۔ آلاتِ تشدد امپورٹ کیے جاتے تھے۔ تشدد ایک سائنس بن گیا تھا اور جو کچھ انقلاب روس اور چین کی روایات سے منسوب تھا۔ جو مظالم نازی جرمن افواج قاہرہ اور ہٹلر کے پیروکاروں نے ڈھائے یا سپرپاور امریکا کے جمہوریت پسند حکمرانوں نے آزادی مانگنے والے کوریائی اور ویتنامی عوام پر کیے ان کے سامنے ہلاکو اور چنگیز خان یا نادر شاہ کی خوں آشامی کے قصے کیا

ہیں۔

میری آنکھ کئی بار کھلی۔ دو بار میں خواب کے ڈراؤنے منظر دیکھ کے اٹھ بیٹھا۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک بے چہرہ شخص مجھے مردہ خانے میں دھکیل رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جاؤ اپنے دوست سے مل لو۔ وہ اندر لیٹا ہے' تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ دوسری بار میں نے ایک پرانے درخت کی شاخ سے ہڈیوں کے ایک پنجر کو جھولتا دیکھا۔ درخت کے نیچے سرسبز لان پر خوش رنگ پھولوں کے درمیان رب نواز بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ میں اس کے سامنے الف ننگا کھڑا تھا اور میرے جسم سے خون ٹپک رہا تھا۔ رب نواز نے مجھ سے پوچھا "بھئی کیا خیال ہے؟ اب تمہیں بھی اوپر نہ پہنچادیں۔ تمہارا دوست کب سے جھول رہا ہے۔"

صبح میری طبیعت بہت کسلمند تھی۔ نو بجے کے قریب میں نے غسل کیا اور روم سروس سے اپنے لیے کافی طلب کی۔ رات بھر کوئی فون نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب بہت واضح تھا۔ رئیس کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ شبنم کو کچھ پتا چلتا تو وہ فرید کو بتاتی اور وہ مجھے جگا کے مطلع کرتا۔ اس کے باوجود میں نے پہلے فرید کو اور پھر شبنم کو فون کیا۔

اس نے کہا "میرے رپورٹرز دو خبریں لائے ہیں۔ ایک یہ کہ دو دن پہلے اس شہر میں کوئی عورت جل کے مری تھی۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی کے لیے گئی تھی مگر لواحقین کو دو دن بعد ملی۔ حالانکہ اس کیس میں کوئی تحقیق طلب بات نہیں تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ لاش ادھر ادھر ہوگئی تھی یا کردی گئی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ جس عورت کی لاش رئیس خانے میں لاکے ڈالی گئی تھی' یہ وہی عورت تھی؟"

"یہ ہوسکتا ہے۔ معلوم کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "دوسری لاش مرد کی تھی؟"

"ہاں۔ اس کے بارے میں ایک بات پتا چلی ہے کہ لاش کو پیٹرول ڈال کے جلایا گیا تھا اور پھر وہاں لاکے ڈالا گیا تھا۔ یعنی وہ بے چارہ جو بھی تھا' رئیس خانے میں جل کے نہیں مرا تھا۔ ان کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں تھا اور پولیس نے رئیس کی گرفتاری کے لیے دو لاشوں کا بندوبست کیا تھا۔ ان لاشوں کا بعد میں کیا ہوا' یہ پتا چل جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ پھر رئیس پر دہرے قتل کے الزام کا کیس نہیں بنے گا۔ بن بھی نہیں سکتا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پولیس پابند ہے کہ اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرکے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرے۔"

"دوسری خبر بھی سنادو۔"

"ہاں۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ رئیس کو گرفتار کرنے والا پولیس کا سب انسپکٹر پیارے خاں تھا۔ یہ اطلاع اس کے ساتھ جانے والے ایک کانسٹیبل کے ذریعے ملی ہے اور اگر تصدیق پر درست ثابت ہوئی تو کانسٹیبل کو دو ہزار دیے جائیں گے۔"

"کانسٹیبل کون ہے؟"

"یہ نہیں معلوم۔ ایک پان سگریٹ والے کے ذریعے خبر ملی ہے' ادائیگی بھی اسی کی معرفت ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ بات تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ جب میں نے فون کرکے پوچھا۔"

وہ بولی "مجھے بھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا تھا۔ آج کے لیے میں نے فرید عباسی سے بھی کہہ دیا ہے کہ الرٹ ہوجائے۔ رئیس کو ریمانڈ کے لیے کس مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے۔ ہم ایس آئی پیارے خاں کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ مجھے اب کچھ اطمینان ہوگیا ہے کہ ہماری محنت بالکل ہی رائگاں نہیں گئی۔"

میں نے کہا "میں رات بھر اتنا اپ سیٹ رہا کہ نیند نہیں آئی اور آئی تو برے برے خواب آتے رہے۔"

"ایسا تو سب کا حال تھا۔ میں نے تو آزاد صاحب کی ایک سکون آور گولی چرا کے کھائی" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "تم نے روزنامہ خبردار ملاحظہ کیا؟"

"اب کروں گی۔ میں جا رہی ہوں فرید کی طرف۔ خبردار کی رپورٹر رات مجھے گھر تک چھوڑنے آئی تھی۔ یقیناً بہت مایوس ہوکے گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ آج پھر اسے جاسوسی کا موقع دوں۔ کم سے کم اسے اتنا یقین آجائے کہ شاہ عالم میرے ساتھ نہیں ہے۔"

شاہ عالم کو ہال میں ناشتے کے دوران میں دو شناسا ملے۔ ان میں سے ایک اس کا پرجوش حامی رہا تھا۔ دوسرا بعد میں ہائی جیک ہونے والی پارٹی کے صاحب صدر قریشی کا سیکریٹری بن گیا تھا مگر اس پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ سیاست کے اس گندے حمام میں سب ایک سے ننگے اور بے شرم ہیں تو اس نے بددل ہوکے کنارہ کشی اختیار کی۔

وہ ایک باتونی شخص تھا "ہم نئے نئے کالج سے نکلے تھے جی۔ جوانی کا جوش تھا۔ سیاسی تقریروں سے متاثر ہوجاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم سے بڑھ کر محب وطن اور ملک و قوم کا سچا خادم کوئی نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے کرتوت ظاہر ہوئے تو ہم نے قریشی صاحب کا بہت ساتھ دیا اور انہوں نے

بھی ہمیں خوب استعمال کیا۔ بعد میں ان کو قریب سے دیکھا اور ان کے اعمال دیکھے تو لگا کہ سب سے بڑے احمق ہم ہیں۔ ہم عوام۔۔۔ اور یہ لیڈر سب ایک جیسے چالاک ہیں۔ باتوں سے بے وقوف بناتے ہیں۔"

یہ سب کا المیہ تھا۔ سامنے کی سیدھی سچائی کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عیار اور مکار شخص لیڈر شپ کی لاٹھی سے سب عقل کے اندھوں کو ہانک کر کنوئیں میں دھکیلنے لے جارہا ہے۔ جب تک خود کنوئیں میں نہیں گرتے تھے راستے کی اونچ نیچ کا پتا نہیں چلتا تھا۔ شاید زندگی خود اپنے ہی تجربات سے گزرنے کا نام ہے۔

میں نے موقع پاکے پوچھا "اب تم کیا کرتے ہو؟"

"اپنا بزنس۔ اس ہوٹل میں ٹھیکا ہے اپنا۔ شادی بھی کرلی ہے۔ گھر اور کاروبار سے فرصت بھی نہیں ملتی کہ کہیں ضائع کریں۔"

میں نے کہا "وری گڈ۔ قریشی صاحب یا شمس صاحب سے ملاقات ہوتی ہے کبھی؟ کیا حال ہے پارٹی کا؟"

وہ کچھ حیران ہوا "آپ کو نہیں معلوم۔ ان دونوں نے اپنے اپنے دھڑے بنالیے تھے۔ تیسرا گروپ آپ کے ہم خیال کارکنوں کا تھا۔ ان میں جھگڑے ہوتے رہے۔ مقدمے بازی بھی ہوئی۔ اب پارٹی کا بس نام رہ گیا ہے۔"

یہ سب مجھے بھی معلوم تھا مگر میں اس پر یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں واقعی لندن میں رہ کے یہاں کے حالات سے بے خبر تھا۔ اس سے بھی میں نے یہی کہا کہ مجھ سے ملاقات کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ مجھ سے ملاقات کرنے والا دوسرا شخص صبح کی شفٹ کا انچارج تھا۔ جب میں اسے کمرے کی چابی دینے گیا تو وہ بولا "مجھے اصغر صاحب نے آپ کے بارے میں سب بتادیا ہے۔"

میں نے کہا "بدقسمتی سے ایک صحافی خاتون نے مجھے ائرپورٹ پر دیکھ لیا تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ میرا کھوج لگانے کے لیے ہوٹلوں سے رابطہ کریں۔ اگر صحافی میرے پیچھے پڑگئے تو میرے لیے بڑی پرابلم ہوجائے گی۔"

وہ بولا "آپ فکر ہی نہ کریں۔"

میں نے کہا "کیا آپ میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے والوں کو ٹال سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تصدیق کے لیے ہر جگہ فون کریں گے۔"

"انہیں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ ہم اپنے مہمانوں کو ہر زحمت سے بچانا ضروری سمجھتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کا قیام پرسکون اور خوشگوار رہے۔" اس نے خالص پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا۔

ہوٹل سے میں کار بھی لے سکتا تھا مگر میں نے دن بھر کے لیے ایک ٹیکسی لے لی۔ شام کے کچھ اخبار دس بجے بھی دستیاب ہوجاتے تھے مگر مجھے روزنامہ خبردار کسی ہاکر کے پاس نظر نہیں آیا۔ میں نے مارکیٹ کا رخ کیا اور ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں۔ ان میں ایک سیاہ چشمہ اور ایک ریڈی میڈ پگڑی شامل تھے جسے باندھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اسے بڑی نفاست سے باندھ کے پن کردیا گیا تھا۔ پشاوری چپل اور واسکٹ کے ساتھ میں نے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ایک تسبیح بھی لے لی۔ اب میں ایک خوشحال پٹھان تاجر نظر آتا تھا۔ حاجی شاہ عالم خان۔

ٹیکسی کو انتظار کرتا چھوڑ کے میں نے ایک ریسٹورنٹ سے رب نواز کے گھر فون کیا "مجھے ملک سے بات کرنا ہے۔"

ریسیور اس کی بیوی نے اٹھایا "جی؟ وہ تو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "بھابی مجھے اس سے ملنا ہے۔ میں لندن سے آیا ہوں اور دو دن بعد چلا جاؤں گا۔"

وہ اس طرز تخاطب پر ضرور چونکی ہوگی "آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "اس کا ایک پرانا دوست اور بزنس پارٹنر۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کس قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ لیکن آپ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہیں۔"

"آخر ملک صاحب کے اس دوست اور بزنس پارٹنر کا کوئی نام تو ہوگا۔ ان سب کو جانتی ہوں میں جن پر بھروسا کیا جاسکتا ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "میرا نام سن کے آپ یقین نہیں کریں گی۔ میرا نام ہے شاہ عالم۔ چونکیے نہیں۔ میں کچھ دیر بعد پھر فون کروں گا۔ اگر وہ گھر میں ہی ہے تو اسے بتادیں ورنہ میرا پیغام دے دیں۔"

خلاف توقع وہ بگڑ گئی "دیکھو۔ تم جو بھی ہو' ایسی باتوں سے مجھے بے وقوف نہیں بناسکتے۔ میں بیوی ہوں ملک رب نواز کی۔ اور اس سے پہلے بھی میں پروفیسر تھی۔"

میں نے کہا "بھابی' میں جانتا ہوں۔"

"یہ کیا بھابی بھابی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہارے عزائم کو۔ آخر کیا کہلوانا چاہتے ہو تم مجھ سے فون پر۔ دھوکے باز۔"

میں نے کہا "مسز ملک۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی گفتگو فون پر کرنا غیر محفوظ ہوتا ہے لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ

آپ کا یہ فون ٹیپ نہیں ہو سکتا۔ یہ فون ملک رب نواز کے نام پر نہیں ہے۔ اس کا اصل کنکشن بھی کہیں اور ہے۔ آپ کارڈلیس فون پر بات کر رہی ہیں۔ رب نواز کے حالات کا مجھے علم ہے۔ وہ درخواستِ ضمانت نامنظور ہو جانے کے بعد سے روپوش ہے۔"

"غلط معلومات ہیں تمہاری۔"

میں نے ہنس کے کہا "مجھے تو اس سے بھی کہیں زیادہ معلوم ہے۔ مگر میں فون پر نہیں بتاؤں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح ان تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ شاہ عالم ان سے ملنا چاہتا ہے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔ شاہ عالم مر چکا ہے۔ وہ کیا دوسری دنیا سے ملنے آیا ہے" وہ آگ بگولا ہو گئی۔

"ایسا عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ملک رب نواز جانتا ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے۔ اگر آپ نے اسے میرا پیغام نہ دیا تو وہ بہت ناراض ہو گا۔ یہ اس کا مفاد ہے کہ وہ مجھ سے ملے۔ میں آدھے گھنٹے بعد پھر فون کروں گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

ریسٹورنٹ کا پے فون ایک الگ جگہ پر لگا ہوا تھا چنانچہ میری گفتگو کسی نے نہیں سنی تھی۔ میں نے اطمینان سے چائے پی اور پھر ملک رب نواز کا فون نمبر ملایا۔ اس بار خود رب نواز نے ریسیور اٹھایا۔

اس نے آواز بدل کے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ملک رب نواز صاحب گھر میں تشریف رکھتے ہیں۔"

اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی "کیا کام ہے آپ کو ان سے؟"

"یہ میں صرف انہی کو بتا سکتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ملکانی کو فون پر بتایا تھا۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

ملک اب اپنی اصل آواز میں بات کر رہا تھا "اچھا پھر؟"

میں نے کہا "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میری بات کا خاطرخواہ اثر ہوا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد رب نواز نے کہا "مجھ سے...؟ میں تو رب نواز نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم رب نواز ہو۔ آج بھی تمہاری آواز اسی طرح پہچان سکتا ہوں جیسے تم نے میری آواز پہچانی۔"

خاموشی کے ایک اور وقفے کے بعد وہ بولا "میں کیسے مان لوں کہ تم شاہ عالم ہو؟ وہ لندن میں ٹریفک کے ایک حادثے میں مر گیا تھا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"اچھا فرض کرو۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم شاہ عالم ہو۔ مگر مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "پرانی رنجش ختم کرنے کے لیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم پرانی باتیں بھول کے پھر ایک ہو جائیں۔ سیاست سے تو میں تائب ہو چکا ہوں مگر ہمارا کاروباری اشتراک ہو سکتا ہے۔ میں تمہارے سب گلے شکوے دور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہارا جو نقصان میری وجہ سے ہوا' میں اس کی پوری ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ ہم پھر مل کر بزنس کریں تو اس کی تلافی ہو جائے گی۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری نیت پر اعتبار کروں؟"

"موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے۔ اور ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔"

وہ بولا "پھر تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "اگر ایسی بات ہوتی تو کیا میں تم سے خود رابطہ کرتا؟ لندن سے لاہور آتا؟ یہاں اب میرے لیے کیا تھا۔ نہ میری سیاست ہے نہ گھربار اور کاروبار ہے۔ میں تم سے اور صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آج کل تم بھی مشکلات کا شکار ہو۔ میں بھی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ یہ سب باتیں فون پر تو نہیں ہو سکتیں۔"

اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر تم میرے گھر آجاؤ۔"

مجھے اس تجویز کی امید نہ تھی "تمہارے گھر۔"

"ہاں' میرے گھر۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ رب نواز نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی "روپوش" تھا۔ ایک چھاپا مار کے پولیس نے قانون کے تقاضے پورے کر دیے تھے اور یہ رپورٹ دے دی تھی کہ رب نواز خانہ تلاشی میں برآمد نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے ہائی کورٹ کی ڈویژن بینچ کے سامنے اپیل دائر کی جا چکی تھی لیکن ضمانت کی درخواست منظور ہونے تک وہ کہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

خود میں اس سے کسی ایسی جگہ ملنا چاہتا تھا جہاں اس کے اور میرے سوا کوئی نہ ہو۔ ایسی خلوت کی ملاقات اس کے اور میرے حالات کی ضرورت تھی مگر میرے ذہن میں ابھی تک کوئی جگہ واضح نہیں تھی۔ میں اسے کسی پارک میں بلا سکتا تھا۔ کسی گمنام ہوٹل میں مل سکتا تھا یا پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کے بات کر سکتے تھے۔ میں اپنی حفاظت کے خیال سے بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ عالم کی وجہ سے رب نواز کو کروڑوں کا نقصان ہوا تھا۔ اس کے کاروبار کا شیرازہ بکھر گیا

تھا اور انڈر ورلڈ کی مارکیٹ میں اس کے سارے رابطے ختم ہو گئے تھے۔ جب شاہ عالم کو ایمانداری' ضمیر پرستی اور قانون کی پاسداری کا دورہ پڑا تھا تو رب نواز نے اس کا خمیازہ بھگتا تھا۔ اس کے بہت سے شریکِ کار مفادات کی اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے تھے جس میں جیت کسی کی نہیں ہوئی تھی۔

اچانک رب نواز کو اس شخص نے فون کر دیا تھا جس کو وہ اپنا دشمن نمبرون سمجھتا تھا۔ اس دشمن نے مصالحت اور مفاہمت کی غیر مشروط پیشکش کی تھی اور بدلے ہوئے حالات میں رب نواز بھی مجبور ہو گیا تھا کہ وہ ٹھنڈے دماغ سے کام لے۔ محبت اور جنگ کی طرح کہا جا سکتا ہے کہ بزنس اور سیاست میں سب جائز ہے۔ بزنس مالی مفادات کی جنگ ہے اور پیسے کی محبت ہے۔ سیاست اقتدار کی جنگ ہے اور کرسی کی محبت ہے۔ اس میں حالات کے مطابق کل کے دشمن آج کے دوست بن جاتے ہیں اور آج کے دوست کسی اخلاقی ضابطے کے تحت دوستی نبھانے کے پابند نہیں ہوتے۔

رب نواز نے مجھے شاہ عالم مان لیا تھا۔ میری آواز اور میرا لہجہ پہچانتا تھا۔ اسے کبھی اعتبار نہیں تھا کہ شاہ عالم لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے دوران میں سڑک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار نہ کرتا تو فون پر خود بات نہ کرتا۔ اس کی بیوی مجھے ٹال دیتی کہ ملک صاحب سے رابطہ نہیں ہوا۔

لیکن رب نواز چالاک آدمی تھا۔ اس نے میرا کارڈ میرے ہی خلاف استعمال کیا۔ اگرچہ میرا اسے دھوکے یا فریب سے پھنسانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے جال کے موجود ہونے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے ایک دشمن پر اعتبار کا رسک لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بال کو اس نے میرے کورٹ میں پھینک دیا۔ نیت میں کھوٹ نہیں ہے تو مسٹر شاہ عالم' میرے گھر آجاؤ۔ اعتبار کرتے ہو مجھ پر تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

میں سخت کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میری عقل احتیاط کا تقاضا کرتی تھی مگر بے اعتباری میں بات بننے سے پہلے ہی بگڑ سکتی تھی۔ میں نے فرید اور شبنم سے مشورہ کرنے کا سوچا مگر ایک تو ان کا ملنا مشکل تھا۔ دوسرے وہ رب نواز کی تجویز کے حق میں کبھی رائے نہ دیتے۔

بالآخر میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چائے کا بل ادا کیا اور ٹیکسی میں ملک ہاؤس جا پہنچا۔ میں نے ٹیکسی کو دروازے سے کچھ فاصلے پر روکا اور گیٹ پر جا کے بیل بجائی۔

اندر سے اسی چوکیدار نے جھانکا جو میرے لیے نیا نہیں تھا مگر وہ مجھے نہیں پہچانا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا "میں حاجی شاہ عالم خان ہوں' ملک رب نواز..."

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بولا "ملک صاحب ملک سے باہر ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرتا' میں نے کہا "میری ابھی بات ہوئی تھی ان سے۔ انہوں نے ہی مجھے یہاں بلایا ہے۔"

اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ آہستہ آہستہ اس کی نامہرباں آنکھوں میں آشنائی کے آثار عیاں ہوئے تھے "آپ... شاہ صاحب!"

میں نے کہا "ہاں۔ بہت دیر میں پہچانا تم نے؟"

"ہم... ابھی بتاتا ہے' ملکانی کو" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

کھڑکی بند ہو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں گیٹ کے آس پاس لگے ہوئے کسی نہ کسی ویڈیو کیمرے کی زد میں ہوں۔ جب چوکیدار انٹرکام پر ملک صاحب کو میرے بارے میں مطلع کرے گا تو ملک اپنے ریموٹ کنٹرول سے کیمرے کو مجھ پر لائے گا اور اپنے مانیٹر کے اسکرین پر میرا بغور جائزہ لینے کے بعد میرے داخلے کے احکامات جاری کرے گا۔ اس کام میں آدھا منٹ بھی لگ سکتا تھا اور اگر ملک اس وقت کسی باتھ روم میں ہوتا تو دس منٹ تک گیٹ بند رہتا۔

گیٹ آدھے منٹ میں کھل گیا۔ چوکیدار نے مجھے اندر جانے کے لیے سیکیورٹی کلیرنس دی۔ میرے پیچھے دروازہ پھر بند ہو گیا۔ دروازے میں اسکینر لگے ہوئے تھے چنانچہ کسی کی جیب میں دھات کی کوئی بھی چیز ہو میٹل ڈی ٹیکٹر چلانے لگتا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی چنانچہ میں اپنے ساتھ ایسی کوئی بھی چیز نہیں لایا تھا۔ اسکینر یہ بھی بتا دیتا تھا کہ آنے والا مسلح ہے تو اس کے پاس کس قسم کا ہتھیار ہے۔ ایکس رے جیسی ایک تصویر میں مانیٹر اسکرین سب دکھا دیتا تھا۔

ملک ہاؤس میں سب کچھ وہی تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی مجھے کہیں کوئی چیز بدلی ہوئی نظر نہ آئی۔ سیدھے جانے والے راستے پر رب نواز کی پجارو دھلی دھلائی اور چمکتی دمکتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے آگے ملکانی کی وہ سرخ آلٹو بھی موجود تھی جو ایک بار شبنم کو بظاہر بڑی نیک نیتی کے ساتھ پیش کی گئی تھی مگر اس کے درپردہ مقاصد کچھ اور تھے۔

ملک ہاؤس کو میں نے اندر سے بھی خوب دیکھا تھا۔ یہاں میں دوبار شبنم کے ساتھ اس کا شوفر بن کے آیا تھا اور تیسری بار سونی کے ساتھ میں نے یہاں سے صبح دم ملک رب نواز کے ولی عہد دلنواز کو اغوا کیا تھا۔ داڑھی والا جن آج حاجی عالم خاں کے روپ میں ملک صاحب کا معزز مہمان بن کے آیا تھا۔ یا شاید اس کے برعکس اس کی دشمنی کا مزہ چکھنے۔ ایک وقت تھا جب شاہ عالم کے اثر رسوخ اور بدمعاشی کی طاقت کے سامنے ملک رب نواز کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ پھر وقت نے کروٹ لی۔ شاہ عالم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا اور جان بچا کے جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے کے سوا اس کے پاس چارہ نہ رہا۔ اس نے گمنامی اور روپوشی کی زندگی اختیار کرنے کا ڈراما کیا۔ رب نواز نے جن ستونوں پر اپنے کروڑوں کے ناجائز کاروبار کے پل کی تعمیر کی تھی، وہ جنون ہی نہ رہے تو اس کے لیے دولت مندی کے جزیروں تک پہنچنے کے سارے راستے بند ہوگئے۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم آگیا ہے۔ اس نے تو یہی سمجھا کہ شاہ عالم کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اس کی فطرت کے انقلاب کی قیمت رب نواز کو کاروبار کی تباہی کی صورت میں چکانی پڑی تھی۔

آج اس کے لیے وقت نے ایک اور ڈرامائی کروٹ لی تھی۔ اچانک شاہ عالم پھر آگیا تھا اور اس نے شکست خوردہ جنرل کی طرح خود کو ملک رب نواز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اب یہ طے کرنا رب نواز کا کام تھا کہ شاہ عالم کے جرائم کی سزا اسے ہزار بار موت کی صورت میں دے یا اس کے ساتھ وہی سلوک کرے جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

میرا اندازہ کہتا تھا کہ رب نواز اپنے زخمی اور لہولہان پیروں پر کلہاڑی نہیں مارے گا۔ ڈوبتے جہاز کے پیندے میں ایک اور سوراخ نہیں کرے گا۔ وہ دوستی کے لیے بڑھنے والے دشمن کے ہاتھ کو کاٹ کر نہیں پھینکے گا۔ وہ اس ہاتھ کو سہارے کے لیے تھام لے گا۔

میں پورچ سے گزر کے برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ لالی نمودار ہوئی۔ چھ فٹ قد کی دیوزاد عورت جس کے بارے میں مجھے حیران کن حد تک افسانوی بات معلوم ہوتی تھی کہ وہ پروفیسر ہاشم رضا کے جینیاتی تجربات کی تخلیق ہے اور اس کے وجود کی تشکیل حیوانی طاقت اور انسانی ذہانت کے ملنے سے ہوئی تھی۔ ایسی ہی ایک مخلوق کا مردانہ روپ جبو کی صورت میں خود پروفیسر ہاشم رضا کے پاس تھا۔ اس کی وحشیانہ قوت کے ہاتھوں رئیس ایک پر اذیت موت سے دوچار ہوتے ہوتے بال بال بچا تھا۔ ہاشم رضا کے بیان کے مطابق ان دونوں کی مائیں عام عورتیں تھیں مگر باپ افریقہ کے بن مانس یا گوریلے تھے۔ جبو اور لالی ٹیسٹ ٹیوب بے بی تھے اور ان کی مائیں ان بچوں کو جنم دیتے ہوئے مرگئی تھیں۔ ان کی زندگی پروفیسر نے خرید لی تھی۔

لالی ہر لحاظ سے ایک عورت تھی۔ اس کے بدن کے سارے نشیب و فراز، چہرے کے خدوخال، اس کے بال اور اطوار سب زنانہ تھے۔ صرف اس کی جسامت انتہائی غیر معمولی تھی اور جبو کی طرح وہ بھی بے پناہ جسمانی قوت رکھتی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اس غیر معمولی جوڑے کو جسمانی مناسبت کے باوجود رشتہ ازدواج میں نہیں باندھا جاسکتا تھا کیونکہ وہ عام انسانوں کی طرح REPRODUCTION کی قدرتی صلاحیت سے محروم تھے۔ ایسی GENETIC انجینئرنگ کی ایک بہت پرانی اور عام مثال خچر ہے جو گدھے اور گھوڑے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنومند جفاکش اور مضبوط ہوتا ہے۔

لالی کا چہرہ ہمیشہ جذبات سے عاری، بالکل سپاٹ اور کسی حد تک بے رحم نظر آتا تھا۔ وہ آگے آگے چلتے ہوئے مجھے اس ڈرائنگ روم میں لے گئی جس کی آرائش اور ترتیب میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لالی کا قد مجھ سے بھی چار انچ زیادہ ہی ہے۔ یعنی۔۔۔ چھ فٹ دو انچ۔ اس کی ٹانگیں، بازو اور کولہے اسی مناسبت سے بھاری تھے۔ اس کا وزن بھی مجھ سے زیادہ ہوگا۔ ناقابلِ یقین ہونے کے باوجود مجھے پروفیسر ہاشم رضا کے اس تجربے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

رب نواز فوراً ہی آگیا۔ وہ کچھ دیر مجھے سرد سفاک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی خشونت میں کمی آئی اور اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"تو اب تم حاجی شاہ عالم خان ہو۔" وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔

میں نے کہا "مگر تمہارے لیے وہی شاہ عالم۔۔!"

"اب یہاں کس امید میں آئے ہو؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے کہا "یہ میں نے بتا دیا تھا۔"

"مگر میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ تم ایک ذلیل اور کمینے، احسان فراموش آدمی ہو۔ میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا تم نے" وہ چلّانے لگا "تم نے پاگل ہوجانے والے کتے کی طرح اپنے مالک کو کاٹ لیا تھا۔ تم نے برباد کردیا ہے مجھے۔ اب میں کیسے

اعتبار کرسکتا ہوں تم پر۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

اس نے چیخ کے کہا "غلطی؟ صرف غلطی۔ تمہارا ایسا جرم تھا کہ مجھے گولی مار دینی چاہیے تمہیں۔ تمہارے ٹکڑے کرکے کتوں کو ڈال دینے چاہئیں۔"

میں نے اپنا لہجہ پرسکون رکھا "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمہیں رب نواز۔ یہ سوچا تھا میں نے کہ تمہارے نقصان کی تلافی کردوں۔"

اندر سے ملکانی فوراً پانی کا ایک گلاس لے آئی "ملک صاحب۔ آپ کا بلڈ پریشر، یہ گولی کھائیں۔"

رب نواز نے ایک گہری سانس لی۔ گولی زبان پر رکھی اور پانی پی لیا۔ ملکانی نے مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور وہیں بیٹھ گئی۔ ملک نے اسے اندر جانے کا حکم دیا "تم جاؤ اندر۔ میں اب ٹھیک ہوں۔"

جاتے جاتے اس نے کہا "آپ نے غصے میں نہیں آنا ہے ملک صاحب!"

ملک نے سہلایا "تم نے اچھا کیا کہ پہلے فون کیا پھر آئے۔ اگر میں اچانک تمہیں سامنے دیکھتا تو مشتعل ہوکے گولی ضرور مار دیتا۔ مجھے سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے خود کو کنٹرول کرلیا۔ میں تم پر ہرگز یقین نہ کرتا لیکن اتفاق سے دلنواز نے ایک اخبار دیکھ لیا۔ اس میں خبر تھی تمہارے بارے میں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میری بدقسمتی کہ مجھے فرزانہ علی نے دیکھ لیا۔ کسی زمانے میں وہ میری پبلسٹی سیکریٹری ہوا کرتی تھی۔ خود کو صحافی سمجھتی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسے شبنم نے آؤٹ کردیا اب تو وہ خود اخبار نکال رہی ہے اور بہت نام کمایا ہے اس نے بلیک میلنگ میں۔ پیسے کے ساتھ، تمہاری شبنم بھی اب اخبار کی ایڈیٹر ہے۔ اسے بھی مالک ہی سمجھو۔"

میں نے چہرے پر حماقت طاری کرکے کہا "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں یہاں کے حالات سے بالکل لاتعلق تھا۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اس نے تمہیں نہیں بتایا۔"

میں نے کہا "میں اس سے ملتا تو بتاتی۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ۔۔۔ اسے بھی علم نہیں۔۔۔؟"

میں نے کہا "تو۔ میں صرف تم سے ملنے آیا تھا۔ اور اپنی آمد کو سیکرٹ رکھنا چاہتا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے پہچان لیا مجھے۔"

"یہ کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کون ہے جس کے ساتھ تم ڈنر کر رہے تھے۔"

"کوئی نہیں۔ ایک بزنس مین ہے جو لندن سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اس اُلّو کی پٹھی کو انکار کرنا مشکل تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ وہ تو جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ انٹرویو لینا چاہتی تھی میرا۔ اس وقت میں نے ٹال دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں پی سی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"وہ معلوم کرلے گی۔"

میں ہنسا "میں نے وہاں اصل نام کب لکھوایا ہے۔ پرسوں ویسے ہی میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"اتنی جلدی؟"

میں نے کہا "ابھی مجھے یقین نہیں تھا کہ تم سے رابطہ کامیاب ہوگا۔ میں نے بہت سوچا اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ پاکستان آکے تم سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے وہاں بہت کاروبار کیے۔"

"ایمانداری کے دھندے۔" وہ طنز سے بولا۔

"یہی سمجھ لو۔ لیکن آہستہ آہستہ میں مالی تباہی کے غار میں گرتا گیا۔ رہی سہی کسر اس شادی نے پوری کردی۔"

وہ چونکا "تمہارا مطلب ہے۔ وہ خبر سچ تھی۔ تم نے کسی ماڈل سے شادی کرلی تھی؟"

"ہاں۔ میری عقل ماری گئی تھی۔ اس کے علاوہ۔۔۔ میں مجبور ہوگیا تھا" میں نے کہا۔

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتا ہوں کہ اس ماڈل نے خبر کی اشاعت پر اخبار کو نوٹس دے دیا تھا" رب نواز نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ دراصل اس وقت تک میرا اس کے ساتھ عدالت کے باہر ہی تصفیہ ہوگیا تھا۔ مجھے اپنے آدھے اثاثے اس کے حوالے کرنے پڑے۔ اس کے بعد ہماری علیحدگی ہوگئی۔ اخبار میں اس کا نام غلط چھپ گیا تھا۔ جس کی تصویر شائع ہوئی تھی، وہ ایک معمولی ماڈل تھی۔ یہ اس کی چوتھی شادی تھی۔ ہر شادی اس کے لیے منافع بخش رہی۔ وہ کئی ملین پاؤنڈ کی مالک ہے اب۔ خبر میں غلطی سے ایک ایکٹریس کا نام شائع ہوگیا تھا۔ دونوں کا نام ایک تھا۔ سرنیم میں فرق تھا۔"

میں نے اسے قائل کرنے کے لیے ایک تلخ ازدواجی زندگی کی کہانی سنائی جس میں بہت سے حوالے مستند لگتے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے اس ماڈل کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن گئی تھی۔ مجھے کہاں کہاں رسوا ہونا پڑا۔ کیسے میں شرابی بن گیا۔ کیسے میں بلیک میل ہوا اور اس نے مجھے

کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اس کے سفید فام دوستوں نے کیسے مجھے ذلیل کیا اور ان کی پٹائی کرنے کے جرم میں کتنا عرصہ میں نے جیل کاٹی۔ لندن کا شہر میرا دیکھا بھالا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہاں اکثر میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ مجھے وہاں کے بازاروں' ہوٹلوں اور کاروباری اداروں کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔

رب نواز سنتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر بہت مضطرب ہے۔ حالات نے اسے بلڈ پریشر کا مریض بنادیا تھا یا یہ اس کا خاندانی مرض تھا جو پریشانیوں کے باعث بڑھ گیا تھا۔ رہی سہی کسر زندگی کی بے اعتدالی اور عیاشی نے پوری کردی تھی۔ عام حالات میں وہ کبھی مجھے معاف نہ کرتا لیکن وہ ہر طرف سے مالی مسائل میں گھر گیا تھا۔ کچھ غلط فیصلے خود اس نے کیے تھے' کچھ تقدیر نے۔ سب سے زیادہ نقصان اسے میری وجہ سے ہوا تھا۔ اس کے کاروباری رابطے ٹوٹ گئے تھے اور قابل اعتماد ساتھی مارے گئے تھے۔ اسے آئندہ انتخابات میں پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی کی امید نہیں تھی کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق اقتدار کے کھیل میں اب باری ان کے حریفوں کی تھی۔ سیاسی حالات سے وہ زیادہ دلبرداشتہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ میوزیکل چیئر کا کھیل ہے اور کچھ عرصہ حزب اختلاف میں رہنے کے بعد ان کی پارٹی کو پھر حکومت مل جائے گی لیکن وہ اب آزاد امیدوار بن کے اپنے حلقے کی آبائی سیٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آزاد امیدواروں کا گروپ ہر حکومت سے بارگین کرنے کی پوزیشن میں رہتا تھا۔ وہ اقلیت کو اکثریت میں اور اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرسکتے تھے۔ رب نواز کا اصل مسئلہ وہ کاروبار تھا جس کا میں نے بھٹا بٹھادیا تھا۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے میں بہت محتاط تھا۔ اگرچہ میں نے رب نواز کے کاروباری راستوں سے اپنی راہیں جدا کرتے ہوئے ذاتی دشمنی کی ایک طویل جنگ لڑی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ کسی اور کی زندگی جینا مشکل ہی نہیں' ناممکن ہے۔ رخشی کے ساتھ "ازدواجی" زندگی کا کھیل بڑی آزمائش کا تھا لیکن خدا نے مجھے کردار کی استقامت دی اور رفتہ رفتہ رخشی نے بھی سمجھ لیا کہ میں جسمانی شکل وشباہت میں شاہ عالم کا نقش ثانی ضرور ہوں مگر میری شخصیت اس کے بالکل برعکس ہے اور یوں ہمارے درمیان ایک باعزت سمجھوتا ہوگیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی اور اس مشکل صورتِ حال سے نکلنے میں کامیاب رہے۔

شاہ عالم کی سیاسی گدی سنبھالنے کے مقصد میں مجھے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سازشی عناصر پہلے ہی شاہ عالم کو راستے سے ہٹا کے پارٹی پر قبضہ کرنے کی اسکیم کو فائنل کرچکے تھے اور پیشہ ور قاتلوں کی مدد سے انہوں نے شاہ عالم کو ٹھکانے بھی لگادیا تھا مگر ان کی بدقسمتی کہ ناصر عظیم کے روپ میں شاہ عالم پھر زندہ ہوکے ان کے سامنے آگیا۔ یہ کام مجھ سے دوسرے گروپ نے لیا تھا مگر سازشی عناصر زیادہ طاقتور تھے اور انہیں ایک کرپٹ بیوروکریسی کے ساتھ راشی پولیس افسران کی حمایت بھی حاصل تھی۔ نتیجہ یہ کہ شاہ عالم بننے والے ناصر عظیم کو جان بچاکے فرار ہونا پڑا اور اس کا دھوبی کے کتے سے بدتر حال ہوا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ وہ پھر ناصر عظیم بنا تو اپنا بہت کچھ گنوا چکا تھا۔

تیسرا پہلو کاروباری تھا جس میں شاہ عالم کے ساتھ رب نواز جیسے لوگ تھے۔ ازدواجی اور سیاسی معاملات سے کہیں زیادہ دشوار کام ناصر عظیم کے لیے ایک ایسے کاروبار میں شراکت تھی جس کی اخلاقی اور قانونی حیثیت کو وہ مرکے بھی تسلیم نہ کرتا۔ اس کا نتیجہ اختلاف اور علیحدگی کی صورت میں نکلا۔ مگر رب نواز کے لیے بھی یہ آسان نہ تھا کہ وہ کسی اندر کے راز جاننے والے کو آزاد چھوڑدے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اسے ایمانداری' اصول پرستی اور شرافت کی زندگی کا مرض لاحق ہوگیا ہو۔

رب نواز نے زبردستی اور بدمعاشی کی۔ ناصر عظیم نے بھرپور مزاحمت کی اور اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوا۔ انجام کار دونوں کی راہیں جدا ہوگئیں لیکن ان کے درمیان عداوت کی بنیاد پڑگئی۔ شاہ عالم بن کے ناصر عظیم نے رب نواز کے سارے کاروباری اسرار ورموز کو سمجھ لیا تھا۔ اس کے تعلقات وروابط کے سلسلے پہچان لیے تھے اور یہ اندازہ کرلیا تھا کہ اس وطن دشمن کاروبار کی جڑیں ملک میں اور ملک سے باہر کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

میرے ہاتھ رب نواز کا ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر بھی لگا تھا جس میں اس کے کاروبار کی ہر تفصیل تھی مگر اس کا سارا ریکارڈ ضائع ہوگیا۔ تاہم بہت کچھ میرے دماغ میں منتقل ہونے کے بعد محفوظ ہوگیا تھا۔ آج رب نواز سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے اس کے حوالے استعمال کیے۔ کچھ میں نے اس طرح رب نواز سے اگلوایا کہ اسے شک نہ ہوسکے۔

میری ایک پوری دوپہر اسے قائل کرنے میں گزرگئی۔ وہ بات کرتے کرتے اچانک مشتعل ہوجاتا تھا اور پرانے

نقصانات کی بات کرنے لگتا تھا۔ مجھے اس کو سمجھانا پڑتا تھا کہ ماضی کی اس غلطی کو بھلانا ضروری ہے۔ اس نے تو صرف کاروبار میں نقصان اٹھایا تھا۔ میں نے سیاست میں ایک پُرخواب مستقبل ہاردیا تھا جس کی تعبیر پانا میرے لیے سعی وامکاں کے دائرے سے باہر بھی نہ تھا۔ میں نے اپنی بیوی گنوادی تھی جس سے میں بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اپنے سارے اثاثے کھودیے تھے اور آج موازنہ کیا جائے تو رب نواز کے مقابلے میں شاہ عالم کہیں زیادہ ہارا ہوا جواری تھا۔

لیکن دو شاطر ذہن رکھنے والے پرانے جواری آج بھی اس ہار کو جیت میں بدل سکتے ہیں۔ یہ اہم ہے اور رب نواز کو آج کی حقیقت کو تلخ ہونے کے باوجود قبول کرلینا چاہیے۔ اس جھوٹ سے بھری ہوئی گفتگو کے دوران میں مجھے بعض اوقات احساس بھی ہوا کہ میں ایک خطرناک کھیل کو پھر کیوں شروع کررہا ہوں مگر اس کے مقابلے میں یہ ضرورت کہیں زیادہ اہم واشد تھی کہ شاہ عالم کا نام اور وجود بھی حتمی طور پر ایسے مٹادیا جائے کہ پھر اس کے روئے زمین پر کہیں زندہ پائے جانے کی افواہ پر بھی کوئی کان نہ دھرے۔ یہ تھوڑے دن کا کھیل تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا۔ اس عرصے میں مجھے PHYSICALLY یہ ثابت کرنا تھا کہ ناصر عظیم لاہور میں تھا اور ہے۔ اس کی زندگی کے کئی برسوں پر محیط معمولات کے ثبوت اور گواہ ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ہم شکل شاہ عالم لندن میں جی رہا ہے۔ رب نواز اس سے لندن میں ملے اور یقین کرلے کہ ایک کا دوسرے سے نہ کوئی تعلق تھا نہ ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بھی کبھی نہیں آئے۔ اس یقین کے بعد اگلے مرحلے میں رب نواز کو شاہ عالم کی موت کا یقین دلایا جائے۔ اس کی موت بھی ناقابل تردید ثبوت اور گواہوں کی سند رکھتی ہو اور خود رب نواز کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح قابل قبول ہو۔

شاہ عالم کی موت کے بعد ہی ناصر عظیم کی ذات شک وشبہے سے آزاد ہوتی تھی اور اسے اپنی زندگی کو تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہوسکتی تھی۔ وہ شاہ عالم کی زندگی کے آسیب سے نجات پاسکتا تھا اور بے خوف وخطر اپنے مستقبل کے راستے پر جاسکتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد رب نواز نے میرے سامنے پرانا حساب رکھا "تمہارے ذمے جو رقم واجب الادا تھی۔"

میں نے کہا "میں وہ یکمشت ادا نہیں کرسکتا۔ ہمارے آپس کے حساب میں ایڈجسٹ ہوجائے گی۔"

"ایک کروڑ ستر لاکھ تم نے باہر وصول کیے مگر مجھے نہیں دیے تھے" اس نے بتایا سود میں چھوڑدوں پھر بھی اصل کتنے سالوں میں وصول ہوگا مجھے۔ اور اس کے علاوہ جو کاروبار کی تباہی کا نقصان ہے۔ جانی ومالی نقصان۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ یہ طے کرلو کہ مجھے کتنا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اگر وہ سب اس زندگی میں ادا کرنے کے قابل ہوا تو کروں گا ورنہ تمہیں اختیار ہے' تم میری جان لے لو۔ اس سے زیادہ کیا لے سکتے ہو تم۔ ہم اپنے اپنے نقصان کو روتے رہے تو کچھ نہیں کرپائیں گے۔ میں سارے مالی نقصانات کی ذمے داری قبول کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر تم مجھے کچھ رعایت دے سکتے ہو تو تمہاری مرضی۔ ورنہ ہم سب کچھ وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے ختم ہوا تھا۔ اب میں آزاد ہوں۔ بزنس کو زیادہ وقت دے سکتا ہوں۔ میں نے کچھ نئے فیلڈ بھی EXPLORE کیے ہیں۔ نئی مارکیٹ بنائی جاسکتی ہے۔ دو چار سال میں ہم اس سے کہیں زیادہ پاسکتے ہیں جتنا ہم نے گنوادیا۔ جو کام میں کرسکتا ہوں کوئی اور نہیں کرسکتا۔ ایسا ہوتا تو اب تک تم نے خود کو پھر ESTABLISH کرلیا ہوتا۔"

اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی "یہی تو بدقسمتی ہے میری۔ ادھر تم کو شرافت کے وائرس نے INFECT کردیا۔ تم کو خدمت خلق' شرافت کی سیاست اور حب الوطنی کا بخار چڑھ گیا۔ ادھر ہاشم رضا نے میرا ساتھ چھوڑدیا۔"

میں نے کہا "پروفیسر نے؟"

"ہاں۔ اسے اپنے سائنسی تجربات کے لیے بہت پیسا مل گیا تھا۔ میرے ساتھ کام کرتا تھا تو اسے وقت کم ملتا تھا۔ اس نے باہر اپنے تعلقات استوار کیے۔ معلوم نہیں کون لوگ اسے بے حساب رقم دینے پر راضی ہوگئے۔ میرے بے حساب کہنے کا مطلب واقعی بے حساب ہے۔ وہ جتنی مانگے۔ جس کرنسی میں مانگے اور خرچ کے معاملے میں وہ خود مختار ہے۔ اسے کسی کو حساب نہیں دینا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایسے کون لوگ ہیں؟"

"ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست ہو' تجارت یا ثقافت۔ ہر جگہ ایک مافیا ہے جس کے اپنے VESTED انٹرسٹ ہیں۔ کہیں خانہ جنگی کراکے۔ کہیں اپنی ثقافتی یلغار سے۔ مذہب کی تبلیغ کے ذریعے۔ سائنسی ترقی کے نام پر۔ مفادات کی یہ جنگ لڑی جارہی ہے۔ بالادستی کے لیے۔"

میں نے کہا "پروفیسر کا فیلڈ تو GENETIC انجینئرنگ تھا۔"

"وہی ہے۔ لیکن یہ فیلڈ بہت وسیع ہے۔ اس میں کچھ

لوگ زراعت میں تجربات کر رہے ہیں۔ سال میں چار بار سے بھی زیادہ فصلیں اگانا۔ بغیر پانی کے کاشت۔ نقصان دہ اجزا سے پاک سبزیاں اور پھل۔ اصل سے دگنی چوگنی پیداوار۔ دوسرا فیلڈ جانوروں پر تجربات کا ہے۔ ہمارے پاس اس کی ایک مثال وہ مرغیاں ہیں جو روز ایک انڈا دیتی ہیں۔ لوگ عام طور پر انھیں پی آئی اے کی مرغیاں کہتے ہیں۔" "PIA- SHAVER" نے سب سے پہلے یہ پولٹری فارم بنائے تھے۔"

"ہاں۔ مرغیوں کی برائلر اور لیئر نسلیں ایسے ہی بنی ہیں۔ ان کی نسلی صفات بدل کے۔ ہمارے پاس ولایتی کہلانے والی گائے بھینسیں آگئی ہیں جو دیسی کے مقابلے میں کہیں زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ کراس بریڈ کی اصطلاح تو پرانی ہوگئی۔ اب سائنس داں ایک خلیے سے ایک پورا جانور بنانے کی فکر میں ہیں۔ جو ہو بہو اصل جانور کے مطابق ہو۔ (بعد میں ڈولی نام کی بھیڑ اسی طرح تیار کی گئی 'ادارہ)

میں نے کہا "تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں۔"

وہ بولا "مجھے یہ سب خود پروفیسر نے بتایا تھا۔ وہ تیسرے میدان میں کام کر رہا ہے۔ یعنی انسان کی نسلی صفات بدلنے اور اپنی مرضی کا انسان بنانے کے لیے لیبارٹری میں کنٹرول کیے جانے والے حالات۔ دنیا بھر میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہو رہے ہیں لیکن سائنس دانوں کا خواب ہے ایک خلیے سے پورا انسان تیار کرنا۔ یعنی آئن اسٹائن کو پھر وجود میں لانا۔ ایک الزبتھ ٹیلر سے دوسری بنا لینا۔ باپ مرجائے تو دوسرا بنالو یا بنوالو۔"

"HORRIBLE" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر پروفیسر کی باتوں سے مجھے لگا کہ یہ ناممکن نہیں ہے اور اس کا ثبوت ہیں جیوا اور لالی۔ بے شک یہ کراس بریڈ پروڈکشن بھی لیکن اس کے تجربات جاری ہیں۔ وہ انھیں اپنے جیسے اور پیدا کرنے کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ بلکہ ذہانت اور جسمانی طاقت میں ان سے سو یا ہزار گنا بہتر ماڈل لانا چاہتا ہے۔"

"آخر پروفیسر کو سپورٹ کرنے والے کون لوگ ہیں؟"

وہ بولا "تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم جانتے ہو کہ سائنس کی ہر ایجاد کو بالآخر تعمیر سے زیادہ تخریب کے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا گیا۔ میں نے سنا ہے کہ ڈائنامائٹ ایجاد کرنے والا وہی تھا جس کے نام پر نوبل انعام برائے امن دیا جاتا ہے۔"

"ہاں۔ الفریڈ نوبل!" میں نے کہا "اسے بہت افسوس تھا کہ اس نے ایسی چیز ایجاد کردی جو انسانیت کی تباہی اور قتل و غارت گری میں استعمال ہوگی۔"

"ایسا ہی ایٹمی طاقت کے معاملے میں ہوا۔ ایٹمی قوت سے بجلی پیدا کی جاسکتی تھی لیکن ہوا کیا؟ امریکا نے اسے لاکھوں انسانوں کو پلک جھپکتے میں موت کے گھاٹ اتار کے فتح حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ تو جینیاتی سائنس غلط مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو رہی ہے۔ مجھے پروفیسر نے بتایا کہ یورپ اور امریکا کی سفید فام نسل کی ساری دنیا پر حاکمیت کے لیے ایک پروگرام پر کام جاری ہے۔ تم جانتے ہو جرمن اپنے آپ کو دنیا کی سب سے برتر اور مخلص نسل کہتے تھے۔ یہی احساس قدیم یونانی تہذیب کے دور میں یونانیوں کو بھی تھا کہ ان کی تخلیق باقی دنیا پر حکومت کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ وہ ساری اقوام کو غلام بناکے رکھنا چاہتے تھے۔ ہٹلر نے بھی جرمنوں میں یہی احساس برتری پیدا کرکے انھیں دنیا پر قبضے کا خواب دکھایا تھا۔ وہ جاپان' برطانیہ' روس اور بالآخر امریکا سے لڑ گئے تھے۔ سفید فام اقوام میں آج بھی براؤن اور بلیک نسل سے نفرت کم نہیں ہوئی حالانکہ آج انسان زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے اور انسانی حقوق کا بہت ڈھول پیٹا جارہا ہے۔ خیر' مختصراً یہ سمجھ لو کہ برتر قومیں کم تر قوموں کو محکوم بنانے اور بالآخر ختم کرنے کے ایک طویل المعیاد منصوبے پر کام کر رہی ہیں۔ سیاسی اور معاشی طور پر ہم یورپ اور امریکا کے غلام بن چکے ہیں۔ آدھی سے زیادہ دنیا بن چکی ہے۔ تم غور کرو تو وہ آدھی سے زیادہ زمین پر قبضہ بھی کرچکے ہیں۔ امریکا' یورپ' کینیڈا' آسٹریلیا۔ سب جگہ وہی ہیں جو انگریز کہلاتے ہیں۔ فرنچ' جرمن اور ڈچ نو آبادیاں ہر جگہ تھیں مگر پھر وقت بدلا اور ان لوگوں نے سوچا کہ جسمانی غلامی سے ذہنی غلامی بہتر ہے۔ کم تر نسلوں کو طاقت سے غلام بنائے رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ اس میں بہت خون خرابا ہوگا اور کالے غلام بغاوت اور سرکشی کریں گے تو سفید فام آقاؤں کو ختم کردیں گے۔ چنانچہ ہر جگہ آزادی کی تحریکیں چلوائی گئیں اور حاکموں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر جگہ سے اپنا تسلط ختم کردیا۔ ایشیا اور افریقہ کے سارے غلام ملک آزاد ہوگئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کو ذہنی طور پر غلام بنانے اور بالآخر نیست و نابود کردینے کے منصوبے کا آغاز ہوگیا۔ امریکا کے لیے یہ خیال بڑی اذیت اور شرمندگی کا باعث ہے کہ وہ غاصب ہیں اور اس ملک کے اصل مالک ریڈ انڈین ہیں جن کو انھوں نے مار مار کے بھگا دیا اور وہ آج جنگلی قبائل کی طرح مہذب امریکی آبادیوں سے دور رہتے

ہیں۔ ان کی نسل معدوم ہوتی جارہی ہے۔ ایسا ہی آسٹریلیا کے ABORIGENS کے ساتھ ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ مگر ان کو جسمانی طور پر ختم کرنے کے لیے سائنس سے بھی مدد لی جارہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں پروفیسر کی بات میں کتنا سچ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پہلے انھیں عام بیماریوں کے علاج کی ایسی دوائیں دی گئیں جن کی اصلیت کچھ اور تھی۔"

میں یہ سب انتہائی حیرانی سے سن رہا تھا "اصلیت کیا تھی؟"

رب نواز اپنی معلومات کا اظہار کرکے لطف اندوز ہو رہا تھا "یہ ریڈ انڈین اور قدیم نسل کے سب لوگ خود پسماندہ اور جاہل ہیں۔ وہ خود کچھ بھی نہیں بناتے۔ انھیں مفت علاج کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ افریقہ میں' آسٹریلیا میں اور امریکا میں مشن اسپتال قائم کیے گئے جو خدمت خلق کے نام پر دوائیں اور خوراک تقسیم کرتے تھے۔ ملیریا' ٹی بی' پیٹ اور جگر کے امراض کے نام پر ایسی دوائیں دی گئیں جو درحقیقت نسل کشی کے لیے تھیں۔"

میں اچھل پڑا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یہ ہوا۔ ان دواؤں کے استعمال سے مرد یا عورتیں بانجھ ہونے لگے یا ان کی FERTILITY کم ہوگئی۔ شرح پیدائش میں خطرناک حد تک کمی واقع ہوگئی۔ اس کے بعد کانگو وائرس ہیپاٹائٹس ایڈز اور موت کی نیند جیسی بیماریوں کی دہشت پھیلائی گئی۔ یہ بیماریاں بلاشبہ خطرناک ہیں لیکن اتنی عام نہیں جتنا مشہور کیا گیا اور اس بہانے کم تر اقوام کا قتل عام شروع کردیا گیا۔ قتل عام اس لیے کہ نام علاج کا تھا مگر ان میں بیماریاں منتقل کی جارہی تھیں اور پھیلائی جارہی تھیں۔ دواؤں اور انجکشنوں کے ذریعے اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کے زیر اثر عورت مرد کا آزادانہ میل جول بڑھ رہا تھا چنانچہ ایڈز جیسی بیماریاں وہی کام کر رہی تھیں جو کیمیائی جنگ کرتی ہے۔ کیا یہ سب تمہارے لیے قابل یقین ہے؟"

"نہیں۔ مگر میں اسے جھوٹ قرار نہیں دے سکتا" میں نے کہا۔

"دواؤں کے ساتھ اب جینیاتی سائنس میں خوراک اور غذاؤں سے مدد لی جارہی ہے۔ ایسی کھانے کی عام چیزیں بنائی گئی ہیں جن کے مسلسل استعمال سے تولیدی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اگلے پچاس سالوں میں کچھ نسلیں باقی نہ رہیں۔ وہ اولاد نہ ہونے کو قدرت سے منسوب کرتے ہیں اور پھر علاج میں بھی تحقیق سے مدد نہیں لے سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے ختم ہوسکتی

ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہاشم رضا یہی کام کر رہا ہے؟"

وہ بولا "نہیں۔ ہاشم رضا مختلف ذہنی وجسمانی صلاحیت رکھنے والے انسان بنانے کے پراجیکٹ پر کام کر رہا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ آخر کس لیے؟"

رب نواز نے کہا "کچھ لوگ انسان کو مشین کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں کیونکہ روبوٹ بہت مہنگا پڑتا ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی مشکل ہوتی ہے۔ فرض کرو کسی کے پاس جبو جیسے انسانوں کی ایک پلٹن ہو تو ان سے وہ کیا کام نہیں لے سکتا۔ لالی جیسی کوئی عورت بن جائے جو نو ماہ میں نہیں چھ ماہ دو یا چار جبو پیدا کر دے۔ پھر چار ماہ بس۔ اگر اس عمل میں وہ ضائع ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایک مشین اگر چار مشینیں بنا کے بے کار ہو جائے تو کیا نقصان ہے۔ پھر ایک پہلو اور بھی ہے اس ریسرچ کا۔ لالی اور جبو جیسے انسانوں کے دماغ پر کنٹرول حاصل کرنے کا۔ دماغ پر اثر کرنے والی دوائیں اب بھی بازار میں ہیں مگر یہ ذرا مختلف اور ADVANCED دوائیں ہوں گی۔ کسی کو ایک انجکشن لگا کے اس سے کچھ بھی کرایا جا سکے۔ مثلاً اسے کسی کو قتل کرنے بھیج دیا جائے یا بم کے ساتھ کسی خودکش حملے میں استعمال کر لیا جائے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ اگرچہ ان باتوں کا میرے مقصد سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر یہ معلومات اتنی دلچسپ، پریشان کن اور ناقابل یقین تھیں کہ میں سنتا رہا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں رئیس کا خیال مسلسل اذیت دینے والے ناسور کی طرح تھا جسے میں نظرانداز کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے شبنم اور فرید کی تگ و دو پر پورا بھروسا تھا۔

رب نواز کچھ دیر بعد بولا "میں نے اسی لیے ہاشم رضا کے ساتھ پنگا نہیں لیا کہ وہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کی پشت پناہی کرنے والے عام لوگ نہیں ہیں۔ میں اس سے ملتا رہتا ہوں۔"

میں نے کہا "کہاں؟ اس کی لیبارٹری میں، کہاں کام کر رہا ہے وہ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں نہیں جانتا۔ آخری بار میں تین ماہ قبل گیا تھا تو مجھے پہلے کی طرح بند گاڑی میں لے جایا گیا تھا۔ اس کے بلٹ پروف شیشے سیاہ تھے اور ہم نے رات بھر سفر کیا تھا۔ مجھے سمت کا بھی کوئی اندازہ نہیں۔"

میں نے کہا "وہ یقیناً بہت خفیہ اور ممنوعہ جگہ ہوگی۔"

"ظاہر ہے۔ مگر پروفیسر ہاشم رضا کچھ احسان مانتا ہے میرا۔ اسے میں نے ہی باہر جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ابتدائی سرمایہ حاصل کرنے میں اس کو مجھ سے مدد ملی تھی۔ اس کے علاوہ۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

میں نے کہا "تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"جو مجھے معلوم تھا سب بتا چکا ہوں" وہ بولا۔

"ایک بات کے سوا۔ تمہاری اس کام میں دلچسپی کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا "لالی ہے میرے پاس۔ یہ پروفیسر کا تحفہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں رشتہ چاہیے لالی کے لیے؟"

وہ مسکرانے لگا "یہی سمجھ لو۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے بھی کچھ جبو بنوانے کا آرڈر دیا ہو۔"

وہ چونک پڑا "تم ذہین آدمی ہو۔ بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ میں نے اسے ایک درجن ذاتی غلاموں کے لیے کہا ہے۔ جبو سے بھی بہتر۔ اس کے لیے میں پروفیسر کو ایک کروڑ روپے دوں گا۔"

"کیا کرو گے تم ان کی مدد سے؟"

"وہ میرے محافظ ہوں گے، کارکن ہوں گے۔ میرا ہر کام بلا معاوضہ کریں گے۔ غداری اور غلطی نہیں کریں گے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا ان سے کہ اور کسی سے مل جائیں یا راز فاش کر دیں۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "اور تمہیں یقین ہے کہ پروفیسر تمہارا آرڈر پورا کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔"

"مگر کیسے۔ کیا وہ ایسے انسان بنائے گا یا بنا چکا ہے۔"

رب نواز نے کہا "پتا نہیں۔ شاید وہ کچھ انسانوں کی جینیاتی صفات بدل دے گا۔ مثلاً وہ تمہیں شاہ عالم کے بجائے ایک ایسی شخصیت بنا دے جو بالکل مختلف ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ کام زیادہ مشکل ہے۔ اس کام کے لیے بچے بہترین معمول ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے مداری کے کھیل میں ایک معمول ہوتا ہے، بچہ جمورا، جمورا وہی کہتا ہے اور کرتا ہے جو مداری چاہتا ہے۔"

میں نے اپنے سر کو جھٹکا "رب نواز۔ میرا دماغ خراب ہو جائے گا اگر میں تمہاری یہ باتیں سنتا رہا۔"

"آل رائٹ۔ ہم کام کی بات کرتے ہیں" اس نے کہا

"یہ بتاؤ، تمہارے پلان کیا ہیں؟"

میں نے کہا "کیا تمہارے پاس باہر بھیجنے کے لیے مال ہے؟"

وہ بولا "مال تو ہے مگر مجھے گارنٹی چاہیے۔"

"کیسی گارنٹی؟"

"یہی کہ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا رہے ہو۔ پہلے کا حساب ابھی ہوا نہیں، تم کو اور مال دے دوں تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ کتنی گارنٹی چاہیے۔ ایک کروڑ کی۔۔۔ تم لندن آجاؤ۔"

"میں لندن کیسے آسکتا ہوں۔ اپنے گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔"

میں نے اسے طیش دلانے کے لیے کہا "کیا رب نواز اتنا بزدل ہو گیا ہے۔ اس کے وسائل نہیں رہے۔ ایک عام آدمی دس شناختی کارڈ اور دس پاسپورٹ رکھتا ہے۔"

وہ سوچتا رہا۔ "میری درخواست ضمانت کی تاریخ ہے اگلے ہفتے۔ مجھے کورٹ میں حاضر ہونا ہے۔"

میں نے کہا "تو اگلے ہفتے کے بعد آجاؤ۔ مگر یہ ضمانت کا کیا چکر ہو گیا ہے تمہارے ساتھ۔"

اس نے مجھے مختصراً بتایا کہ فرید عباسی اور شبنم کے ساتھ اس کا جھگڑا کب اور کیسے شروع ہوا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ میں واقعی یہاں کے معاملات سے بالکل بے خبر ہوں۔ "دیکھا جائے تو ان سب کی ذمے داری بھی تم پر ہی عائد کی جانی چاہیے۔ تمہاری وجہ سے میرا اتنا نقصان ہوا اور پھر تم منہ چھپا کے بھاگ گئے۔ میں نے تمہارا پتا چلانے کے لیے ایک تو تمہاری اسی معشوقہ سے پوچھا۔"

"کس معشوقہ سے؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"چیف معشوقہ شبنم سے اور کس سے۔ ایک داشتہ کو بھی کچھ خیال ہوتا ہے اپنی رسوائی کا مگر اسے نہیں تھا حالانکہ وہ صحافی تھی۔"

میں نے ایک مصنوعی آہ بھری "ہاں، اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے رخشی سے شادی نہ کی ہوتی، شبنم کا انتظار کیا ہوتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا جو بعد میں میرے ساتھ ہوا۔ بہت محبت کرتی تھی وہ مجھ سے۔ بہت ذہین تھی اور بہادر تھی۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات ثابت ہوتی۔"

"کیا رخشی اچھی بیوی نہیں تھی؟"

"تھی۔۔۔ بیوی اچھی تھی گھر کی حد تک۔ مگر میں سمجھتا ہوں شریک حیات ایسی ہو جو گھر کے ساتھ باہر کے معاملات میں بھی اتنی ہی قابل اعتبار ہو۔ خیر، وہ باتیں پرانی ہو گئیں۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا گیا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تمہارا واقعی، اب اس سے کوئی تعلق نہیں؟"

میں نے کہا "تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے اس معاملے میں؟"

"اس نے بھی تم سے رابطہ نہیں رکھا؟"

"کیسے رکھتی۔ میں جان کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ تم نے اور میرے دشمنوں نے یہاں میرا جینا محال کر دیا تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم یا دوسرے لوگ میرا سراغ نہ لگا لیں۔"

اس نے سر ہلایا "کوشش بہت کی تھی میں نے۔ مجھے یقین تھا کہ اور کوئی چاہے نہ جانتا ہو مگر شبنم کو ضرور معلوم ہوگا۔ میں نے اسے اٹھوا بھی لیا تھا مگر۔۔۔"

"مگر کیا۔۔۔ ڈر گئے؟ اس لیے کہ وہ صحافی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے اپنے کچھ ساتھی نمک حرام تھے۔ ان کی وجہ سے وہ بچ گئی۔ انہوں نے شبنم کو بہت کچھ بتا دیا۔ میرے کاروبار کے بارے میں اس لیے وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔ اس کی وجہ سے میرا بہت نقصان ہوا۔ مجھے شک ہے کہ وہ میرا تین کروڑ کا مال دبائے بیٹھی ہے۔"

"تین کروڑ کا مال؟"

"ہاں۔ اس نے مجھ سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اینٹی نارکوٹکس والوں نے اسے بتا دیا ہوگا۔ مگر وہ خود لالچ میں پڑ گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کسی اور کے پاس ہو اور اس نے شبنم کے ذریعے مجھ سے سودا کرنے کا سوچا ہو۔"

میں نے کہا "پھر سودا ہوا کیوں نہیں؟"

"بس۔ مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی شبنم کے معاملے میں۔ اور وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ میں نے رخشی سے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی۔"

"اس سے میرا کیا تعلق رہا تھا۔ میں نے اسے طلاق دے دی تھی۔"

رب نواز کچھ سوچتا رہا "ایک وکیل سے شادی کر لی ہے اس نے۔ میرا خیال تھا کہ رخشی کے ساتھ تمہارے مالی معاملات چل رہے ہوں گے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ آسانی سے تو کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیے تھے۔ وہ الگ میری دشمن ہو گئی۔"

میں نے کہا "رخشی میں اتنا دم کہاں؟"

"ہاں مگر اس کا شوہر بڑی ٹیڑھی چیز ہے۔ پولیس کی نوکری نہیں کرسکا کیونکہ اسے فرض شناسی ملک وقوم کی خدمت اور رزق حلال کا مسئلہ درپیش تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگ ڈراما کرتے ہیں تو کیوں؟"

"ایسے لوگ ہوتے ہیں" میں نے اسے یقین دلایا "ہر دور اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔"

"خیر۔ وہ میری جان کا دشمن ہورہا ہے۔ درمیان میں شبنم بھی روپوش ہوگئی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر رئیس خان نام کے ایک بدمعاش کے گھر میں تھے۔ جس کو وہ غریب خانے کے بجائے رئیس خانہ کہتا ہے۔"

میں نے انجان بن کے کہا "کوئی بہت بڑا بدمعاش ہے؟"

"بدمعاش تو خیر ہم سے بڑا نہیں ہوسکتا مگر اس کے سیاسی لوگوں سے تعلقات ہیں جو اس کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ایک بڑا خاندانی جاگیردار تھا۔ نواب خدا بخش مندرال۔"

میں نے کہا "جانتا ہوں میں۔"

"رئیس اس کا خاص آدمی ہے۔ خدا بخش تو مرگیا۔ مگر اس کا بیٹا بڑی توپ چیز ہے۔ وزارت داخلہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہے آج کل۔ وہ رئیس کا سرپرست بنا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ میرا مال رئیس خانے میں ہے اور رئیس ہی شبنم کے ذریعے مجھ سے سودا کرنا چاہتا ہے۔"

وہ بتاتا رہا کہ اس نے اپنا مال واپس لینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ بالکل یک طرفہ بیان تھا۔ وہ خود کو ہر الزام سے بچاتا رہا۔ اس نے مجھے سونی کے بارے میں بھی بتایا کہ اس نے اپنی بہن کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بہن کے شوہر کے ساتھ مل کے کیا کارروائی کی تھی "اس نے لاکھوں کی بس کو آگ لگادی۔ لاکھوں کا مال برباد ہوگیا۔ لاکھوں ہرجانے کے دینے پڑے۔ ایک کروڑ کے چکر میں آگیا تھا میں۔ پھر وہ میرے بیٹے دلنواز کو اغوا کرکے لے گئی۔ گھر سے اٹھاکے لے گئی۔"

میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا "اس کی اتنی ہمت؟"

وہ سونی کو گالیاں دیتا رہا "وہ ڈاکوؤں کے ساتھ رہی ہے' کنجری۔ مجھے شک ہے کہ اس کے ساتھ جو داڑھی والا ہے' شبنم کے ساتھ۔ وہ پہلے سونی کا یار تھا۔ کوئی پرانا پاپی ہے' پہلے ڈاکو تھا۔ اب بھیس بدل کے پھر رہا ہے' کبھی شبنم کا ڈرائیور بن جاتا ہے' کبھی چراغ علی ولد باغ علی' کبھی ناصر عظیم۔"

اس نے داڑھی والے جن کے بارے میں وہ سب بتایا جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے رئیس خانے میں آگ لگوانے کا ذکر بھی کیا۔ میں منتظر رہا کہ وہ رئیس کے دہرے قتل کے الزام میں گرفتاری کا ذکر بھی کرے گا مگر اس نے اچانک مجھ سے پوچھ لیا "تم جانتے ہو کسی ناصر عظیم کو؟"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

ذہنی طور پر میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ رب نواز نے سوال بڑے CASUAL انداز میں کیا تھا۔ اس کا سوال ختم ہونے سے پہلے گھر کے اندر کوئی شیشے کا برتن ایک چھناکے سے ٹوٹا چنانچہ اس کی توجہ میرے چہرے پر ظاہر ہونے والے جذبات کے ردِعمل پر نہ رہی۔

میں نے بڑی کوشش سے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سوچتے ہوئے سرہلا دیا "مجھے یاد نہیں پڑتا یہ نام۔۔۔ کون ہے ناصر عظیم؟"

وہ بے خیالی میں بولا "جانتا میں بھی نہیں۔ ایسا ہی ایک غیر معروف سا بزنس مین ہے۔"

"پھر اس کا کیا ذکر؟"

وہ بولا "اس کی وجہ سے ایک عجیب صورتِ حال بن گئی تھی۔ پولیس نے اسے پکڑلیا چراغ دین ولد باغ علی سمجھ کے۔"

"کون چراغ علی۔۔۔؟"

"وہی سؤر کا بچہ۔ داڑھی والا جن کہتا ہے اپنے آپ کو۔ اس نے یقیناً نقلی داڑھی لگا رکھی تھی۔ اس کے بال بھی ملنگوں جیسے بڑے بڑے تھے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "کیا پتا وہ بھی وگ ہو۔"

"وگ ہی ہوگی" رب نواز کے ذہن نے میرے SUGGESTION کو قبول کرلیا "یہ ناصر عظیم تو خیر کاروباری آدمی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا اور اسے لوگ جانتے ہیں' ایک ڈاکٹر کمال ہے۔"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ کمال کلینک والا۔؟"

"وہ کمال کا اسپتال ہے اب۔ وہ ناصر عظیم کو بچپن سے جانتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ تھے یتیم خانے میں۔ دونوں کے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ وہیں پرورش پائی تھی شروع میں۔ پھر کمال کو کسی ڈاکٹر نے گود لے لیا۔ یہ ناصر عظیم بھی کسی کرنل خان کے گھر میں رہا۔ فلم ایکٹریس نیلم دس سال سے جانتی ہے اسے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ناصر کا حلیہ کیوں اختیار کیا تھا اس داڑھی والے جن نے۔ ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا "یہ تو وہ خود ہی بتا سکتا تھا۔ مگر مجھے بھیس بدل کے کوئی کام کرنا ہو تو میں بھی یہی کروں گا۔"

رب نواز نے جیسے اپنے آپ سے کہا "مجھے تو شک پڑتا ہے تیری اس فاحشہ پر۔ جو ایڈیٹر بن کے بڑی معزز ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے بھی کوئی ایسی حرکت کی تھی؟"

وہ بولا "ایک بار نہیں دوبار۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی یہاں۔ تو اس کے ساتھ تھا وہ داڑھی والا۔ بظاہر اسے وہ شوفر بناکے لائی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا کوئی یار تھا۔"

میں نے کہا "وہ کیوں ملنے آئی تھی تم سے؟"

"وہی چکر تھا۔ پہلے کہتی رہی کہ میں سودا کرادوں گی۔ کسی نے مجھ سے رابطہ کیا ہے لیکن بعد میں مکرگئی۔ اس عورت کا والی وارث تو کوئی ہے نہیں۔ آج کل تو ماں باپ کا کوئی کنٹرول نہیں اولاد پر' بڈھا کیا کرے۔"

"کون بڈھا؟"

"وہی ابوبکر آزاد۔ جس کے گھر میں وہ رہتی تھی' بے غیرت۔"

میں نے کہا "رہتی تھی کیا مطلب؟ اب نہیں رہتی؟"

"نہیں' وہ میرے ڈر سے کافی عرصہ روپوش رہی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ اس کا ٹھکانا رئیس نام کے ایک شخص کے ساتھ ہے۔"

میں نے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کی "یہ رئیس کون ہے' صرف نام کا رئیس ہے کیا۔؟"

وہ بولا "نام بھی اس کا رئیس خان ہے۔ پہلے کوئی چھوٹا موٹا نمبری۔۔۔ ہی تھا۔ پولیس کی سرپرستی میں بدمعاش بن گیا۔ شہر کے غنڈے اکٹھے کرلیے تو بدمعاشی کو پیشہ بنالیا۔ پولیس کے علاوہ سیاست دانوں کے لیے کام بھی کرنے لگا۔ اس میں پیسہ بھی خوب کھینچا اور معزز بھی ہوگیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک خدا بخش مندرال کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا اثر رسوخ والا بندہ تھا۔ اس کے بیٹے آج بڑے اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ ان کی وجہ سے رئیس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ خود اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جاہل آدمی ہے۔ عجیب گورکھ دھندا قسم کا مکان بنایا ہے اور نام رکھا ہے رئیس خانہ۔"

"پھر شبنم کے ساتھ اس کے مراسم کیسے ہوگئے" میں نے یوں کہا جیسے اس خبر سے میں نے دکھ اور حسد محسوس کیا ہے۔

"مراسم اس کے کسی سے نہیں ہیں۔ جوان خوبصورت عورت اگر اپنے جسم کی طاقت کو کیش کرانا چاہے اور ذہانت بھی ہو اس کے پاس تو ساری دنیا کو غلام بنا سکتی ہے۔ وہ رئیس خانے میں رہی۔ اتنا پتا ہے مجھے۔ وہاں وہ داڑھی والا بھی آتا جاتا تھا۔ بعد میں فرید عباسی کا بھی آنا جانا ہوگیا۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی "وہ۔۔۔ جس سے رخشی نے شادی کی ہے؟"

وہ میرے چونکنے پر مسکرایا "کیوں' تکلیف ہوئی یہ جان کے؟"

میں نے کہا "یار' ایک کتا بھی کچھ عرصہ ساتھ رہے اور بعد میں خود آدمی چھوڑدے اسے' تو دلچسپی ضرور رہتی ہے کہ اب وہ کس کے پاس ہے۔ رخشی تو بیوی تھی میری۔ چھ سال رہی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر لحاظ سے وہ ایک اچھی بیوی تھی۔ بس میں اچھا شوہر نہیں تھا۔ وہ کہاں تک برداشت کرتی۔ گھر میں ہی جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ میں باہر عیاشی کرتا پھرتا تھا۔"

"وہ رہنا نہیں چاہتی تھی تمہارے ساتھ یا تم نے خود ہی چھوڑدیا تھا اسے' سچ بتانا؟"

میں نے کہا "میں نے خود ہی چھوڑدیا تھا۔ زبردستی کیا فائدہ؟ وہ جیسا شوہر چاہتی تھی ویسا میں بن نہیں سکتا تھا۔"

"خیر اب اسے مل گیا ہے ایسا ہی شوہر۔ یہ فرید عباسی بالکل الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے۔ سب سے بڑھ کر وہی میری جان کا دشمن ہورہا ہے۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی؟"

رب نواز بولا "ایک بڑی عجیب سی تکڈم بن گئی تھی رئیس خانے میں۔ تمہاری معشوقہ اور اس کا نیا خصم وہ داڑھی والا' یہ وکیل فرید عباسی اور رئیس۔ معلوم نہیں ان کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ مجھے تو اپنے تین کروڑ کے مال کی تلاش تھی۔ مجھے شک ہوگیا تھا کہ مال رئیس خانے میں ہی چھپاکے رکھا گیا ہے۔ میں نے بندے پیچھے لگادیے مگر وہ تھک ہار کے ناکام لوٹے کیونکہ رئیس خانے کا ایک راستہ ہے سامنے کی طرف مگر پیچھے والی گلی میں بھی انہوں نے ایک خفیہ راستہ بنالیا تھا۔ وہ مکان دیکھنے میں لاوارث اور غیر آباد نظر آتا تھا مگر اسے وہ چور دروازے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ خیر اس کا بھی پتا چل گیا مجھے۔ میں نے اپنے خاص بندے بھیجے وہاں مگر رئیس کے دو نوکر بیچ میں آگئے۔ ایک چارفٹ کا بونا تھا نام تھا تمیں مار خان۔ پتا نہیں اصلی نام تھا یا مذاق میں کہتے تھے اور ایک عورت تھی پونے چار فٹ کی۔ بیوی ہی ہوگی

اس بونے کی' وہ مارے گئے۔ رئیس نے میرے خلاف کیس بنادیا۔ اس کا وکیل بن گیا فرید عباسی۔ ثبوت اکٹھے کرلیے میرے خلاف اور گواہ بنالیے۔ میری ضمانت منظور نہیں ہوسکی۔ خیر' اپیل کردی ہے میں نے۔ میرے وکیلوں نے کچھ نئے نکات اٹھائے ہیں۔ امید ہے منظور ہوجائے گی۔ لیکن مجھے تو میری چیز ابھی تک نہیں ملی نا۔"

میں نے جانتے بوجھتے بے وقوفی کا سوال کیا "کون سی چیز؟"

وہ گرم ہوگیا "وہی تین کروڑ کی چیز۔ جو تمہاری بے وقوفی سے ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں پکا یقین ہے کہ وہ چیز وہاں ہے؟"

"میں نے آگ لگوادی تھی رئیس خانے میں۔ میرے اپنے بندے وہاں فائرمین بن کے پہنچ گئے تھے۔ سب دیکھ لیا انہوں نے مگر کچھ ملا نہیں یا پھر جل کے راکھ ہوگیا۔" وہ افسوس سے سہلانے لگا۔

میں بے نیازی کے انداز میں پُرسکون اور شرمسار سا بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ آگے کچھ بولے۔ رئیس کے بارے میں یہ بتائے کہ اسے کس طرح دہرے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرادیا گیا ہے اور پولیس اس سے کیا معلوم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ رئیس خانے سے ملنے والی دو لاشیں کس کی تھیں اور کس کے اشارے پر وہاں ڈالی گئی تھیں لیکن رب نواز کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ وہ رئیس کی فرد جرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا یا مجھے کچھ بتانے سے گریز کررہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ حقیقت کو اس نے کس حد تک رنگ آمیزی سے اپنی موافقت میں کرلیا تھا۔ اس کے بیان سے یہ تاثر ملتا تھا کہ مخالف حالات کی تشکیل میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ اس نے جو بھی کیا وہ غلط نہیں تھا۔ اسے دوسروں نے غلط بنادیا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی کہے کہ میں نے تو ایک ریوالور سے فائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ قتل کا جرم مجھ پر بنایا پولیس نے۔ قاتل کہلایا میں قانون کی وجہ سے۔ ورنہ میں قاتل نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر بعد بولا "تم شبنم سے ملو۔"

میں چونکا "کیوں ملوں میں اس سے؟"

"تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ وہ تین کروڑ کا مال اب کس کے پاس ہوسکتا ہے۔ وہ سودا کرارہی تھی تو کس کے لیے' وہ کون لوگ تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اول تو یہ میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ شبنم کو میں نے اپنی زندگی سے خارج کردیا ہے۔"

وہ چلانے لگا "تو پھر داخل کرلو۔ یہ تین کروڑ کا معاملہ ہے' اس کے لیے تم کوشش بھی کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ اس نقصان کے ذمّے دار تم ہو۔ کیا حرج ہے اس سے پوچھنے میں۔ وہ بتاسکتی ہے تو صرف تمہیں۔"

میں نے کہا "خوش فہمی ہے تمہاری۔ اول تو وہ بھی مجھ سے نہیں ملنا چاہے گی۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا اور وہ مجھے بھول چکی ہے۔ اگر میں نے اس موضوع کو چھیڑا تو وہ سمجھ جائے گی کہ میں اسے جذباتی استحصال سے بے وقوف بنا کے اپنا الو سیدھا کرنے آیا ہوں لیکن... میں کوشش ضرور کروں گا۔ اپنے طریقے سے' ایسے کہ اسے شک نہ ہو۔"

"یعنی تم ملوگے اس سے۔"

"پہلے مجھے اس کا ری ایکشن دیکھنا پڑے گا۔ اس کے مطابق ہی کوئی پلان سامنے آئے گا۔ اگر اس نے پھر مجھے لفٹ کرائی تو شاید مجھے یہ بات پوچھنے کا موقع مل جائے۔"

وہ کچھ پُرامید ہوگیا "ہوسکتا ہے وہ خود یہ خبر پڑھ کے تمہارے فون کا انتظار کرے۔ اس لڑکی فرزانہ سے پوچھے یا تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہو۔"

میں نے کہا "کسی کا مجھ تک پہنچنا تو مشکل ہے بلکہ ناممکن۔ اس کو کچھ بھی معلوم ہونے سے پہلے میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں؟"

"میری بیوی کراچی میں میری منتظر ہوگی۔ ہماری واپسی کے ٹکٹ پر سیٹ کنفرم بھی ہوچکی ہے۔ اور میں اپنا قیام بڑھا نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ تمہارے نہ ہونے سے لندن اِدھر اُدھر ہوجائے گا؟"

میں نے سکون سے کہا "وہاں میری بیوی کی ماں سخت بیمار تھی۔ اچانک بیمار ہوگئی تھی۔ مگر میں یہاں آنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔"

اچانک اس کا لہجہ بدل گیا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دوسرا جھوٹ بولتے جارہے ہو۔ بے وقوف بنارہے ہو مجھے۔"

میں نے کہا "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور یہاں بھی اپنی مرضی سے آیا تھا' صرف تم سے ملنے۔"

"تم اپنی آمد کو اس قدر خفیہ کیوں رکھنا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا "کیا تم جانتے نہیں کہ میرے خلاف عدالتوں میں کتنے مقدمات چل رہے تھے۔ میں ایک مفرور مجرم ہوں اور رہوں گا۔"

"بکواس بند کرو" اس نے اچانک فون میرے سامنے رکھ دیا "اور شبنم سے بات کرو۔"

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی "ابھی..."

"ہاں ابھی" اس نے فون نمبر ڈائل کرکے ریسیور مجھے تھمادیا۔

میں نے ریسیور واپس رکھ دیا "تم ایسے زبردستی نہیں کرسکتے میرے ساتھ۔"

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔" وہ غرا کے بولا "تمہیں ایک پنجرے میں ڈال کے نمائش کے لیے رکھ سکتا ہوں یہاں۔ اور سب کو بلا سکتا ہوں کہ تمہیں آکے دیکھ لیں۔ میری مرضی کے بغیر تم باہر نہیں جاسکتے۔"

میں نے اپنے چہرے پر شکست خوردگی کے جذبات طاری کرلیے "او کے۔ میں بات کرتا ہوں شبنم سے' نمبر بتاؤ۔"

اس نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے نمبر بتایا "یہ وہی نمبر ہے۔ اسے کیسے بھول سکتے ہو تم۔"

میں نے نمبر ملاتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ پھر ڈرائنگ روم پر ایک نظر ڈالی۔ اوپر کی منزل پر کسی نے اونچی آواز میں ڈیک پر ویسٹرن پوپ میوزک لگا رکھی تھی۔ نیچے ملکانی کسی نوکر پر ناراض ہورہی تھی۔

جس بات کا مجھے ڈر تھا وہ ہوگئی تھی۔ اچانک رب نواز کا دماغ گھوم گیا تھا اور میری سلامتی مخدوش ہوگئی تھی۔ اب میرے لیے ملک ہاؤس سے باہر نکلنا بھی آسان نہیں رہا تھا۔ شاید غیر یقینی ہوگیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے بھی میں یہ بات بھولا نہیں تھا کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور جانا دوسرے کی مرضی سے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی رب نواز غصے میں ہوش کھو بیٹھے۔ اسے ہر پرانی یاد کی تلخی میرے خلاف انتقامی کارروائی پر اکسائے اور میں اپنی کوشش کے باوجود اسے اپنے تعاون اور خیرسگالی کے جذبات کا یقین دلانے میں ناکام رہوں۔ اب اسے میرے تعاون کی ضرورت ہی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے قلعے میں داخل ہونا خود اپنی موت کا سامان کرنے کے مترادف ثابت ہو۔

اگر ایسا ہوتا تو میں پلان نمبر دو پر عمل کرتا جو میرے ذہن میں مکمل تھا۔ اب اس پر عمل درآمد کا وقت آگیا تھا۔ رب نواز نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ میں نے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے کر اچھا کیا تھا۔ وہ کسی فوری' غیر متوقع اور شدید نفرت کے ردِّعمل کا شکار ہوجاتا تو میری صورت دیکھتے ہی مجھے گولی ماردیتا مگر سوچنے سمجھنے کی مہلت ملی تو اس نے میرا صفائی کا موقف سننے کا فیصلہ کرلیا۔

لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا۔ جیسے ہی اسے شک ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں' اس کا رویہ بدل گیا۔ اب اگر وہ مسلح محافظوں کو بلالیتا تو میں رب نواز کو ڈھال بناتا اور اطمینان سے مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں باہر نکل جاتا۔ کلاشنکوف کے برسٹ اور توپ کے گولے روکنے کے لیے میری ایک ہی دھمکی کافی ہوتی کہ میرے قریب آنے کی کوشش کا انجام رب نواز کی موت ہوگا۔ میں اس کی گردن توڑدوں گا۔ اس کے بعد سب بند دروازے کھل جاتے اور مجھے تحفظ کی پوری ضمانت حاصل ہوجاتی۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ رب نواز کی نیت کا اندازہ کرتے ہی میں نے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ فون گھماتے ہوئے میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے شبنم کا نمبر مصروف مل رہا ہے۔ میری ساری توجہ ڈائل گھمانے پر مرکوز تھی۔ رب نواز میرے دائیں جانب والے صوفے پر

نیم دراز تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور مجھے جیسے میری چھٹی حس نے بتادیا کہ اگلے لمحے وہ ریوالور نکال لے گا جو وہ اپنی حفاظت کے لیے ہر جگہ ساتھ رکھتا تھا۔ ایک خطرناک دشمن ملاقات کے وقت وہ اپنے گھر میں بھی غیر مسلح ہونے کا رسک کبھی نہ لیتا۔

میں نے ڈائل پر دو کا ہندسہ گھماتے گھماتے ایک دم اٹھ کے خود کو رب نواز پر گرادیا۔ میں ایک پنجے پر گھوم کے اس پر ایسے جاگرا کہ اسے حرکت کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ اس کے جسم نے ایک REFLAX ایکشن میں مجھے دھکیلنا چاہا مگر اس کے ہاتھ حرکت میں پوری طرح آزاد نہ تھے۔ میں نے آواز نکالنے سے پہلے اس کی گردن دبوچ لی اور اس کی کنپٹی پر کہنی کا بھرپور وار کیا۔ وہ ایک تڑپ کے ساتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اگر میں اس کو ایک اور ہاتھ رسید کردیتا تو شاید وہ مرجاتا۔

جب میں اٹھا تو رب نواز پہلے کی طرح صوفے پر نیم دراز تھا۔ میں نے اس کا سر پیچھے کی طرف پشت کے ساتھ لگادیا۔ کوئی اسے سامنے سے دیکھتا تو وہ سوتا ہوا دکھائی دیتا۔

افراتفری میں فرار ہونا اپنی پوزیشن کو مشکوک بنانے کے مترادف ہوتا۔ اس احتیاط نے مجھے بچالیا۔ میں نے اچانک کھانے کی میز کے پیچھے والے دروازے سے رب نواز کی بیوی کو اندر آتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے افشائے راز کے خوف نے مجھے سن کردیا مگر میری سوچنے سمجھنے کی قوت برقرار تھی۔

خود کو سنبھال کے میں نے بے سدھ پڑے ہوئے رب نواز کو مخاطب کیا "مجھے ذرا واش روم تک جانا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ واش روم کس پردے کے پیچھے ہے۔ میں نے کسی سے بھی سوال نہیں کیا تھا۔ ملکانی نے عادتاً ہاتھ ہلادیا "ادھر چلے جاؤ۔"

میں صحیح سمت میں قدم پہلے ہی بڑھا چکا تھا مگر میں نے کہا "تھینکس۔" اور پھر پلٹ کے مسکرایا "بھابی جی! کاروباری باتیں کرنے والوں کو جانے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کچھ تو میں پیتا نہیں اب۔"

اس نے کچھ حیرانی اور طنز سے کہا "اچھا! یہاں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں پینا جرم بھی تھا اور گناہ بھی۔ تو آپ مے خوار رہے۔ اور وہاں سوسائٹی کے آداب میں شامل تھا تو آپ نے توبہ کرلی۔"

میں نے کچھ شرمندگی ظاہر کی "بس اب کیا کہا جائے اس کے سوا کہ خدا جب توفیق دیتا ہے تو کافر بھی مسلمان ہوجاتا ہے۔"

وہ مبہم سے انداز میں مسکرا کے پلٹ گئی "چائے یا کافی؟"

میں نے کہا "چائے ہو تو خوب۔ کافی ہو تو بہت خوب اور چند قدم باتھ روم کے دروازے کی طرف چلا۔

ملکانی کے دروازے سے غائب ہوتے ہی میں نے اپنا رخ بدلا اور پورچ کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ ڈرائنگ روم سے نکلنے میں مجھے چند ہی سیکنڈ لگے مگر ابھی میرے سامنے گیٹ تک کم سے کم بھی سو فٹ کا فاصلہ تھا جو مجھے کسی گھبراہٹ یا عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر طے کرنا تھا کیونکہ گیٹ کھولنے کے لیے مستعد ہوجانے والے سیکیورٹی گارڈ کی نظر مجھ پر تھی۔

میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تھا۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو گیٹ میں نصب SCANNER خاموشی سے اس کا ایکس رے جیسا عکس اندر کسی مانیٹر پر پیش کردیتا اور داخلے کی اجازت ملنے سے پہلے ہی مجھ سے اسلحہ رکھوالیا جاتا۔

ملکانی کسی وجہ سے لوٹ کے ڈرائنگ روم میں آسکتی تھی۔ وہاں وہ کسی کام سے ہی آئی تھی کہ میں نے کافی طلب کرکے اسے واپس بھیج دیا لیکن رب نواز کو دیکھ کے اسے فوراً شک نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سمجھتی کہ میں ابھی تک واش روم میں ہوں اور تھکن کے باعث اس کے شوہر کی آنکھ لگ گئی ہے۔

میرے اطمینان کو ایک لاکھ وولٹ کا شاک لگا جب اچانک میرے پیچھے سے ملکانی نے سوال داغ دیا "یہ کیا، کافی پئے بغیر ہی جارہے ہو؟"

میرے قدم پتھر کے ہوگئے لیکن ایک سیکنڈ بعد میں اطمینان سے گھوم گیا "کچھ کاغذات ہیں گاڑی میں، وہ لے آؤں۔"

ملکانی گیلری سے پورچ میں آگئی تھی "میں بھی سوچ میں پڑگئی تھی کہ ایک اتنا بہادر آدمی چوروں کی طرح کیوں فرار ہورہا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "چور سمجھنا تو غلط نہیں مگر بہادر ہونے کی سند کیسے مل گئی مجھے۔"

"بہادر نہ ہوتے تو ایسے خالی ہاتھ ایک جانی دشمن کے مقابل آنے کی ہمت کیسے کرتے۔"

میں نے کہا "آف کورس، رسک لیا تھا میں نے۔"

وہ گملوں کے پھولوں کا معائنہ کرتی آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگی "کیوں آخر؟ اب کیا ضرورت پڑگئی تمہیں ملک صاحب کی۔ تم نے تو چھوڑ دیا تھا انہیں۔"

میں نے کہا "حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے، مجبوری میری تھی۔"

"تمہارا فون آیا تو مجھے یوں لگا جیسے ملک صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ ان کا بی پی بہت ہائی رہنے لگا ہے۔"

"اس کا ذمے دار صرف میں تو نہیں۔"

وہ برہمی سے بولی "تم نہیں تو پھر اور کون ہے؟ یہ ساری خرابی تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔ تم نے خود اپنے پیروں پر تو کلہاڑی ماری ہی۔ ملک رب نواز کی پیٹھ میں بھی خنجر گھونپ دیا۔ مسائل کی اس دلدل میں تم اکیلے نہیں ڈوبے۔"

میں رک گیا کیونکہ گیٹ اب چند قدم دور رہ گیا تھا "اگر میں جان بچاکے فرار نہ ہوتا تو مارا جاتا۔ ایک بار تو قسمت نے بچالیا تھا۔ میری جگہ پتا نہیں کون میرا ہم شکل مارا گیا تھا۔ بار بار ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا "رب نواز میرا شوہر ہے۔ اس کا دشمن میرا دشمن ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے لیکن۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "اگر اسے کچھ ہوا تو تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔"

"یہاں جو کچھ ہوتا رہا اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں تو لندن میں تھا اور یہاں میں آیا تھا صرف رب نواز سے ملنے نیک نیتی کے ساتھ گزری باتوں کو بھول کے پرانے تعلقات بحال کرنے۔ میں سارے نقصانات کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔"

اس کے چہرے کی سختی میں نرمی آگئی اور اس کا لہجہ بھی بدل گیا "پھر۔۔؟ کیا رب نواز نہیں مانا۔ میں منالوں گی اسے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں صرف دو دن کے لیے آیا تھا اور مجھے کل واپس جانا ہے۔ یہاں کسی کو بھی میری آمد کا علم نہیں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک اخبار کی رپورٹر نے مجھے دیکھ لیا۔ اب میں بالکل نہیں رک سکتا۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ میں کچھ دن بعد پھر آؤں۔ یا ملک مجھ سے لندن میں ملے۔"

وہ مایوسی سے بولی "ابھی تو اس کا لندن آنا مشکل ہوگا۔ جب تک اس کی ضمانت منظور نہیں ہوجاتی۔"

میں نے کہا "بھابی۔ اگر ملک کہیں جانا چاہے تو کیا اسے روک سکتا ہے کوئی۔ معمولی لوگ بھی دو دو پاسپورٹ رکھتے ہیں لیکن اسے قانون کی پاسداری کا اتنا ہی خیال ہے تو وہ ضمانت منظور ہوجانے کے بعد آجائے، ضمانت تو منظور ہوجائے گی نا۔"

اس نے سرہلایا "ہاں، امید تو ہے، مگر کیا پتا۔"

میں نے کہا "اچھا، میں ذرا کاغذات نکال لاؤں۔"

وہ کچھ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ واپس جانے لگی۔ میری بات نے اس کو تھوڑا سا پُرامید کردیا تھا۔ میں نے گیٹ تک چند قدم کا فاصلہ زیادہ بے خوفی کے ساتھ طے کیا۔ ابھی تک سب ٹھیک تھا۔ اندر جانے کے بعد ملکانی ڈرائنگ روم میں پہنچ کے رب نواز کو سوتا ہوا دیکھ لیتی تو اسے جگانے اور صورتِ حال کو سمجھنے میں اسے کم سے کم بھی تین چار منٹ لگ جاتے۔ پھر وہ چلا کے احکامات صادر کرتی کہ پکڑو اس حرام کے جنے شاہ عالم کو تو حکم کے غلاموں کو حرکت میں آنے کے لیے بھی اس سے زیادہ وقت درکار تھا۔

چوکیدار بہت دیر سے اٹین شن کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا۔ پھر ایک کھٹکے سے الیکٹرانک لاک والا گیٹ کھل گیا۔ میرا اگلا قدم مجھے رب نواز ہاؤس کی پُرخطر دیواروں سے باہر لے جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ ٹیکسی باہر موجود ہوگی۔ ابھی تک میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا تھا اور وہ آدھے دن کا کرایہ چھوڑ کے جا ہی نہیں سکتا تھا۔

اچانک اندر سے ایک چیخ ابھری جس نے خاموشی کے وجود کو خنجر کی طرح چیردیا۔ اندر کے نفسیاتی خوف کی لہر میرے جسم میں سردی کی لہر بن کے دوڑی۔ ایک لمحے کے لیے میرے قدم رکے۔ میں نے چوکیدار کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اب سپاٹ نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں فکرمندی سے آواز کی سمت میں چلی گئی تھیں۔

کسی خادمہ نے چلا کے کہا "ملکانی جی! دیکھو، ملک صاحب کو کیا ہوگیا ہے۔"

میں نے باہر قدم رکھتے ہی دروازے کو اپنے پیچھے خود بخود لاک ہوتے سنا۔ ٹیکسی کو میں نے خود ہی گیٹ سے کافی فاصلے پر روکا تھا اور وہ ابھی تک وہیں موجود تھی۔ ونڈ اسکرین کے شفاف شیشے کے پیچھے مجھے ٹیکسی کے ڈرائیور کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ انتظار کی کوفت سے تھک کے سوگیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے ٹیکسی تک چالیس قدم کی مسافت پل صراط کے سفر کی طرح فیصلہ کن ہوگئی ہے۔ میں دوڑ کے ٹیکسی تک پہنچ جاتا اور پھر ڈرائیور کو اٹھانے میں بھی کامیاب رہتا تب بھی اس کو گاڑی اسٹارٹ

کرنے میں وقت لگتا۔ مجھے دوڑ کر آتا دیکھ کے وہ شک میں پڑجاتا اور میں اس سے مطالبہ کرتا کہ اب میرے ساتھ اپنی جان بچاؤ' بھاگو تو شاید وہ دن بھر ساتھ دینے کے معاہدے پر لعنت بھیج کے گاڑی سے اتر جاتا یا مجھے اتار دیتا۔

یکلخت مجھے یہ چالیس قدم کا فاصلہ طے کرنا خودکشی کے مترادف لگا۔ اپنی حفاظت کے سارے امکانات کو مدِنظر رکھنے کے باوجود میری زندگی غیر یقینی ہوگئی تھی اور موت ایک دیوار بن کے میرا راستہ روک رہی تھی لیکن ابھی وقت تھا۔ میں اس دیوار کو عبور کر سکتا تھا۔

ملکانی کسی بھی لمحے چلا کے چوکیدار کو کہہ سکتی تھی کہ شاہ عالم کو روکو۔ اشتعال کی کیفیت میں وہ مجھے گولی مار دینے کا حکم بھی دے سکتی تھی اور چوکیدار کے پاس جو خطرناک مشین گن تھی وہ شاید دو سو گز کے فاصلے پر بھی مجھے چھلنی کر سکتی تھی۔

میں نے رب نواز کے ملک ہاؤس کے مقابل بند دروازوں والا ایک منزلہ گھر دیکھا جو رقبے میں کم نہ تھا مگر اس کا تعمیری رقبہ کم تھا۔ زیادہ حصہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ پرانے طرز کا بنگلا تھا جس کے درودیوار خود اپنی خانہ ویرانی کا افسانہ سناتے تھے۔ بیرونی پھاٹک جس کے گیٹ پر بھاری قفل تھا اور برسوں کی دھوپ' بارش اور سردی گرمی نے زنگ کو رنگ پر غالب کردیا تھا۔ دھندلے اور میلے رنگ کی پپڑیاں جگہ جگہ سے اکھڑ رہی تھیں اور زنگ کی سلطنت وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔

بیرونی دیوار کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ اس پر شوقیہ فنکاروں نے مصوری اور خطاطی کے قابلِ رشک نمونے پیش کیے تھے۔ فلاں کو پھانسی دو' فلاں کو رہا کرو کے مطالبات کے علاوہ لاوارث نظر آنے والی دیوار پر سنسنی خیز تجدید شباب کی ضمانت یوں دی گئی تھی کہ "اسی سال پرانی گاڑی میں زیرو میٹر انجن ممکن ہے۔" دوسرا اشتہار کسی عامل کا تھا جس کی گارنٹی کے مطابق ایک طلسماتی نقش سے محبوب آپ کے قدموں میں۔ یوں جیسے نئے حاکم کا حلف جس کے بول سنتے ہی سیاسی لوٹے اس کے قدموں میں آگرتے ہیں۔

باقی تحریروں کا تعلق ذاتی معاملات سے تھا کہ کون کیا ہے اور کس کی اصل ولدیت کیوں مشکوک ہے۔ میں نے ان پر غور کیے بغیر اور دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک کو ایسے عبور کیا جیسے میرے پیچھے پاگل کتا لگ گیا ہو۔ ایک جست لگا کے میں نے دیوار کو اوپر سے پکڑا اور اندر کود گیا۔ میری اس جراتِ رندانہ نے مجھے بچالیا۔ میں ایک ایسی جگہ گرا جو پہلے کبھی لان ہوگی مگر اب وہاں صرف دھول تھی۔ میں کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ ملک ہاؤس میں شور مچ گیا۔ پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ہونے کے باوجود میں ملکانی کے شیرنی کی طرح دھاڑنے کی آواز سن سکتا تھا۔

وہ چیخ چیخ کے گارڈ سے کہہ رہی تھی "ایسے کھڑے میری شکل مت دیکھو' بے وقوف۔ جاؤ' باہر جاکے اسے تلاش کرو۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ تم بھی جاؤ گاڑی لے کے۔ کسی سے پوچھو۔ اس کی گاڑی باہر کھڑی تھی۔"

درمیان میں پتلی سی سڑک حائل تھی مگر فاصلہ زیادہ نہیں تھا چنانچہ میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا۔ اپنی حفاظت کی فکر نہ رہی تو میں نے بنگلے کے بند دروازوں اور کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ وہاں ہر چیز سال خوردہ اور عدم توجہی کا شکار اور خستہ حال تھی۔ لکڑی کے دروازوں پر برسوں پہلے کیا جانے والا سفید رنگ پیلا پڑنے کے بعد مٹیالا ہوگیا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی گرد کی تہ جم گئی تھی۔ اس کے باوجود رنگ دار TINTED شیشوں کی کوالٹی کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ اگر وہ صاف ہوتے تب بھی باہر سے اندر کا منظر دکھائی نہ دیتا۔

بنگلے کے دو گیٹ تھے اور دائیں بائیں تقریباً ایک ہی فاصلے پر تھے۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی طرف والے گیٹ کا رخ کیا۔ یہ تقریباً ملک ہاؤس کے گیٹ کی سیدھ میں تھا۔ اس کے دونوں پٹ ایسے ملے ہوئے تھے کہ بیچ میں کسی جھری سے باہر جھانکنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ تلاش کرنے پر مجھے کنڈی کے ساتھ نیچے کی طرف آدھے انچ کا ایک سوراخ مل گیا۔ یہاں پہلے الیکٹرانک لاک ویلڈ کرکے لگایا گیا تھا۔ بعد میں کسی وجہ سے لاک ہٹالیا گیا اور سوراخ باقی رہ گیا۔ اب فولادی سریوں کی بھاری کنڈیوں میں بڑے بڑے کھٹکے سے بند ہوجانے والے قفل پڑے ہوئے تھے۔

یہ بات مجھے عجیب لگی کہ کہنگی کے اس ماحول میں جہاں ہر چیز مالکوں کی عدم موجودی پر اداس اور شکوا خواں نظر آتی تھی' وہاں یہ نئے تالے اپنی چمک دمک اور بناوٹ سے بالکل الگ اور اجنبی لگتے تھے۔ ان کے مقابلے میں باہر سے لگائے جانے والے قفل پرانی وضع کے لیور والے تھے جو عام طور پر علی گڑھ کے تالے کہلاتے تھے۔ اس بات نے بھی مجھے حیران کیا کہ باہر سے گیٹ مقفل کرنے کے بعد اندر نئے تالے ڈالنے میں مصلحت یا دانائی کی کیا بات تھی۔ آنے والا تو میری طرح کہیں سے بھی دیوار پھاند کے آسکتا تھا۔

تاہم اس وقت مجھے اس دہرے حفاظتی نظام کے مقصد

پر غور کرنے کی ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ میں نے رکوع کی حالت میں گیٹ کے سوراخ سے آنکھ لگا کے باہر جھانکا۔ جس چوکیدار نے چند منٹ پہلے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا تھا وہ اب بڑے قاتلانہ انداز میں کلاشنکوف اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور اس فوجی کی طرح نظر آتا تھا جو خندق کے مورچے سے باہر آکے دشمن کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے بعد خود بھی جان دینے کا فیصلہ کرچکا ہو۔ سامنے کوئی بھی نہیں تھا مگر وہ کلاشنکوف کو دائیں بائیں گھما رہا تھا اور خود سے پوچھ رہا تھا "کدھر گیا' کہاں گیا' ابھی تو یہیں تھا؟"

اس کو پیچھے سے کسی نے دھکا دیا "سامنے سے ہٹ۔"

چوکیدار لڑکھڑا کے آگے گیا اور کلاشنکوف سمیت سیمنٹ کے RAMP جیسے چکنے فرش پر گر گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دھکا دینے والے کو خونیں نظروں سے گھورا "پاگل دے پتر' اندھا ہے کیا۔"

دھکا دینے والا غرایا "تیرا کام ہے چوکیداری کرنا۔ کتے' بھونک مت اور گیٹ کھول۔ گاڑی نکالنی ہے۔"

پھر تیسرا شخص برآمد ہوا اور اس نے عقابی نظروں سے سڑک پر دائیں بائیں دیکھا۔ رب نواز کے سارے ملازم طویل قامت' مضبوط جسم والے اور کسی حد تک بدشکل تھے۔ اس میں کچھ قصور ان کی موروثی جہالت کا تھا۔ تعلیم اور تہذیب سے چہرے پر اور انداز اطوار میں جو نرمی اور انکساری آجاتی ہے' وہ اس سے محروم تھے۔ کچھ قصور ان کے اعمال کا تھا جن کا عکس ان کی صورتوں پر بدصورتی بن کے نظر آتا تھا لیکن اصل وجہ ان کی فطری جسمانی ساخت اور نسلی صفات تھیں۔ شاید ان کا تعلق میانوالی جیسے کسی علاقے سے تھا جہاں ایسے ہی دراز قد' سخت جان' مضبوط جسم اور جارحانہ تیور والے جوان نظر آتے ہیں۔ لمبے تیل سے چپکتے بالوں کے پٹے اور نکیلی مونچھیں پال کے وہ چہرے سے بھی خطرناک نظر آنے لگتے ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور میں نے چھوٹی گاڑی کو باہر آتا دیکھا۔ ایک آدمی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا' یہ سرخ رنگ کی آلٹو وہی تھی جو رب نواز نے شبنم کی گاڑی "چوری" ہوجانے کے بعد استعمال کے لیے پیش کرکے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس میں مسلسل سگنل نشر کرنے والا ایک آلہ نصب کرنے کا مقصد شبنم کے ٹھکانے کا سراغ لگانا تھا لیکن خوبیٔ قسمت سے رب نواز کی یہ اسکیم فیل ہوگئی تھی۔ ہم نے اس آلے کا سراغ لگا کے اسے ناکارہ بنادیا تھا۔

گاڑی گلی کی ایک سمت میں تیزی سے گئی۔ ڈرائیور نے اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے ہر گلی میں مجھے تلاش کیا ہوگا اور ان سب لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی جو اس وقت وہاں موجود تھے یا وہاں سے گزر رہے تھے۔ لیکن گیٹ کے سوراخ سے میں آخر تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے ملک ہاؤس کا گیٹ پھر بند ہوچکا تھا۔ چوکیدار نے تلاش کے کام کو اپنی ذمے داری کے دائرے سے باہر سمجھتے ہوئے خود کو اندر تک محدود کرلیا تھا۔

اب مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر ہوئی۔ یہاں میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ابھی تک ٹیکسی ڈرائیور مطمئن تھا۔ میں اس کی نظروں کے سامنے ملک ہاؤس میں داخل ہوا تھا اور اس نے مجھے باہر آتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچھ دیر اور اسی جگہ میری واپسی کا انتظار کرسکتا تھا مگر اس انتظار کی ایک حد تھی۔ اگلے دو تین گھنٹوں میں شاید اس کا حوصلہ جواب دے جاتا اور شام کے بعد رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا تو اس کی پریشانی اتنی بڑھ جاتی کہ وہ گیٹ تک جاکے چوکیدار سے میرے بارے میں پوچھتا کہ جس صاحب نے ٹیکسی دن بھر کے لیے لی تھی کیا وہ اندر ہی ہے۔ اگر ہے تو اس سے پوچھو کہ ابھی واپسی میں دیر ہے تو بتادے۔ میں ایک پیالی چائے کی پی لوں کہیں جاکے۔ دوپہر سے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا۔

یہ سوال کرکے ٹیکسی ڈرائیور مشکل میں پڑجاتا۔ ملکانی خود اس سے تفتیش کرتی اور ہوش میں آنے کے بعد ملک خود اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دے کر پوچھتا کہ وہ مجھے کہاں سے لے کر آیا تھا اور ملک ہاؤس پہنچنے سے پہلے کہاں کہاں لے گیا تھا۔ ظاہر ہے ٹیکسی ڈرائیور اسے سب بتا دیتا لیکن وہ میرے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسے راہ چلتے سڑک پر روکا تھا۔

رب نواز کے ساتھ میری میٹنگ غیر متوقع طور پر طویل بھی ہوگئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا کہ باتوں میں چار گھنٹے گزر جائیں گے۔ میں کسی کو کچھ بتا کے نہیں آیا تھا اور موجودہ حالات میں میرا چار گھنٹے تک غائب رہنا سب کو تشویش میں مبتلا کرسکتا تھا۔ صرف فرید عباسی کو معلوم تھا کہ میرا قیام کہاں ہے مگر وہاں ہوٹل کی انتظامیہ میری خواہش کے احترام میں مکمل رازداری برتنے کی پابند تھی۔

یہ ہوسکتا تھا کہ ان چار گھنٹوں میں رئیس کا سراغ مل گیا ہو یا فرید عباسی اور شبنم کی کوشش سے پولیس نے اسے "برآمد" کرلیا ہو۔ یہ میری ذمے داری تھی کہ ان سے رابطے میں رہوں۔ اب میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا مگر باہر

میری جان کے دشمن شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

بظاہر اس گھر سے باہر نکلنے کے دونوں راستے ایک ہی سڑک پر کھلتے تھے۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کہیں میں آسمان سے گر کے کھجور میں تو نہیں اٹک گیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں رات تک کے لیے اسی ویرانے میں قید ہو جاؤں اور رات کی تاریکی کی پناہ ملنے تک باہر نکلنا اتنا ہی مشکل ہو جائے جتنا ملک ہاؤس کے گیٹ سے ٹیکسی تک پہنچنا خطرناک ہو گیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کو پہلے رخصت کرنا ضروری تھا۔ لیکن پیسے لیے بغیر وہ بھی یہاں سے نہ ٹلتا اور ایسی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ میں اسے طے شدہ کرایہ ادا کروں اور کہوں کہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔

وقتی طور پر حالات کچھ کم خطرناک ہو گئے تھے۔ میری تلاش میں جانے والے آس پاس کی سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور ملک ہاؤس کا گیٹ بھی بند تھا۔ میں نے سوچا کہ میدان، خالی ہے تو ایک زقند میں تیر کی طرح ٹیکسی تک جاؤں اور نکل جاؤں لیکن میں نے چانس لینا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تلاش کرنے والے کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتے تھے اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر سکتے تھے۔ انھیں کامیابی کا موقع فراہم کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی۔

میں نے گھر کا جائزہ لیا۔ سامنے والے حصے میں تقریباً آدھے کنال پر لان اور باغ کی جگہ تھی۔ عدم توجہی کے باعث لان کب کا ختم ہو چکا تھا۔ سرسبز ہموار گھاس سوکھ گئی تھی اور اس کی جگہ جنگلی گھاس کے لمبے لمبے نکیلے پتے لہرا رہے تھے۔ خودرو جھاڑ جھنکاڑ پودے اور جھاڑیاں اگنے سے یہ جگہ ایک قدرتی جنگل کی طرح ہو گئی تھی۔ اگر کبھی یہاں پھولوں کے پودے تھے تو وہ نیست و نابود ہو چکے تھے لیکن درخت خوب پھیل گئے تھے۔

اندر آنے والے راستے' پورچ اور برآمدے کے علاوہ اندر کی گلی میں سوکھے پتے تنکے اور گرد و غبار کے ڈھیر میں کاغذوں کے ٹکڑے ہر جگہ پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گھر میں کم سے کم پانچ سال سے کسی انسان نے قدم نہیں رکھا لیکن اور سے دیکھنے پر مجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔

میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے منہ لگا کے آواز دی "ہیلو۔ اندر کوئی ہے" مگر میری آواز خاموشی میں بازگشت بن کے کھو گئی۔ شیشے سے ہاتھ اندر ڈال کے میں نے کنڈی کھولی تو وہ آسانی سے کھل گئی۔

کھڑکی سے اندر کود کے میں نے ہاتھوں کی گرد صاف کی اور دائیں جانب مقابل کی دیوار کے آخری دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ مجھے ایک کوریڈور میں لے گیا۔ بارہ فٹ چوڑی راہداری کی چھت اوپر سے نصف دائرے کی شکل میں تھی اور آخر تک کسی سرنگ کے اوپر والے آدھے حصے جیسی لگتی تھی۔ اس محرابی چھت کی تعمیر میں لکڑی اور شیشے کا استعمال زیادہ ہوا تھا۔ شیشے جب صاف کیے جاتے ہوں گے تو دن کی دھوپ سے راہداری میں قدرتی روشنی بھر جاتی ہو گی۔ اس وقت بھی گرد آلود شیشوں کی وجہ سے راہداری مکمل نور' پر تاریک نہیں تھی۔

راہداری کے دونوں جانب چار چار دروازے تھے۔ یہ برنائیک کے پالش والے منقش دروازے تھے جو سب مقفل تھے۔ یہ شاید بیڈ روم وغیرہ تھے جن کو اس کوٹھی کے مالکوں نے جاتے ہوئے بند کر دیا تھا۔ باہر کی دیکھ بھال کے لیے وہ ایک چوکیدار کو چھوڑ گئے تھے جس کی رہائش کچن تک محدود تھی۔ مالک لوٹ کر ہی نہ آئیں تو ذمے داری کے ساتھ دیکھ بھال کون کرے؟ چوکیدار کبھی کبھی آ کے دیکھ لیتا ہو گا کہ کوٹھی کے دروازے سلامت ہیں اور تالے کسی نے نہیں توڑے یا ممکن ہے وہ دن میں کہیں اور ملازمت کرتا ہو اور رات کو یہاں سونے کے لیے آ جاتا ہو۔

زینہ مجھے دائیں جانب درمیان میں نظر آیا اور میں اس خیال سے اوپر چڑھ گیا کہ چھت سے سڑک کا جائزہ لوں۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا' وہاں ایک دروازہ تھا جو اندر کی طرف سے بند تھا۔ میں کنڈی کھول کے کھلی چھت پر طلوع ہوا تو سہ پہر کا سورج ڈھل چکا تھا۔

چھت پر دو تخت بچھے ہوئے تھے اور ان پر بستر لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ ایک ٹی وی کا انٹینا صحیح حالت میں نصب تھا۔ پیچھے کی طرف آخری حصے میں ٹوٹے ہوئے فرنیچر کا ڈھیر تھا۔ بستروں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ کوٹھی میں چوکیدار ٹائپ کے کم سے کم دو افراد رات کو سونے کے لیے ضرور آتے ہیں اور وہی کچن کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

سڑک کی طرف والی منڈیر پانچ فٹ سے زیادہ بلند تھی۔ میں نے محتاط رہتے ہوئے سر کو تھوڑا سا اوپر نکال کے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ مجھے تلاش کرنے والے ناکام لوٹ آئے تھے۔ سرخ رنگ کی آٹو گیٹ کے سامنے کھڑکی ہوئی تھی اور اندر شاید حکم کے غلام ملکانی کو یا خود ملک کو بڑی شرمندگی کے ساتھ اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر رہے تھے۔

ٹیکسی بائیں جانب اتنے فاصلے پر تھی کہ میں ڈرائیور کو آواز دے کر متوجہ کرتا تو میری آواز پر ملک ہاؤس کا گیٹ کیپر پہلے متوجہ ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور جاگنے کے بعد باہر آ گیا تھا اور اب بونٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے بے چینی یا اضطراب کی کیفیت کا بالکل اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار اس کی نظر میری طرف بھی اٹھی مگر اس نے میری صورت پر غور نہیں کیا ورنہ وہ چونکتا یا مجھے نظر بھر کے دیکھتا۔

اس وقت اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے ادھر ادھر کوئی ایسی چیز تلاش کی جس سے میرا کام آسان ہو جائے۔ کاٹھ کباڑ فرنیچر کے ڈھیر میں سے میں نے دو انچ لمبا لکڑی کا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اس پر میں نے پانچ سو کا نوٹ لپیٹ دیا۔ پھر مجھے اس کا وزن کم لگا۔ میں نے اس سے بڑا ٹکڑا تلاش کیا۔ یہ کسی کرسی کے بازو کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا۔ اس کی لمبائی چھ انچ سے کچھ زیادہ تھی۔ بستر کھول کر دیکھنے پر مجھے تکیے کا غلاف ادھڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے ایک پتلی سی دھجی پھاڑ کے الگ کی اور اسے نوٹ پر باندھ کے گرہ لگا دی۔ اب یہ رقم ٹیکسی ڈرائیور کو بائی ائر منی آرڈر روانہ کی جا سکتی تھی۔

چھت کی منڈیر کے اوپر سے میں نے نشانہ لے کر لکڑی کے ٹکڑے کو پوری طاقت سے پھینکا اور جب وہ بیزار کھڑے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کے پاس جا کے گرا تو مجھے خوشی ہوئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چونک کے لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھا۔ اس کا پہلا ری ایکشن خفگی کا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر کس خبیث بچے نے اس کو یہ لکڑی مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نظر ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی میری طرف آئی تو میں نے ہاتھ ہلایا۔

ٹیکسی ڈرائیور دم بخود رہ گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا مگر اس کی عقل یہ معما حل کرنے سے قاصر تھی کہ بائیں جانب کی کوٹھی میں داخل ہونے والا دائیں طرف کی کوٹھی کی چھت پر کھڑا کیا کر رہا ہے؟

میں نے پھر ہاتھ ہلایا اور اشارے سے اس کو لکڑی کے ٹکڑے کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ نوٹ دیکھ کر وہ پھر بھونچکا رہ گیا اور اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ یہ نوٹ جیب میں رکھ لو اور جاؤ۔ وہ کچھ دیر مجھے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا۔ میں نے اشاروں کی زبان میں اپنی بات پھر سمجھائی اور اس نے سر ہلا کے واضح کیا کہ بات تو خیر اس نے سمجھ لی ہے مگر یہ چکر کیا ہے آخر؟ میں نے تیسری بار زیادہ اصرار کے انداز میں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔

وہ آدمی اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ تجسس میں مبتلا رہنے کا خطرہ مول لیتا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن دال کون سی ہے اور اس میں کالا کالا کیا ہے اور کیوں ہے؟ ایسے سوالوں میں پڑنا اس کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنا پانچ سو وصول کر کے خیر و عافیت کے ساتھ اس جگہ سے بھاگ جانا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مشکوک اور شاید پُرملامت نظروں سے دیکھا کہ تم دیکھنے میں تو ایسے پُراسرار آدمی نہیں لگتے تھے پھر ایک منٹ میں وہ ٹیکسی کو بھگا کے لے گیا۔

ویری گڈ! میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ایک کام اور ٹھیک ہو گیا۔ اب مسئلہ رہ گیا یہاں سے نکلنے کا۔ تو جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

جس چھت پر میں کھڑا تھا وہ ساتھ والے گھر کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ ان کی حد بندی کرنے والی دیواریں بھی الگ الگ مگر آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ گھر کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ یہ خاموشی اعتراف کرتی تھی کہ وہاں چھوٹے بچے نہیں ہیں جو کچھ بھی نہ کریں تو لڑتے ہیں۔ روتے چلاتے ہیں۔ چیخیں مار کے خوش ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے اور کھلونوں سے باتیں کرتے ہیں اور چیزیں گراتے ہیں۔ توڑتے ہیں اور ادھر سے ادھر کرتے ہیں۔ پھر ان کا خیال رکھنے والے مسلسل بولتے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے' خبردار جو ایسا کیا۔ باز آ جاؤ شرارت سے ورنہ۔۔۔ یا میرے خدا!

گھر میں سے کسی ریڈیو ٹی وی یا ڈیک کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کوئی دروازہ کھولنے بند کرنے کی آواز نہیں تھی اور کسی کے باتیں کرنے کی آواز نہیں تھی۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا کہ گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں یا گھر میں ایک ہی شخص ہے جو خود اپنے آپ سے باتیں نہیں کر سکتا۔ کوئی اکیلا ملازم' کوئی بوڑھا باپ یا بوڑھی ماں۔

میرے لیے رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں خود کو ہاتھوں کے سہارے اوپر اٹھایا اور ٹانگیں سیدھی رکھتے ہوئے دیوار عبور کر گیا۔ دوسری چھت پر اترتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ میرے قدم آہستگی سے پڑیں۔

زینے کا راستہ میرے سامنے تھا۔ اس کی پوزیشن بتاتی تھی کہ یہ مجھے باہر پورچ کی طرف لے جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ نیچے پہنچنے کے بعد میں نے ٹی وی کی آواز سنی۔ اندر کوئی بہت کم والیوم پر ایک بہت پرانی فلم دیکھ رہا تھا۔ گیلری کی طرف ایک کھلی کھڑکی کے سامنے سے میں جھک کے گزرا تو میں نے دلیپ کمار اور راج کپور کی آواز میں جانے پہچانے ڈائیلاگ سنے۔ پھر ایک مشہور گانے کا میوزک شروع ہوا جو مکیش نے گایا تھا تو میں سمجھ گیا کہ کسی نے وی سی آر پر فلم "انداز" لگا رکھی ہے۔ اپنے وقت کی یادوں کو تازہ کرنے والے پرانے لوگ ہی ہوسکتے تھے۔ نئی نسل کی پسند ایتابھ اور سلمان خان کی ایکشن رومانس اور بے ہنگم گلے والی موسیقی پر ڈانس کی فلمیں تھیں۔

دیوار کے ساتھ لگ کے میں نے اندر موجود افراد کی تعداد کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ گانا ختم ہوا تو ایک عورت نے کہا "کتنا درد تھا مکیش کی آواز میں بھی؟"

اتنی ہی عمر رسیدہ آواز میں مرد بولا "ہاں۔ اب ایسے گانے کہاں بنتے ہیں۔ یاد ہے' یہ فلم ہم نے کہاں دیکھی تھی؟"

"شاید راولپنڈی میں؟ تم میجر تھے۔"

"کیپٹل سینما میں لگی تھی یہ فلم۔ صدر میں' بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔"

وہ پھر خاموش ہوگئے۔ میں سائڈ سے نکل کے برآمدے میں آگیا۔ اندر جانے کے لیے دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک بند تھا۔ شاید یہ ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ باہر والے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور کسی نے جاتے ہوئے گیٹ کو ایک ہک پھنسا کے بند کردیا تھا۔ اندر سے گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ایسا شاید بڈھے بڑھیا کو باہر آکے گیٹ کھولنے کی زحمت سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ کچھ حیرانی اور افسوس کی بات تھی کہ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلے تھے۔ ان کا خیال رکھنے والا کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔

میں نے دوسرے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سے عورت نے پوچھا "کون؟ رضوان بیٹا! تم آگئے" اس کے کان یقیناً بہت تیز تھے۔

میں جواب دیے بغیر خاموشی سے ان کے سامنے پہنچ گیا۔ بیڈ پر ستر سال سے زیادہ عمر کا ایک بوڑھا نیم دراز تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کے سر' پلکوں اور بھوؤں کے سارے بال سفید تھے لیکن اس کا چہرہ اب بھی سرخ و سفید اور بارعب تھا۔ عورت شاید اس سے عمر میں دس سال چھوٹی ہوگی مگر وہ اتنی موٹی تھی کہ کرسی میں پھنسی ہوئی تھی۔ ٹی وی ان دونوں کے بالکل سامنے چند فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ کونے میں رکھا ہوا تھا۔ وی سی آر اور ٹی وی کے دو کنٹرول بوڑھے کے ہاتھ میں تھے۔

اچانک اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ خوف سے سُن ہوگئے۔ عورت نے چیخ مارنے کے لیے اپنا منہ کھولا اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مرد نسبتاً پُرسکون انداز میں پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔

عورت نے دہشت سے کانپتی آواز میں پوچھا "کو۔ کون ۔۔۔ ہو تم۔ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے انتہائی عاجزی سے بات کی "دیکھیے' میں اس طرح اندر آجانے پر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

مرد نے ایک ریموٹ سے ٹی وی اور دوسرے سے وی سی آر بند کردیا اور پھر دونوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ جب اس کا ہاتھ تکیے سے باہر آیا تو اس میں ایک فوجی ساخت کا اعشاریہ چار پانچ کیلیبر والا ریوالور تھا "یہ میری بیوی کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تمہیں دس سیکنڈ دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے انگریزی میں کہا۔

"میرے پاس تمہیں شوٹ کرنے کا جواز ہوگا۔ کرنل نظام بوڑھا ہوگیا ہے لیکن اس کے ہاتھوں میں دم ہے اور اس کا نشانہ آج بھی خطا نہیں ہوتا۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھالیے "مجھے اس دعوے کی صداقت میں کوئی شک نہیں سر!"

اس نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں۔ "کوئی چور ڈاکو یہ سمجھے کہ بوڑھے کرنل کے اکیلے یا بیمار ہونے سے اس کو موقع مل جائے گا۔"

میں نے کہا "پلیز سر! الزام لگانے اور سزا دینے کا اختیار آپ کے پاس ہے مگر مجھے بھی توصفائی میں کچھ کہنے کا حق ملنا چاہیے۔"

میرے لہجے سے عورت کچھ متاثر ہوگئی تھی اور اس کا خوف بھی کم ہوگیا تھا "اگر تمہیں کوئی سوال کیے بغیر بھی گولی ماردی جائے تو یہ قتل عمد نہیں سمجھا جائے گا۔ ہم گھر میں گھس آنے والے چور ڈاکو کو ہلاک کرسکتے ہیں۔"

"لیکن میں چور ڈاکو نہیں ہوں میڈم! میں کچھ لوٹ کر لے جانے کی نیت سے نہیں آیا تھا" میں نے کہا۔

"لیکن تم TRESPASS کے مجرم ہو۔ کیا اس سے

انکار کرسکتے ہو تم؟" کرنل نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں لیکن مجھے مجبوری میں ایسا کرنا پڑا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں اندر آگیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے" میں نے کہا "آپ تلاشی لے کر دیکھ لیں۔"

کرنل کی بیوی نے ہمدردی کے ساتھ میری سفارش کی۔ "نظام۔ اس لڑکے کو موقع دو۔ یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"اوکے۔ میں تمہیں تیس سیکنڈ دیتا ہوں" کرنل نے کہا۔

میں نے کہا "میرے کچھ دشمن میرا تعاقب کررہے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے میں ساتھ والے گھر کی دیوار پھاند کے اندر چلا گیا۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ میرے دشمن اس سڑک پر مجھے تلاش کرتے رہے۔ میں نے چھت پر سے دیکھا۔ غالباً انہیں یقین ہے کہ میں نے کسی گھر میں پناہ لے لی ہے۔ وہ باہر ابھی تک پوری سڑک کی پٹرولنگ کررہے ہیں۔ اگر میں باہر نکلا تو وہ مجھے گلی کے کتے کی طرح گولی مار کے گرادیں گے اور چلے جائیں گے۔ میں اوپر والی دیوار کو پھاند کے آپ کے گھر کی چھت پر اترا اور زینے سے نیچے آگیا۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو" کرنل نے میری بات بڑے دھیان سے سن کے سوال کیا۔

"نو سر۔ کیا میں بیٹھ جاؤں؟"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر سرہلادیا "ٹھیک ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ اور مجھے اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

میں نے کہا "میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں اسی شہر کا ایک معزز سمجھا جانے والا بزنس مین ہوں اور بہت سے معتبر حوالے رکھتا ہوں۔"

"FOR EXAMPLE؟"

میں نے ڈاکٹر کمال اور نیلم کے بعد کرنل خان کا حوالہ دیا "وہ میرے لیے ایک باپ کی طرح تھے۔ آج میں جو بھی ہوں انہی کی وجہ سے ہوں۔"

بوڑھا کرنل چونکا "کون کرنل خان؟ کیا اس کا تعلق انیس بلوچ رجمنٹ سے بھی تھا؟"

"یس سر۔ اور اس سے پہلے چودہ پنجاب!" میں نے کہا۔

بوڑھے کرنل کے چہرے پر اعتماد اور خوشی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ریوالور کو تکیے کے نیچے رکھ دیا "اس کی صرف ایک بیٹی تھی؟"

میں نے کہا "جی۔ چاندنی خانم۔ مگر وہ اس کی بیٹی نہیں' پوتی تھی۔"

"میں چیک کررہا تھا کہ تم اسے کس حد تک جانتے ہو۔ کہیں تم اس حوالے کو جان بچانے کے لیے تو استعمال نہیں کررہے ہو؟"

"پھر' اب یقین آگیا ہے آپ کو؟ کہ میں شریف آدمی ہوں؟"

عورت نے کہا "کرنل صاحب ۔۔۔ مجھے اس نوجوان سے کچھ پوچھنے دو۔"

وہ خفت سے مسکرایا "اوہ یس۔ ضرور پوچھو۔"

عورت نے میری طرف دیکھا "وہ کون ہیں جو تمہاری جان لینا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا "ویسے تو اس سوال کا بہت لمبا جواب ہے مگر میں مختصراً بتاتا ہوں۔ وہ میرے کاروباری پارٹنر تھے۔ ہم بالکل جائز قسم کا بزنس کرتے تھے پھر ان کو لالچ نے گمراہ کردیا۔ انہوں نے بہت زیادہ منافع کے لیے ایک ایسا بزنس بھی شروع کردیا جو غیر قانونی' غیر اخلاقی اور میرے نقطۂ نظر سے وطن دشمنی کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں ان سے الگ ہی نہیں ہوا' میں نے ان کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں اوپر والوں کو بتادیا۔"

"کون اوپر والے؟" کرنل بولا۔

میں نے کہا "ان کے بہت سے نام ہیں۔ مجاز اتھارٹی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے۔ اعلیٰ اختیار رکھنے والے حکام۔"

"پھر کیا وہ مشکل میں پڑگئے۔"

"نہیں۔ میں مشکل میں پڑگیا۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں" میں نے کہا۔

کرنل مسکرانے لگا۔ "اب ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں سبق حاصل ہوگیا لیکن کیا تم ڈر گئے ہو۔ یہ سمجھنے لگے ہو کہ تم نے غلطی کی تھی؟"

"NOT AT ALL" میں نے کہا "میں ان کا مقابلہ کررہا ہوں اور ہوسکتا ہے کسی دن اپنی اس احمقانہ جذباتی سوچ کی وجہ سے مارا جاؤں۔"

"اس سوچ کو تم جذباتی کہہ سکتے ہو۔ احمقانہ ہرگز نہیں۔ سب ایسا سوچنے لگیں تو دنیا میں جج نہ رہے۔ قانون کی حکمرانی نہ رہے۔ یہ انسانوں کی دنیا درندوں کا جنگل بن جائے لیکن تمہیں عقل کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ خدا تمہارے ساتھ ہے اور اب یہ بتاؤ کہ ہم تمہاری کیا مدد کرسکتے ہیں؟" اس نے کلائی کی

گھڑی میں وقت دیکھا۔

میں نے کہا "آپ کی ایک گاڑی باہر کھڑی ہے اور غالباً دوسری باہر گئی ہوئی ہے۔"

اس نے سہلایا "یہ تم نے کیسے جانا؟"

میں نے کہا "صرف آبزرویشن سے۔ تیل کے داغ دیکھ کر اور کھڑی ہوئی گاڑی کے کور کو دیکھ کر۔"

عورت نے کہا "میرا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گیا ہے۔ بچوں کو اسکول کی نئی یونیفارم اور جوتے دلوانے کے لیے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

"یہی تو پرابلم ہے ان نوجوانوں کی۔ یہ کسی پلان کے مطابق نہیں چلتے اور ٹائم ان کے نزدیک غیر اہم ہے حالانکہ یہ دنیا اور کائنات کی ہر چیز انتہائی نظم وضبط اور پلان کے مطابق بڑی ACCURACY کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہ ڈسپلن نہ ہو تو سورج کبھی مشرق سے نکلے کبھی مغرب سے۔ ایک دن سات بجے نکلے تو اگلے دن ساڑھے سات بجے اور کہہ دے سوری' آج ذرا لیٹ ہوگیا۔"

عورت نے کہا "کرنل صاحب۔ آپ تو بس شروع ہوجاتے ہیں۔"

کرنل نے ایک ٹھنڈا سانس لیا "وقت کتنا بدل گیا ہے۔ اب کرنل نظام کی بات صحیح ہو تب بھی کوئی سننے والا نہیں۔ ورنہ وہ ایک بار کہتا تو پوری رجمنٹ اٹین شن ہو کے ایک ٹانگ پر کھڑی ہوجاتی۔"

عورت نے کہا "اب تم باہر کیسے جاؤ گے؟ اگر تم چاہو تو فون کر کے پولیس کو بلا سکتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی گاڑی میں نکل جاؤں۔"

کرنل نے کہا "میری گاڑی میں؟ اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ جذباتی ہو کے اپنی گاڑی کی چابیاں تمہیں تھمادوں۔"

میں نے کہا "آپ نے غلط سمجھا۔ میں آپ کی گاڑی میں چھپ کر جاسکتا ہوں۔ اگر میرے دشمن باہر کہیں موجود ہوں گے تو انہیں بالکل شک نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ کی گاڑی تو آتی جاتی رہتی ہے اور وہ ہر گاڑی کو تلاشی کے لیے روک بھی نہیں سکتے۔"

"کس کی ہمت ہے کہ کرنل نظام کا راستہ روکے لیکن افسوس یہ ہے میں ڈرائیو نہیں کرسکتا' میں بیمار ہوں۔"

میں نے کہا "میں یہ EXPECT بھی نہیں کرتا۔ آپ مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ انہیں سمجھا بھی سکتے ہیں۔"

اس نے کچھ دیر سوچا "یہ ہو سکتا ہے لیکن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا کچھ دیر۔"

میں نے کہا "مجھے اتنی جلدی بھی نہیں۔"

عورت ہمت کر کے کراہتی ہوئی اٹھی "چائے کا وقت ہوگیا ہے۔ آج اتفاق سے کوئی نوکر بھی نہیں ہے گھر میں۔"

"بڑا مبارک اتفاق ہے۔ یہ جو نوکر ہے ہمارا' یہ بچہ تھا جب یہاں آیا تھا۔ بھیک مانگتا ہوا۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ بڑی کوشش کی میں نے مگر اس نے پڑھ کے نہیں دیا' چار جماعتوں سے آگے۔ ویسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے کا بڑا شوق ہے۔ بیس سال میں ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا ہے۔ ہم نے پچھلے مہینے اس کی شادی کرادی۔ اب وہ بیوی کے ساتھ گیا ہے گھومنے۔ ہنی مون پر۔ جانے پر راضی نہیں تھا۔ میں نے زبردستی بھیجا ڈانٹ کر۔ میں نے کہا کہ گزارا کرلیں گے ہم ایک ہفتے۔ بہو کالج میں پڑھاتی ہے۔ اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔"

کرنل کی بیوی دس منٹ بعد چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی واپس آئی تو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ باتونی کرنل اس کا مذاق اڑانے لگا "تم یقین کرو گے کہ یہ ایک بہت دبلی پتلی اور تباہ کن لڑکی تھی۔ اس نے نوجوان کیپٹن نظام کے دل کو ہیروشیما سمجھ کے اپنے حسن کا ایٹم بم ایسے گرایا تھا کہ کچھ نہیں بچا تھا۔ سوائے ایک شوہر کے۔ اور اب دیکھو' اس نے کیا حال کیا ہے اپنا۔ تم نے عشق کیا ہے کبھی؟"

میں نے اس اچانک سوال پر بوکھلا کے کہا "جی۔۔۔ جی کئی بار۔"

"ویری گڈ! عشق جتنی بار موقع ملے کرنا چاہیے لیکن شادی کا موقع بار بار ملے تب بھی ایک ہی کرنی چاہیے۔"

کرنل کا ہونق لڑکا اس وقت نمودار ہوا جب ہم چائے پی چکے تھے۔ وہ تیس سال کا جوان آدمی اپنے باپ کے مقابلے میں بہت کم خود اعتماد لگتا تھا۔ شاید کرنل نے اس کی پرورش میں سخت ڈسپلن سے کام لیا تھا اور اس کی شخصیت کو آزادانہ طور پر خود نمائی کا موقع فراہم کرنے کے بجائے اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد میں آدھی کامیابی یا آدھی ناکامی نے بیٹے کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنادیا تھا۔ نہ وہ باپ کی طرح کرنل جنرل بن سکا اور نہ مصور۔ (جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا)

اسے بیوی بھی بہت دبنگ اور DOMINATING نیچر کی ملی تھی۔ اس نے باپ کی بات سن کے مجھے دیکھا اور بے

چینی سے بولا "ڈیڈ۔ کہیں ہم کسی مشکل میں نہ پڑجائیں ایک اجنبی کی مدد کر کے۔"

"ایڈیٹ۔ اب یہ کوئی اجنبی نہیں رہا۔ جانتے ہو' اس کی پرورش کس نے کی؟ کرنل خان نے۔"

اس کی بیوی نے شوہر کو نظروں ہی نظروں میں ہمت پر اکسایا "آپ سوچ لیں۔ باہر تو آپ نے بھی جانا ہوتا ہے۔"

اس کے سسر نے اسے بھی ڈانٹا "کیا عورتوں کو ضرور مشورہ دینا چاہیے ایسے معاملات میں۔ جن کا ان کی ناقص عقل احاطہ نہیں کرسکتی۔"

بہو نے سخت برا منایا "آخر لیکچرر ہوں میں' بچوں کو پڑھاتی ہوں۔"

"تمہارا شوہر بچہ نہیں ہے۔ اور نہ تمہارا اسٹوڈنٹ۔ چلو جاؤ" کرنل بگڑ گیا "رضوان۔ تم ابھی باہر گئے تھے تو کیا کسی نے تمہیں روکا تھا؟ شام تک تم دس بار باہر جاؤ گے۔ جیسے ہمارے آس پاس کے لوگ آجا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے ڈکی میں کون دیکھ سکتا ہے۔"

رضوان مان گیا "ٹھیک ہے۔ مگر آپ جائیں گے کہاں؟"

میں نے اسے تین چوائس دیے۔ فلم اسٹار نیلم کے گھر' شبنم کے اخبار کے دفتر یا کمال اسپتال میں جہاں کرنل خان کی بیٹی چاندنی رہتی ہے۔ فیصلہ اس کے باپ نے کیا "تم کمال اسپتال جاؤ۔ کرنل خان کی بیٹی سے ملو' اس کو بولنا کہ تمہارا ایک انکل ہے کرنل نظام۔ وہ مجھ سے ضرور ملے۔"

رضوان نے مظلوم شکل بنالی "ڈیڈ! آپ تو ہر کرنل کے دوست بن جاتے ہیں۔ پہلے تو کبھی آپ سے کسی کرنل خان کے بارے میں نہیں سنا۔"

اس کی بیوی نے فوراً گرہ لگائی "اور اب دیکھے بغیر اس کی بیٹی کے انکل بھی بن گئے۔ آج تک اس کرنل برادری نے کبھی پوچھا ہے آپ کو؟"

کرنل نظام کے چہرے پر ایک دکھ بھری افسردگی طاری ہوگئی "اب باقی کون بچا ہے جو پوچھے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں جانے والا۔ تم کیا جانو ہم سب کے درمیان کیسا رشتہ تھا۔ ہم ایک ساتھ کیسے جیے۔ ایک ساتھ کہاں کہاں لڑے۔ فتح مند بھی ہوئے' موت کے مقابل بھی گئے اور شکست کھا کے قید میں بھی رہے۔ بس ایک ساتھ مر نہ سکے۔۔۔ اور اگلی نسل یہ سب نہیں جانتی۔ جان لے تو مانتی نہیں کہ یادوں کا بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے۔"

رضوان نے مجھے اشارہ کیا اور میں کرنل سے ہاتھ ملا کے اس کا شکریہ ادا کر کے اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے باہر آگیا۔ رضوان کے پاس چھپای ماڈل کی کارولا تھی جس کی ڈکی اتنی بڑی تھی کہ میرے جیسے دو سما جاتے۔

اس نے کچھ ناگواری سے کہا "بس اب ڈیڈی پر پڑ گیا دورہ۔"

میں نے کہا "کیسا دورہ؟"

"NOSTALGIA۔ یاد ماضی کا۔ اب دو دن تک وہ سب کو بور کریں گے اپنی جوانی کے قصوں سے۔"

میں نے کہا "مسٹر رضوان۔ کیا ستر کی عمر کو پہنچنے کے بعد تم اپنے بیٹے سے اس کی جوانی کے قصے سنو گے؟"

اس نے زور سے ڈکی بند کی۔ میری بات بھی اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ کمال اسپتال کا فاصلہ کم نہ ہوتا تو شاید وہ میرے کہنے پر بھی وہاں نہ جاتا۔ دس منٹ بعد اس نے گاڑی عین اسپتال کے دروازے پر روک کے ڈکی کھول دی۔

"تم میرا شکریہ ادا کیے بغیر جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا "شکریہ میں کرنل نظام کا ادا کرچکا ہوں۔ تم اگر اخلاقیات پر کچھ یقین رکھتے ہو تو واپس جا کے ایک جھوٹ بول دینا۔"

"یہ جھوٹ بولنا اخلاقیات میں شامل ہے؟" وہ طنز سے بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ ایک غم زدہ' تنہا اور بیمار بوڑھے باپ کا دل اس سے خوش ہوجائے تو ہر بیٹے کو ایسا جھوٹ بولنے کا ثواب کمانا چاہیے۔ تم اس سے کہنا کہ کرنل خان کی بیٹی نے سلام کہا ہے۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوا اور اقرار میں سر ہلا کے لوٹ گیا۔ یہ اسپتال میں ملاقات کا وقت تھا۔ اسپتال کے اندر کار پارکنگ نہیں تھی چنانچہ ملاقاتیوں کی گاڑیاں باہر ہی ایک قطار میں ترچھی کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ سے کچھ فاصلے پر تین چار ٹیکسیاں بھی واپسی کی سواری کے انتظار میں موجود تھیں۔ ان کے ڈرائیور بھی مجھے ڈکی سے برآمد ہوتا دیکھ کے اتنے ہی ہکا بکا کھڑے تھے جتنا اسپتال کا پرانا چوکیدار۔ وہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں؟ کبھی اس نے مجھے کلین شیو نہ دیکھا ہوتا تو آج پہچاننے سے بھی انکار کردیتا۔

اس نے مجھے سلام کیا "سر۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "بھئی مجبوری میں سب جائز ہے۔"

اس نے یہ عذر قبول نہیں کیا "سب مرضی کی بات ہے سر' مجبوری کی نہیں۔ آپ اگر نہ چاہتے تو۔"

میں نے کہا "یار' گاڑی میری نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ

ڈکی میں بیٹھو تو مجھے ماننی پڑی اس کی بات۔"

"اوجی ڈکی میں بیٹھو آپ یا انجن میں۔ لیکن میں بات کر رہا تھا اس کی" اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا "داڑھی بہت نجتی تھی آپ پر۔"

میں نے کہا "کچھ لوگوں کا خیال اس کے برعکس تھا۔ داڑھی ہی نہیں، انہیں تو میرا وجود بھی آنکھ میں تنکے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اللہ توفیق دے گا تو پھر رکھ لیں گے۔"

کمال ایک مقدمے کی سماعت کر رہا تھا۔ کسی نرس نے مریض کو غلط دوا دے دی تھی اور اب بضد تھی کہ یہ دوا ڈاکٹر نے لکھی تھی اور اسے فارمیسی والوں نے دی تھی۔ ڈاکٹر کے سامنے مریض کا چارٹ تھا اور اس میں یہ دوا نہیں لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ناراضگی جائز تھی۔ فارمیسی کا ڈسپنسر پہلے ہی انکار کر چکا تھا کہ اس نے غلط دوا نہیں دی۔ مجھے دیکھ کے وہ چونکا اور زیر لب مسکرایا۔

نرس نے خفگی سے کہا "ڈاکٹر صاحب نے لکھی نہ تم نے دی تو میں دوا کیا بازار سے خرید کے لائی اور مریض کو دے دی۔ ڈاکٹر کمال آپ مس کوئن سے کہیں کہ اسٹاک چیک کرے۔ آج اس دوا کی کتنی گولیاں دی گئی تھیں۔ اب فارمیسی میں کتنی موجود ہیں۔"

کمال نے اپنا سر پکڑ لیا "اسٹاف۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں ممکن نہیں سر؟ ایک ایک گولی کا حساب لیتی ہیں وہ۔ جب الزام مجھ پر آ رہا ہے تو؟"

کمال نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "دیکھو ذمے دار تو ہم سب ہیں۔ اسپتال ہم سب کا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس غلطی سے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ہو بھی سکتا تھا۔ تم اتنی سینئر ہو اور بہت تجربہ ہے تمہارا۔ تمہیں بھی دینے سے پہلے ہر دوا کو دیکھ لینا چاہیے۔"

نرس اپنی بات پر قائم رہی "میں دیکھتی ہوں سر۔ لیکن وہ ایک جیسی گولیاں ہیں۔ ویلیم فائیو اور پریزون۔"

"اوکے، اوکے۔ فنش اٹ ناؤ۔ آئندہ کے لیے ہم سب کو زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔" کمال نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

سب کے نکل جانے کے بعد میں نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہا ہے، الو کے پٹھے۔"

"دیکھ رہا ہوں تیرے نئے سوانگ کو۔ یہ تبدیلی ظاہری ہے یا باطنی۔ اب کیا ڈراما چل رہا ہے سؤر کے بچے!"

میں نے کہا "بتاؤں گا، پہلے ایک فون کر لوں۔"

"ہاں۔ فون کر لے ورنہ وہ پھر پوچھے گی۔"

میں نے کہا "فون؟ کس نے فون کیا تھا پہلے۔"

"کون کر سکتا ہے تیرے لیے اتنی بے قراری کا اظہار۔" وہ خفا ہونے لگا "دماغ خراب ہے اس کا۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کیا ڈرتا ہوں اس سے۔ میں نے تو اس کے سوال کا یہی جواب دیا تھا کہ ناصر تو یہاں نہیں آیا۔"

"اور اس نے کہا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو نے سنائی نہیں اسے" میں نے رب نواز کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

"ضرور سناتا مگر فون بند کر دیا اس نے غصے میں۔"

میں رب نواز کے فون کی گھنٹی سن رہا تھا۔ تیسری گھنٹی پر ریسیور اس کی بیوی نے اٹھا لیا "ہیلو!"

میں نے کہا "کیا حال ہے ملک صاحب کا۔ ہوش تو آ گیا ہوگا؟"

وہ مجھے گالیاں دینے لگی "تم ذلیل، کمینے، کتے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ جواب میں ایک شعر سنو۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا"

پھر شاید رب نواز نے ریسیور لے لیا کہ مجھے اس شعر کی داد ایک درجن خاصی بے مزہ کرنے والی گالیوں کی صورت میں ملی۔ چونکہ کمال کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور اسے وہ گالیاں دیں جو اسے پہلے کسی نے نہ دی ہوں گی۔

اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا "شاہ جی۔ میں چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔"

میں نے کہا "پہلے پکڑ کے تو دکھاؤ۔ تم اور تمہارے شکاری کتے مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ میں دیکھ رہا تھا جب وہ بے وقوفوں کی طرح اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ اس وقت بھی میں یہیں موجود ہوں۔ تمہارے ایک ہمسائے کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد اس کا لہجہ بدل گیا "دیکھو شاہ عالم۔ ہمارے درمیان جو اعتماد کا رشتہ تھا، وہ ٹوٹ چکا ہے۔"

میں نے کہا "تم بھی ایک شعر سنو۔

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا"

"پھر بھی۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "کوشش ہی تو کی تھی میں نے۔ لیکن تم نے اسے ناکام کر دیا۔ میں احمق نہیں ہوں رب نواز کہ تم پر بھروسا کر کے تم سے ملنے آ گیا۔ اور چوروں کی طرح نہیں

آیا۔ تمہیں بتا کے آیا لیکن ایسا کرتے ہوئے میں نے خطرات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور مخالف امکانات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

اس نے میری بات خاموشی سے سنی "چلو میں مان لیتا ہوں اپنی غلطی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک موقع تم نے اپنی بے وقوفی سے گنوا دیا۔ دوسرا موقع تم خود پیدا کرو گے۔ اب تم لندن آ کے مجھ سے ملو گے۔"

"مگر ابھی یہ ناممکن ہے۔ بہت مشکل ہے۔"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے، کل میں لندن واپس چلا جاؤں گا۔"

وہ بولا "میرے پاس نہ تمہارا پتا ہے نہ فون نمبر۔"

میں نے کہا "لندن میں میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ پہلے میں پے انگ گیسٹ بن کے رہتا تھا۔ اب کرائے کے مکان میں رہتا ہوں لیکن اپنا ٹھکانا بدلتا رہتا ہوں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے؟"

میں نے کہا "ہاں، یہی بات ہے۔ میں خود فون کروں گا تمہیں اور اگر تمہارا پروگرام بن جائے تو مجھے بتانا۔ ہم لندن میں کہیں بھی مل سکتے ہیں۔ یہاں مجھ سے ملنے کی اور میرا پتا لگانے کی کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم چھوٹے بڑے سارے ہوٹل چھان مارو لیکن تمہیں میرا سراغ نہیں ملے گا۔ نہ تمہیں شبنم سے کچھ معلوم ہوگا۔ تم چاہو تو اپنے آدمی اس کے تعاقب پر مامور کر دو جو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے۔"

رب نواز بولا "میں اگر چاہوں تو ایک رات میں اس سے سب کچھ اگلوا لوں۔"

"ملک صاحب! اپنے مسائل میں اضافہ مت کرو۔ وہ اب کوئی رپورٹر نہیں، اس اخبار کی ایڈیٹر ہے۔ اس کے اور میرے تعلقات کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔"

"مت مانو۔ حقیقت خود ہی تمہارے سامنے آ جائے گی" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کمال کچھ دیر کے لیے اٹھ کے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے فرید عباسی کے آفس کا نمبر ملایا مگر اس سے بات نہ ہو سکی۔ ایک شائستہ اور مستقل مزاج قسم کی سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ وہ عزیز اللہ شیخ صاحب کے ساتھ ہیں اور کلا تھلس سے ڈیل کر رہے ہیں۔

میں شبنم سے بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اس کے اور اپنے درمیان کسی رابطے کا سراغ دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا کہ رب نواز اس کے ہر ٹیلی فون کو ٹیپ کرانے کے لیے اپنی دولت کی قوتِ خرید آزمائے اور ٹیلی فون ایکس چینج میں خاموشی سے آبزرویشن لگوا دے۔

مجھے رئیس کے بارے میں معلوم کرنا تھا لیکن رخشی دن بھر کے واقعات سے بے خبر تھی۔ اس نے مجھے کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔ "میری تو عجیب زندگی ہو گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اپنے ہی گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ باہر گارڈ کھڑی ہے۔ میں کہیں آجا نہیں سکتی۔ فرید کو باہر خطرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور خود کا سارا وقت باہر گزرتا ہے۔ نہ دن کا پتا نہ رات کا۔"

میں نے کہا "ناشکری مت کرو۔ ایسی فراغت کسے نصیب ہوتی ہے کہ بس کھاؤ اور لمبی تان کے سو جاؤ۔ کوئی فکر نہ فاقہ، عیش کرو۔"

"خاک عیش کروں۔ تمہارا وہ یتیم خانے والا پروجیکٹ کب شروع ہوگا آخر۔ جو تم نے ہمارے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ بھی ہوگا بہت جلد۔ ابھی تو خوا مخواہ کے مسائل گلے پڑتے جا رہے ہیں۔ اب یہ رئیس کے اغوا کا معاملہ ہی دیکھو، ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں۔ ہم سب نے سر توڑ کوشش کر کے دیکھ لیا۔"

تقریباً ایسے ہی جذبات سونی کے تھے۔ وہ بھی خود کو قیدی سمجھ کے سخت غم زدہ اور مایوس تھی۔ "آخر کب تک گزرے گی میری زندگی ایسے۔ صبح سے شام تک اس محل کے اندر کسی بدروح کی طرح بھٹکتی پھرتی ہوں۔ کتنی آزاد زندگی تھی میری۔ اب خیال آتا ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "یہ اسی آزادی کا خمیازہ بھگت رہی ہو تم۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں لڑکی کہ تم جیل میں نہیں ہو۔ پولیس کے ہاتھ لگ جاتیں تو اب تک وہ تمہارا حشر نشر کر دیتے۔ نیلم کے گھر کو جیل کہہ رہی ہو اس لیے کہ جیل دیکھی نہیں تم نے اور تمہیں اندازہ نہیں کہ تم جیسی قیدی عورتوں کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔"

وہ شرمندہ ہو گئی "آئی ایم سوری!"

"کیا سوری۔ تم کہو تو میں تمہیں آزاد کردوں۔ جہاں جی چاہے جاؤ۔ تمہارے پرانے ساتھی بھی مل جائیں گے کہیں نہ کہیں۔ اور یہ زندگی کی پابندی منظور نہیں تمہیں تو چلی جاؤ رب نواز کے پاس۔ آخر تمہاری بہن بھی تو رہتی تھی وہیں۔"

میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ سونی نے فون بند کردیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایسی باتیں میں نے سونی سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ اس نے سخت ذلت محسوس کی ہوگی اور شاید اب وہ بستر پر اوندھی پڑی زار و قطار رو رہی ہوگی۔ وہ رئیس کے لیے سخت پریشان تھی اور اس جذباتی بحران میں تنہائی اس کے اعصاب پر زیادہ اثر انداز ہو رہی تھی مگر اسے سمجھنا چاہیے کہ خود ہم بھی رئیس کے لیے کم پریشان نہیں ہیں اور اس کی بازیابی کے لیے دن رات ایک کر رہے ہیں۔

یہ کمال کے لیے مصروفیت کا وقت تھا۔ ہر مریض کے تیماردار اور ملاقاتی نرسوں اور ڈاکٹروں سے بیماری اور علاج کے ہر پہلو کو ڈسکس کرنا چاہتے تھے اور اکثر ایسے سوالات کرتے تھے جن کا قطعی جواب دینا کسی ڈاکٹر کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کج بحثی میں ناخوشگوار صورت حال بھی پیدا ہو جاتی اور اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کسی مریض کو دیکھنے کے لیے آنے والوں میں کوئی ڈاکٹر بھی تھا جس نے ایک ڈاکٹر سے تشخیص اور علاج کے معاملے میں اختلاف کیا اور اپنی ماہرانہ رائے مسلط کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے تنگ آکے کہہ دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو آپ اپنے مریض کو لے جائیں اور خود علاج کرلیں۔ یہاں تو علاج ہم کریں گے اور کسی بڑے سے بڑے اسپیشلسٹ کو بھی دخل اندازی نہیں کرنے دیں گے۔ اصولی طور پر یہ بات صحیح تھی مگر اس مریض کے دوسرے ملاقاتی مشتعل ہوگئے اور انہوں نے اپنے ڈاکٹر کی حمایت میں بولنا شروع کردیا۔

کمال نے انہیں سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا اور وارڈ سے اپنے آفس کی طرف لے آیا۔ کمال کے لوٹنے سے پہلے کوئن آگئی۔ وہ پہلے کی طرح آج بھی مجسم پیکر شرافت و معصومیت نظر آتی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں پاکیزگی کا انداز بھی وہی تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ وہ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پر پھیلا کے پرواز کر جائے گی اور بادلوں کے غبار کی طرح آسمان میں گم ہو جائے گی۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا "یہ تم ہو؟ کیا آج کل کسی تھیٹر میں پرفارمنس دے رہے ہو۔ یہ پگڑی اور یہ تسبیح۔ پشاوری چپل اور واسکٹ۔"

میں نے کہا "کیا میں اس لباس میں شاندار نہیں لگتا؟"

"بہت شاندار لگ رہے ہو تم۔ ویری گریس فل۔ اینڈ یو آر اے ہینڈسم مین 'یوتو'" وہ بولی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "یہ بات میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پھر کہو۔"

"یہ تو میں ایڈی کے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں" وہ مسکرائی۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا "کون ایڈی۔ تمہارا شوہر! کنگ ایڈورڈ نمبر نائن! کہاں ہے وہ آج کل، وہیں افریقہ کے گوریلوں اور آدم خوروں کے ساتھ جنگلوں میں گھوم رہا ہے، اور قبائلی کاسٹیوم میں ڈانس کر رہا ہے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ اسے میں نے یہاں بلالیا ہے اور کمال ہے کہ اس نے میری بات مان لی۔"

میں نے کہا "بات تو میں بھی تمہاری مان لیتا اگر تم نے صرف ایک بار مجھے پروپوز کیا ہوتا۔ خیر، ڈیئر کوئن! کنگ ایڈورڈ سے کب ملواؤ گی مجھے؟"

کوئن بیٹھ گئی "پہلے یہ بتاؤ شریر آدمی کہ تمہارے وعدے کا کیا ہوا۔ تم نے اسپتال EQUIPMENT اور لیبارٹری دینے کی بات کی تھی۔"

میں نے کہا "وہ آفرابنی جگہ ہے۔"

"اور اس کی LIMIT کیا ہے؟"

میں نے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، دو کروڑ تک تھی۔"

اس کا منہ کھل گیا "دو کروڑ۔ آر یو سیریس؟"

"آخر تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ میں ایک پیدائشی جوکر ہوں۔ تم شاید مجھے انتقال پُرملال کرتا دیکھو گی تب بھی یہی سمجھو گی کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔"

"دو کروڑ بہت رقم ہوتی ہے۔"

"مجھے بڑی شرم آتی ہے تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ جیسے تم نے ساری عمر ثواب کماتے گزاری، میں نے صرف دولت کمائی اور اب مجھے دولت کے نام سے نفرت ہوگئی ہے کیونکہ دولت اکٹھا کرتے ہوئے میں نے کبھی اس کے بامصرف ہونے کو قابل غور نہیں سمجھا تھا۔ یعنی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ آخر میں بے حساب دولت سے کیا کروں گا؟ ایسا بہت لوگ کرتے ہیں۔ وہ ایک شوق میں جنون میں دولت جمع کرتے جاتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ

دولت کینسر کے خلیوں کی طرح خود بڑھنے لگتی ہے۔ بینکوں میں 'انویسٹمنٹ اسکیموں میں 'شیئرز میں اور بونڈز میں۔ یہ پانچ سال میں دگنی اور دس سال میں چار گنا اور پندرہ سال میں آٹھ گنا اور بیس سال میں سولہ گنا ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جتنی خرچ کرسکتا تھا، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے میرے ڈیپازٹ بڑھتے رہے۔ کچھ نہ کرنے کے باوجود یہ دولت کی امربیل پھیلتی گئی۔ پیسہ پیسے کو کھینچتا رہا اور جو پیسہ کھنچ کر آیا اس نے مزید پیسوں کو کھینچا۔ ایسا ہوتا ہے" میں نے ایک گہرا سانس لیا۔

وہ منہ کھولے سنتی رہی "ضرور ہوتا ہوگا۔ اگر تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ میں نہیں سمجھ سکتی یہ باتیں۔"

"کوئن ڈیئر! یہی ٹریجڈی ہے ہماری۔ تمہاری فلاسفی آف لائف میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ ہم دو مخالف POLES کے باسی تھے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ بعد قطبین تھا ہمارے درمیان اور رہے گا۔ ہم دو مختلف اور متضاد دنیاؤں کے لیے تھے۔ چنانچہ اب میں دو کروڑ خرچ کرسکتا ہوں اور بالآخر دولت کا ایک مفید اور فلاحی مصرف سمجھنے سے مجھے کچھ سکون ملا ہے۔ اور بھی ایسے ہی مقاصد سمجھ میں آنے سے میرا بوجھ کچھ کم ہوگیا ہے۔"

وہ بولی "بوجھ کیوں سمجھتے تھے تم اس دولت کو؟"

"مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے پھر شرم آتی ہے کہ وہ دولت میں نے جائز اور ناجائز کے فرق کو سمجھے بغیر کمائی تھی۔ جیسے سب کماتے ہیں۔ میں نے غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام نہیں کیے تھے مگر جو بھی میں نے کیا اس میں بہت سے پہلو ایسے تھے جو غلط سمجھے جاسکتے ہیں۔"

"اب تم اس کا کفارہ ادا کر رہے ہو؟"

"یہی سمجھو۔ میرا پہلا کمپلیکس احساس محرومی کا نتیجہ تھا۔ یتیم خانے میں بھیک پر پلنے والے بچے کا انتقامی ردّعمل۔ میں نے دنیا سے وہ سب چھین لیا جو مجھے حق کے طور پر نہیں ملا تھا۔ اب اس ردِ عمل کا ردّ عمل ہے۔ میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے تمہیں توفیق دی صحیح سمت میں سوچنے کی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ورنہ کیا میں ایک عیاش رئیس نہیں بن سکتا تھا جو اپنی ساری دولت جوئے شراب، عورتوں اور گھوڑوں پر لٹا دیتا۔"

"دراصل ڈاکٹر کمال نے جو کوٹیشن مانگی تھیں، ان کے جواب موصول ہوگئے ہیں۔ کچھ بین الاقوامی فرموں نے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ ایک برٹش فرم نے ایکس رے پلانٹ کی فراہمی، نصب اور دیکھ بھال کے لیے بہت معقول آفر دی ہے۔ ایسی ہی ایک اچھی پیشکش جرمنی سے آئی ہے۔ ایم آئی آر اور سی ٹی اسکینر کے لیے۔ الٹراساؤنڈ، بلڈ بینک اور پیتھالوجیکل لیبارٹری کا سب ایکوپمنٹ دو کروڑ سے زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ اگر صحیح چیز لی جائے جس کی گارنٹی بھی ہو۔ آفٹر سیل سروس بھی ہو۔"

میں نے کہا "یعنی تم نے فائنل کرلیا ہے؟"

"یہ ذمّے داری کمال نے مجھے سونپی تھی اور اس کے لیے میں نے ایڈی کو بلایا۔ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "پھر اب مسئلہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ شاید کمال تم سے بات کرے گا۔ ہمیں آرڈر PLACE کرنا ہے۔ ڈیل فائنل ہونے کے بعد ہی آفیشل کلیرنس میں اور ایکوپمنٹ کی ڈلیوری میں چھ مہینے لگ جائیں گے۔ تب تک ہم اضافی جگہ کی تعمیر مکمل کرسکتے ہیں۔ اس عمارت میں توسیع ضروری ہوگی۔"

میں نے کہا "جو ایکوپمنٹ اور مشینری آئے گی، اس کی ڈیل کون فائنل کرے گا، یہاں ان کے ایجنٹ؟"

"ہم خود کریں گے۔ ڈائریکٹ ڈیل میں مڈل مین کا منافع بچے گا۔ اور ذمّے دار ہوگا براہِ راست مینوفیکچر کرنے والا۔ سپلائر نہیں؟"

میں نے کہا "اس کے لیے کسی کو جانا پڑے گا؟"

"یس۔ اس میں وقت کی بچت ہوگی۔ یورپ کی تین چار فرموں سے بات ہوگی۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور جرمنی۔ جس کی TERMS بہتر ہوں گی اور کوالٹی قابل قبول ہوگی، اس سے ایگریمنٹ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اسے حسنِ اتفاق کہو کہ ایک دو دن میں میرا پروگرام ہے لندن جانے کا۔ باقی ممالک آس پاس ہیں اور وہاں جانا ایسا ہی ہے جیسے لاہور سے کراچی یا کراچی سے دبئی جانا۔ ویزا پرابلم نہیں ہوتی اور ٹائم بھی کم لگتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بزنس کے سلسلے میں یورپ جانا میرے لیے روز مرہ کی بات تھی۔"

"دیٹ از گریٹ۔ پھر تو مس چاندنی کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

میں ایک دم سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "چاندنی!"

"یس۔ وہی جا رہی تھیں ڈیل فائنل کرنے کے لیے ایڈی کے ساتھ۔ اور ایڈی بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ بہت

گھبراتا ہے کاروباری معاملات سے۔ کہتا ہے کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرانے کا رسک بھی کیوں لیا جائے۔ حالانکہ یہ باہمی اعتماد کی بات ہے۔ خیراب اس کی جان بچ جائے گی۔ تم ان معاملات میں ایڈی سے ہزار درجہ بہتر ہو' تم اور چاندنی!"

میں نے کہا "اسٹاپ۔۔۔ پلیز' مجھے سوچنے سمجھنے دو۔ ابھی میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے چندا کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"لیکن اعتراض کی کیا بات ہو سکتی ہے تمہارے لیے۔ چندا کا کوئی کزن ہے وہاں۔ اس نے پہلے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں ہر طرح سے مدد کرے گا۔ پھر ہم نے ایڈی کو راضی کرلیا۔"

"اور پھر طوق میرے گلے میں ڈال دیا۔ آئی ایم سوری' کوئن! میں نہیں سمجھتا کہ چندا اس مقصد کے لیے مناسب انتخاب ہے۔ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں' ایڈی کے ساتھ تمہیں جانا چاہیے' تمہارا تجربہ ہے۔"

"تو۔ ایک دم ناممکن۔ میں اپنا جو کام کررہی ہوں' وہی میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتی۔ میرا کام مجھے ہی کرنا ہے' یہ بزنس ڈیل تو کوئی بھی کرلے گا' تم اور چندا۔۔۔!"

"ON SECOND THOUGHT" میں نے کہا "میرا پروگرام بدل گیا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ فی الحال میں لندن نہیں' ٹمبکٹو جارہا ہوں یا ہنولولو۔ چندا' اس کا برٹش کزن اور تمہارا اکنگ ایڈورڈ ثانی جو چاہیں کریں۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی اور خاموشی سے اٹھ گئی۔ اب ملاقاتیوں کا وقت بھی ختم ہوگیا تھا اور شام ڈھل چکی تھی۔ دن کی ڈیوٹی والا اسٹاف بھی اپنا کام ختم کرکے رخصت ہونے کی تیاری کررہا تھا اور ان کی جگہ نائٹ شفٹ کے لوگ آنے والے تھے۔ اس ایک گھنٹے میں جب میں کمال کے آفس سے فون کررہا تھا اور کوئن سے باتوں میں مصروف تھا کئی نرسوں اور ڈاکٹروں نے کمرے میں جھانکا۔ کوئن سے کوئی بات کی' ڈاکٹر کمال کو پوچھا یا ایک سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا مگر مجھے چندا کی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی۔

مجھے یہاں آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ پہلے میں فون پر باتیں کرتا رہا۔ پھر کوئن سے باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور اب مجھے چائے کی طلب بے قرار کررہی تھی۔ اسپتال میں کمال کو مجھ سے بات کرنے کی فرصت میسر آنا مشکل لگتا تھا۔ میں نے اس کے گھر جاکے قمر کو ایک SURPRISE کا شاک دینے کا فیصلہ کیا۔

میں نے قراقلی ٹوپی سر پر رکھی اور تسبیح گھماتا ہوا باہر آگیا۔ آفس بلاک کے مختصر سے برآمدے کو عبور کرتے ہوئے میں نے مریضوں کو دیکھا جو آزادی کے ساتھ اپنوں کی محفل میں دو گھنٹے گزار کے اپنے اپنے بیڈز پر لوٹ آئے تھے۔ اب ان کے سامنے ایک اور رات تھی۔ بیماری اور دکھ کے احساس' مایوسی اور افسردگی اور اکیلے پن کے عذاب کا سلسلۂ روزوشب۔ جس میں بے داغ کفن جیسے سفید چادروں والے بیڈ تھے' دواؤں کی بوتل' انجکشن کی ٹیس تھی۔ بدذائقہ پرہیزی کھانا تھا اور ایک پُرخوف انتظار تھا۔ لوٹ کے گھر جانے کا دن کب آئے گا' آئے گا یا نہیں آئے گا' کون جانے؟

قمرلان میں اپنے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اچانک مجھے دیکھ کے پہلے اس کی ہنسی گم ہوگئی اور ایک چیخ مار کے اس نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ جب میں نے قہقہہ مارا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور شرمندگی سے پانی پانی ہوگئی۔

"بھائی۔۔۔! تم۔۔۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے بولی اور بچے کو نیچے اتار کے میری طرف لپکی۔

میں نے اسے سینے سے لگالیا "آج پتا چل گیا تیری نظر بھی کمزور ہے اور عقل بھی۔"

وہ خوشی سے کانپتے لہجے میں بولی "مجھے یقین نہیں آرہا ہے بھائی۔ یہ تم ہو' تمہاری داڑھی کہاں گئی۔ اور یہ کیا بنے ہوئے ہو تم؟"

بچہ اپنی ماں کی طرف سے بے رخی اور عدم توجہی کے اس مظاہرے پر احتجاجاً چلّا رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی بھیانک چیخ ماری اور ماں سے لپٹ گیا۔

میں نے کہا "آخر ہے نا الو کا پٹھا۔ انسان کی شکل دیکھ کے ڈر رہا ہے۔"

قمر نے اسے اٹھالیا "سال میں دو بار عید کے چاند کی طرح شکل دکھاؤ گے بھائی تو بچہ کیسے پہچانے گا تمہیں کہ تم ماما جی ہو" پھر وہ بچے سے بولی "دیکھو بیٹا' یہ ماما ہیں تمہارے' گندے گندے' ایک تو آتے نہیں اور آتے ہیں تو خالی ہاتھ آجاتے ہیں۔ نہ بھانجے کے لیے ٹافی لاتے ہیں نہ بہن کے لیے چاکلیٹ۔"

بچہ مجھے بُرعداوت اور کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ یہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ مگر چائے پینے سے پہلے نہیں۔ قمر' تو اب کوئی بچی نہیں رہی۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ "سب کچھ کتنا بدل گیا ہے بھائی۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا۔ پہلے کبھی ایسا ہوتا تھا کہ تم کہیں سے آؤ اور میرے لیے چاکلیٹ نہ لاؤ۔ ملک سے باہر جاتے تھے تو میں تمہاری واپسی کا انتظار کرتی تھی کہ چاکلیٹس کا ایک ڈھیر لاؤ گے۔ ایک سے ایک اعلیٰ کوالٹی کی۔"

میں نے کہا "اچھا' آج آخری بار معاف کردے۔ اگلی بار تیرا سارا پچھلا قرض چکادوں گا۔ میں لندن جارہا ہوں۔"

اس نے بچے کو بیڈ پر میرے پاس بٹھادیا "سچ! کب جارہے ہو؟"

"بہت جلد۔ کل پرسوں میں" میں نے کہا "اور ابھی ابھی کوئن نے مجھے بتایا ہے کہ اس کا شوہر بھی جارہا ہے چندا کے ساتھ۔"

"ہاں۔ اسپتال کا کچھ سامان خریدنا ہے جس کے لیے سرمایہ میرے بھائی نے فراہم کیا ہے" وہ فخر سے بولی۔

"تیرے بھائی کے لیے بڑی مشکل یہ ہے کہ اسے چندا کے ساتھ جانے کے لیے کہا جارہا ہے۔"

"تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تمہاری رائے بھی شامل ہوگی' خریداری میں" اس نے کہا۔

"بہنا۔ چندا میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں۔ ایسی الرجی ہوگئی ہے اسے مجھ سے۔ وہ کب جائے گی اکیلی میرے ساتھ۔"

"اکیلی کیوں' ایڈی بھی تو ہوگا۔"

"نہیں۔ یہی تو پرابلم ہے۔ ایڈی مجبوری میں راضی ہوا تھا۔ اب کوئن چاہتی ہے کہ میں اور چندا چلے جائیں تو ایڈی کی پریشانی بھی دور ہو۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ چندا نہیں جائے گی میرے ساتھ۔"

"بھائی' نہیں جاتی تو نہ جائے۔ خصماں نوں کھائے" قمر نے خالص زنانہ محاورے میں دل کی بھڑاس نکالی "تم اور ایڈی چلے جاؤ۔ ورنہ کیا تم اکیلے یہ کام نہیں کرسکتے بھائی! تمہارے تو بڑے تعلقات ہیں باہر اور تم اچھی طرح سمجھتے ہو یورپ کی مارکیٹ کو۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ خیر تو بتا' باؤ از لائف؟"

"میں کیا بتاؤں' تم بتاؤ بھائی! کہ کہاں ہو' کیا کررہے ہو؟ یہ تبدیلی کیسے آئی اور کیوں آئی؟"

میں نے کہا "ہر کام کے لیے قدرت کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو وہ کام خود بخود ہوجاتا ہے۔ میں بھی اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ گیا ہوں۔ پوری طرح' اپنا پرانا بزنس شروع کررہا ہوں۔ آج کل آفس تلاش کرنے میں لگا ہوا ہوں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر بھائی' یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے' بھیس بدل کے پھر رہے ہو کیا؟"

میں نے اسے ٹال دیا "ارے نہیں پگلی۔ ایسے ہی جی چاہا کہ یہ لباس پہن کے دیکھا جائے۔"

"ویسے تو اس لباس میں بالکل دولہا لگ رہے ہو تم۔ تمہاری نظر اتارنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن بھائی' مجھے معلوم ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے کمال نے بتایا ہے کہ تمہیں رب نواز نے باغ علی سمجھ کے گرفتار کرادیا تھا۔ پھر کمال نے تمہیں کورٹ میں شناخت کیا۔ نیلم نے بھی بیان دیا کہ تم ناصر عظیم ہو۔ تب تمہاری جان چھوٹی۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا۔۔۔ یہ سب جانتی ہے تو علامہ!"

"یقیناً اس کے بعد ہی داڑھی صاف کرائی ہوگی تم نے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے میری۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ بات بھی سمجھ لے کہ میں حلیہ نہ بدلتا تو شاہ عالم نظر آتا۔ وہ اور مشکل ہو جاتی۔"

"خدا کے لیے بھائی۔ اس رب نواز سے جان چھڑاؤ اپنی۔ آخر وہ کیا چاہتا ہے' کیوں تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ بس اب کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک مہینے کے اندر اندر' میں لندن ہو آؤں۔"

میرے پیچھے سے کمال نے کہا "بہت خوب۔ اب آپ لندن تشریف لے جا رہے ہیں گویا۔ کس حیثیت میں؟ ناصر عظیم بن کے یا شاہ عالم بن کے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ اپنے ہاتھ میں ایک اخبار لہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ شام کے اخبار "خبردار" کا وہ شمارہ تھا جس میں آج شاہ عالم کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔

میں نے گھبرا کے قمر کی طرف دیکھا مگر وہ چائے دم کرنے کے لیے کیتلی میں ابلتا ہوا پانی ڈال رہی تھی۔ اسی وقت اندر ایک دھماکا ہوا اور قمر کے بیٹے نے چیخ ماری۔ قمر چائے چھوڑ کے اندر لپکی "یا اللہ۔ اچھا ٹیلی فون کا دشمن ہوا ہے یہ لڑکا۔ اب اوپر رکھ دیا ہے تو تار کھینچ کے سر پر گرا لیتا ہے۔"

میں نے کہا "یار کمال! یہ اخبار مجھے دے دے۔ قمر کو کچھ مت بتانا۔"

"کیوں نہ بتاؤں۔ وہ بیوی ہے میری۔ اور خیر سے آپ کی بھی بہن ہے۔ آپ کے سارے کرتوت جانتی ہے۔"

میں نے اخبار اس سے چھین کر تہ کیا اور قمیص کے نیچے اڑس لیا۔ "اس میں جو لکھا ہے سب جھوٹ ہے۔"

"یعنی اخبار والوں نے اپنی طرف سے گھڑ کے جھوٹ چھاپ دیا؟ بکواس کرتا ہے میرے سامنے سؤر کے بچے۔" وہ ناراض ہونے لگا "شاہ عالم کی روح آئی تھی یہ انٹرویو دینے دوسری دنیا سے؟"

میں نے کہا "اوکے بابا۔ میں سچ بتا دیتا ہوں' اندر چل۔"

میرے سچ نے زیادہ خرابی پیدا کی۔

کمال کا موڈ خراب ہو گیا "میں نے سوچا تھا کہ اب تجھ سے کبھی نہیں پوچھوں گا کہ تو کیا کر رہا ہے؟ کوئی سروکار نہیں رکھوں گا تیرے معاملات سے۔ میری طرف سے تو جہنم میں جا۔ جو جی چاہے کر۔ تجھے نہ کسی کی پروا ہے نہ ضرورت۔ دوست کیا اور بہن کون؟"

میں نے کہا "تیری ناراضی سے تیرے خلوص کا پتا چلتا ہے۔"

"بھاڑ میں گیا خلوص۔ مصیبت تو ہمارے لیے ہے کہ لاتعلق ہو کے بھی نہیں رہ سکتے۔ تو بڑی خود غرضی سے سب کو دکھ دے رہا ہے۔ صرف چندا کی بات نہیں' قمر بھی پریشان رہتی ہے۔ بے وقوف لڑکی' نماز کے بعد روتی ہے اور تیرے لیے دعا کرتی ہے کہ اللہ میرے بھائی کو سلامت رکھنا۔ اسے دعا مانگنی چاہیے کہ اللہ میرے بھائی کو عقل دے۔ مجھے پریشان ہونے کی فرصت بھی نہیں مگر کیا کروں' آدمی کسی بچے کو منع کر سکتا ہے' بے وقوف ہو تو سمجھا سکتا ہے۔"

میں نے اسے دل کی ساری بھڑاس نکالنے کا موقع دیا۔ وہ بولتا رہا اور قمر روتی رہی۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا کہ میں شاہ عالم کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد صرف ناصر عظیم بن کے زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا مگر اس نے میری کسی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ جس راستے پر میں چل پڑا ہوں اس پر ایک نہ ایک دن مجھے ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔

اس کے بعد ہماری لڑائی ہوئی۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ کسی کو میرے لیے پریشان ہو کے مجھ پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا برا بھلا سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ہمارا یوں لڑنا بھی دوستی میں شامل تھا۔ ہم بحث کرتے تھے تو یہی ہوتا تھا مگر قمر بھی جانتی تھی کہ ایسی لڑائیوں سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ وہ کھانا تیار کرنے چلی گئی' ہم پھر نارمل ہو گئے۔

میں نے کہا "میں چندا کے ساتھ لندن نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟ تو اتنا ڈرتا ہے اس سے؟ یا ڈر لگتا ہے کہ شاہ عالم کی محبوبہ بدگمان ہو جائے گی؟" وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔

میں نے کہا "وہ بدگمانی کا مطلب بھی نہیں جانتی۔ اگر میں پھر چندا کا ہو جاؤں یا شادی کر لوں اس سے تب بھی اس کے جذبات یہی رہیں گے۔"

"یہ بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ غیر مشروط اور یکطرفہ محبت کرتی ہے۔ بے طلب اپنا سب کچھ دے کر کچھ نہ طلب کرنے والی ہے اس کی چاہت۔"

"پھر تو شادی کر لے چندا سے" کمال نے چٹکی بجائی۔

میں نے اس کو مارنے کی کوشش کی "تو پاگل ہو گیا ہے؟"

"کیوں۔ خود تو نے ہی یہ کہا تھا ابھی کہ شبنم کو اس سے بالکل فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو رہے گی تیری ہر حال میں" اس نے خود کو بچا لیا۔

"ہاں۔ مگر مجھے فرق پڑتا ہے۔۔۔ اور تو کیا سمجھتا ہے کہ چندا ایسی صورتِ حال کو برداشت کر سکتی ہے؟ تو دیکھ رہا ہے اس کا حال۔ شادی کے بعد میں شبنم کا نام بھی لوں گا تو وہ مجھے قتل کر دے گی۔ حد سے زیادہ حاسد اور شکی مزاج ہے وہ۔ اور اسے مکمل ملکیت اور اجارہ داری چاہیے۔ جو میرے لیے ناممکن ہے۔"

"یعنی تو شبنم کو نہیں چھوڑ سکتا؟"

میں نے سوچ کے کہا "اب تو یہی کہنا چاہیے مجھے کہ ہاں' کیونکہ شبنم مجھے چھوڑنے والی نہیں ہے جیسے چندا نے چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں مجبور ہوں کہ دونوں کی پوری نفرت یا پھر دونوں کی آدھی محبت کے عذاب سے بچنے کے لیے ایک کی محبت قبول کر لوں اور دوسری کی نفرت۔"

وہ طنز سے بولا "اور چندا بدقسمت ہے کہ نفرت اس کے حصے میں آئی۔"

"کیونکہ اس کے برعکس ہو نہیں سکتا۔ شبنم مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی۔ ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا۔ مگر نفرت دی خود چندا نے مجھے۔ وہ مجھے معاف بھی تو کر سکتی تھی یار!"

ہم اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ ہمیں چندا کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ خاموشی سے اندر آئی اور بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کتنی دیر سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ صورتِ حال ایک دم عجیب ہو گئی۔

میں نے کہا "کیا حال ہے چندا!"

اس نے سادگی سے کہا "ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟"

میں نے بھی رسمی جواب دیا "دیکھ لو۔ تمہارے سامنے ہوں۔"

"بہت اچھے لگ رہے ہو' اس لباس میں" اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا۔

میں نے کہا "ورنہ میں اچھا نہیں لگتا' میں جانتا ہوں۔"

"سنا ہے تم لندن جا رہے ہو؟" چندا بولی۔

میں نے کہا "ابھی تو کوئی پروگرام نہیں۔"

"مجھے کوئی نے بتایا۔"

میں نے کہا "شاید غلط فہمی ہوئی اسے۔ میں نے کہا تھا کہ شاید کاروبار کے سلسلے میں لندن جانا پڑے۔"

"تو چلو' میرے ساتھ چلو" اس نے نظر اٹھا کے کہا۔

میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا "تمہارے ساتھ؟"

"ہاں۔ پہلے ہم اسپتال کا کام کر لیں گے' پھر تم چاہو تو رک جانا ورنہ ساتھ ہی آ جائیں گے" اس نے کہا۔

"مگر تمہارے ساتھ مسٹر ایڈورڈ جا رہے ہیں۔۔۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

وہ بولی "تم چلو گے تو اس کی ضرورت نہیں' وہ خود بھی جانا نہیں چاہتا۔"

قمر کے لیے چندا کے رویے کی یہ تبدیلی اتنی ہی حیران کن تھی جتنی کمال کے لیے پُرلطف۔ خود میں اس ڈرامائی صورتِ حال کی وجہ سے جتنا حیران تھا' اس سے زیادہ محتاط تھا۔ چندا کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ وہ کئی بار مجھے متاثر کرنے کے لیے یا اپنی مظلومیت کی تبلیغ کے لیے ایسے ڈرامے کر چکی تھی جن سے اس کے جذباتی عدم توازن کا پتا چلتا تھا۔ وہ ایک بار کسی کو بتائے بغیر عائشہ کلینک پہنچ گئی تھی اور وہاں اس نے شبنم سے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی مگر بعد میں صاف مکر گئی تھی کہ وہ تو کہیں بھی نہیں گئی۔ حالانکہ اس نے آنے جانے کے لیے کمال اسپتال کی ایمبولینس استعمال کی تھی جسے سب نے دیکھا تھا۔ دوسری بار اس نے ڈیپریشن اور فرسٹریشن کی انتہا کو ظاہر کرنے کے لیے میرے سامنے خودکشی کرنا چاہی تھی لیکن بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ ریوالور خالی تھا۔ کرنل خان کی موت نے اسے بالکل ہی توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اور اس کی شخصیت کا ڈھانچا ذہنی عدم توازن کا شکار ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کی زندگی کی گاڑی دو مضبوط سہاروں کے اعتماد پر چل رہی تھی۔ ایک میں اور میری محبت اور دوسرا اپنے دادا کی شفقت اور تحفظ کا سایہ۔ چلتی ہوئی گاڑی کے دو پہیے نکل جائیں تو اس کی چال کہاں رہے گی اور وہ حادثے کا شکار کیسے نہیں ہو گی۔

چندا کا رویہ اور لہجہ اچانک ایسا ہو گیا تھا جیسے اس کے اور میرے درمیان کچھ بھی نہیں۔ اور سب کچھ وہی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا لیکن میں اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تبدیلی حقیقی نہیں تھی۔ ظاہر کا روپ بدلا جا سکتا ہے مگر شخصیت اور کردار کو کسی سوئچ سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا کہ پل بھر میں دھوپ کی جگہ چاندنی نظر آنے لگے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "مس چاندنی۔ آخر آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ کیوں ایسا سمجھتی ہیں آپ کہ میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

اس نے برا مانے بغیر اسی سادگی سے کہا "جی' کیا مجھے معلوم نہیں کہ ایڈی کے مقابلے میں تم زیادہ صحیح فیصلہ کر سکتے

ہو۔ اور تمہارا کردار بھی سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تمہاری DONATION ہے۔"

کمال نے فوراً اسے سپورٹ کیا "یس اور ہم نے مجبوری میں کیش قبول کیا تھا۔ ورنہ اسپتال اور لیبارٹری ایکوپمنٹ کا چوائس تمہارا اپنا ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "سوری کمال صاحب! میں جانتا ہوں کہ ایڈی بھی مشن اسپتال کا منتظم تھا جنوبی افریقہ میں اور مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ میں صرف PAYMENT کی ذمّے داری لے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

کمال نے بدمعاشی جاری رکھی "ٹائم کو MANAGE کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تو کون سا پہاڑ کھود رہا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "ابھی میں نے بتایا تھا کہ میں اپنا بزنس نئے سرے سے ESTABLISH کر رہا ہوں اور آفس تلاش کر رہا ہوں۔ یہ سب چھوڑ کے لندن چل پڑوں۔ تمہارا وفد جائے اپنے پروگرام کے مطابق۔ میں نہیں جا سکتا۔"

کمال نے مجھے آنکھ ماری "اگر میں' چندا اور قمر! ہم سب درخواست کریں آپ سے کہ اسپتال کے انٹرسٹ میں اپنے قیمتی وقت کی قربانی دیجیے۔"

"میں نہیں کہہ رہی ایسا" قمر نے ناگواری کا اظہار کیا۔

کمال نے اسے ڈانٹا "اپنے مجازی خدا کے فیصلے سے اختلاف کر رہی ہو؟ شوہر کے مقابلے میں بھائی کی طرف داری' اس کا تو پاپ بھی جائے گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہاں' میں جا رہا ہوں۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

چندا نے مجھے التجا آمیز نظروں سے دیکھا "ناصر۔ میں خود بھی ایڈی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔"

میں نے بے رخی سے کہا "تو مت جاؤ۔ لندن میں تمہارا کزن ہے نا؟"

"اس سے تو میں آج تک ملی بھی نہیں۔"

کمال بولا "ویسے بھی وہ کہتا ہے کسی ہوٹل کا منیجر ہے مگر میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ ویٹر ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ کوئی نہ جانا چاہے تو کسی کا بھی لندن جانا ضروری نہیں۔ بڑے سے بڑا سودا یہاں پاکستان میں بیٹھ کے ہو جاتا ہے۔ BUYER چاہے تو دنیا بھر کے مینوفیکچررز اپنے ایجنٹ بھیج سکتے ہیں اور اپنی مصنوعات کا معائنہ بھی کرا سکتے ہیں۔ لٹریچر' فلمیں اور SAMPLES بھیج سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل ٹریڈ کیسے ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں' میں یہاں بھی سب کچھ ARRANGE کرا سکتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔"

"ہرگز نہیں۔ ایک تو اس میں وقت زیادہ لگے گا۔ دوسرے کوالٹی کی صحیح پہچان کے لیے آزمائش ضروری ہوتی ہے۔ خیر' تو سوچ لے" کمال نے کہا "مگر تو جائے گا کیسے؟"

میں نے کہا "جیسے آیا تھا' ٹیکسی مل جائے گی۔"

اسی وقت چندا نے اپنی طرف سے ترپ کا پتا پھینک دیا "چلو' میں چھوڑ آتی ہوں تمہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "تم۔ کیسے۔؟ اور پھر تم خود واپس کیسے آؤگی؟"

"ایک گاڑی ہے ہم سب کے استعمال کے لیے" کمال بولا۔

"وہی ایمبولینس ہائی روف۔ تھینک یو!" میں نے کہا۔

"میں تو ہر جگہ ہر وقت جاتی ہی رہتی ہوں" چندا کھڑی ہوگئی "میں اور کوئی بہترین ایمبولینس ڈرائیور ہیں۔"

میں نے کہا "چندا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

کمال نے کہا "برادر عزیز! اس وقت یہاں کون سی ٹیکسی ملے گی آپ کو۔ جوتیاں چٹخاتے جاؤ گے ایک دو کلومیٹر دور تو شاید کوئی بٹھا لے۔"

میں نے کہا "چل پھر تو آجا۔"

لیکن چندا دل میں کچھ ٹھان چکی تھی "نہیں' مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔"

کمال نے خوش ہو کے کہا "پھر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا حافظ!"

قمر نے سخت جزبز ہو کے کہا "یہ بھی تو سوچو کہ چندا رات گئے اکیلی کیسے واپس آئے گی؟"

"اپنے جیسا موم کا مادھو کیوں سمجھ رکھا ہے تم نے چندا کو۔ ریوالور نہ ہو تب بھی وہ چار چھ کی ہڈیاں توڑ دے مذاق مذاق میں۔"

اس سے زیادہ مزاحمت میرے لیے ممکن نہ تھی۔ چندا نے میری بے رخی اور بے مروتی کے باوجود برا نہیں مانا تھا۔ اس سے آگے جانا بے عزتی کہلاتا اور چندا کی ذہنی حالت کے پیش نظر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے مزید ذلیل کروں۔ اس نے بات کرنے کی بات کی تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس کے رویے کی اس ڈرامائی تبدیلی کے پیچھے پوشیدہ مقاصد کا پتا چلاؤں۔ اگر اس نے میری اور کمال کی گفتگو سننے کے بعد جانتے بوجھتے اپنا رویہ بدلا تھا تو اس سے میں بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔ چندا وہ پہلے والی چندا پھر بھی نہیں ہو سکتی

تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں اس نے جس طرح مجھے مسلسل ذہنی اذیت اور طویل ذلت کے عذاب میں مبتلا کیا تھا وہ میں بھولا نہیں تھا۔

غلطی کر کے معافی مانگنے اور کفارہ ادا کرنے کی خواہش رکھنے والے کے بارے میں ایسا سمجھنا جہالت اور بے وقوفی کی بات ہوگی کہ اس کی عزتِ نفس نہیں رہی اور اب ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جب تک چاہے اس غلطی پر ذلیل کرے۔ چندا نے ایسا ہی کیا تھا اور اس نے میرے پندار کو اتنا مجروح کیا تھا کہ ایک فطری ردِ عمل کے طور پر میں اس سے بدظن ہو گیا تھا۔ صبح کا بھولا اگر شام کو لوٹ آئے اور اس پر گھر کے دروازے بند کر دیے جائیں تو پھر وہ کبھی نہ آنے کے لیے چلا جاتا ہے۔

میں نے اخلاقاً بھی اس سے نہیں کہا کہ ڈرائیونگ میں کرتا ہوں۔ وہ ایمبولینس شروع سے کمال کے استعمال میں تھی اور درحقیقت اس کی ذاتی گاڑی تھی جسے اس نے ایمبولینس بنا دیا تھا۔ بہت پہلے میں بارہا کمال کے ساتھ اس میں سفر کر چکا تھا۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ پہلے یہ شہر کے اندر ہی کم فاصلوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ نئے اسپتال کا شہر کے مرکزی علاقوں سے فاصلہ بہت زیادہ تھا اور یہ گاڑی تین افراد استعمال کرتے تھے۔

اسپتال کے گیٹ سے نکل کے گاڑی مین روڈ پر آئی تو زیادہ رات نہیں ہوئی تھی مگر اس علاقے میں ابھی رہائشی مکانات بہت کم بنے تھے چنانچہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ گیٹ سے سڑک کا فاصلہ سو گز یا کچھ زیادہ ہوگا۔ سڑک نسبتاً بلندی پر تھی۔ گیٹ تک کا راستہ نیم پختہ اور نشیبی تھا۔ چندا نے چڑھائی پر ایکسی لریٹر دبایا اور دائیں طرف مڑتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ بائیں جانب سے ایک ٹرک کتنی تیز رفتاری کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ ٹرک سے پہلے گزر کے سڑک کے بائیں طرف پہنچ جائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ چندا کو کسی خطرے کا احساس ہی نہیں۔

اس نے ابھی چند منٹ پہلے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بڑی اچھی ڈرائیور ہے اور میں بھی جانتا تھا کہ اس دعوے کی صداقت میں شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اصل بات کچھ اور تھی۔ شاید اس نے ٹرک دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ بے خیالی میں سڑک پر آرہی تھی۔

ٹرک کے لیے رفتار کم کرنا یا ایمبولینس کو بچانا یقیناً مشکل ہو جاتا۔ میں نے چلا کے چندا کو پکارا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بڑھا کے ایمبولینس کا اسٹیئرنگ دائیں طرف گھما دیا۔ چندا ایک دم چونکی۔ گاڑی تھوڑا سا بے قابو ہو کے لہرائی مگر چندا نے اسے سنبھال لیا۔ ٹرک ایک بگولے کی طرح ایمبولینس کے پیچھے والے بمپر کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ ریتی بجری کے ٹرک ڈرائیور ایسی ہی خطرناک ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ٹرک کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جسے اپنی جان بچانی ہوگی خود بچائے گا۔

میں نے کہا "کہاں غیر حاضر تھا تمہارا دماغ؟"

چندا نے سکون سے کہا "کہیں نہیں' آئی ایم سوری۔"

میں دروازہ کھول کے اترا "ادھر آؤ تم۔ میں ڈرائیونگ کروں گا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ میں گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پر جاتا ایک کار کی ہیڈ لائٹس سیدھی ہماری طرف ہوئیں۔ پھر شبنم کی سوزوکی ایف ایکس عین ایمبولینس کے پیچھے آکے رک گئی۔ اچانک اس سنسان تاریک سڑک پر شبنم کے مقابل میں اور چندا آگئے۔

میں نے سخت حیران ہو کے کہا "تم کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"یہ سوال تو میں بھی کر سکتی ہوں تم سے' تم دونوں سے؟" شبنم طنز سے بولی۔

چندا نے کہا "میں ناصر کو چھوڑنے جا رہی تھی۔"

"اب اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ میں بھی ناصر کو لینے ہی آئی تھی۔" شبنم نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

چندا نے سر ہلایا "ٹھیک ہے' پھر میں جاتی ہوں۔"

شبنم نے سر بھی نہیں ہلایا۔ وہ چندا کو گاڑی میں بیٹھ کے واپس جاتا دیکھتی رہی۔ ایمبولینس تھوڑا سا ریورس میں گئی۔ پھر موڑ کاٹ کے نشیبی راستے پر اتر گئی۔ شبنم نے اپنی کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔

میں نے کہا "تم کہاں چھپی کھڑی تھیں' میں نے نہیں دیکھا۔"

"تم دیکھ کیسے سکتے تھے' تمہاری نظر تو چندا پر ہوگی اور اس کی تم پر۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ تم کو کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی اور تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں۔"

"یہ میرا اندازہ تھا۔ اور غلط نہیں تھا" وہ تیز ہو کے بولی "لیکن تمہارے ڈاکٹر کمال نے جانتے بوجھتے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم یہاں نہیں ہو۔"

میں نے کہا "اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

شبنم نے چلّا کے کہا "جھوٹ بولا تھا اس نے۔ اس سے

پہلے ہی چندا مجھے بتا چکی تھی کہ تم یہاں ہو۔"

میں دم بخود رہ گیا "چندا نے ایسا کہا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے فون کیا تھا" وہ غصے میں بولی۔

"کیوں فون کیا تھا؟" میں نے بھی درشتی سے کہا۔

"اسی لیے کہ تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ تم کہاں ہو۔ فرید عباسی تمہیں بار بار ہوٹل میں فون کرتا رہا اور اسے ہوٹل والے یہ بتاتے رہے کہ تم موجود نہیں ہو۔ پھر اس نے مجھے فون کیا۔ نیلم سے پوچھا اور میں نے یہاں معلوم کیا۔ میری چندا سے بات ہوئی۔"

میرا غصہ اب جھنجلاہٹ میں بدل گیا "کس وقت فون کیا تھا تم نے؟"

"چار بجے!"

"چار بجے میں یہاں نہیں تھا" میں نے کہا۔

"پھر چندا نے کیوں کہا کہ تم یہاں ہو؟ میں نے کہا کہ میری بات کراؤ اس سے تو اس نے کہا کہ وہ کمال کے ساتھ باہر نکلے ہیں۔ ابھی آجائیں تو میں بتادوں گی۔ وہ خود فون کرلیں گے آپ کو۔"

"بکواس کی ہے اس نے۔ جھوٹ بولا ہے تم سے" میں نے چلا کے کہا۔

شبنم نے کہا "چلاؤ مت۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ یہاں کھڑے رہ کر کب تک لڑ سکتے ہیں ہم؟"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا "شبنم۔ یہ سچ ہے' میں ساڑھے پانچ بجے کے بعد آیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے سات تک ملاقاتوں کا وقت ہوتا ہے۔ وہ شروع ہی ہوا تھا' تم پوچھ لو چوکیدار سے۔"

"اس سے کیا پوچھوں۔" شبنم منہ سجا کے بولی۔

میں نے کہا "پوچھ کے دیکھو۔ یہ پوچھو کہ ناصر صاحب کیسے آئے تھے۔ وہ تمہیں بڑی دلچسپ بات بتائے گا۔ مجھے ایک شخص اپنی کار میں چھوڑ گیا تھا۔ بہت شاندار چھیاسی ماڈل کی گاڑی تھی۔ مگر میں ڈکی سے برآمد ہوا تھا۔ اس چوکیدار نے دیکھا تھا۔"

"میں آدھا گھنٹا منتظر رہی تمہارے فون کی۔ پھر کمال سے بات ہوئی تو وہ صاف مکر گیا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ مت پوچھو۔"

"تم نے اس سے کہہ دیا کہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اور فون بند کردیا غصے میں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ جھوٹ تمہاری اس چاندنی نے بولا تھا۔"

میں نے اسے منانے کے لیے اس کا چہرا اپنی طرف کیا "کیوں کو چھوڑو' جھوٹ تو تھا ناوہ۔ پھر ناراضی کیسی' کیا تمہیں جلن ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔ گیارہ بجے ہیں اس وقت" اس نے منہ پھیر لیا "ساڑھے پانچ گھنٹے سے یہاں ہو تم اس کے ساتھ۔"

"لا حول ولا قوۃ۔ وہ تو ابھی آئی تھی مشکل سے آدھا گھنٹا پہلے۔ میں قمر کے پاس تھا' وہیں کھانا کھایا' کمال سے باتیں کرتا رہا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم اس کے ساتھ جارہے تھے کہیں۔ مجھے دیکھ لیا تو اس نے ایک اور جھوٹ بول دیا۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ نہیں تھا۔ وہ مجھے چھوڑنے جارہی تھی۔"

"بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ یہ جھوٹ تھا وہ جھوٹ نہیں تھا۔" وہ پھر چلانے لگی "تمہیں چھوڑنے کے لیے تمہارا دوست کمال نہیں جاسکتا تھا' آدھی رات کو کیا وہ اکیلی واپس جاتی۔"

میں نے کہا "یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم مجھ پر شک کررہی ہو۔ میری سننے اور ماننے پر تیار نہیں ہو۔ تمہاری محبت پر تو میرا اعتماد شکوک اور بے یقینی سے بالاتر تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم رشک وحسد اور رقابت کے جذبات سے مبرا ہو۔"

وہ تنک کر بولی "کیوں؟ کیا میں عورت نہیں ہوں۔ خلائی مخلوق ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "کیونکہ تم نے کبھی رخشی سے یا کسی بھی عورت سے خطرہ محسوس نہیں کیا۔ اس کی پروا نہیں کی۔"

"پہلے کی بات مت کرو۔ اس وقت میں مجبور تھی۔ تم شاہ عالم نہیں ہو۔ ناصر عظیم ہو۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ تم کرتے ہو' کرتے ہونا' نہیں۔؟" اس نے دل زدہ لہجے اور گلوگیر آواز میں کہا۔

میں نے کہا "کیا تمہیں شک ہے کہ ایسا نہیں۔"

"آج تک نہیں تھا۔ آج چندا کو دیکھ کے نہ جانے کیوں میں ڈر گئی۔ وہ عورت تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے۔ اس کے پاس جو طاقت ہے وہ تمہاری کمزوری ہے۔ میں جانتی ہوں۔ نمبرون وہ ہے۔ میں دو نمبر ہوں اور دو نمبر ہی رہوں گی جب تک۔"

"کب تک؟"

"ہمیشہ۔ تم اسے بھول نہیں پاؤ گے۔ اس سے نفرت کرنا

تو دور کی بات ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا "خیر' چھوڑو یہ بات۔ تم یہاں نہیں تھے تو سارا دن کہاں تھے؟"

میں نے کہا "تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی تھی میری؟"

"فرید عباسی تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ رئیس کا پتا چل گیا ہے۔"

میں نے خوشی سے کہا "اچھا۔! کہاں ہے وہ؟"

"پولیس کی تحویل میں۔ انہوں نے کسی مجسٹریٹ کے گھر جاکے اس کا فزیکل ریمانڈ لے لیا ہے' چودہ دن کا۔"

میں نے کہا "الزام وہی ہے؟"

وہ بولی "ہاں۔ دہرے قتل کا۔ خود آگ لگا کے انشورنس کمپنی سے حرجانہ وصول کرنے کا۔ اور ایسے ہی بے بنیاد الزامات۔ پولیس کے مطابق وہ سی آئی اے سینٹر میں ہے اور اس سے تفتیش جاری ہے۔ فرید نے سیشن کورٹ میں درخواست دائر کی تھی مگر وہ خارج ہوگئی۔ جب تک چالان پیش نہ ہو اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوشش فضول ہوگی۔ فرید ہائی کورٹ میں اپیل کررہا ہے اس بنیاد پر کہ رئیس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کو فزیکل چیک اپ کے لیے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ اب ہم اسے قتل کے الزام سے ایسے بچالیں گے جیسے دودھ سے مکھی نکالتے ہیں۔ مکھی کو بچانے کے لیے۔ مگر یہ بات بتانے کے لیے تمہارا یوں اپنے ماہی سے ملنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح لپکنا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔"

"ماہی صاحب! یہ بے وقوفی کیسے ہوئی؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ تمہارے اور شاہ عالم کے تعلق کو دنیا جانتی ہے اور میں تمہیں بچانے کے لیے روپوش ہوں۔ بقول غالب۔ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔ شاہ عالم کا اب شبنم سے کوئی تعلق نہیں۔"

وہ چیخ کے بولی "شاہ عالم کا اس چندا جیسی چاندنی سے کب تعلق تھا۔ اس کا تو قمر یا ڈاکٹر کمال سے بھی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ کیوں گیا تھا پھر وہ وہاں؟"

میں نے بھنا کے کہا "بے وقوف لڑکی۔ میں نے اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ کوئی میرے پتے ٹھکانے کا سراغ نہ لگا سکے اور میرا تعاقب کوئی کرہی نہیں سکتا تھا۔ تم پر تو نہ جانے کس کس کی نظر ہوگی۔ جو یہ سمجھتے ہوں گے کہ شاہ عالم پاکستان میں ہے تو شبنم کے پاس ہی ہوگا۔ شبنم کے سوا اب کون ہے اس کا؟"

وہ بولی "ہاں' ایسا ہی خیال ہے لوگوں کا۔ انٹرویو سے بات پھیل گئی تھی۔ لوگوں نے پہلے تو فرزانہ سے ہی پوچھا ہوگا۔ پھر بڑے بڑے ہوٹلوں سے معلوم کیا ہوگا۔ میری چوائس میں بن گئی۔ مجھے نہ جانے کس کس کے فون آتے رہے۔"

"تمہیں کسی کا نام یاد نہیں؟"

"کچھ لوگوں کو میں جانتی ہوں۔ تمہاری پارٹی کو ہائی جیک کرنے والے دو نائب صدور تھے۔ وکیل قریشی اور شمس الزماں۔ گاڑی کا ایک ایک پہیا لے کر الگ ہوگئے تھے۔ گاڑی چلی نہیں۔ اب پھر تمہارے آسرے پر سیاست کی دکان چمکانے کی فکر میں ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ شاہ عالم سے سب مل کے درخواست کریں گے کہ ملک اور قوم کے مفاد میں وہ پھر پارٹی کی کمان سنبھالیں۔ بے شرم لوگ! کتنی ڈھٹائی سے ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ ایک کوئی اشرف علی تھا۔ وہ سب سے زیادہ بے چین تھا۔ اخبار والوں نے سب سے زیادہ پریشان کیا۔ وہ مجھے قائل کرتے رہے کہ مجھے ذاتی تعلقات سے زیادہ صحافت کے پیشے کی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہر ایک مجھ سے پرانے مراسم کا حوالہ دے کر یہ چاہتا تھا کہ میں اس کا ایک خصوصی انٹرویو کراؤں۔"

"یعنی وہ تمہارے انکار کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھے۔ یہ سمجھنے پر بضد تھے کہ تم ان سے بھی جھوٹ بول رہی ہو۔"

"ہاں۔ کچھ لوگوں سے تلخ کلامی بھی ہوگئی۔ میں نے کہہ دیا کہ تم شاہ عالم کی اور میری چھپ چھپ کر خلوت میں ملنے کی تصویریں چھاپ دو۔ لکھ دو کہ شبنم نے اپنے آشنا کو اپنی خواب گاہ میں چھپا رکھا ہے۔ بعض نے دھمکی دی کہ فکر مت کرو' ایسا ہی ہوگا۔ ہم پتا لگالیں گے کمینے۔ بلیک میلر۔!"

میں نے کہا "کیا تمہیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اب وہ جاسوسی کریں گے۔ تمہارے پیچھے لگ جائیں گے یا ایسے لوگوں کو لگادیں گے جن کو تم نہیں جانتیں۔"

"بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں میں ان معاملات کو۔ میں خود اسی میدان کی پرانی کھلاڑی ہوں۔ آج کسی نے مجھے آفس سے نکلتے نہیں دیکھا۔ انہیں بہت دیر بعد پتا چلا ہوگا کہ سونے کی چڑیا تو اڑ گئی۔"

"کیا تم سلیمانی ٹوپی پہن کے سب کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں؟"

وہ ہنسی "برقع کہتے ہیں اس سلیمانی ٹوپی کو۔ میں نے اوپر سے ہی دیکھ لیا تھا کہ نیچے کچھ لوگ مشکوک اور مضحکہ خیز انداز میں جاسوس بنے کھڑے ہیں۔ بابر وقار کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں۔ جسے سب پی وی کہتے ہیں۔ وہ راہ چلتے ہر لڑکی پر عاشق ہو جانے والا نوجوان فوٹو گرافر۔ جو غالباً تم پر بھی فریفتہ ہے۔"

"ہاں۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا کہ مجھے خاموشی سے نکلنا ہے۔ وہ آگیا کسی برقع پوش محبوبہ کو ساتھ لے کر۔ اسے بٹھا دیا آفس میں۔ میں اس کا برقع اوڑھ کے پی وی کے ساتھ نیچے اتری اور اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کے نکل گئی۔ جنھوں نے کچھ دیر پہلے اسے آتا دیکھا تھا انھیں شک بھی نہیں ہوا۔ وہ سب وہیں ٹہلتے رہے ہوں گے۔ میری گاڑی سروس اسٹیشن کا ایک ملازم لے گیا تھا۔ وہاں سے میں نے گاڑی لی اور ادھر آگئی۔ وہ لڑکی شاید چلی گئی ہوگی اپنے گھر۔ تم نے دیکھا نہیں، شیشوں کے پیچھے رنگین اسٹیکر بھی لگوائے ہیں میں نے۔ شیشے اب سیاہ نظر آتے ہیں۔"

"جہاں تک میری ناقص معلومات ہیں۔ یہ وقت ایک ایڈیٹر کے لیے انتہائی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ تم کسی کو لفٹ نہیں کراتی ہو دس بجے یا اس کے بعد۔ آزاد صاحب غیر ذمے داری کے اس مظاہرے کو پسند نہیں کریں گے۔"

"آزاد صاحب اسپتال میں ہیں۔ انھیں ایک MILD سا اٹیک ہوا تھا۔ ان کے لیے اب اخبار اور صحافت شجرِ ممنوعہ ہو گئے ہیں۔ میں ذرا مختلف انداز سے سوچتی ہوں۔ کسی پارٹی، ادارے یا کاروبار کو ون مین شو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہے تو سب ٹھیک ہے ورنہ ختم۔"

"ہمارے ملک میں تو ایسا ہی ہے۔ سیاسی جماعت ہی نہیں، ایدھی صاحب کا فلاحی ادارہ بھی ان کے نام کی برکت سے چل رہا ہے۔ ان کے بعد دوسرا کون ہے، لوگ نہیں جانتے۔"

"میں نے ایک معاون کو اپنا متبادل بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جو کسی بھی وقت میری جگہ لینے کا اہل ہو۔ کل تم نے دیکھا ہو گا اسے۔"

"وہ تو عجیب بے وقوف اور ہونق قسم کا آدمی تھا۔"

"ہیں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ جینئس بھی صورت سے نہیں پہچانے جاتے۔ آزاد صاحب کی اس سے بالکل نہیں بنتی تھی کیونکہ اس کے نظریات آنے والے کل کے تھے۔ آزاد صاحب گزرے ہوئے کل کے آدمی تھے۔ ان کی خوب کل کل رہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی میری خوب نبھے گی۔ میں نے اسے ذمے داری دی ہے تو وہ خوش ہے۔"

"مطلب یہ کہ اب نام چھپے گا ایڈیٹر کی جگہ تمہارا اور کام کرے گا وہ بے چارہ۔ تمہارے لیے تو ایک مسکراہٹ یا ایک ادائے ناز سے کسی پر الو کی لکڑی گھمانا کوئی مشکل نہیں۔ وہ بھی EXPLOIT ہو گا۔"

شبنم ہنسی "زمانہ ہی EXPLOITATION کا ہے۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا اور ترقی کرنا خود کو منوانا، سب مشکل ہے۔ خیر، یہ بتاؤ کہ کہاں چلیں۔ ابھی ہوٹل جانا ضروری نہیں تو گھر چلتے ہیں۔"

"کون سے گھر؟"

"اپنے گھر، گن آباد میں۔ ابھی تو وہی ہے اپنا گھر۔ آج وہاں کوئی نہیں ہو گا، ہمارے علاوہ" اس نے گاڑی روک دی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا "پھر؟"

"پھر یہ کہ۔۔۔ ہم ہوں گے اور مکمل تنہائی" اس نے مجھے نشیلی جادو کر دینے والی پُرکشش نظروں سے دیکھا "کیا خیال ہے؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "اگر تمہارا مطلب وہی ہے۔۔۔ جو میں سمجھ رہا ہوں تو مجھے افسوس ہے، میں ہوٹل جانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے یہاں اتار دو اور جاؤ، میں پیدل چلا جاؤں گا یہاں سے۔"

وہ کچھ خفیف اور خفا نظر آنے لگی "کیا ہو گیا ہے آخر تمہیں۔ تم مجھے کیوں اس طرح AVOID کرتے ہو۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"شبنم! پہلے کی بات اور تھی" میں نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"کیوں۔ اب کیا ہے؟ تم بھی وہی ہو، میں بھی وہی ہوں۔ کیا تمہارے جذبات بدل گئے ہیں میرے لیے۔" وہ مجروح لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ پہلے شاہ عالم کے جذبات میں صرف ہوس تھی، اب ناصر عظیم تمہیں محبت کا مطلب سمجھانا چاہتا ہے۔"

"چھوڑو یہ فضول باتیں۔ یہ خالی خولی لفاظی والی محبت۔ تم کبھی ایسی افلاطونی محبت کے قائل نہیں تھے۔ تم تو شادی کو بھی ایک فضول معاشرتی رسم کا بندھن کہتے تھے۔ برنارڈ شا کا قول دہراتے تھے کہ یہ PROSTITUITION ہے مگر LEGALISED۔"

میں نے شبنم کے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ "یہ تم بار بار اس قابلِ شرم زمانے کا حوالہ کیوں دے رہی ہو۔ کیا وہ سب ٹھیک تھا؟"

"غلط اور صحیح دونوں کے فائدے نقصانات سب ہمارے ہی ہیں۔ آنے والے وقت میں ہم میں سے کون ہے

جو دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ نہ کبھی تم فرشتہ، پارسا تھے اور نہ میں کوئی باعفت دوشیزہ۔ گناہِ آدم میں ہم دونوں۔"

"پلیز شٹ اپ! بند کرو یہ بکواس!"

اس کی انا کو ٹھیس لگ چکی تھی۔ "تم مجھے ٹھکرا رہے ہو، بے عزتی کر رہے ہو میری، آخر کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں ٹھکرا نہیں رہا ہوں۔ اپنا رہا ہوں۔"

"جھوٹ۔ تم اب مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔ تمہیں میری طلب پہلے کی طرح محسوس نہیں ہوتی۔ میں IGNORED محسوس کرتی ہوں۔ مجھے تمہارا وہی دیوانگی والا پیار چاہیے۔ آخر میں گوشت پوست کی ایک جیتی جاگتی عورت ہوں۔ کوئی کاٹھ کی گڑیا نہیں ہوں جس سے تم کھیلتے رہو۔ ابھی سے یہ حال ہے تو زندگی کیسے گزرے گی۔" وہ ہسٹیریا سے مغلوب ہو کے کانپنے لگی تھی اور اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا "بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم میرے لیے وہ شبنم نہیں ہو جو محض ایک عورت تھی۔ ایک بدنام عورت جس کے جسم پر شاہ عالم کا تصرف تھا۔ تم میرے مستقبل کی امین ہو۔ اور مجھے اپنی امانت کی حفاظت کرنی آتی ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر جم گیا۔ پھر وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ "تم۔۔۔ ذلیل کتے۔۔۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہارا دل بھر گیا ہے میرے جسم سے۔ یہ باسی ٹھنڈا گوشت ہے تمہارے لیے۔ تم کو چاہیے چندا کا کنوارا جسم!"

میں نے اسے ایک ہاتھ اور مارا "فاحشہ۔ آج آگئی نا اپنے اصل روپ میں سامنے۔"

پھر اچانک مجھے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ یہ شراب کی بو تھی۔ میں نے شبنم کے بال پکڑ لیے اور اس کا منہ اپنے منہ کے سامنے لا کے سونگھا۔ وہ تقریباً نیم بے ہوشی میں کراہنے لگی۔ "صاف بات میں کروں؟ شاہ عالم مرد تھا۔ ناصر عظیم نامرد ہے۔ عورت کے کام کا نہیں رہا۔ کس نے کیا ہے یہ حال تیرا۔ بول، بیوی نے بھی اس لیے چھوڑ دیا تھا نا تجھے؟"

اتنی دیر میں نشہ اس پر پوری طرح غالب آ چکا تھا۔ غصے سے میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر سر میں آگیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ شبنم نے شراب پی ہے، میں ایک دم ہوش میں آگیا ورنہ شاید اشتعال کی کیفیت میں میرے ہاتھوں پر میرا اختیار نہ رہتا۔ میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

میں نے اسے چھوڑا تو وہ اسٹیئرنگ پر گر گئی۔ میں نے کچھ لمبے لمبے سانس لے کر اپنی جنونی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اس کے باوجود میرا دماغ گھوم رہا تھا اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ شبنم نے شراب کہاں پی۔ کیسے پی اور کیوں پی؟ کسی نے اسے زبردستی پلائی یا پھر دھوکے سے؟

او مائی گاڈ۔ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ شبنم گاؤں کی نادان، بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی کہ اسے کوئی شراب پلائے اور وہ پی جائے۔ اس کے علاوہ نشے کا اثر بیس پچیس منٹ میں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب وہ اسپتال کے باہر میرے انتظار میں گاڑی لیے کھڑی تھی، اس وقت وہ پی چکی تھی یا پی رہی تھی۔ اس نے زیادہ نہیں پی تھی اور شاید احتیاط برتی تھی کہ مجھے پتا نہ چلے۔ ٹھنڈی ہوا میں شراب کا اثر کچھ دیر سے ہوا تھا اور نشے میں وہ اپنے عقل و حواس پر کنٹرول کھو بیٹھی تھی۔ جو کچھ اس نے کہا وہ اس کے اندر کا سچ تھا جو عقل کا سنسر ہٹتے ہی باہر آگیا۔ نشے میں انسان کی اصل شخصیت ننگی ہو کے سامنے آجاتی ہے۔ مصلحت کے بھاری لبادوں کے نیچے سے نکل آتی ہے۔

مجھے سخت صدمہ ہوا۔ کتنا عرصہ میں دھوکے میں رہا کہ شبنم کیا ہے اور وہ کیا تھی۔ وہ بے غرض چاہت اور حقیقی محبت کا ناٹک کرتی رہی۔ اس امید میں کہ ایک نہ ایک دن میں بھی ضبطِ نفس کا جھوٹا کھیل ختم کر کے پھر پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔ شاہ عالم بھی دولت مند تھا۔ ناصر عظیم بھی ہے اور نام میں کیا رکھا ہے اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اب تو رخشی کا کانٹا بھی درمیان سے نکل گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں ایسے سوچتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ پندرہ منٹ سے ہماری گاڑی سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر سے گزرنے والی کسی گاڑی کے مسافر ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ گاڑی کے سب شیشے بند تھے۔ ایک نظر میں یہ گاڑی لاوارث کھڑی نظر آتی ہو گی۔ جسے مالک خرابی کی بنا پر ایک طرف کھڑا کر گیا۔ کسی نے ہماری گفتگو نہیں سنی تھی اور وہ ڈراما نہیں دیکھا تھا جس میں ہسٹیریا نشہ اور تشدد کے سین تھے۔

اپنی موجودہ حالت میں شبنم اس قابل نہیں تھی کہ سیدھی بھی بیٹھ سکے۔ ابھی تک اس نے گاڑی نہیں ٹکرائی

تھی تو یہ شاید میری خوش قسمتی تھی۔ زندگی کی کوئی نیکی یا کسی کی دعا نے حادثے سے بچا لیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سوچا کہ یہاں بیٹھ کے دکھی ہونے اور افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے شبنم کو اس کے گھر پہنچانے کی فکر کرنا چاہیے۔

وہ اسٹیئرنگ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر پیچھے والی سیٹ پر ڈالنے سے پہلے میں نے گاڑی کی تلاشی لی مگر اس میں شراب کی بوتل نہیں تھی۔ شاید اس نے خالی بوتل کہیں پھینک دی تھی۔ بوتل کہاں سے آئی۔ اس میں کتنی شراب تھی اور کون سی شراب تھی۔ یہ سمجھنا محال تھا۔ میرے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ تھا کہ دفتر سے نکل کے وہ بی وی کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھی تو اس نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت تک اسے نشہ نہیں تھا۔ یہ کم سے کم دو گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ اپنے آفس سے وہ سروس اسٹیشن گئی۔ وہاں سے کار لینے میں بھی وقت لگا ہوگا۔ راستے میں اسے شراب کہاں سے ملی؟ اور کیا اس نے گاڑی چلاتے ہوئے پی؟

عقل یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے اسپتال کے باہر بھی نشے سے مغلوب نظر آتی مگر اس وقت وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔ پھر کیا اس نے اسپتال کے باہر گاڑی میں میرا انتظار کرتے ہوئے پی؟ شاید میرے باہر آتے وقت ہی اس نے بوتل منہ سے لگائی ہوگی۔ پھر وہ بوتل کہاں گئی۔

ذہن سے ان پریشان کن سوالات کو جھٹک کر میں نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولا اور شبنم کو کھینچ کر اٹھا لیا۔ میں نے اسے پیچھے ابھی سیٹ پر ڈالا ہی تھا کہ ایک گزرتی ہوئی گاڑی بریک لگا کے رکی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ پولیس کی جیپ تھی۔

ایک خرانٹ قسم کا سب انسپکٹر بڑے جارحانہ تیور کے ساتھ میری طرف آیا "اوئے اے کی ہو رہیا اے۔"

میں نے دروازہ بند کیا "تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟ مجرا ہو رہا ہے۔"

"بکواس مت کر۔ سیدھی طرح جواب دے، یہ کون عورت ہے؟"

میں نے کہا "میری بیوی، گاڑی چلا رہی تھی۔ طبیعت خراب ہو گئی اس لیے پیچھے لٹایا ہے۔ اب میں گاڑی چلاؤں گا۔"

"کیا ثبوت ہے کہ تیری بیوی ہے یہ؟" وہ غصے میں بولا۔

"کیا ثبوت پیش کروں؟ نکاح نامہ دکھاؤں؟ تم لوگ کب باز آؤ گے شریف لوگوں کو پریشان کرنے سے۔ تم بیوی کے ساتھ پھرتے ہو تو ایسا کوئی ثبوت ساتھ رکھتے ہو؟" میں نے بھی غصے میں کہا۔

سب انسپکٹر کو مجھ سے کچھ الجھنے کی امید تھی۔ اسے یہ موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے شک کا اظہار کرتا اور کہتا کہ تم اور یہ عورت حدود آرڈیننس کے تحت سرعام فحاشی کے ارتکاب میں مبتلا تھے اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر داد عیش دیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ اب چلو تھانے ورنہ مجھے اپنی عزت کی قیمت ادا کرو۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" وہ تو سے تم پر آ گیا۔

"میرا نام چھوڑو، اس عورت کا نام پوچھو۔ اس کو پہچان لیا ہوتا تو تم میرا نام بھی نہ پوچھتے۔ دور ہی سے گاڑی کو سلام کر کے چلے جاتے۔"

وہ مزید محتاط ہوا "یہ کون خاتون ہیں؟"

میں نے کہا "شبنم کا نام سنا ہے؟"

اس نے پھر غرا کے اپنی ڈنڈی میری ناک کے سامنے لہرائی "اڑے۔ اندھا سمجھتا ہے ہمیں یا پاگل؟ وہ فلم والی شبنم تیرے ساتھ پھرے گی؟ اپنی شکل دیکھی ہے۔ اور وہ تو اب ختم ہو گئی۔ یہ کوئی اور شبنم ہے پتر۔ سچ سچ بتا دے کہاں سے لایا ہے اس شبنم جان کو؟"

میں نے اگلی سیٹ پر پڑا ہوا شبنم کا بیگ اٹھایا اور اس میں سے شبنم کا کارڈ نکالا "یہ لو۔ انگریزی آتی ہے تو پڑھ لو۔"

اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی طرف رخ کر کے کارڈ دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ "یہ ایڈیٹر ہیں۔ سر جی! آپ نے پہلے کیوں نہیں فرمایا۔ ہم تو اخبار والوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔"

"عزت کا مطلب سمجھتے ہو تم لوگ؟ یہ کہو کہ زبردست کے سامنے ناک رگڑنے لگتے ہو ورنہ تھانے لے جا کے عزت دار آدمی کی عزت اتارنے میں دیر نہیں لگاتے۔ اب جاؤ ورنہ صبح کچھ چھپ گیا تمہارے خلاف تو یہ چٹھی ہاتھ میں نظر آئے گی۔ نام بھی دیکھ لیا ہے میں نے تمہارا اور جیپ کا نمبر بھی۔"

وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبا کے بھاگ گیا۔ ابھی جیپ روانہ ہی ہوئی تھی کہ پیچھے سے شبنم نے ہنس کے کہا "بہت اچھے!"

میں اچھل پڑا۔ شبنم سیٹ پر سیدھی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو "شبنم، یہ سب کیا

تھا؟"

وہ ہنستی رہی "کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں تھا۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "تم نے شراب نہیں پی تھی؟"

"شراب!" وہ پھر بے اختیار ہنسی "کہاں ہے شراب! اور کیا تم یقین کر سکتے ہو ایسی بات کا۔"

میں نے کہا "مگر ۔۔۔ وہ سب۔ اور تمہارے منہ سے بدبو آ رہی تھی۔"

اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے "ان کو سونگھو۔"

"بو ہاتھوں میں سے بھی آ رہی ہے" میں نے کہا۔

وہ بولی "تھوڑی سی ہاتھوں میں مل کے چہرے پر لگالی تھی۔"

"لیکن کیوں؟" میرا دماغ پھر خراب ہونے لگا۔

وہ ہنستی رہی "آج میں آزمانا چاہتی تھی تمہیں۔"

میرے سر میں لہو کی گرمی بڑھ گئی "کیوں آزمانا چاہتی تھیں مجھے؟ کیا شک تھا تمہیں مجھ پر؟ کیا سمجھا تھا آخر تم نے مجھے کہ میں تم کو نشے میں مدہوش دیکھ کر حالات سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ تمہارے کہنے پر تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا۔ جہاں آج رات ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آئی ایم سوری! یہ صرف ایک مذاق تھا۔" اس کا چہرہ اتر گیا۔

"بکواس کرتی ہو تم۔ جھوٹ بولتی ہو۔ تم مجھے میری نظر سے گرانا چاہ رہی تھیں۔ تم وہی چاہتی تھیں جو اس مذاق کا مقصد تھا۔ جو تم نے مجھ سے نشے کی حالت میں کہا۔ وہ تمہارے دل کی آواز تھی، تمہارا مدعا تھا۔"

اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو، تمہاری قسم وہ مذاق تھا۔"

"قسم کھانے سے جھوٹ سچ نہیں ہو جاتا۔ اگر میں تمہارے جذبات کی یلغار کے آگے سپر ڈال دیتا تو وہ مذاق ایک بدصورت اور گنہگار حقیقت کا شاخسانہ بن جاتا۔ اپنی ناکامی اور شکست پر پردہ ڈالنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بہت بے ہودہ مذاق تھا یہ۔" میں نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور پیدل چل پڑا۔

وہ چلائی "سنو تا ۔۔۔ سر۔ کہاں جا رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "میرے پیچھے ۔۔ ت آنا۔"

"دیکھو۔ میں ہوٹل پہنچ جاؤں گی" اس نے پُرخطر انداز میں کہا۔

میرے قدم رک گئے "شبنم۔ میرا دماغ اور خراب مت کرو۔ میں تمہاری اس حرکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کروں گا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "پلیز، میرے ساتھ آؤ۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ معاف کر دو مجھے" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اس کے بعد میری مزاحمت ختم ہو گئی "اچھا اچھا، رونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی لوگ گاڑی روک کے مجھ سے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگیں گے۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

وہ سارا راستہ روتی رہی۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے آزاد صاحب کے گھر لے جا کے اتارنا چاہا تو اس نے کہا "کیا میں اکیلی رہوں، رات کے وقت یہاں۔ آزاد صاحب تو اسپتال میں ہیں۔"

"تم اچانک ننھی سی بچی کیسے بن گئیں۔ تم تو بہت بہادر صحافی ہو، خطروں سے کھیلنے والی۔"

اس نے مجھے مظلوم نظروں سے دیکھا "لیکن ۔۔۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ شاہ عالم کا پتا پوچھنے یہاں بھی آ جائیں۔"

"پھر ۔۔۔ کہاں جاؤ گی۔ چلو نیلم کے گھر چلی جاؤ تم۔ مجھے ہوٹل کے راستے پر چھوڑ دینا" میں نے کہا۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ مجھے شبنم کے ساتھ نیلم کے گھر تک جانا پڑا۔ رات کے بارہ بجے وہ کھانا کھا رہی تھی۔ اس نے مجھے زبردستی روک لیا۔ اس کا ساتھ دینے والی سونی تھی۔ ان کے اصرار نے مجھے مجبور کر دیا۔ فرید عباسی کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے گیا تھا۔ اس نے رئیس کا سراغ لگانے میں جو محنت کی تھی وہ رائگاں نہیں گئی تھی۔ نیلم کے ایک پرستار ڈی آئی جی کا دباؤ بھی مددگار ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے رئیس کے خلاف ایف آئی آر درج کر کے اس کا ریمانڈ لے لیا تھا لیکن فرید کو پوری امید تھی کہ ایک دو روز میں اس سے ملاقات کی سبیل بھی نکل آئے گی۔ میں نے انہیں رب نواز سے ملاقات اور اس کے انجام کے بارے میں بتایا تو شبنم حیران ہوئی۔ نیلم ناراض ہونے لگی۔

"معلوم نہیں کب احساس ہوگا تمہیں کہ تم اپنی زندگی سے نہیں، دوسروں کے جذبات سے کھیلتے ہو۔ ختم کر دو یہ سب ۔۔۔۔ رشتوں کو۔ کہہ دو کہ نہ میں کسی کا ہوں نہ کوئی میرا۔ پھر اکیلے جو دل میں آئے کرتے پھرو۔"

سونی نے کہا "بالکل ٹھیک کہا آپ نے، اور کہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "نیلم کیوں کہے، تم خود کہو۔ پھر شبنم کہے۔ میں سب کی سننے والا ایک سامع۔ بولوں تو مشکل نہ بولوں تو مشکل۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنی غلطی مان لوں اور

گزارش کروں کہ میرے خلاف مذمت کی قرار داد پاس کرنے کے بعد مجھے معاف کردیا جائے تو میں چلوں۔"

نیلم ہنسنے لگی "شبنم کو کیا ہوا ہے‘ لڑائی ہے تم دونوں کی؟"

میں نے کہا "یہ خود شبنم بتائے گی اور یہ جو بیان دے گی میں اس کو دیکھے بغیر پیچ مان کے دستخط کردوں گا۔"

میرے انکار کے باوجود نیلم نے اپنے ڈرائیور کو اٹھادیا۔ وہ بھی نیلم کے ساتھ ہی کچھ دیر پہلے واپس آیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی نیلم کے شیڈول اور شفٹ کے اوقات کے مطابق چلتی تھی۔ اسے سوتے سے جگا کے اٹھایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ نیلم کے سارے ملازم اس سے ڈرتے ضرور تھے مگر اس کی عزت بھی کرتے تھے اور اس کی وجہ تھی نیلم کا رویہ۔ انہیں گھر میں نوکر نہیں گھر کے ایک فرد کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا جاتا تھا اور نیلم کو ان کے عیش کرنے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ بانو خالہ جتنا چاہیں شور کریں کہ حرام خور ہیں سارے‘ کھا کھا کے مشٹنڈے ہورہے ہیں۔ چیزیں برباد کررہے ہیں۔ گاڑی لے کر پھرتے رہتے ہیں۔ نیلم انہیں کچھ نہیں کہتی تھی مگر چوری اور حکم عدولی ایسے جرائم تھے جس پر وہ کھڑے کھڑے برطرف بھی کردیتی تھی۔

باہر آکے میں نے پڑوس والے گھر میں کچھ ہنگامہ دیکھا۔ اندر کوئی بات ہوئی تھی۔ گھر والوں کے چیخنے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ گیٹ کے سامنے بھی کچھ لوگ کھڑے تھے جو زیادہ تر دوسری کوٹھیوں کے ملازم تھے۔ پھر ایک فائر ہوا‘ اس کے بعد دوسرا۔

میں نے کہا "یہاں کیا ہورہا ہے؟"

ڈرائیور نے بے نیازی سے کہا "سر جی‘ ڈاکو آئے ہوں گے۔ بہت وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

اس کا اطمینان ایک عام شہری رویے کی غمازی کرتا تھا۔ پڑوس میں کیا ہورہا ہے اور کیوں ہورہا ہے‘ اس سے ہمیں کیا؟ پڑوس کے حقوق اور ہمسائیگی کے سارے تصورات فرسودہ اور ناکارہ ہوگئے تھے۔ اکیسویں صدی کی طرف بڑھنے والی دنیا کے بارے میں دعوے یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے اور برق رفتار خلائی مواصلات کے نظام نے فاصلوں کا وجود عملاً ختم کردیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نظر آتی تھی۔ ہر شخص کی دنیا الگ ہوگئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تقاضوں کی خود غرضانہ دیواروں سے باہر صرف ضرورت کا رشتہ رکھتا تھا‘ جذبات کا نہیں۔

رات کے دو بجے مجھے گزشتہ رات والے عملے نے ہوٹل میں پھر خوش آمدید کہا۔ میں نے پوچھا "میرے لیے کوئی فون یا MESSAGE؟"

"فون بہت سے اخبارات والوں نے کیے۔ کچھ جرنلسٹ یہاں بھی پوچھنے آئے تھے۔ دوسرے ہوٹلوں میں بھی گئے ہوں گے۔ ایک دو نے تو بہت پریشان کیا مگر ہم نے سب کو ٹال دیا۔ دو نے دن بھر میں کئی چکر لگائے۔ ویٹرز کو رشوت دے کے معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہال میں بیٹھے رہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ میری زندگی عذاب ہوجاتی اگر انہیں ہوا بھی لگ جاتی۔"

"ہم اپنا فرض نبھانا جانتے ہیں سر! آپ مطمئن رہیں" وہ بولا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کے روزنامہ "خبردار" کا انٹرویو پڑھا۔ فرزانہ نے حسب توقع اس میں خوب رنگ آمیزی کی تھی۔ قارئین کو یہ بتایا گیا تھا کہ لندن میں میرے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ ایک ماڈل سے میری شادی کی افواہ کو حقیقت کا افسانوی روپ دے دیا گیا تھا۔ میں کیسے اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا۔ اس کو کیسے اپنے دام الفت میں گرفتار کیا۔ اس پر کتنا لٹایا اور شادی کے بعد اس نے مجھے کتنا لوٹا۔ اس کی رنگ رلیاں کیا رنگ لائیں۔ اس کے پرانے یار کون تھے جو اس سے حسب سابق ملتے رہے۔ میرے ساتھ میرے رقیبوں نے کیا سلوک کیا۔ طلاق تک نوبت کیسے آئی۔ عدالتی کارروائی کیسے شروع ہوئی۔ اس کا انجام کیا ہوا۔ میں نے گلوخلاصی کی کیا قیمت ادا کی۔ یہ سب اور اس سے کہیں زیادہ فرسٹ ہینڈ اکاؤنٹ کی صورت میں موجود تھا۔ یوں جیسے فرزانہ نے میرے ساتھ سب کچھ خود دیکھا تھا۔

اس نے میری تیسری شادی پر بھی رائے زنی کی تھی اور میری پاکستان واپسی کو میرے سیاسی مقاصد کی تکمیل سے منسوب کردیا تھا۔ اس پورے انٹرویو میں خود میرے لیے بہت سی دلچسپ معلومات تھیں اور مجھے پوری امید تھی کہ اگلے چند دن فرزانہ اس ISSUE کو مزید EXPLOIT کرے گی۔ وہ میرے ماضی کو کریدے گی اور میرے مستقبل پر اپنی بصیرت افروز رائے دے گی۔ مجھ سے دوبارہ تعلق استوار کرنے کی ناکامی کی فرسٹریشن کا نتیجہ کچھ تو نکلے گا۔ کیا آنے والے دنوں میں شبنم ایک اور فرزانہ ثابت ہوسکتی ہے؟ یہ وہ سوال تھا جس پر میں سونے سے پہلے بہت دیر غور کرتا رہا۔

آج شبنم نے جو بھی کیا وہ بہت SHOCKING تھا۔ اس نے مجھے شاہ عالم ضرور مان لیا تھا اور میرے دوبارہ ناصر عظیم بن جانے کی ضرورت اور جواز کو بھی تسلیم کرلیا تھا لیکن ناصر عظیم کے رویے اور کردار سے وہ مطابقت اختیار نہیں کرپائی تھی۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ میں اپنی نئی شخصیت کا ڈراما زیادہ دن نہیں چلا پاؤں گا اور بالآخر تعلقات اسی نہج پر آجائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور شبنم جو شاہ عالم کے ساتھ ایک ایڈونچرس لائف گزارنے کی عادی ہوگئی تھی‘ اکتا گئی۔ شراب پی کے مدہوشی میں خودسپردگی کا ڈراما بے مقصد نہیں تھا۔ وہ کامیاب ہوجاتی تو اس کے دل کی مراد بر آتی۔ ناکام ہوگئی تو اس نے اسے مذاق قرار دیا لیکن میں اس کی چالاکی کو سمجھ گیا اور اسے مزید خفت کا سامنا ہوا۔ اس کے اندر کی عورت کا پندار شکست کھاکے احساس ذلت میں ڈھل گیا۔ اب وہ کیا کرے گی؟ اپنی عزت نفس پر اس رسواکن وار کی اذیت کو خاموشی سے برداشت کرے گی اور اپنی بے عزتی کو اپنی غلطی کا کفارہ سمجھ کے قبول کرلے گی یا مجھ سے بدظن ہوجائے گی؟

خود مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کے اور میرے رشتے کے تقدس کی زمین شق ہوگئی ہے اور اسے پاٹنا شاید اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ہمارے تعلقات اب وہی نہیں ہوں گے جو تھے۔ انہیں پھر سابقہ اعتماد کی سطح پر لانا شبنم کی کوشش پر منحصر ہے۔ کیا وہ اس کے لیے کوشش کرے گی؟ کیا اسے یہ کوشش کرنے کی ضرورت اور اہمیت محسوس ہوگی؟ شبنم کا کون سا پہلو اس کی شخصیت پر غالب آئے گا؟

پہلی شبنم ایک حسین اور پرکشش عورت تھی جس کی آزاد خیالی مشہور تھی لیکن یہ منفی شہرت تھی جسے بدنامی سمجھا جاتا ہے۔ آزاد خیالی اپنی انتہا پر بے حیائی بن جاتی ہے۔ معاشرتی سوچ سے ٹکرانے والی اور اس کی اخلاقی اقدار سے متصادم آزادی کو بے راہ روی اور بغاوت مانا جاتا ہے۔ شبنم نے صحافت کے ابتدائی دور میں ایسی ہی زندگی اختیار کی تھی۔ رہن سہن‘ لباس‘ انداز گفتگو اور مردوں سے روابط میں بے باکی نے شبنم کو پیشہ ورانہ کامیابی ضرور دلائی تھی مگر اس کی قیمت بھی رسوائی سے چکانا پڑی تھی۔

دوسری شبنم کو شاہ عالم سے وہ عشق تھا جس کے بارے میں بلھے شاہ نے کہا تھا کہ ترے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔ وہ شاہ کے اشارۂ ابرو پر ناچتی رہتی اور جب وہ نہ رہا تو پاگل ہوگئی۔ شاہ عالم کے ناصر عظیم بن کر نمودار ہونے تک وہ یقین اور بے یقینی کے برزخ میں اپنا عذاب کاٹتی رہی اور پھر شاید اس

سے بچنے کے لیے ناصر عظیم کے پیار کی پناہ میں آگئی۔ اس کا وہ عشق ایک ایسی سرکش اور منہ زور قوت تھا جس پر خود شبنم کا اختیار نہ تھا۔

تیری شبنم اب اخبار کی ایڈیٹر تھی اور مستقبل کے ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف شہرت اور عزت کے ساتھ طاقت اور اختیار کی منزل تھی۔ وہ صحافت کے افق پر حدِ امکاں تک پرواز کی خواہش ہی نہیں، صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

دوسری طرف اس خوابوں کے گھر کی جنت تھی جسے ہر عورت اپنی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے۔ جس میں اسے محبت کا تحفظ، باعزت ہونے کا فخر اور ماں بننے کے بعد اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا پر حکومت کا غرور ملتا ہے لیکن یہ عام عورت کے خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ شبنم عام عورت نہیں تھی۔ اس کے خواب بھی عامیانہ نہیں ہو سکتے تھے۔

شاعر مشرق نے (تصوراتی طور پر) تین چیزوں کو جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں قرار دیا تھا۔ آج کے حالات میں وہ عورتوں کی شمشیریں بیان کرتے تو کیا فرماتے۔

شباب و حسن و دانائی کی دکاں اک خود فروش کی
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ عورت کی شمشیریں

جو ظاہر ہے شبنم جیسی عورت پر صادق آتا۔ اس کے پاس ان تمام اوصاف حمیدہ کی شمشیریں تھیں اور وہ ان کے استعمال پر ایک ماہرانہ قدرت رکھتی تھی۔ چنانچہ آنے والے وقت میں وہ کس راستے کا انتخاب کرے گی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ صبح ناشتے کے ساتھ مجھے ہوٹل کی طرف سے انگریزی اور اردو کے سب معتبر اخبارات پہنچائے گئے۔ میں نے سرخیوں پر ایک نظر ڈالی۔ انگریزی کے ایک اور اردو کے دو اخبارات نے شاہ عالم کے پاکستان لوٹنے کی خبر دی تھی مگر کسی نیوز ایجنسی کا نام نہیں تھا۔ انگریزی میں "غیر مصدقہ اطلاع" اور اردو میں "معتبر ذرائع" کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اردو کے ایک اخبار نے رب نواز کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ اس کی ضمانت پر رہائی کی اپیل آج ڈویژن بینچ کے سامنے سماعت کے لیے پیش کی جائے گی۔ ابھی تک فرید عباسی کا فون نہ آنے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ صبح نو بجے ہی کورٹ چلا گیا ہوگا۔

ایک اردو اخبار کے آخری صفحے پر باکس میں دی جانے والی ایک خبر نے مجھے متوجہ کرلیا۔ اس میں اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ گزشتہ رات مشہور قلم اسٹار نیلم کے پڑوس میں رہنے والے حمید اللہ بیگ تاجر کی کوٹھی میں سیکیورٹی گارڈ نے ایک بچے کو مار گرایا جس نے مبینہ طور پر دس فٹ اونچی فصیل پر جست لگائی اور وہاں سے اندر کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ وہ ایک پیڑ سے دوسرے پر پہنچا اور گارڈ اسے پکڑنے میں ناکام رہے۔ پھر ایک گارڈ نے اس پر گولی چلائی اور وہ زخمی ہو کے نیچے گرا۔ دوسرے گارڈ نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے ایک کو اٹھا کے دیوار پر مارا اور اس کی گن چھین کے گارڈ کا سر پاش پاش کردیا۔ پھر وہ جست لگا کے دوسری دیوار پر چڑھا اور غالباً نیلم کے گھر میں کودنے والا ہی تھا کہ دوسرے گارڈ کی گولی نے اس کا کام تمام کردیا۔ پہلی گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ دوسری گولی بد قسمتی سے اس کی کمر پر لگی اور ریڑھ کی ہڈی توڑتی ہوئی دل میں اتر گئی۔ اس نشانے میں گارڈ کا کوئی کمال نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بچہ قد میں ساڑھے تین فٹ، جسمانی طور پر انتہائی توانا اور بالکل ننگا تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں قیاس آرائیوں کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ سیکیورٹی کمپنی یا حمید اللہ بیگ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

کسی کہانی کے پلاٹ کی طرح پُر تجسس حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعات پر مبنی یہ خبر جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی اخبار پولیس کے حوالے سے ایسی بے سروپا خبر شائع کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اور وہ اخبار بھی کوئی روزنامہ "خبردار" جیسا چنڈو خانے کا خبرنامہ نہیں تھا۔ یہ خبر لیٹ نائٹ میں دی گئی تھی چنانچہ آخری صفحے پر لگ گئی تھی۔ دوسرے اخبارات میں آنے سے پہلے اس واقعے کی تفصیلات شام کے سنسنی خیز اخبارات کی زینت بننے والی تھیں اور شاید بن چکی تھیں۔ گیارہ بارہ کے درمیان یہ اخبارات مارکیٹ میں دستیاب ہوتے تھے۔

میں نے فون پر معلوم کیا تو ہوٹل والوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ شام کے اخبارات باقاعدگی سے نہیں لیتے کیونکہ معزز مہمانوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہوتی مگر وہ مجھے منگوا کر دے سکتے ہیں۔ اخبار آنے تک میں نے کارڈ دیکھ کر روزنامہ "خبردار" کی مالک و مدیر فرزانہ علی کا نمبر ملایا۔

وہ بہت خوش ہوئی "سر آپ نے انٹرویو دیکھا؟"

میں نے کہا "ہاں دیکھا۔ اور تمہاری ذہانت کا قائل ہوگیا۔ حقیقت کو تم نے خوب افسانہ بنایا ہے لیکن اس سے میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ سیاسی لوگ اور صحافی میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"لوگ مجھے بھی بہت پریشان کر رہے ہیں" اس نے شکایت کے انداز میں کہا مگر اس میں بھی ایک پرغرور احساسِ مسرت شامل تھا "آپ نے برا تو نہیں مانا۔ اس بات کا کہ میں نے آپ سے ایک جھوٹ منسوب کیا۔"

چونکہ انٹرویو میں جھوٹ ہی زیادہ تھا اس لیے میں نے پوچھا "کون سا جھوٹ؟"

"میں نے لکھ دیا کہ آپ نے خصوصی طور پر مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ سب جل جل کے مر رہے ہیں۔ خصوصاً وہ جو اپنے آپ کو بڑی توپ ایڈیٹر سمجھتی ہیں۔ بڑے دعوے رکھتی تھیں آپ سے قربت کے۔ مس شبنم فاروقی۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔"

"تو سر، اس کے لیے آپ فون پر کیوں بات کرتے ہیں۔ مجھے موقع دیں حاضر ہونے کا۔"

میں نے کہا "وہ بھی طے گا۔ ابھی یہ بتاؤ کہ قلم اسٹار نیلم کے پڑوس میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"وہ بڑی ناقابلِ یقین بات ہے سر۔ مگر سچ ہے، ہم نے بہت کوشش کی کہ پولیس سے کچھ پتا چلے۔ اس پر مین بچے کی فوٹو مل جائے۔ میرا مطلب ہے اس کی لاش کی۔ حمید اللہ بیگ تو گھر میں تالا ڈال کے کہیں چلے گئے ہیں اور باہر پولیس بیٹھی ہے۔ وہ کسی کو کچھ بتانے پر راضی نہیں۔ ہر اخبار کے رپورٹر پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "لاش کا پوسٹ مارٹم کہاں ہوگا؟"

"اسے میو اسپتال لے جایا گیا تھا۔ لیکن اب وہاں بھی نہیں ہے۔ سنا ہے اسے اسلام آباد پہنچایا جا رہا ہے۔ وہاں پمس (PIMS) کے سائنس داں اس پر ریسرچ کریں گے۔ انسان کے بچے میں اتنی غیر معمولی تارزن والی طاقت اور صلاحیت کیسے آگئی میو اسپتال سے صرف یہ پتا چلا ہے کہ اس بچے کی جسمانی عمر دس سال سے کم تھی۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو تو مجھے بتانا۔"

"کہاں بتاؤں سر۔ اپنا پتا اور فون نمبر۔" لیکن میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی فون رکھ دیا تھا۔

چند منٹ میں شام کے تین اخبارات مجھے فراہم کردیے گئے۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس یعنی (PIMS) کے ایک ترجمان نے اس خبر سے قطعی لاتعلقی ظاہر کی تھی۔ لیکن ایک انگریزی اخبار نے اپنے ضمیمے میں اس خبر سے تعلق رکھنے والی کچھ اور خبریں بھی شائع کردی تھیں۔ کچھ ہمالین اسنومین کے بارے میں تھیں۔ کچھ APEMAN اور خلائی مخلوق جیسے......

کرداروں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن اس میں ایک حوالہ جینیٹک سائنس کے تجربات کا بھی تھا۔ اخبار نے گوریلے اور بن مانس کے انسانی صفات سے مزین فرضی نام GORMAN رکھ کے اس بچے کا خیالی خاکہ شائع کردیا تھا۔ اس میں ایک اور خبر تھی جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی مگر تین مہینے پہلے لاہور، اسلام آباد، ہائی وے پر کچھ گاڑی والوں نے ایک انسانی قد کے بندر کو گاڑی میں جاتے دیکھا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کی شکل ہو بہو بندر جیسی تھی بلکہ اس کے جسم پر ویسے ہی بال تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے کار چلاتا ہوا گوجرانوالہ اور گجرات کے درمیان نظر آیا۔ اس نے ایک جگہ ہینڈ پمپ چلا کے پانی پیا جو ایک مسجد کے باہر نصب تھا اور وہاں سے عورتیں بچے چیخ مار کے بھاگ گئے۔ وہ بندر پھر گاڑی میں بیٹھ کے چلا گیا۔

یہ خبر بھی دلچسپ تھی مگر اس میں دن یا تاریخ کا حوالہ نہیں تھا اور اس مسجد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ہائی وے پر کہاں واقع ہے۔ کسی نے بھی وہاں جا کے فرسٹ ہینڈ انفارمیشن حاصل نہیں کی تھی ورنہ وہ عورتیں بچے چشم دید گواہ تھے جو اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے تھے۔ گزشتہ روز مجھے رب نواز سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں ان دو خبروں کے پیچھے مجھے پروفیسر ہاشم رضا کا ذہن کارفرما محسوس ہوتا تھا۔ میں نے رب نواز کو فون کیا اور یہ بھول گیا کہ اس وقت وہ اپنی ضمانت پر رہائی کی درخواست کے ساتھ عدالت میں موجود ہوگا۔

جانتے بوجھتے میں نے شبنم سے کچھ نہیں پوچھا۔ اگر میں اس سے کہتا تو وہ اپنے وسائل کو بروئے کار لا کے اس معاملے میں زیادہ بھروسے کے قابل انفارمیشن حاصل کر سکتی تھی۔ میں فی الحال اس کے REACTION کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر تک میں نے اپنے ڈاکومنٹ ہوٹل کے ایک معتبر ٹریول ایجنٹ کے حوالے کیے اور اس سے کہا کہ مجھے آج کل میں بزنس ویزا اور بزنس کلاس کی بکنگ چاہیے۔ اس نے بڑی پرامید شائستگی کے ساتھ کہا کہ یہ ناممکن نہیں مگر ارجنٹ کام آسان بہرحال نہیں ہوتے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ اضافی اخراجات کی پروا نہ کی جائے۔ میرا کاروباری نقصان بہت زیادہ ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کا بلینک چیک تھا جس کے بعد مشکلات اور ناممکنات بے معنی ہو جاتی تھیں۔

دوپہر سے پہلے میں نے ایک کار منگوائی اور اپنے سابق

نائب صدر شمس الزماں کے گھر جا پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس کی ایسی حالت ہوئی جیسے اس نے شاہ عالم کا بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کی آنکھیں بے یقینی میں پھٹی رہ گئی تھیں لیکن اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا۔ "آپ ۔۔ شاہ جی ۔۔ زہے نصیب' بخت جاگے غریب خانے کے۔ آیئے' آیئے۔"

میں نے کہا "وہ شعر نہیں پڑھیں گے آپ۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

اس نے بڑی منافقانہ انکساری کے ساتھ مجھے اندر لے جا کے بٹھایا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو گیا ہے۔ حالانکہ جو عداوت و خباثت اور کمینگی اس نے شاہ عالم سے پارٹی کا عہدہ اور اس کے اثاثے چھینتے ہوئے دکھائی تھی وہ زیادہ دن کی بات نہیں تھی۔

"علم تو مجھے کچھ ہو گیا تھا آپ کی تشریف آوری کا۔ گلہ ضرور کریں گے ہم کہ آپ نے اس دو ٹکے کی عورت کو بھروسے کے قابل سمجھا۔"

میں نے کہا "اس نے جو بھی لکھا ہے جھوٹ ہے۔ اس نے مجھے اتفاق سے دیکھ لیا تھا ریسٹورنٹ میں جہاں میں اپنے دوست کرنل غلام مصطفیٰ ربانی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ میں نے تو شبنم کو بھی خبر نہیں دی۔ ابھی تک میں کسی سے بھی نہیں ملا۔"

وہ خوشی سے ہاتھ ملنے لگا "پھر تو بڑا ہی خوش نصیب ہے یہ خادم جسے آپ نے قدم رنجہ فرمانے کی سعادت بخشی۔ میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی یہ معلوم کرنے کی کہ جناب کا قیام کہاں ہے؟ لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "شمس صاحب میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں پاکستان۔ آپ پاکستان کے سیاسی منظرنامے کو جتنا واضح انداز میں دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں' وہ بصارت اور بصیرت کسی اور کے پاس نہیں۔"

اس کا چہرہ ساٹھ واٹ سے سو واٹ کا بلب بن گیا "اس ناچیز کے بارے میں آپ کی یہ رائے ایک گرانقدر سندِ افتخار ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یہ بتایئے کہ آنے والے انتخابات کے لیے ہم اپنے پلیٹ فارم کو کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے لیے اتنے کم وقت میں کتنے امیدوار لفرے کرنا ممکن ہو گا۔ ہماری کنسوسنگ کا FORMAT اور ایجنڈا کیا ہو گا لیکن ایک درخواست ہے۔"

"آپ حکم کیجئے جناب' حکم۔"

میں نے کہا "میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا علم ان دیواروں کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الیکشن کی حکمتِ عملی فی الحال ایک ٹاپ سیکرٹ رہے گی۔ میرے آپ کے درمیان۔"

وہ غرور اور خوشی سے پھول کے کپا ہو گیا۔ میں نے اسے خوب بانس پر چڑھایا۔ اس نے اپنی محدود اور پُر تعصب عقل کے مطابق مجھے یقین دلایا کہ وقت کی کمی سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر ہم پارٹی میں کچھ نئے لوگوں کو ٹکٹ دیں تو کامیابی یقینی ہے۔ اس نے مجھے بہت سے نام گنائے جو پارٹی کو فتح سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ میں نے اس کی احمقانہ حکمتِ عملی بھی سنی اور یہ کہا کہ اسے فوراً کام شروع کر دینا چاہیے۔

"میں انشاء اللہ ایک دو ہفتے میں پارٹی کا کنونشن بلانے کا اعلان کروں گا۔ لندن سے میری واپسی تک آپ ورکرز کو MOBILISE کریں اور تیاری پکڑیں۔" میں نے کہا "لیکن میرے واپس آنے تک جو کام ہو رازداری سے ہو۔ اس کمینے احسان فراموش اور ذلیل وکیل قریشی کو بتاؤ پہلے۔ اس کا پتا تو ایسے صاف کرنا ہے کہ وہ پھر کبھی سیاست کا نام نہ لے۔"

شمس کے لیے یہ بڑا مبارک دن تھا۔ اس کا اپنا سیاسی مستقبل اچانک سورج سے زیادہ روشن نظر آنے لگا ہو گا۔ اس کے پاس میں نے دو گھنٹے گزارے۔ ظاہر ہے کہ اس میں دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا مگر میں نے معذرت کر لی۔ اسے سخت صدمہ ہوا مگر میں نے اسے تسلی دی کہ یار زندہ صحبت باقی۔ کھانے کی دعوتیں اتنی ہوں گی کہ ہم کھاتے کھاتے تھک جائیں گے۔

لنچ کے لیے میں واپس ہوٹل گیا اور کھانا اپنے کمرے میں منگوالیا۔ اس وقت تین بجے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کورٹ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاید رب نواز کی اپیل کا فیصلہ سنا دیا گیا ہو۔ میں نے فرید عباسی کو فون کیا مگر وہاں کوئی فون ریسیو کرنے والا بھی نہیں تھا۔ رخشی بھی اتنی ہی بے خبر تھی مگر اس نے بتایا کہ آج رب نواز کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس بار کورٹ میں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں اور درخواست مسترد ہونے کی صورت میں رب نواز بھاگ نہیں پائے گا۔ فرید نے جاتے وقت بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ اس کی اپیل سرسری سماعت کے بعد ہی نامنظور کر دی جائے گی۔ اس میں اپیل کے نئے GROUNDS کون ہیں جن پر عدالت غور کرے۔

اب صرف ایک ہی جگہ رہ جاتی تھی جہاں سے مجھے پکی خبر مل سکتی تھی۔ یہ جگہ رب نواز کا گھر تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ

سماعت کے وقت شبنم بھی موجود ہو مگر اس کا آفس میں ملنا مشکل تھا۔ میں نے کافی سوچنے کے بعد رب نواز کے گھر فون کیا تو پس منظر کے شور سے ہی مجھے عدالت کا فیصلہ معلوم ہو گیا۔ وہاں ڈھول بج رہا تھا اور ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی۔ رب نواز کی درخواست ضمانت یقیناً منظور ہو گئی تھی اور اس کے حامی دوست اور نمک خوار اسے جلوس کی صورت میں عدالت سے گھر لائے تھے۔

ایک ملازمہ نے میرے پوچھنے پر اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے کہا کہ ابھی ملک صاحب سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ باہر مصروف ہیں۔ مبارک باد دینے والے لوگوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔

مجھے اس خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ رب نواز کے خلاف شہادت بڑی ٹھوس تھی اور گواہ بڑے مضبوط تھے۔ فرید عباسی نے بھی اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ اپیل میں کوئی بھی نئے GROUNDS نہیں ہیں۔ پھر اچانک عدالت کے سامنے کیا نئی بات آگئی کہ بینچ نے فیصلہ الٹ دیا۔ شاید استغاثہ نے اپنا موقف بدل دیا یا خود کمزور کر لیا۔ وکیل صفائی نے درمیانی مہلت میں نئے گواہ تیار کر لیے اور بے گناہی کے نئے جواز تلاش کر لیے۔ عدالت نے کچھ تو دیکھا ہی ہو گا۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج کسی گواہی کو ناقابلِ اعتبار اور کسی ثبوت کو غیر مستند قرار نہیں دے سکتا خواہ وہ ذاتی طور پر جانتا ہو اور تجربے سے سمجھ لے کہ گواہی خریدی ہوئی ہے اور ثبوت بنائے گئے ہیں۔

تیسرے پہر میں وکیل قریشی سے ملنے گیا اور وہاں اس سے میں نے وہی باتیں دہرائیں جو میں شمس الزماں سے کر چکا تھا۔ وہ نسبتاً چالاک تھا مگر میری باتوں میں آگیا۔ اس نے کہا کہ شمس کی پوزیشن تو پہلے ہی کمزور تھی۔ رہی سہی کسر ہارٹ اٹیک نے پوری کر دی ہے۔ وہ زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ پارٹی اور الیکشن COMPAIGN چلانا اس کے بس کی بات نہیں۔

چلتے چلتے میں نے اس سے کہا "قریشی۔ رب نواز کے بارے میں کیا خیال ہے" اس بار وہ آزاد امیدوار بننے کا سوچ رہا ہے کیوں نہ ہم اسے اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے دیں۔"

قریشی نے سوچ کر کہا "اگر وہ مان جائے تو اسے بھی فائدہ ہو سکتا ہے اور ہمیں بھی۔ اس کے اور ہمارے ووٹ مل جائیں تو اس حلقے میں کون مقابلے پر ٹھہر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر تم خود جا کے اس سے ملو۔ اسے بتاؤ کہ یہ تمہاری خواہش ہے اور تم نے یہ تجویز مجھ سے ڈسکس کی

تھی تو میں نے بھی منظوری دے دی۔ ابھی میں نے ایک خفیہ اور پرائیویٹ دورہ کیا تھا' حالات کا جائزہ لینے کے لیے مگر بہت جلد میں واپس آرہا ہوں۔"

"اور کس سے ملیں گے آپ؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ کل میں واپس لندن چلا جاؤں گا۔ میری اور تمہاری یہ ملاقات ٹاپ سیکرٹ ہے۔"

میرا مقصد صرف ایک تھا۔ میں شمس اور قریشی کو اپنا گواہ بنانا چاہتا تھا۔ ان سے مل کے میں نے دوسرا ضمنی مقصد حاصل کیا یعنی دو دشمنوں کے درمیان عدم اعتماد کا بیج بو دیا اور ان کے آپس میں لڑنے کا سامان کر دیا۔ رب نواز کو اپنی پارٹی کے ٹکٹ کی پیش کش شاہ عالم کی طرف سے اظہارِ خیر سگالی کا واضح عندیہ تھا۔ وہ دہرا فائدہ حاصل کرنے کے لالچ میں پڑ سکتا تھا۔ سیاسی فائدہ الگ اور کاروباری فائدہ الگ۔

شام تک میں اشرف علی سے بھی ملا مگر وہ ایک مخصوص

آدمی تھا۔ اس نے مجھے پارٹی کے انتشار اور زوال کی صحیح تصویر دکھا کے سخت مایوسی کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ ان حالات میں پارٹی کا الیکشن میں حصہ لینا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا۔ شاید امیدواروں کی ضمانت تک ضبط ہوجائے۔

شام کے بعد میری فرید عباسی سے آفس میں مختصر سی بات ہوئی۔ وہ عدالتی فیصلے سے مایوس تھا "مجھے حیرت ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے ضمانت پر رہائی کی مخالفت نہیں کی۔ ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل خود پیش ہوا تھا۔ اس کی اچھی REPUTATION نہیں ہے۔ استغاثہ کا ایک گواہ منحرف ہوگیا۔"

"پھر کیا ہوسکتا ہے عباسی صاحب' کیا ضمانت مانگی عدالت نے؟"

"دس دس لاکھ کے دو مچلکے۔ دو شخصی ضمانتیں۔ رقم انہوں نے وہیں ادا کردی۔ پچاس لاکھ لے کر آئے تھے والی وارث۔ شخصی ضمانت ایک سابق منسٹر نے دی اور ایک صنعت کار نے۔"

میں نے کہا "کیا شبنم پہنچی تھی عدالت میں؟"

"میں نے اسے رب نواز سے باتیں کرتے دیکھا تھا' فیصلے کے بعد۔ میرا خیال ہے وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"کیا؟ رب نواز کے ساتھ۔۔۔ کیوں؟"

"شاید اس کا انٹرویو لینے۔ تو خود بات کرلے اس سے۔ وہ اس وقت آفس میں ہی ہوگی یا آنے والی ہوگی" فرید بولا "میں ذرا مصروف ہوں۔"

میں بہت دیر تک سوچتا اور جلتا کڑھتا رہا۔ کیا شبنم نے اپنی راہ جدا کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے؟ اور اتنی جلدی وہ دشمن کے کیمپ میں پہنچ گئی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا ذاتی کردار شاہ عالم کے معاملے میں کیسا ہی ہو مگر صحافت کے میدان میں وہ آزاد صاحب کی شاگرد اور جانشین ہے۔ وہ اصولوں پر سمجھوتوں کی صحافت نہیں کرسکتی اور لفافہ جرنلزم کی قائل نہیں ہوسکتی۔ مگر اس ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا؟ جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا۔ قدریں اور قدروں کے پیمانے بدل رہے ہیں۔ خلائی روڈ اور فاسٹ فوڈ کے اس دور میں تبدیلی کا عمل بھی بہت تیز ہے۔

شبنم سے میری رات آٹھ بجے سے پہلے بات نہ ہوسکی۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگی "آج دن بھر کیا کرتے رہے؟"

میں نے کہا "اپنی سناؤ۔ رب نواز کے ساتھ وقت کیسا گزرا؟ فرید نے مجھے بتایا کہ تم کورٹ سے اس کے ساتھ چلی گئی تھیں؟"

وہ ہنسنے لگی "لگتا ہے تم ابھی تک بہت ناراض ہو۔ اس کے ساتھ تو پورا جلوس گیا تھا۔ سارے صحافی گئے تھے۔ اس نے سب کو گھر پر مدعو کیا تھا۔"

"سنا ہے بڑا جشن تھا؟"

"ہاں۔ خوشامدی اور چمچے مٹھائیاں تقسیم کررہے تھے اور مبارک باد دے رہے تھے کہ ملک صاحب نے حق کا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا کردیا۔ کل رپورٹ دیکھ لینا اخبار میں۔"

میں نے کہا "کل تو میں جارہا ہوں لندن۔"

وہ بولی "واپس کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "چار چھ دن تو رہوں گا۔ کمال نے بھی ایک ذمے داری سونپ دی ہے کہ اسپتال کے لیے لیبارٹری اور DIAGONOSTIC ایکوپمنٹ کی بات کروں۔ ڈیل فائنل کرنی ہے۔"

"یہ تو بڑا کام ہے۔ تم اکیلے ہی فیصلہ کروگے؟"

میں نے کہا "فنانس میں فراہم کررہا ہوں اور مجھے یورپ کی مارکیٹ کا کچھ اندازہ بھی ہے۔ کوٹیشن پہلے بھی آچکے ہیں۔ شاید اسپتال سے میرے ساتھ کوئی جائے۔ تم ایک کام کرو' میری عدم موجودگی میں کم سے کم ایک آفس تلاش کرکے فرنشنگ کا کام شروع کرادو۔ تفصیلات سب تمہارے پاس ہی ہیں۔"

"ہاں۔ بروکرز کے بہت فون آئے تھے مگر اس وقت فرصت ہی نہیں ملی۔ خیر' میں کچھ کرتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ۔۔۔ اے۔۔۔ یہ کیا ہورہا ہے' کیسا شور ہے؟"

شور میں بھی سن رہا تھا۔ کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ کچھ چیزوں کے اٹھانے گرانے کی آوازیں آرہی تھیں' پھر ایک شیشہ ٹوٹا۔

میں نے کہا "شبنم۔۔۔ ہیلو!"

مگر وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے خود بھی چلا رہی تھی۔ "کون ہو تم۔۔۔ ارے کوئی پکڑو اسے۔ او مائی گاڈ!" پھر وہ چلائی "میں گولی ماردوں گی' رک جاؤ۔"

آخری آواز اس کی چیخ تھی۔

غالباً ٹیلی فون کا ریسیور شبنم سے چھین لیا گیا تھا اور اب کہیں میز پر یا فرش پر پڑا تھا۔ آفس کے اندر ہونے والی ساری گڑبڑ کا شور اس کے ذریعے میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے اخبار کے دفتر میں زلزلہ آگیا ہے یا شاہ جنات نے اپنی غضبناک فوج کے ساتھ اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آفس میں مسلسل دھماکے ہورہے تھے' میزیں الٹنے اور کرسیاں اٹھا کے پھینکنے' الماریاں گرانے اور شیشوں کے ٹوٹنے کی ملی جلی آوازیں کسی ریڈیو ڈرامے کے صوتی اثرات کی طرح تصور میں ایک تصویر بنارہی تھیں جو مکمل تباہ کاری کی تھی۔ جیسے قربانی سے پہلے بھاگ کھڑا ہونے والا مشتعل بیل کسی چینی کے برتنوں کی دکان میں گھس جائے۔

مجھے بہت دیر بعد اندازہ ہوا کہ میں یک طرفہ طور پر ٹیلی فون کے ماؤتھ پیس میں مسلسل "ہیلو' ہیلو!" چلا رہا ہوں اور میری آواز بیٹھنے لگی ہے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آوازوں میں ہر آواز تھی سوائے شبنم کی آواز کے۔ وہ خود چھپ گئی تھی یا پھر ناک آؤٹ ہونے کے بعد کہیں بے ہوش پڑی تھی مگر میری چھٹی حس چیخ چیخ کے مجھے خبردار کررہی تھی کہ شبنم کے ساتھ کوئی واردات ہوچکی ہے اور مجھے فوراً کچھ کرنا چاہیے۔

ریسیور رکھ کے میں نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور تصور میں آنے والے مناظر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اخبار کے دفتر پر کسی مشتعل ہجوم نے حملہ کردیا ہے۔ معاشرے میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر یہ اب عام سی بات ہوگئی ہے کہ کسی خبر یا کالم کی اشاعت پر کوئی ناراض ہو تو وہ سچ لکھنے کی سزا کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی سیاسی جماعت ہو مذہبی گروہ یا خود حکومت۔ طلبا' عوام' سیاسی کارکن اور علما سب کا ایک ہی رویہ ہے۔ اختلاف ختم نہیں ہوسکتا تو اختلاف کرنے والے کو ختم کردو۔ اظہارِ رائے کی آزادی جو ایک بنیادی آئینی حق ہے محدود' مفلوج اور معدوم ہوتی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم ایک بزدل اور خودغرض افراد کی قوم میں تبدیل ہورہے ہیں۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اس احساس کی شدت میں اضافہ کررہی تھی کہ حملے کا نشانہ اخبار نہیں' شبنم کی ذات ہوگی کیونکہ جہاں تک مجھے علم تھا' گزشتہ چند روز میں شبنم نے کوئی متنازع خبر' کالم یا اداریہ شائع نہیں کیے تھے۔

تصدیق کا ذریعہ صرف فون تھا۔ میں نے دوسری بار اٹھا کے دیکھا تو ریسیور سے سنائی دینے والی بزر کی ٹون بند ہوگئی تھی۔ میں نے پُرامید ہو کے دوبارہ نمبر ملایا تو دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ اس سے میرے دل کو کچھ سکون ملا مگر یہ سکون بھی عارضی ثابت ہوا۔ گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ دسویں گھنٹی پر میں نے ریسیور رکھ دیا' غالباً فون کا تار ہی توڑ دیا گیا تھا۔

بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے میں نے سوچا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر میں فرید عباسی کو فون کرکے ساری صورتِ حال سمجھاتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ فوراً روانہ ہوجائے مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہو اور اپنا کام ادھورا چھوڑ کے فوراً نہ جاسکے لیکن اسے بتانا ضروری تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ ایک بار' دوبار' تین بار۔

اس کے فون پر کوئی بات کررہا تھا۔ آفس میں ایک نہیں' تین فون تھے مگر دوسرے نمبر مجھے معلوم نہیں تھے۔

مجھے پولیس سے رجوع کرنے کا خیال بھی آیا مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ وہ پہلے مجھ سے میرا نام پتا پوچھتے' گمنام کال پر تو ضابطے کی رسمی کارروائی بھی شروع نہیں ہوتی۔ یہاں تو ایمرجنسی پولیس اور RAPID فورس کی کارکردگی اور برق رفتاری کے ساتھ حرکت میں آنے کی روایات کے بارے میں لطیفے مشہور ہیں کہ ڈکیتی کی اطلاع دی جائے تو وہ ڈاکوؤں کا تھانے میں انتظار کرتے ہیں۔ مالِ غنیمت سے اپنا حصہ وصول کرنے اور مہمانوں کی خاطرمدارات کے بعد انہیں خدا حافظ کہنے سے پہلے واردات کی طرف روانگی کا سوچتے بھی نہیں۔ قتل ہوجائے تو وہ قتل کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔

چند منٹ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت اپنی شناخت سے پیدا ہونے والے مسائل سے ڈر کے مجھے بے کار نہیں بیٹھنا چاہیے اور اپنا وقت محض سوچ بچار یا اندیشہ ہائے دور دراز میں نہیں گزارنا چاہیے۔ مجھے فوراً خود جا کے شبنم کی خبر لینی چاہیے۔

ہوٹل میں کار ہائر سروس چوبیس گھنٹے دستیاب تھی۔ میں نے ایک اچھے شوفر کی فرمائش کی۔ جو شوفر مجھے آج دن میں دیا گیا اس کی زندگی کا ہر ایکشن سلوموشن ری پلے کی طرح تھا۔

یہ کسی حد تک درست بھی تھا' میری ہر بات اس کے کانوں تک دس سیکنڈ میں پہنچتی تھی۔ اس سے دگنے وقت میں اس کا دماغ یہ بات سمجھتا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ کے متحرک ہونے تک تیس سیکنڈ بیت جاتے تھے اور تب تک سڑک کا

کوئی موڑ یا کٹ بہت پیچھے رہ جاتا تھا جہاں سے اس کو دائیں یا بائیں طرف مڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

منیجر نے ہنس کے ایک نوجوان کو بلایا "اس سے آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ یہ تانگے کو بھی سپرسانک طیارے کی طرح اڑا سکتا ہے۔ مہمانوں کو اس سے تیز رفتاری کی شکایت ہوتی ہے مگر اس نے آج تک کوئی ایکسی ڈنٹ نہیں کیا۔"

اس نے سر جھکا کے کہا "سر جی۔ مجھے یار لوگ جیٹ فائٹر کہتے ہیں۔"

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "ہم کتنی دیر میں ایبٹ روڈ پہنچ سکتے ہیں مسٹر جیٹ فائٹر؟"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "جتنی دیر آپ بولیں جناب۔ پندرہ منٹ، دس منٹ، پانچ منٹ۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا، زندہ سلامت۔"

رات کے وقت سڑکوں پر ٹریفک بھی نہیں تھی اور گاڑی صرف شاندار ہی نہیں جاندار بھی تھی۔ جیٹ فائٹر نے اسے خلائی راکٹ کی رفتار سے دوڑانا شروع کیا۔ اس کا ایک پاؤں ایکسیلیٹر پر تھا تو ایک ہاتھ مسلسل ہارن پر۔ وہ تیز رفتاری کے چیلنج کو پوری طرح انجوائے کر رہا تھا ورنہ اسے گلہ تھا تو یہ کہ گاڑی کی حدِ رفتار ڈیڑھ سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

اسٹیئرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے ہر موڑ پر گاڑی کو یوں دائیں بائیں لہرایا کہ پچھلی سیٹ پر میں کسی بے پیندے کے لوٹے کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکتا رہا۔ جیٹ فائٹر نے مجھے ایڈونچر اور ایکشن سے بھرپور ایک سنسنی خیز واقعہ بھی سنایا کہ کس طرح اس نے ایک مہمان کی پریشانی دیکھتے ہوئے اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنے کے لیے صرف دس منٹ میں ائرپورٹ پہنچادیا تھا۔ "لوجی، میں نے آنکھیں بند کرکے کہا یارب جی تیرا ہی آسرا۔ اور پھر جناب، جو اسپیڈ پکڑی تو کچھ نہیں دیکھا۔ اسپیڈ بریکر آئے۔ سگنل آئے۔ بتی لال ملی ہر جگہ مگر میں نے کہا کہ اب تو پیر۔ ایکسیلیٹر سے ہٹانا نہیں ہے۔ دو جگہ میں نے شارٹ کٹ مارا۔ ون وے ٹریفک تھا ادھر۔ سامنے سے آنے والی گاڑیاں ادھر ادھر ہوکے نکل گئیں۔ جیسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ میں بیچ میں سے گزر گیا۔ چار گاڑیوں کو سائڈ مار کے نکلا۔ ایک ریڑھا بھی الٹ گیا ذرا سا چھونے سے۔ اس پر ایک بندہ بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔

میں نے خود کو سنبھال کے کہا "ویری گڈ۔ گاڑی روک لو ورنہ یہ جو بھینس گئی ہے سامنے، اس میں گھس جاؤ گے۔"

اس نے سارے جسم کا بوجھ بریک پر ڈال دیا اور دس گز پر گاڑی روک لی۔ میں نے خود کو سامنے والے ونڈ اسکرین سے ٹکرا کے شیشہ توڑتے ہوئے باہر جانے سے بچایا اور سانس بحال کرکے نیچے اترا۔

جیٹ فائٹر نے مجھے تعریف طلب نظروں سے دیکھا "لو سر جی گیارہ منٹ میں پہنچادیا آپ کو، زندہ سلامت۔"

میں نے سہلایا "یہ بتاؤ، اس مسافر کا کیا ہوا، اسے اسلام آباد کی فلائٹ مل گئی تھی؟"

جیٹ فائٹر نے نفی میں سر ہلا کے ایک آہ بھری "نہیں جناب۔ اسلام آباد کی فلائٹ تو مل جاتی اسے لیکن وہ چلا گیا عدم آباد۔ راستے میں ہی اس کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ سچ ہے، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

آفس کے گیٹ کے سامنے پندرہ بیس غیر متعلقہ افراد جمع تھے۔ میں نے ان کے درمیان سے گزر کے آگے جانا چاہا تو سات فٹ قد کا ایک کانسٹیبل اپنی سات انچ کی مونچھیں ہلاتا میری راہ میں حائل ہوگیا "کیا بات ہے۔ کدھر جانا ہے چلو پیچھے سب۔"

اس کے پیچھے حوالدار کے عہدے کا افسرِ اعلیٰ نمودار ہوا جس کی لمبائی ماتحت کی بلندی سے دو فٹ کم تھی "ادھر کیا مداری کا تماشا ہو رہا ہے، یا سرکس لگا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں ساتھ دیکھ کے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر میں ایڈیٹر ہوں۔"

اس نے سر کھجایا "تم بھی ایڈیٹر ہو، کتنے ایڈیٹر ہوتے ہیں، ایک اخبار میں؟"

ماتحت بولا "ایک تھانے میں تو ایک ہی ایس ایچ او ہوتا ہے سر جی۔"

کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ میں مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ نیچے آزاد صاحب کی "چلبلی" گرد سے ڈھکی افسردہ کھڑی تھی لیکن اس کے ساتھ شبنم کی کھٹارا نہیں تھی جو اس کی چھوٹی بہن نظر آتی تھی مگر چلتی خوب تھی۔

اوپر جانے والے راستے پر میری ملاقات مضروب و مجروح گارڈ سے ہوئی جس کی ناک اب خوفناک ہو چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر تحفۂ شجاعت کی طرح ایک گومڑ بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے ناک میں بولتے ہوئے اور جملے کے ہر دوسرے لفظ کے بعد ہائے کا اضافہ کرتے ہوئے مجھے سب سے پہلی رپورٹ دی "وہ تو جناب جن کا بچی تھا، آسمانی بلا تھا۔ توبہ خدایا، ہائے۔"

میں نے کہا "کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"ایک لڑکی۔ ادھر سے آیا۔ ادھر دوسرا گیٹ پر چڑھا۔ وہ جو بند ہے۔ ہم بولا خانہ خراب کون اے تم، ہائے۔ وہ ادھر سے چھلانگ مارا۔ ادھر گیا، وہ اوپر والا کھڑکی کے پاس پھر درخت سے چمٹ گیا، ہائے۔ ادھر سے جمپ مارا۔ کھڑکی پر گیا، کھڑکی سے اندر۔ ہائے، ادھر بھی پھر بہت توڑ پھوڑ کیا، ہائے۔"

میں نے کہا "ایک لڑکی، تمہارا مطلب ہے عورت!"

وہ دائیں بائیں سر ہلانے لگا "نہیں صاب! وہ انسان نہیں، جن کا بچی تھا جن کا۔ توبہ خدایا! ہائے، اوپر بہت مار دھاڑ کیا۔ ہم جب بہت شور سنا۔ اوپر گیا اس کو پکڑنے کا واسطے۔ ہائے، وہ ہم کو ایسا دھکا مارا، ہم اوپر سے کدو کا مافک لڑھک گیا۔ ہائے سب جگہ چوٹ آیا۔ ابھی ہاتھ اٹھاتا بندوق نہیں اٹھتا۔ ہائے، وہ بھوت کا مافک غائب ہوگیا۔"

میں نے اس کے پاس مزید وقت ضائع کرنے سے بہتر سمجھا کہ اوپر جاکے شبنم سے سارا ماجرا سنوں مگر اوپر کا عجیب حال تھا۔ اس ایک کمرے کے سوا جہاں چند سب ایڈیٹر مختلف میزوں پر جھکے اخبار کی پریس جانے والی کاپی جوڑ رہے تھے، کہیں کوئی چیز سلامت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے ان کی اتری ہوئی صورتوں پر وحشت کے آثار نظر آئے۔

میں سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جو ایڈیٹر کا کمرا تھا۔ پہلے یہاں آزاد صاحب بڑے کروفر کے ساتھ رونق افروز ہوتے تھے۔ اب یہاں شبنم نے جانشینی اختیار کی تھی تو کمرے کی مجموعی بے ترتیبی میں نفاست اور سلیقہ نظر آنے لگا تھا۔ چھت اور دیواروں کے کونوں سے جالے صاف کردیے گئے تھے۔ پہلے چھ فٹ کی بلندی تک دیوار کا ہر حصہ عاشقِ نامراد کے دل کی طرح داغ دار تھا۔ اس پر سرخ سیاہ اور نیلی روشنائی کے داغ تھے جو آزاد صاحب مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور چونکہ قلم بھی لکھ لکھ کے تھک چکے تھے اس لیے ہر بار انہیں چلانے کے لیے جھٹکنا پڑتا تھا۔ اس پر پان کے داغ تھے جو کسی خصوصی تقریب میں نوش فرمائے جاتے تھے۔ اس سالن کے داغ تھے جو کاتب جواہر رقم لال دین عرف جواہر لال نہرو نے غریب نواز ہوٹل سے منگوا کے کھائے۔ روغن آملہ ہیئر ٹانک کے داغ تھے جو دفتر کا چپراسی چھپ چھپ کے اپنے بے آب و گیاہ سر کے اوپر لگاتا تھا۔ دیوار پر درجنوں فون نمبر اور نام لکھے ہوئے تھے اور ایک شعر جو خود جواہر لال نہرو نے کہا اور لکھا تھا۔

اب دیواروں پر نیا روغن تھا۔ کھڑکیوں پر نئے پردے تھے اور فرش پر نیا قالین۔ کرسیاں بھی نئی تھیں، مگر ایڈیٹر کی ٹیبل وہی تھی اور اس پر جمع رہنے والا سارا کاٹھ کباڑ بھی وہی تھا۔ پرانے اور نئے ملکی و غیر ملکی اخبار۔ تراشے یعنی CLIPPING، فوٹوگراف، ڈیزائن اور ریفرنس میٹریل۔ خطوط اور رسالے لیکن اس وقت یہ سارا اسباب فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ ایڈیٹر کی میز ایک طرف الٹی ہوئی تھی۔ اس کا نیا شیشہ دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہوچکا تھا۔ کرسی دوسری طرف گری ہوئی تھی اور الماری دروازے کے اور میز کے درمیان الٹی لیٹی ہوئی تھی۔

جواہر لال نہرو کو میں نے اس کیبن میں دریافت کیا جہاں پہلے شبنم بیٹھتی تھی۔ وہ سر پر پٹی باندھے میز پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ میں اندر گیا تو وہ اچھل کے بیٹھ گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ "کون۔۔۔ کو۔۔۔ کون ہے؟"

میں نے کہا "لال دین کیا ہوا ہے تمہیں۔ اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو آخر، یہ سب کیا ہے؟"

اس نے میز سے اتر کے واٹر کولر سے پانی کا گلاس بھرا "کیا ہے جی، قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔"

میں نے کہا "وہ تو مجھے بھی نظر آرہی ہیں لیکن یہ سب ہوا کیسے، میں نے سنا ہے کوئی لڑکی تھی۔"

"لڑکی۔۔۔ جناب عالی! وہ تو بلائے آسمانی تھی۔ شیطانی مخلوق تھی کوئی" اس نے کان پکڑ کر اوپر دیکھا "قہرِ خداوندی کا نمونہ تھی۔"

میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ شبنم کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"وہ۔۔۔ ٹھیک ہی سمجھئے۔ اللہ نے بچالیا ہم سب کو آج" وہ پھر میز پر لیٹ گیا "معافی چاہتا ہوں جناب عالی، کمر میں ضرب شدید ہے۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا "کوئی بات نہیں، تم لیٹے رہو۔"

"شبنم بی بی گئی ہیں اسپتال۔۔۔ اور پولیس کو مطلع کرنے۔"

میں نے کہا "پولیس تو موجود ہے نیچے۔"

"وہ گشتی پولیس ہے۔ جائے واردات پر انتظار کر رہے ہیں کہ تھانے سے تفتیش کرنے والے آجائیں۔"

میں نے کہا "کیا شبنم کو زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔ اسے کون لے گیا ہے اسپتال؟"

"کوئی نہیں" لال دین نے ایک آہ بھری "وہ لے کر گئی ہیں دو بندوں کو۔ اللہ نے ان کو محفوظ رکھا ورنہ پتا نہیں کیا

ہو جاتا۔ ان دونوں نے شبنم بی بی کو بچانے کی کوشش کی تھی مگر جناب عالی' اس نے ایک کے جبڑے پر مکا رسید کیا۔ پھر پیٹ پر لات ماری۔ اندر اس کے تمام اعضائے رئیسہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں گے۔ قہرِ خداوندی تھی وہ جناب' دوسرے کو اس نے ایسے اٹھایا اور ایسے پھینک دیا۔ جیسے میں یہ پرانی جوتی اٹھاؤں اور دیوار پر دے ماروں۔ اس غریب کی ساری پسلیاں چٹخ گئی ہوں گی۔" اس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگا کے آسمان کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "کچھ بتاؤ تو سہی آخر وہ کون تھی؟ تم نے دیکھا اسے؟"

اس نے سرہلایا "دیکھا مگر کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ دیکھنے میں وہ بچی لگتی تھی' دس بارہ سال کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا کہہ رہے ہو؟ دس بارہ سال کی لڑکی نے یہ سب کیا ہے؟"

"میں سچ عرض کر رہا ہوں جناب عالی۔ بچی جیسی لگتی تھی مگر قد میں تھی پوری عورت۔ اس نے کونڈا کر دیا دو منٹ میں کیا ٹارزن کی بچی تھی۔ بال زیادہ لمبے نہیں تھے مگر کھلے ہوئے تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ دبلی پتلی تو خیر نہیں مگر موٹی بھی نہیں تھی۔ کپڑے بھی زنانہ پہن رکھے تھے کچھ پچھ ۔۔ نیچے شلوار تھی کالے رنگ کی مگر اوپر جو قمیص تھی وہ شلوار کے اندر کی ہوئی تھی۔ اور جناب! میں نے تو بہت نزدیک سے دیکھا۔ بے شک قد میں عورت تھی وہ۔ مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا تھا اور اوپر سے جسم بھی برابر تھا۔ دوپٹا کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک دم اندر آئی اور دوڑ کے گھس گئی شبنم بی بی کے کمرے میں۔ ادھر اپنے رفیق صاحب تھے' وہ جو کرائم رپورٹر ہیں۔ اچھے کبرو جوان ہیں۔ انہوں نے روکا اسے تو اس بھوت کی بچی نے ان کو مکا مارا اور پھر لات ماری۔ وہ کلمہ پڑھ کے لیٹ گئے۔ لیکن پیچھے تھا وہ قلم والا بندہ وحید نامراد کہتے ہیں سب جسے۔ وہ سامنے آگیا۔ لوجی اس نے بچے کی طرح وحید نامراد کو اوپر اٹھایا اور دیوار پر ماردیا۔ شبنم بی بی جان بچانے کے لیے چلی گئی میز کے نیچے۔ اس نے کرسی گرادی اور پھر میز اوپر الٹ دی۔ شبنم دوسری طرف سے نکل کے بھاگی۔ وہ چھلانگ مار کے آگے آئی اور اس نے دھکا دے کر الماری گرادی۔ الماری کا ایک کونا ان کے سر پر لگا لیکن معمولی سی خراش ہی آئی۔ وہ پھر لپکی شبنم بی بی کی طرف تو وہ چلی گئیں چھلانگ مار کے دوسری طرف۔ اور اچانک ان کی نظر پڑ گئی اپنے ریوالور پر۔ انہوں نے میز کی دراز میں ڈالا تھا مگر میز گری تو دراز کھل گئی اور ریوالور باہر آگیا۔ شبنم بی بی نے بڑی

ہوشیاری دکھائی۔ ریوالور اٹھا کے اس کی طرف کر دیا اور اس سے کہا کہ رک جاؤ ورنہ میں گولی ماردوں گی مگر وہ بھی بلا تھی جناب' وہ ایک دم پلٹ کے بھاگی۔"

"شبنم نے گولی کیوں نہیں ماردی اسے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کو وہ زندہ پکڑنا چاہتی تھیں۔ بعد میں انہوں نے فائر کیا مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے خوف سے۔ ڈرنے کی بات تو ہے جناب۔ ریوالور نہ ہوتا تو پتا نہیں وہ گوریلے کی بچی کیا کرتی۔ اپنے ہاتھوں سے شبنم بی بی کو توڑ مروڑ کے پھینک دیتی۔"

میں نے کہا "گوریلے کی بچی کیوں کہا تم نے اسے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "لوجی اور کیا کہوں۔ انسان کی بچی میں تو اتنی حیوانی طاقت ہوتی نہیں۔ سنا ہے بن مانس اور گوریلے افریقہ میں جن عورتوں کو اٹھا کے لے جاتے ہیں' ان کے بچے انسانی اور حیوانی صفات رکھتے ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کس سے سنا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "بہت سی باتیں مشہور ہیں جناب!"

میں نے کہا "تم کیا سمجھتے ہو' ایسا ہو سکتا ہے؟"

وہ کچھ نروس ہو گیا "میرا مطلب یہ نہیں تھا جناب کہ وہ لڑکی واقعی کسی بن مانس یا گوریلے جیسی مخلوق کی اولاد تھی۔ یا جن کی بچی تھی۔ میں نے تو مثال کے لیے ایسا کہا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا پھر کیا ہوا' آگے بتاؤ۔"

"شبنم بی بی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی وہ بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر سے کسی نے باہر جانے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اس نے دروازہ بند دیکھا تو پلٹ کے ادھر آگئی' اس کمرے میں۔ یہاں میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپا ہوا تھا۔ اس کا راستہ روکنے کی ہمت کہاں تھی مجھ میں مگر بدقسمتی سے میں آگیا بیچ میں اور اس نے جو دھکا دیا مجھے تو میں پیچھے گرا۔ اس میز کا کنارہ لگا کمر میں۔ وہ سیدھی گئی کھڑکی میں۔ مکا مار کے شیشہ توڑا اور پھر سر سے ٹکر مار کے پٹ توڑ دیے۔"

میں نے کہا "وہ کھڑکی کھول بھی سکتی تھی۔"

"ہاں جی۔ کوشش کی تھی اس نے لیکن یہ کھڑکی دیکھ رہے ہو آپ۔ یہ کبھی کھولی نہیں گئی۔ اوپر نیچے کی چٹخنی جام ہے۔ اور زنگ لگنے سے وہ حصہ ٹوٹ گیا ہے جو چٹخنی کو اوپر اٹھانے یا نیچے کھینچنے کے لیے انگلی سے پکڑتے ہیں۔ توبہ خدایا! ایسے میں سر سے ٹکر مارتا تو میرا سر ٹوٹ جاتا۔ اندر کا مغز اوپر نیچے ہو جاتا تو ساری یادداشت چلی جاتی۔ مگر اس نے کھڑکی کے پٹ ہی چوپٹ کر دیے۔ اس کے قبضے نکل گئے اور پٹ باہر جھولنے لگے۔ وہ کھڑکی سے باہر لٹک گئی۔ ادھر نیچے

چھجا ہے۔ لوجی' اپنی تو مت ماری گئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہیں تھا مگر میں دوڑ کے گیا اور باہر جھانکا تو وہ ایک چھجے پر سے دوسرے تک جارہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھلانگ مار کے ایک بجلی کے کھمبے پر پہنچ گئی اور اس سے چمٹ کے نیچے پھسل گئی۔"

"سڑک پر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ روکنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

وہ نفی میں سرہلانے لگا "ادھر اندھیرا تھا۔ اور کسی کی نظر نہیں تھی اس طرف۔ چند سیکنڈ میں وہ غائب ہو گئی۔"

میں نے کہا "نیچے اترنے کے بعد وہ کہاں گئی؟"

"میں نے اسے سڑک پار کرتے دیکھا تھا۔ اتنی گاڑیاں آرہی تھیں دونوں طرف سے مگر وہ بیچ میں سے چھلانگیں لگاتی نکل گئی۔ ایک گاڑی پر چڑھتے میں نے خود دیکھا تھا اسے۔ دوسری کے اوپر سے گزر گئی وہ ایک چھلانگ میں۔ اس کے بعد پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ذرا دماغ پر زور دو۔ کہیں وہ کسی گاڑی میں بیٹھ کے تو نہیں گئی تھی؟"

"وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی تھی جناب۔ پتا نہیں وہ تانگے' رکشے میں بیٹھی یا ٹیکسی میں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے ہی چھلانگیں لگاتی نکل گئی ہوگی۔ اسے دیکھ کے لگتا نہیں تھا کہ وہ انسان کی بچی ہے۔ بندر بھی ایسے چھلانگیں ضرور لگاتے ہیں۔ ادھر سے ادھر مگر اتنی طاقت نہیں ہوتی ان میں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس کو کچھ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ وہ یقین کہاں کریں گے میری بات پر کہیں گے کہ میں نے سوٹا لگایا ہوا ہے یا بھنگ پی لی ہے۔ گلی میں اتنے لوگ اور بھی ہیں۔ سب نے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں پولیس کو حقیقت بتانی چاہیے۔ اس بات کی پروا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ یقین کرتے ہیں یا نہیں۔ آخر شبنم بھی تو گواہی دے گی۔ اس نے سب دیکھا تھا۔ اور بھگتا بھی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔"

مجھے یہاں آئے ہوئے چالیس منٹ ہو گئے تھے لیکن ابھی تک تھانے سے کوئی تفتیش کے لیے نہیں پہنچا تھا۔ یہ میرے لیے کچھ حیرانی کی بات تھی کیونکہ اخبار کے دفتر کا معاملہ ہو تو پولیس تھوڑی بہت کارکردگی کا مظاہرہ ضرور کرتی ہے بصورتِ دیگر اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ صبح کے اخبار میں ان کی نااہلی کا ذکر صفحۂ اول پر ہوگا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ تاخیر کی ذمے دار خود شبنم تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے لیے طبی امداد کی فراہمی کو فوقیت دی۔ وہ زخمی تھے اور

مارپیٹ سے انہیں اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر ان کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئی تھیں اور انہیں اسپتال میں داخل کرنا ضروری نہیں تھا۔

اگر وہ سب پریس کے بندے نہ ہوتے تو ڈاکٹر بھی علاج سے پہلے پولیس رپورٹ پر اصرار کرتے اور پولیس "ضرباتِ خفیف یا ضرباتِ شدید" کی نوعیت کے مطابق ضابطۂ فوجداری کی دفع تین سو تئیس یا چوبیس کا اطلاق کرتے ہوئے ایف آئی آر پر اصرار کرتی کہ مارپیٹ کس کے ساتھ ہوئی کیوں اور کہاں ہوئی؟

آدمی تھانے میں رپورٹ لکھوانے جائے تو اسے چوری' ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین جرائم کی رپورٹ لکھوانی بھی مشکل ہوتی ہے۔ سفارش یا نذرانے کے بغیر شنوائی نہیں ہوتی۔ اسپتال کے میڈیکو لیگل سیکشن میں معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ حادثے یا لڑائی جھگڑے میں زخمی ہونے والے رپورٹ کے چکر سے بچنا چاہتے ہیں۔ پولیس قانون کے مطابق رپورٹ لکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ بالآخر وہی ہوتا ہے۔ ضابطے کے مطابق کارروائی نہ کرنے کا معاوضہ لے کر پولیس فریقین کو جانے کی اجازت دے دیتی ہے۔

شبنم کے دفتر میں سب مجھے ناصر عظیم کے نام سے جانتے تھے۔ انہوں نے میرے شلوار قمیص پگڑی اور پشاوری چپل والے حلیے کو دلچسپی اور حیرانی سے ضرور دیکھا مگر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک تو وہ بے حد مصروف تھے۔ دوسرے کچھ دیر پہلے ان کی آنکھوں نے اتنا غیر معمولی حد تک حیران کن واقعہ دیکھا تھا کہ میرے لباس کی تبدیلی میں حیرت بے معنی ہو کے رہ گئی تھی۔

آفس کے سامنے اب دو چار لوگ ہی رہ گئے تھے چنانچہ ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لیے پولیس کی موجودگی کا جواز ہی نہ رہا تھا۔ بجلی کے کھمبے جیسا ماتحت اور ٹیلی فون کے کھمبے جیسا افسر اعلیٰ بے فکری سے گشت جاری رکھنے کے لیے چلے گئے تھے۔

جیٹ فائٹر نے انتظار کا وقت گاڑی میں بیٹھ کر اونگھتے اور جماہیاں لیتے نہیں گزارا تھا۔ وہ ایک چست' جوشیلا اور مستعد نوجوان تھا۔ شوق اور تجسس سے مجبور ہو کے اس نے اخبار کے دفتر کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں سے رجوع کیا تھا اور اسے خاصی سنسنی خیز خبریں ملی تھیں۔ میرے لوٹ کر آنے تک وہ اِدھر اُدھر کے بہت سے لوگوں کا انٹرویو لے چکا تھا جو سب کے سب عینی شاہد ہونے کے دعوے دار تھے۔ ان سب نے اس محیرالعقول واقعے کو بیان کرتے ہوئے اپنی

عادت اور پروازِ تخیل کے مطابق رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کی تھی چنانچہ اب جیٹ فائٹر کے دماغ میں خیالات کا ایک آتش فشاں ابلنے کے لیے تیار تھا۔

اس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا "اب ہم چلیں گے فلم اسٹار نیلم کے گھر۔ تم نے دیکھا ہے؟"

اس نے اقرار میں سرہلا کے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بولا "آپ نے کچھ سنا جناب۔ اخبار کے دفتر میں کیا ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک پاگل عورت اندر گھس گئی تھی۔ بڑی توڑ پھوڑ کی اس نے۔"

ڈرائیور نے مجھے بے یقینی سے دیکھا "پاگل عورت۔ نہیں جناب! وہ تو کوئی آسمانی بلا تھی۔ ادھر سب نے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا کیا دیکھا تھا؟"

جواب میں اس نے ذاتی تحقیق سے حاصل ہونے والے بہت سے نتائج پر مبنی رپورٹ پیش کی۔ بالکل سامنے والے لعاب پان اسٹال کے پروپرائٹر رمضان شاہ نے جو بقلم خود ایک چشم دید گواہ تھا' اپنے بیان میں حلفیہ کہا کہ وہ خلائی مخلوق تھی جو غالباً مریخ سے آئی تھی۔ اس نے ایک فلم کے حوالے سے کہا کہ مریخ کی مخلوق ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کا قد نو دس فٹ تھا۔ وہ دیکھنے میں عورت لگتی تھی لیکن وہ پروں کے بغیر بھی اڑ سکتی تھی۔ وہ اڑتی ہوئی اخبار کے دفتر کی اوپر والی منزل پر ایک کھڑکی سے اندر چلی گئی تھی۔ بعد میں وہ ایک کھڑکی توڑ کے نکلی اور اڑتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے عجیب سی روشنی نکل رہی تھی۔ ایک بینچ پر لیٹ کر مالش کرا کر اٹھنے والے جمعہ پہلوان نے بھی کہا کہ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے عورت کے کھڑکی سے کودنے اور چھلانگیں مار کے فرار ہونے کا منظر بیان کرتے ہوئے سارا زورِ بیان اس کے جسم کی نسوانی رعنائی کا نقشہ کھینچنے پر صرف کیا اور اش اش کرتا رہا کہ کیا باڈی تھی ظالم کی۔ ایک صوفی ٹائپ بزرگ نے جو وہیں سکون سے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ اسے جنات میں شامل کیا اور کہا کہ اس کا وجود شفاف تھا اور اس میں سے انگاروں جیسی روشنی خارج ہو رہی تھی۔

باتونی ڈرائیور کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ اس نے کم سے کم دس افراد کے نظریات کو اپنی تحقیق میں شامل کیا تھا۔ ہر شخص کی دس باتوں میں مشکل سے ایک قابلِ غور تھی۔ ان سے بننے والی تصویر کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے سے واقعات کی جو تصویر سامنے آئی تھی' وہ یہ تھی کہ وہ اخبار کے دفتر کی اوپر والی منزل کی ایک کھڑکی سے باہر آئی۔ لوگوں نے اسے کسی بندریا کی طرح ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک جمپ لگاتے دیکھا۔ ہر کھڑکی کا درمیانی فاصلہ دس سے پندرہ فٹ کے درمیان تھا۔ اتنی طویل چھلانگ مار کے ہاتھوں کے بل پر چھجے سے لٹکنا اور پیروں کو جھلا کے دوسری جگہ پہنچ جانا ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے دیکھنے والوں کی عقل خبط کر دی۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں وہ کھمبے سے پھسل کے نیچے پہنچی اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی سڑک پر آ گئی۔ اس نے کسی گاڑی کے رکنے کا انتظار نہیں کیا اور دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ وہ راستے کی ساری رکاوٹوں کو کسی دشواری کے بغیر عبور کرتی چلی گئی۔ اس نے کم سے کم چار گاڑیوں کے اوپر چڑھ کر چھلانگ ماری اور ساتھ والی کسی گاڑی کے اوپر سے گزر گئی۔ گاڑی والوں نے بدحواسی میں بریک لگائے تو کچھ گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ کچھ دائیں بائیں ہو کے فٹ پاتھ پر چڑھ گئیں۔ اس سے وقتی طور پر ٹریفک جام ہوا۔ ایک گاڑی والے نے کہا کہ اچانک اس نے ونڈ اسکرین کے سامنے بونٹ پر ایک عورت کو دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے بونٹ پر کودی تھی۔ اس کے بریک لگانے سے پہلے ہی وہ اچھل کے ہوا میں چھ سات فٹ کی جمپ لگاتی ہوئی فٹ پاتھ پر اتر گئی اور ناقابلِ یقین رفتار سے دوڑتی ہوئی گلی میں گھس گئی۔

سڑک عبور کرنے کے بعد وہ ایک گلی میں گئی تھی۔ یہ سب نے دیکھا تھا مگر گلی میں اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ سڑک کے مقابلے میں گلی سنسان اور تاریک تھی۔ لوگ گلی کے اندر تک گئے مگر اس کا کوئی سراغ نہ لگا سکے یا تو وہ کسی گھر میں گھس گئی یا کسی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئی۔

میرے لیے شک و شبے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ گزشتہ روز نیلم کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والا ایک لڑکا تھا جو اسی طرح بندروں جیسی چھلانگیں مارتا ساتھ والے گھر میں گھسا تھا اور وہیں سے نیلم کے گھر کی دیوار پھاندنا چاہتا تھا کہ سیکورٹی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ اس نے بھی انتہائی غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور کوئی بھی اسے نہیں پکڑ سکا تھا۔

طے شدہ طور پر یہ دونوں سپرمین قسم کے بچے اسی نوع کی چیز تھے' جیسے جمبو اور لالی۔ انسانی ذہانت اور حیوانی طاقت کے یکجا ہونے سے وجود میں آنے والی مخلوق۔ رب نواز سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں میرے لیے یہ سمجھنا مشکل

نہ تھا کہ ان کو پروفیسر ہاشم رضا کی جینیاتی سائنس نے یہ شکل عطا کی ہے۔ ابھی تک میں نے جمبو کو نہیں دیکھا تھا جو ہاشم رضا کے اشاروں پر چلنے والا جیتا جاگتا روبوٹ قسم کا حیوان نما انسان تھا۔ اس کی بے پناہ جسمانی طاقت کا تجربہ رئیس کو ہوا تھا۔ میرا واسطہ لالی سے پڑا تھا جو عورت نظر آنے کے باوجود عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیو قامت مخلوق تھی جو اپنے خدوخال' چہرے' لمبے بالوں اور آواز سے عورت لگتی تھی مگر عورت کے جسم کی بنیادی رعنائیوں سے بھی محروم تھی اور تخلیقی صلاحیت سے بھی۔

جمبو اور لالی کی تخلیق کے راز مجھ پر رفتہ رفتہ منکشف ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش کے پیچھے پروفیسر ہاشم رضا کے جینیاتی تجربات کی فطانت کارفرما تھی۔ اس نے یہ صلاحیت برسوں کے تجربات سے حاصل کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے کئی سال افریقہ میں گزار چکا تھا۔ جہاں اس نے نر اور مادہ گوریلے یا بن مانس کے نظامِ تولید کا جینیاتی سائنس کے اصولوں کے مطابق تجزیہ کیا تھا اور اسے انسانی قوتِ تخلیق سے مربوط کرنے کے عمل میں کامیاب رہا تھا۔

یہ سائنسی تجربہ کسی حد تک سفاک طرزِ عمل اور بے رحمانہ سوچ کا حامل تھا۔ اس کے غیر اخلاقی' غیر قانونی اور غیر انسانی ہونے میں تو کلام ہی نہیں۔ پروفیسر نے مبینہ طور پر دس' دس لاکھ میں دو عورتوں کو خرید لیا تھا۔ ایک نے اپنے خاندان کی فلاح اور خوش حالی کے لیے یہ قربانی خود دی تھی۔ دوسری کو ایک لالچی شوہر نے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

ان دونوں عورتوں نے اپنے وجود میں ایک حیوانی نطفے کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے ایک بن مانس کے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو اپنے رحم میں نشوونما فراہم کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عورت کا جسم صرف انسانی بچے کو جنم دے سکتا ہے۔ انہوں نے ایک دیو قامت حیوان کے بچے کو پیدا کرنے کی ذمے داری قبول کی اور اس کی پیدائش کے عمل میں اپنی جان گنوا دی۔ وہ جمبو اور لالی کی ماں بن گئیں مگر انہیں اپنی اولاد کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

کیا دس' دس لاکھ میں عیش و آرام کی زندگی پانے والے آج ان عورتوں کو یاد کرتے ہوں گے؟ شاید نہیں۔ پروفیسر نے دس لاکھ میں دو شوہروں سے ان کی بیویاں اور بچوں سے ان کی مائیں غیر مشروط طور پر خرید لی تھیں۔ انہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ بعد میں ان عورتوں کے ساتھ کیا ہوا۔ پروفیسر نے انہیں واضح طور پر سمجھا دیا تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے ہنسی خوشی اپنی جان کی قربانی دی اور وہ جس کو زبردستی قربان کیا گیا' دونوں ایک ہی انجام سے دوچار ہوئیں۔ دونوں کے خاندان غربت و افلاس اور فاقہ کشی کے اندھیرے سے نکل کے خوش حالی اور پُرمسرت اجالے والی زندگی میں پہنچ گئے۔ وہ خود گمنام قبروں کے سفاک اندھیرے میں حشرات الارض کا رزق ہوئیں۔ ان کے شوہروں نے دوسری عورت ضرور تلاش کر لی ہوگی۔ بچوں نے بھی ماں کو بھلا دیا ہوگا۔ وہ کہاں گئی' کیوں گئی' ان سوالوں کا جواب مانگنے سے کسی کو کچھ نہیں ملا ہوگا۔

جمبو اور لالی کو پیدا کرنے والی کوئی عورت نہ رہی مگر وہ زندہ رہے اور پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات کی کامیابی کی سند بن گئے۔ پروفیسر نے اپنی تخلیق کا ایک شاہکار اپنے دوست رب نواز کو پیش کر دیا اور دوسرا اپنے پاس رکھا۔ رب نواز نے اسے تجربات کے لیے ابتدائی سرمایہ فراہم کیا تھا۔ بعد میں وہ خود کفیل ہو گیا۔ دنیا بھر کے سائنس داں اور سائنسی تحقیق میں معاونت کرنے والے ادارے اس کی پشت پناہی کرنے لگے۔

پروفیسر کے تجربات ابھی جاری تھے۔ اس کے پیشِ نظر مقاصد بہت واضح تھے۔ دنیا کے بہت سے جینیاتی سائنس داں یہی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک خلیے سے DOLLY نام کی پوری بھیڑ بنا لی تھی جو اصل بھیڑ کا فوٹو پرنٹ تھی۔ پابندیوں کے باوجود بہت سے سائنس داں ایک انسانی خلیے سے بالکل ویسا ہی دوسرا انسان بنانا چاہتے تھے اور چوری چھپے دنیا کے مختلف حصوں میں یہ کام کر رہے تھے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی کے متضاد دعوے سامنے آتے رہتے تھے لیکن ڈولی کی تخلیق کے بعد یہ دعوے محض سائنس فکشن کی بات نہیں رہے تھے۔ ان کی کامیابی کے امکان کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

پروفیسر کے مقاصد اس سے بھی دو قدم آگے تھے۔ وہ ایک ایسا انسان بنانا چاہتا تھا جس کے پاس اعلیٰ ترین انسانی ذہانت ہو مگر اس ذہانت کو کنٹرول کیا جا سکے۔ اس کے پاس شیر جیسی حیوانی طاقت ہو مگر وہ سرکس کے شیر کی طرح انسان کے اشارۂ ابرو کا غلام ہو۔ اسے اپنے قول و فعل پر اختیار حاصل نہ ہو۔ اس کا مالک اور آقا اسے جیسے چاہے استعمال کر سکے۔ اس کے دماغ کو دواؤں سے' اور دیگر طبی طریقوں سے CONDITION کیا جا سکے مثلاً اسے کمپیوٹر کی طرح کمانڈ دی جائے کہ یہ تصویر دیکھو' یہ فلاں ملک کا صدر ہے۔ اس کا

قافلہ آج اتنے بج کر اتنے منٹ پر فلاں جگہ سے گزرے گا۔ اس کی گاڑی کے سامنے بم رکھ دو یا گاڑی کو الٹ دو۔ غلام چلتی گاڑی کے سامنے آکے یہ کام کرے گا اور فلاں ملک کے صدر کی گاڑی کے آگے پیچھے چلنے والے حفاظتی دستے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ گاڑی کی تیز رفتاری کے باوجود کس نے سامنے آنے کی ہمت کی اور ایک آدمی نے گاڑی کیسے الٹ دی۔ ایک غلام کم ہوگیا۔ کوئی بات نہیں، دوسرا بن جائے گا۔

یہ کسی کو علم نہیں تھا کہ پروفیسر اپنے تجربات کہاں کر رہا ہے۔ ان تجربات کی اجازت فی الحال دنیا کے کسی ملک کے قوانین میں نہیں تھی۔ ان کی مذہبی یا اخلاقی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی کہ کوئی بھی مہذب معاشرہ اس قسم کے شیطانی تجربات کو برداشت کرسکے۔ ایسے بہت سے سائنس داں جو ایک خلیے سے لیبارٹری میں انسان بنانا چاہتے تھے (نعوذ باللہ) خدا نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ یہ تخلیق کا عمل نہیں تھا۔ یہ تشکیل کا عمل تھا۔ وہ ایک خلیہ جس سے کسی جانور یا انسان کو بنایا جا رہا تھا بہرحال خدا کا پیدا کیا ہوا تھا۔ یہ ایسا ہی کام تھا جیسے ایک دھاگے سے سیکڑوں یا لاکھوں گز کپڑا بن جائے یا ریت کے ذرات سے ڈیم کی دیوار تعمیر ہوجائے۔ ایک بیج سے ایک شجر اور ایک شجر سے پورا گلستان وجود میں آجائے۔

سائنس داں ایک ایٹم کو توڑ کے اندر جھانک سکتے تھے۔ نیوکلیئس کے پروٹون اور نیوٹرون کو شمار کرسکتے تھے۔ اس کے مدار میں گردش کرنے والے الیکٹران کی تعداد بتاسکتے تھے، ان کا وزن بتاسکتے تھے مگر وہ خود ایک ایٹم بنا نہیں سکتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ D.N.A سے خلیے کے بارے میں مفصل معلومات لے سکتے تھے مگر اسے کیمیائی طریقے سے لیبارٹری میں ایجاد نہیں کرسکتے تھے۔

میری معلومات اس معاملے میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں نے دو اور دو چار کرکے جو نتائج اخذ کیے تھے رب نواز کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کیے تھے۔ اسی نے مجھے جمبو اور لالی کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ اس نے ایسے ہی غلاموں کی فراہمی کے لیے پروفیسر کو آرڈر دے رکھا ہے۔ کیا پروفیسر اس قابل ہوگیا تھا کہ مطلوبہ تعداد میں یہ حیوان نما انسان پیدا کرسکے جن کے دماغ کو کمپیوٹر کی طرح پروگرام کیا جاسکے؟

پروفیسر کی اصل مجبوری یہ تھی کہ دیکھنے میں مرد اور عورت نظر آنے والے جمبو اور لالی اولاد پیدا نہیں کرسکتے تھے۔ ان کی مثال خچر سے دی جاسکتی تھی جو گھوڑے گدھے کی مخلوط نسل ہے۔ دونوں سے زیادہ خوبصورت، توانا اور جفاکش ہے لیکن خچر سے خچر پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہر جمبو اور لالی کو جنم دینے کے لیے ایک عورت کی قربانی ضروری تھی۔ اس کے جسم کی پیداواری مشینری صرف ایک دفعہ استعمال ہونے کے بعد عورت کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی تھی۔ دس لاکھ بھی ویسے تو کم نہیں ہوتے دنیا کے بازار میں جسم فروش عورتوں کی بھی کمی نہیں مگر جان بیچنے والی عورت آسانی سے کہاں دستیاب ہوتی ہے۔

چنانچہ نیلم کے گھر پہنچتے ہوئے جو سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا، یہ تھا کہ پروفیسر کیا کرتا ہوگا؟ کیا وہ گلی گلی نگر نگر کیش لے کر پھرتا ہوگا کہ جتنی عورتیں جسم کے ساتھ جان بیچنے پر تیار ہوں، اٹھا لے جیسے آڑھتی مال اٹھاتا ہے۔ نہیں، یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ پروفیسر بہت سیانا آدمی ہے اور اس کو لوکل مارکیٹ کا بھی صحیح اندازہ ہے۔ یہاں بہت سے علاقوں میں بیٹی کو کسی بھی اجنبی کے ساتھ رخصت کردیا جاتا ہے جو شادی کے نام پر پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپیہ نقد ادا کردے۔ بردہ فروش ہر جگہ جال پھیلا کے لڑکیوں کو مڈل ایسٹ سے سنگاپور اور ہانگ کانگ سے لندن تک پہنچا رہے ہیں۔ پروفیسر کو عورت کی صورت، شکل، رنگ و روپ اور حسن و شباب سے کیا۔ اسے صرف عورت کی پیداواری صلاحیت چاہیے۔ اس کے لیے چالیس پچاس سال کی کالی پیلی سوکھی سڑی یا بھینس جیسی عورت بھی چلے گی۔ اور ایسی عورت سستی بھی ملے گی۔ وہ یقیناً بردہ فروشوں سے رابطے میں ہوگا جو اسے اپنے تجربات جاری رکھنے کے لیے عورتیں فراہم کرتے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے سائنس دانوں کو لیبارٹری میں خرگوش، گنی پگ یا بندر فراہم کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جو اخلاقی طور پر زوال پذیر ہو۔ جہاں مذہب سے بے گانگی نے انسانیت کو بے وقار کردیا ہو اور عورت کو ذاتی پراپرٹی، مرد کے پاؤں کی جوتی اور جنس بازار بنادیا ہو وہاں پروفیسر ہاشم رضا جیسے لوگوں کی دولت سب کچھ خرید سکتی ہے۔

میرا ذہن اب دو الگ الگ واقعات کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ شب پیش آنے والے ایک ناقابلِ یقین واقعے کی رپورٹ میں نے صبح کے اخبارات میں دیکھی تھی۔ اس کا تعلق نیلم کے پڑوس میں رہنے والے حمید اللہ بیگ نام کے ایک تاجر سے تھا۔ اس کے گھر میں سیکورٹی گارڈز نے ساڑھے تین فٹ قد کے ایک برہنہ بچے کو مار گرایا تھا۔ جس

نے دس فٹ اونچی فصیل پر جست لگائی تھی اور پھر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگ مارتے ہوئے نیلم کے گھر کی دیوار پھاندنے کی کوشش کی تھی۔ سیکورٹی گارڈز اسے پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔ اس نے ایک گارڈ کو دیوار پر دے مارا تھا اور دوسرے سے گن چھین کے اس کا سر پاش پاش کردیا تھا۔ اسے بالآخر گولی ماردی گئی تھی۔

دوسرا واقعہ ابھی کچھ دیر پہلے اخبار کے دفتر میں پیش آیا تھا لیکن اس میں حملہ آور ایک لڑکی تھی۔ اس نے چند منٹ میں اخبار کے دفتر کو تہس نہس کردیا تھا اور تین جوانمردوں کو زخمی کردیا تھا۔ اگر شبنم فائر نہ کرتی تو اس سے کوئی نہ نمٹ پاتا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئی ورنہ اس کی لاش بھی میو اسپتال لے جائی جاتی اور پھر شاید پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس اسلام آباد۔

حمید اللہ بیگ کے گھر میں مارے جانے والے بچے کے بارے میں بھی یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی شکل و صورت انسانی تھی مگر اس میں گوریلے جیسی طاقت تھی اور بندر جیسی پھرتی۔ ایک اخبار نے اسے مخلوط نسل کی مخلوق قرار دیا تھا، اسے گوریلے اور انسان کے ملاپ کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے گورمین GORMAN کا نام بھی دے دیا گیا تھا۔ جو میرے لحاظ سے مناسب تھا۔ اور اسی مناسبت سے لڑکی کو گوروومین GORWOMAN کہنا بھی غلط نہ تھا۔

لیکن ابھی تک گورمین کا وجود بھی ایک افسانوی کردار کی طرح تھا جیسے کہ اسنومین۔ ہمالیہ کا برفانی آدمی۔ یا CAVEMAN یا APEMAN پریس یا پبلک نے گورمین کی تھیوری کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ بہت سی باتیں میرے علم میں تھیں۔ ایک یہ کہ گورمین اور گوروومین پروفیسر ہاشم رضا کے سائنسی تجربات کی پیداوار تھے۔ دوسری یہ کہ حمید اللہ بیگ اور اخبار کے دفتر میں نظر آنے والے لڑکا اور لڑکی جو نسلی صفات کے اعتبار سے ایک تھے۔ غالباً رب نواز کے ایما پر وہاں بھیجے گئے تھے۔ انہیں رب نواز کے دوست ہاشم رضا نے پروگرام کرکے بھیجا تھا۔ اس کا مقصد حمید اللہ بیگ یا اخبار کے دفتر پر حملہ نہیں تھا۔ پہلے حملے کا اصل ٹارگٹ نیلم تھی اور دوسرے کا شبنم۔ تیسری اہم بات یہ ہوسکتی تھی کہ اس معاملے سے ہاشم رضا کا تعلق ہی نہ ہو۔ اس نے آرڈر کے مطابق دو عدد گورمین بنا کے رب نواز کو سپلائی کردیے ہوں اور انہیں رب نواز نے خفیہ استعمال کیا ہو۔

رب نواز نے دو چیزوں کی تلاش میں تمام قانونی اور غیر قانونی طریقے استعمال کرکے دیکھ لیے تھے۔ ایک وہ مورتی کا سر جس کی مالیت دنیا کے سب سے دولت مند اور طاقتور ملک کی کرنسی میں تین کروڑ روپے بنتی تھی۔ اس مجسمے کے سر کو بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر پلاسٹر آف پیرس کی تہ تھی۔ اس کے نیچے آدھ انچ کی تہ ہیروئن کی جما کے پھر پلاسٹر آف پیرس کی ایک LAYER جمائی گئی تھی۔ یہ عمل الٹا شروع ہوا تھا یعنی اندر شاید آدھا کلو ہیروئن گیند کی شکل میں رکھ کے اوپر پلاسٹر آف پیرس پھیلا دیا گیا۔ اس کے خشک ہوکے سخت ہوجانے کے بعد ہیروئن کی دوسری تہ جمائی گئی اور اس کے اوپر پھر پلاسٹر آف پیرس، یہ دونوں ایک ہی رنگ کے پاؤڈر تھے چنانچہ انسانی آنکھ مورتی کے سر کو توڑ کے بھی ان تہوں کو الگ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ رب نواز کو پورا یقین تھا کہ یہ سر شبنم کے پاس ہے یا وہ اس کے بارے میں جانتی ضرور ہے۔

دوسری چیز جس کی رب نواز کو اتنی ہی شدت کے ساتھ آرزو تھی، سونی تھی۔ ایک بار اس نے قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوئے نیلم کے گھر پر پولیس کے ساتھ چھاپا مارا تھا لیکن سونی کو بانو خالہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لے کر فریج کے اندر چھپا کے بٹھا دیا تھا۔ اچانک گھر کا چپا چپا چھان لینے کے باوجود رب نواز کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ دوسری بار وہ خود اچانک نیلم کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ نیلم نے سونی کو چھپا رکھا ہے۔ وہ سونی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سونی اس کی مجرم تھی۔ اس نے رب نواز کو لاکھوں کا نقصان پہنچایا تھا۔ وہ رب نواز کی نظروں کے سامنے سے اس کے جوان بیٹے کو اغوا کرکے لے گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکا تھا۔ وہ سونی کو سزا دینا چاہتا تھا، اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

اگر مورتی کے سر کی قیمت واقعی تین کروڑ تھی تو اس کی بازیابی کے لیے دس بیس لاکھ کی ایک گوروومین قربان کی جاسکتی تھی۔ سونی کا پتا چلانے کے لیے بھی ایک گوروومین کو ضائع کیا جاسکتا تھا۔ شاید رب نواز کو امید تھی کہ مستقبل قریب میں ہاشم رضا اسے کچھ اور تجرباتی بچے دے سکتا ہے۔

اس وقت ایک دلچسپ سوال نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ آخر پروفیسر ہاشم رضا کے گوریلے اور انسان کی مخلوط نسل والے بچے کو جوان ہونے میں کتنے دن لگتے ہیں۔ اس کی طبعی عمر کیا ہوتی ہے؟ نیلم کے پڑوس میں مارا جانے والا بچہ ساڑھے تین سال کا تھا۔ اس کی عمر کا تعین کس نے کیا اور کیسے؟ اسی طرح اخبار کے دفتر پر حملہ کرنے والی لڑکی کو قد میں عورت کے برابر ہونے کے باوجود بچی سمجھا گیا۔

آخر کیوں؟ کیا ایک نظر میں جسم کی ساخت سے عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو جمبو اور لالی کی عمر کیا ہے؟

میرے اندازے کے مطابق لالی بیس سے تیس سال کے درمیانی عمر کی عورت تھی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں لگتی تھی۔ جمبو کو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا مگر رئیس نے اسے بچہ یا بوڑھا نہیں کہا تھا۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ جوان تھا۔ تو کیا رب نواز نے انہیں بچے سے بڑا کیا تھا یا پروفیسر ہاشم رضا نے بیس سال تک انہیں اپنے فارم ہاؤس میں رکھا تھا۔

یہ بات بعید از امکان نہیں لگتی تھی کہ تجرباتی طور پر پیدا کیے جانے والے ایسے بچے دگنی یا چوگنی رفتار سے عمر کا سفر طے کرتے ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک انڈا دینے والی LAYER مرغی کے مقابلے میں BROILER یعنی کھائی جانے والی مرغی کا وزن کہیں زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مخصوص غذاؤں اور دواؤں سے جمبو اور لالی نے پانچ سال میں بیس سال عمر کے مرد اور عورت کی جسامت حاصل کر لی ہو۔

میں اپنے خیالات کے گرداب میں ایسے غوطہ زن تھا کہ مجھے نیلم کے گھر پہنچنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ میں نے آدھے گھنٹے کے سفر میں جیت فاطر کی مسلسل جاری رہنے والی نشریات بھی نہیں سنی تھیں۔ وہ یقیناً اپنی عقل اور معلومات کی روشنی میں اس آسمانی بلا کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات پیش کرتا رہا ہوگا۔

اس نے مجھے پلٹ کے دیکھا "سر جی۔ یہی ہے نیلم کا گھر۔"

میں نے چونک کے کہا "ہاں ... ہاں یہی ہے۔ اب تم انتظار کرو یہاں۔"

اس نے فرطِ اشتیاق سے ہاتھ مل کے کہا "انتظار تو ہم ساری رات کر سکتے ہیں جی مگر... وہ بات یہ ہے کہ... اگر..."

"اگر کیا۔ ملنا چاہتے ہو نیلم سے؟"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "آپ تو دل کی بات سمجھ لیتے ہو جناب! اگر آج اس سے ہاتھ ملانے کا موقع مل جائے تو زندگانی سنور جائے۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیوانے ہو تم بھی اس کے۔ اچھا دیکھو ابھی تو پتا نہیں وہ گھر میں ہے یا نہیں۔"

گیٹ پر کھڑے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مجھے غور سے دیکھ کے پہچانا اور گیٹ کھولتے ہوئے بولا "ابھی آپ ایک دم بدر منیر کا تک لگتا اے۔"

میں نے مسکرا کے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر چلا گیا۔ برآمدے میں بانو خالہ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کچھ کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے خوف زدہ انداز میں چلا کے کہا "ارے، یہ کون موا پٹھان گھسا چلا آ رہا ہے گھر میں۔ گارڈ!"

میں نے کہا "خالہ۔ یہ میں ہوں، ناصر عظیم... نیلم کہاں ہے؟"

انہوں نے سکون کا سانس لیا "نیلم کا مجھے کیا معلوم۔ آدھی رات ہو گئی۔ ابھی تک فرصت نہیں ملی شوٹنگ کے چکروں سے۔ شوٹنگ نہ ہوئی جان کا عذاب ہو گئی۔ صبح، دوپہر، شام... جب دیکھو شوٹنگ ہے۔ تم اچھے دوست ہو اس کے۔ کچھ سمجھاتے کیوں نہیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "میں کیا سمجھاؤں، اس کا کام ہے۔"

"اجی کام کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا ذ ُمدہ ایسے کام ہے کہ زندگی تھوڑی پڑ جائے۔ آدمی خود ختم ہو جائے مگر کام ختم نہ ہو۔ کیا ملتا ہے اس کام سے آخر۔ پیسہ... پیسہ جان سے پیارا ہو گیا ہے؟ دیکھتے نہیں، صحت کا کیا حال ہو گیا ہے۔ کھانا پینا پہلے ہی بند ہے۔ اس سے وزن بڑھ جائے گا۔ اس سے بلڈ پریشر بڑھ جائے گا۔ اس سے شوگر بڑھ جائے گی۔ کھانے کو رہ گئی ہیں بس گولیاں، وٹامن کی گولیاں، سر درد کی گولیاں، وزن کم رکھنے والی گولیاں، اب تو خیر سے نیند کی گولیاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔"

میں نے کہا، نیلم نیند کی گولیاں کھاتی ہے؟"

"نہیں کھائے گی تو کیا کرے گی۔ نیند جو نہیں آتی اور نیند آئے گی اگر آدمی ایک وقت پر لیٹ جائے۔ کبھی رات بارہ بجے تک۔ کبھی دو بجے تک۔ کبھی پوری رات شوٹنگ میں گزر جاتی ہے۔ چائے اور کافی پی پی کے ستیاناس کر لیا ہے بھوک کا بھی۔ ایسے آخر کب تک چلے گا؟"

میں نے کہا "فکر مت کریں خالہ، تھوڑے دن کی بات ہے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" انہوں نے تلخی سے کہا۔

"نیلم نے کہا تھا مجھ سے کہ فلموں میں کام کرنا چھوڑ دے گی۔"

"اجی رہنے دو۔ بہت سنا ہے یہ میں نے بھی۔ نہ وہ چھوڑے نہ دوسرے چھوڑنے دیں۔ اور کیا کرے گی وہ گھر بیٹھ کر۔ صبیحہ خانم کو دیکھ لو، مسرت نذیر اور زیبا، نیلو اور رانی۔ سب نے شادی کر لی اور گھر بار سنبھال لیا۔ برا وقت

آنے سے پہلے اچھا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی۔"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "اپنا برا بھلا وہ خود بھی سمجھتی ہے اور اس نے وعدہ کر لیا ہے مجھ سے۔"

خالہ ایک دم سیدھی ہو کے بیٹھ گئیں "اچھا؟ تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے۔ پھر میاں، دیر کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے گھبرا کے کہا "دیکھیے، میں نے شادی کی بات نہیں کی۔"

ان کا چہرہ بجھ گیا "نہیں کی تو اب کر لو۔ یا تم بھی انہی میں شامل ہو جو سمجھتے ہیں کہ وہ ایکٹریس ہے اور شادی کے لیے تمہیں بھی چاہیے شرافت کی سند؟"

میں نے کہا "خالہ۔ آپ سے بہتر جانتا ہوں میں اسے۔ آپ تین سال سے ہیں اس کے ساتھ میں دس سال پہلے بھی اس کا دوست تھا۔ اگر میں شادی کرنا چاہتا تو مجھے اس سے اچھی لڑکی کہاں مل سکتی تھی۔ انتہائی خوش قسمت ہوگا وہ شخص جسے نیلم جیسی شریکِ حیات ملے گی۔ رہی اس کی شرافت کی بات تو میں اس کی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"کیا تمہاری بات طے ہو گئی ہے کسی سے؟" خالہ نے مجھے غور سے دیکھا۔

میں نے ہنس کر کہا "ایسا بھی نہیں کہہ سکتا میں۔"

"وہ عمر میں کچھ زیادہ ہے تم سے۔ سال دو سال بڑی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں خالہ۔ ایک تو اس کی کوئی اہمیت نہیں، ہمارے پیارے نبیؐ نے تو بہت اچھی مثال قائم کی ہے ہمارے لیے۔ بی بی خدیجہؓ پندرہ سال زیادہ تھیں عمر میں اور اصل عمر تو وہ ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ نیلم شاید آٹھ دس سال چھوٹی لگتی ہوگی مجھ سے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں خالہ، معلوم نہیں کیوں سارا زمانہ یہ سوال ہمیشہ کرتا ہے مجھ سے۔ ہر شخص کو جیسے اور کوئی فکر ہی نہیں، اس کے سوا کہ آخر میں نیلم سے شادی کیوں نہیں کرتا۔ اسے میں نے کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ وہ میری محسن ہے۔ دوست ہے اور ہمدرد ہے۔ اس نے ہمیشہ بڑا خیال رکھا میرا۔ دیکھا جائے تو میری یہ زندگی اسی کی مرہونِ منت ہے۔ اس نے مجھے جینے کے لیے حوصلہ نہ دیا ہوتا تو میں شاید خودکشی کر لیتا۔ میرے لیے اس کی محبت بہت قیمتی ہے۔ جیسے ماں کی محبت اور شفقت ہوتی ہے۔ اسے میں گنوانا نہیں چاہتا۔"

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آ سکتی تھیں چنانچہ میں اٹھ گیا۔ تلاش کرنے پر سونی مجھے باغ کے ایک تاریک گوشے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ملی۔

میں نے کہا "تم یہاں ہو، میں اندر ڈھونڈتا رہا؟"

اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا "تم تو پہچانے نہیں جا رہے۔ یہ شلوار قمیص اور واسکٹ۔ قراقلی ٹوپی اور پشاوری چپل۔ بالکل قبائلی سردار لگ رہے ہو۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے ایک ضروری بات کرنے آنا پڑا۔"

"ورنہ نہ آتے؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے شاہ عالم کا کیا تعلق نیلم سے یا سونی سے۔"

وہ بولی "رئیس سے مل کے آئے ہو؟"

میں نے بڑی روانی سے پورے اعتماد کے ساتھ سرہلا دیا۔ "ہاں، ایک وجہ یہ بھی ہے میرے آنے کی۔ رئیس نے کہا تھا کہ تمہیں تسلی دوں اور یہ بتاؤں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ بہت جلد آ جائے گا تمہارے پاس۔"

سونی کی صورت پر مسلط اداسی کا رنگ ایک امید کے خوش آئند اجالے میں گم ہو گیا "وہ... ٹھیک تو ہے؟"

"اسے کیا ہو سکتا ہے۔ بہت ڈھیٹ چیز ہے لیکن تم کچھ ضرور ہو جائے گا اگر تم نے اپنا ٹھکانا نہ بدلا۔ ہو سکتا تمہارے ساتھ نیلم کو بھی نقصان پہنچے۔"

وہ پھر افسردہ اور دکھی ہو گئی۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں آخر؟ تم سب کی مرضی سے یہاں نظربندی کے دن خاموشی سے گزار رہی ہوں۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک غلطی سے وہ مقصد فوت ہو گیا۔ جس کے لیے میں تمہیں یہاں لایا تھا۔ تمہیں یہاں روپوش رہنا تھا مگر تم نے خود اپنا راز فاش کر دیا۔ تم نیلم کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے چلی گئیں۔"

"میں کہہ چکی ہوں کہ اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔"

"مرضی شامل تھی یا نہیں لیکن تم کو دیکھنے والوں نے پہچان لیا۔ اور یہ بات رب نواز تک پہنچ گئی۔ اس نے نیلم کے گھر کی خانہ تلاشی کے وارنٹ نکلوا دیے۔ پولیس تمہیں برآمد نہیں کر سکی۔ مگر اس سے رب نواز کا شک دور نہیں ہوا۔ تمہیں معلوم ہے کل تمہارے پڑوس میں کیا ہوا تھا؟"

وہ سر جھکا کے بولی "بانو خالہ کچھ بتا رہی تھیں، عجیب سی بات تھی۔ پولیس بھی آئی تھی اور میں نے اخبار میں بھی

دیکھا تھا مگر وہ کوئی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔"
میں نے کہا "اخبار میں جو آیا سو فیصد سچ تھا۔"
"یعنی وہ کوئی بڑا سا بندر نہیں تھا' انسان کا بچہ تھا۔"
میں نے کہا "تم نے لالی کو دیکھا ہے؟"
"ہاں۔ وہ لالی کا بیٹا تو نہیں ہو سکتا" وہ مسکرائی۔
"رئیس نے تمہیں جبو کے بارے میں کبھی کچھ بتایا؟"
سونی نے سوچ کے کہا "ہاں۔"
میں نے کہا "یہ بھی ویسی ہی مخلوق تھی۔ تمہیں معلوم ہے ابھی کچھ دیر پہلے شبنم کے آفس میں کیا ہوا؟ اچھا جاؤ پہلے میرے لیے چائے بنا کے لاؤ۔ پھر بتاؤں گا باقی بات۔"
اس نے کہا "اندر چلو۔ یہاں لاتے لاتے چائے بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔"
ملازم سو گئے تھے۔ تخت پر نیم دراز بانو خالہ کی بھی نیلم کا انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ گئی تھی۔ سونی نے کچن میں الیکٹرک کیٹل لگا کے اپنے اور میرے لیے چائے بنائی۔ نیلم کے گھر کا کچن بھی بہت شاندار تھا۔ بائیس فٹ چوبیس فٹ کے لمبے چوڑے ائرکنڈیشنڈ کچن میں فرش سے دیواروں تک رجگہ سفید ٹائل تھے۔ سفید کچن کیبنٹ تھے اور سفید ماربل ٹاپ شیلف تھے۔ ایک کونے میں گلاس ٹاپ ڈائننگ ٹیبل تھا جس کے گرد چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر چیز بالکل بے داغ اور اجلی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی ٹیوب لائٹس کی روشنی میں کچن جگمگ کرتا نظر آتا تھا۔
میں نے سونی کو مختصراً اس لڑکی کے بارے میں بتا دیا۔ جس نے شبنم پر آفس میں حملہ کیا تھا۔ وہ خوف اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سب سنتی رہی اور میرے ساتھ بیٹھی چائے کے ساتھ بسکٹ کھاتی رہی۔ مجھے رات کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے میں نے کہا "یار' چائے سے تو اپنا کچھ بھی نہیں بنا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ دوپہر کے بعد کچھ کھانے کو نہیں ملا آج۔"
"کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا ہے" سونی نے کہا۔
میں نے حیرانی سے کہا "کیوں بھئی' آپ کیوں بھوکی بیٹھی ہیں؟"
"بس ایسے ہی ہوتا ہے روز۔ نیلم باجی کہہ کے جاتی ہیں کہ جلدی آ جائیں گی لیکن پھر ہو جاتی ہے ایسی کوئی بات۔ کبھی سین لمبا ہو جاتا ہے' کبھی ہیرو یا کوئی اور وقت پر نہیں پہنچتا۔ تکنیکی مسئلہ آ جاتا ہے۔ بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے اور شوٹنگ وقت پر ختم نہیں ہو پاتی۔ مجھے بھی عادت سی پڑ گئی ہے۔ وہ آئیں گی تو بہت معذرت کریں گی۔ خفا ہوں گی کہ تم کیوں بیٹھی رہتی ہو میرے انتظار میں' گھر میں اکیلی وقت پر کھانا کھا کے کیا کروں؟"
میں نے کہا "کرنے کو کام نہیں ہے کوئی تو ٹی وی دیکھو۔ سو جاؤ۔"
"سارا دن اور کیا کرتی ہوں؟" وہ بولی "عجیب زندگی ہو گئی ہے میری گھر کے اندر قید خانہ کہوں گی تو تم برا مانو گے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں خود کو نظربند محسوس کرتی ہوں۔ حالانکہ جب میں یہاں آئی تھی تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں نیلم کے گھر میں ہوں۔ اس کے ساتھ مہمان کی طرح نہیں گھر کے ایک فرد کی طرح رہتی ہوں اور مجھے خود اپنی خوش قسمتی پر رشک آتا تھا۔"
میں نے کہا "اب کیا نیلم کا رویہ بدل گیا ہے تمہارے ساتھ؟"
"ایسا مت کہو۔ وہ تو ایسی ہیں کہ اب میں کیا کہوں' مجھے اپنی بہن کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ نیلم باجی جیسی بڑی بہن ہوتی میری تو شاید میری زندگی میں یہ دن نہ آتا کہ میں پکڑے جانے کے خوف سے کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتی اور جب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اپنے آپ سے کہ میں اس قابل نہیں کہ کوئی مجھے عزت دے یا محبت دے۔ میں ایک خطرناک اشتہاری مجرم ہوں۔ دس لاکھ روپے کا انعام ہے مجھے زندہ یا مردہ پولیس کے حوالے کرنے والے کے لیے۔"
میں نے محسوس کیا کہ فرسٹریشن کا ہسٹریا اسے مغلوب کرنے لگا ہے۔ "پرانی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ۔ آج تم وہ نہیں ہو جو کل تھیں۔ اور ہم سب تمہارے آنے والے کل کے لیے فکرمند ہیں۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ رونے لگی "آخر کیوں؟ میں ایک آوارہ' بدچلن اور بہت بری لڑکی ہوں۔"
"نہیں۔ اب تم میرے لیے اور نیلم کے لیے' رئیس کے لیے' شبنم کے لیے۔ فرید اور رخشی کے لیے' ویسی ہی ہو جیسے ہم سب ہیں۔ تمہاری آنے والی پوری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم غور کرو تو ہم سب بھی ٹھکرائے ہوئے اور ٹھوکر کھائے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم سب نے ٹھوکریں کھا کے سنبھلنا سیکھا ہے اور سنبھالنا سیکھا ہے۔"
اس نے اپنے آنسو پونچھ دیے "لیکن تم سب قانون کی نظر میں مجرم تو نہیں ہو۔"
میں نے کہا "یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ میں کیوں بھیس

بدل کے پھر رہا ہوں۔ شاہ عالم بھی ایک مفرور مجرم ہے۔ داڑھی والے جن کے خلاف کتنے کیس ہیں؟ وہ کون ہے میرے سوا۔ اور کیس کیا رئیس کے خلاف نہیں ہیں۔ اس نے کون سی شرافت کی زندگی گزاری ہے۔ وہ نامی گرامی بدمعاش تھا اسی شہر کا۔ فرید کیوں نکالا گیا پولیس کے محکمے سے۔ شبنم کا ماضی میں کیا کردار تھا۔ رخشی کیا تھی؟ ہم سب کی کہانی الگ ہے مگر عنوان ایک ہے لیکن ہم اگر گنہگار ہیں تو یہاں کون ہے جو بے گناہی کی سند رکھتا ہو؟ جو کہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہم سب اچھے انسان بننا چاہتے ہیں۔"
وہ خاموش ہو گئی "میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔"
میں نے کہا "اگر تم اپنے ماضی کی طرف دیکھتی رہو گی تو مستقبل تمہیں کہاں دکھائی دے گا۔ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں' وہ کیا ہے تمہاری نظر میں؟ بے وقوفی یا تضیع اوقات؟ ہم سب ایک اچھے' باعزت اور خوشی دینے والے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ مل کے اور امید کے ساتھ۔ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سب غلط ہے یا لاحاصل ہے۔"
"لیکن حالات تو خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔"
میں نے کہا "حالات کی خرابی کیا ہے؟ ذرا انسانوں کی اس دنیا کو دیکھو جو تمہارے اردگرد بستی ہے۔ اس وقت کتنے لوگ ناکردہ گناہ کی پاداش میں جیل کے اندر کسی کال کوٹھری میں پڑے پھانسی چڑھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو سڑکوں پر نفرت انگیز جسموں کے ساتھ رینگتے ہوئے بھیک مانگ رہے ہیں؟ اسپتالوں میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں اور بچے بوڑھے اور جوان مر رہے ہیں۔ حشرات الارض کی طرح۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم روانڈا میں نہیں ہو ورنہ تمہارا فاقے سے مر جانے والا جسم دھوپ میں پڑا سڑ رہا ہوتا یا کسی خرکار کے کیمپ میں نہیں ہو۔ تم نیلم کے قصرِ عالی شان میں فروکش ہو جہاں دنیا کی ہر نعمت تمہارے اشارے پر حاضر کر دی جاتی ہے۔ ہمارے پاس دولت کے انبار ہیں۔"
وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگی "یہ سب تو ٹھیک ہے۔"
میں نے کہا "دولت تو رب نواز کے پاس شاید ہم سے زیادہ ہی ہو گی مگر ایک چیز اس کے پاس نہیں ہے۔ جس پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ وہ ہے ہمارا کردار۔ ہم سب کو کوئی پچھتاوا نہیں ہے کیونکہ ہمارے قول و فعل میں نیک نیتی ہے۔ اچھا اب اٹھو' خدا کے لیے اور کھانا لگاؤ۔ ورنہ میرا دم نکل جائے گا بھوک سے۔ رات کا ایک بجنے والا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔"
کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ بولتی رہی۔ "پتا نہیں ایسے کب تک گزرے گی میری زندگی۔ کب تک میں اس عالی شان محل میں قید رہوں گی' کسی شہزادی کی طرح۔ میں تو عاجز آ گئی ہوں' اپنی تنہائی سے۔ سارا دن میں اکیلی اِدھر سے اُدھر بھٹکتی رہتی ہوں۔ آدمی کتنا وقت ٹی وی کے سامنے گزارے۔ کتنی دیر سوئے' دماغ میں اِدھر اُدھر کے پریشان کرنے والے خیالات کی یلغار رہتی ہے۔ اس لیے کہ کام کوئی نہیں۔ باتیں بھی کروں تو کس سے کروں۔ بانو خالہ ہیں تو ان کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بن بلائے مہمان کی طرح ان پر مسلط ہوں۔ وہ مجھے برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوتیں تو مجھے نکال باہر کرتیں۔"
میں نے ہنس کے کہا "برداشت تو وہ مجھے بھی کر رہی ہیں۔ نیلم کا میرے ساتھ حسنِ سلوک انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"
"گھر کے نوکر بھی زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کا رویہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ لگتا ہے وہ نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہے ہیں کہ آخر کب تک قیام فرمائیں گی آپ اور آپ ہیں کون؟ کہاں سے اچانک نمودار ہو گئے ہو تم سب لوگ نیلم سے اپنائیت کا رشتہ جوڑنے۔ یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔ ان بے چاروں کی کیا اوقات کہ ایسا سوچیں۔"
"اور فرق کیا پڑتا ہے ان کے کچھ بھی سوچنے سے۔"
"ہاں۔ میں بھی پروا نہیں کرتی۔ لیکن اپنے اکیلے پن سے تو نجات نہیں۔ نیلم آتی ہے آدھی رات کے بعد۔ پھر صبح دیر تک سوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے میں بھی رات بھر جاگنے لگی ہوں۔ رات ایک دو بجے کھانا کھا کے نیند فوراً کہاں آتی ہے۔ اس کے بعد ہم چائے یا کافی پی کے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ دن کا زیادہ وقت میں سو کے گزارتی ہوں۔ پھر رات کو نیند کیسے آئے۔ نیلم تو پہلے ہی بے خوابی کی مریض ہے۔ وہ نیند کی گولیاں کھا کے سوتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں مجھے بھی عادت نہ پڑ جائے۔"
"عادت۔ یعنی تم کھانے لگی ہو کبھی کبھی؟"
اس نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔ "ایک دو بار کھانی پڑیں مگر مجھے معلوم ہے کہ عادت کیسے بنتی ہے۔ ضرورت بالآخر مجبوری ہو جاتی ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ انقلاب بھی۔ کہاں وہ زمانہ کہ میں ہر جگہ' ہر وقت سو جاتی

تھی۔ اس وقت ذہن فکروں سے آزاد تھا۔ اعصاب پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تمہاری مشکل کا کوئی حل نکالتے ہیں۔"

وہ بولی "بس تم مجھے یہاں سے نکالو۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ میں تمہارے ساتھ' تم سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے اور رب نواز کے خوف سے مجھے ساری زندگی ایسے ہی چھپ کے گزارنی پڑے' کسی زیرزمین تہ خانے میں' کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ہر وقت ڈرتے ڈرتے کانپتے اور فرار ہوتے' چھپ چھپ کے جیتے عمر گزرے تو یہ بھی کوئی جینا ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ میں رب نواز کو مار کے خود کو قانون کے حوالے کردوں۔ پھانسی چڑھ جاؤں یا لوٹ جاؤں اپنی پچھلی زندگی کی طرف۔"

سونی کا مسئلہ سنگین ہوگیا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی مریضہ بننے لگی تھی۔ اس کا یہ ردِعمل بالکل فطری تھا۔ اس کی جگہ میں یا کوئی اور ہوتا تو ایسا ہی سوچنے لگتا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ چند دن اور انتظار کرے پھر اس کی یہ قید تنہائی ختم ہوجائے گی۔ وہ ہمارے ساتھ زندگی کی تمام مصروفیات میں بھرپور طریقے سے شریک ہوسکے گی۔

"چند دن بعد کیا ہوگا؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں خود بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اب تمہارا اس گھر میں رہنا نیلم کے لیے خطرے کا سبب بن گیا ہے۔ رب نواز کا شک برقرار ہے کہ تمہیں نیلم نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس کا یہ شک رفع ہوجانا چاہیے اور یہ کام خود نیلم کرسکتی ہے۔ تمہارے نکل جانے کے بعد وہ کسی طرح رب نواز کو موقع فراہم کرے کہ وہ اپنی تسلی کرسکے۔ میں تمہیں یہاں سے شفٹ کردوں گا۔"

"جب طے کرلیا ہے تو پھر چند دن بھی انتظار کیوں؟"

میں نے کہا "رئیس خانہ بڑی محفوظ جگہ تھی ہم سب کے لیے مگر اس کی تباہی بھی ہماری وجہ سے ہوئی۔ میں نے اور رئیس نے سمن آباد میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا اور اسے فرنش کرکے رہائش کے قابل بھی بنالیا تھا۔ بدقسمتی سے رئیس حالات کی سازش کا شکار ہوگیا۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ بہت جلد اس کی ضمانت پر رہائی ہوجائے گی۔ فی الحال تمہیں اس گھر میں شفٹ نہیں کیا جاسکتا۔"

"کیوں۔ وہاں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں میں؟"

میں نے کہا "ہاں' مگر میں چند دن کے لیے لندن جارہا ہوں۔ اگر سیٹ مل گئی اور ویزا لگ گیا تو آج یا کل تک میں نکل جاؤں گا۔ میرے لندن جانے کا مقصد تم سے پوشیدہ نہیں۔ میرے واپس آجانے کے بعد ہم یقیناً اس گھر میں رہ سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے' فرید عباسی اور رخشی کا گھر۔ ان کے ساتھ تمہارا رہنا کسی کے حق میں اچھا نہیں ہوسکتا۔ نہ تمہارے لیے' نہ ان دونوں کے لیے۔ ان کو اپنی زندگی سکون اور عافیت کے ساتھ گزارنے دینا چاہیے۔ میرے کچھ پلان ہیں۔ لندن سے واپس آکے میں اپنا بزنس اور آفس سیٹ کروں گا۔ جگہ دیکھ لی ہے شبنم نے اور دو چار دن میں ڈیل بھی ہوجائے گی۔ واپس آکے میں دیکھوں گا کہ تمہارے لیے وہاں کوئی کام نکل سکتا ہے یا نہیں۔"

وہ خوش ہوگئی "آفس کا کوئی کام مجھے آتا تو نہیں مگر تم سکھا دینا۔ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں میں۔"

"ورنہ جھاڑ پونچھ کا کام تو کرہی لوگی" میں نے کہا "دوسرا پروگرام ہے یتیم خانے کے پروجیکٹ کا۔ وہ میں رخشی اور فرید عباسی کے سپرد کروں گا۔ فرید وکیل ہے اور اس نے ابھی اپنا ایک آفس کھولا ہے۔ پھر بھی وہ باہر کے مسائل دیکھ لے گا۔ انتظامی امور میں تم رخشی کے ساتھ مل کے کام کرسکتی ہو۔"

وہ اور خوش ہوئی "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "تیسری صورت یہ ہے کہ جب میں لندن سے واپس آؤں تو اسپتال کی توسیع کے کام میں تمہیں ڈاکٹر کمال کے سپرد کردوں۔ وہاں قمر تمہارا خیال رکھے گی۔ وہ بڑی محفوظ جگہ ہے۔"

"یہ تو سب سے اچھا ہوگا... لیکن..." اس کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑگیا۔

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

"میں یہ سب کروں گی کیسے؟"

میں نے ہنس کے کہا "ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم برقع اوڑھ لو اور ایسے کام کرو جیسے ایرانی عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں کررہی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تمہارا چہرہ اور حلیہ ہی نہیں' تمہاری شناخت بدل دی جائے۔ بھیس بدل کے کوئی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں بھی اب ناصر عظیم کی شناخت قائم کررہا ہوں۔ شاہ عالم کو میں نے زندہ رکھا تھا۔ اب اس کا وجود مٹانا ضروری ہے۔ تم سونی کا وجود مٹادو۔"

وہ سوچنے لگی "یہ ہوسکتا ہے۔ اگر میرا نام بدل جائے۔"

میں نے کہا "تم نے شناختی کارڈ بنوایا ہے اپنا؟"

"نہیں' کیسے بنواتی۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "اب بنوالیں گے۔ پھر تم سونی نہیں رہوگی۔ اگر ڈرائیونگ لائسنس اور پاسپورٹ بھی ہوں گے تو تمہاری شناخت پکی ہوجائے گی۔ تم دو چار بار لندن یا باہر کے کسی ملک کا چکر لگالوگی تو اطمینان سے کہیں بھی کام کرسکوگی۔"

"کہاں... ؟لندن میں...؟" وہ EXCITED ہوگئی۔

"ہاں ہاں' لندن میں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بھی مجھے آفس کھولنا پڑے گا۔ اس کے بعد رب نواز ڈھونڈتا پھرے تمہیں اور پولیس تلاش کرتی رہے پاکستان میں۔ تم ٹھاٹ سے لندن میں آفس کی منیجر بن کے رہنا۔ ساری دنیا گھومنا رئیس کے ساتھ۔"

وہ خوابوں میں کھوگئی "رئیس کے ساتھ؟"

"میرا مطلب ہے۔ آخر وہ بھی تو میری ذمّے داریوں میں شریک ہوگا۔ میں اور تم... رئیس اور شبنم۔ فرید عباسی اور رخشی۔ ہم سب جو کریں گے مل کے ہی کریں گے۔ قمر اور کمال بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

"اور چندا؟" سونی نے سوال کیا۔

"چندا! ہاں' وہ بھی ہوگی اگر چاہے گی۔" میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"وہ کیوں نہ چاہے گی آخر؟" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "باقی سب کے بارے میں جتنے یقین کے ساتھ کوئی بات کرسکتا ہوں۔ اتنے یقین کے ساتھ چندا کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا راستہ الگ کرلے' کرہی چکی ہے وہ۔"

سونی نے کہا "ناصر۔ یہ سب جو تم نے ابھی کہا' کیا ایسا ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "پاگل۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اب تم بھول جاؤ ساری پچھلی باتوں کو اور اپنے مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سوچو۔ تم کہہ رہی تھیں ناکہ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ دیکھو کتنا اچھا مستقبل ہے تمہارا۔"

"کہیں تم مجھے بہلانے کے لیے خواب تو نہیں دکھا رہے ہو؟"

میں نے کہا "چند دن میں سب سامنے آجائے گا۔ شبنم کے بھی اپنے پلان ہیں۔ وہ اس اخبار کو پاکستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا اور جدید ترین اخبار بنانا چاہتی ہے۔ میرے بزنس' یتیم خانے یا اسپتال کے بارے میں تم شبنم سے بھی پوچھ سکتی ہو۔ رخشی سے بھی اور خود سے بھی۔ میں نے کوئی شیخ چلی والا منصوبہ نہیں بنایا۔ کتنے OPTIONS ہیں تمہارے لیے۔ میرا امپورٹ' ایکسپورٹ کا بزنس۔ شبنم کا اخبار۔ ڈاکٹر کمال کا اسپتال یا وہ یتیم خانہ۔ جس کام میں دلچسپی ہو' کرو۔ کام الگ الگ ہیں مگر ہم سب ایک ہیں۔ اس ٹیم میں تمہاری اہمیت کسی سے کم نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں' دو بجنے والے ہیں۔ تمہاری نیلم کا تو کچھ پتا نہیں۔"

فون کو جیسے میرے اس جملے کا انتظار تھا۔ گھنٹی بجنے لگی تو سونی نے ریسیور اٹھالیا "بڑی لمبی عمر ہے آپ کی شبنم باجی۔ آپ کا نام لیا ہی تھا ابھی ناصر نے۔ جی... اچھا سوری' یہ لیں بات کریں" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے آہستہ سے کہا "شبنم ہے۔"

میں نے اس سے ریسیور لے لیا "فراغت ہوگئی تمہیں؟"

اس نے طنز سے کہا "میری چھوڑو' اپنی بات کرو۔ تمہیں کب فراغت ہوگی نیلم کے انتظار سے۔ شبِ فرقت کی سحر ہونے والی ہے۔"

میں نے کہا "میں نکل ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔"

"اب تو یہی کہوگے" اس کے لہجے میں ناراضی سے زیادہ تلخی تھی "میں دیکھ رہی ہوں کہ میرے ساتھ تمہارے رویے میں کتنی بے اعتنائی آرہی ہے۔"

"بے اعتنائی! کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ میں سب کچھ بھول کے تمہیں دیکھنے پہنچا تھا؟" میں نے خفگی سے کہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن انتظار نہیں کیا میری واپسی کا۔ اور پلٹ کے خبر بھی نہیں لی؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کررہی ہو تم۔ میں پریس یا پبلک کے سامنے آنے سے گریز کررہا ہوں۔ وہاں پولیس آجاتی تو میرے لیے مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے رسک لیا۔"

"بڑی مہربانی جناب کی۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تمہارے ساتھ خدانخواستہ کوئی سیریس معاملہ نہیں ہوا۔ تم خود اپنے اسٹاف کو اسپتال لے کرگئی تھیں۔"

"یعنی اس کے بعد تمہارا مجھ سے مل کے میرا حال پوچھنا ضروری نہیں رہا تھا؟" وہ اسی تند لہجے میں بولی "میں ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتی۔ الماری میرے پاؤں پر گری تھی۔ میرا ایک بازو شل ہورہا ہے اور میں کتنی اپ سیٹ تھی۔

اس کی فکر نہیں تھی تمہیں؟ تمہارا فرض نہیں تھا مجھے تسلی دینا؟ مجھے مورل سپورٹ کی ضرورت تھی۔ میں نفسیاتی طور پر اتنی خوف زدہ تھی۔"

میں نے کہا "او کے۔ آئی ایم سوری۔ دراصل گزشتہ رات یہاں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔"

"چنانچہ تم پہنچ گئے نیلم سے اظہارِ ہمدردی کرنے۔ اور کیوں نہ جاتے۔ برسوں کا ساتھ ہے۔ ایک تمہی تو ہو اس کی دلجوئی کرنے والے۔"

میں نے جھنا کے کہا "شبنم۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔"

اس نے ترخ کے جواب دیا "میں نہیں۔ پاگل تمہاری چندا ہو رہی ہے تمہارے لیے۔ ایک ایک سے پوچھ رہی ہے تمہارے بارے میں۔ اچھی فلمی مثلث ہے یہ بھی۔ تم جاگ رہے ہو نیلم کے لیے۔ چندا جاگ رہی ہے تمہارے لیے اور میں جاگ رہی ہوں۔ خوف نے میرے اعصاب کو منتشر کر دیا ہے۔ دہشت سے میں سو بھی نہیں سکی۔ میری فکر کسی کو نہیں ہے" اس نے ہسٹریا میں چلانا اور رونا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "اچھا میں آ رہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ تم اب باتوں سے بے وقوف نہیں بنا سکتے مجھے۔ میں جا رہی ہوں اور تم بھی جاؤ رنگ رلیاں منانے اپنی چندا کے ساتھ لندن۔"

غصے اور صدمے کے باوجود میں نے ضبط سے کام لیا "کون الو کا پٹھا جا رہا ہے چندا کے ساتھ لندن؟"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ چیخ کے بولی "ہم سب کو دھوکا دیتے رہے ہو تم۔ ہم سے تم نے کیا کہا تھا کہ لندن جانے کا مقصد کیا ہے؟"

"کیا کہا تھا' سب کو اچھی طرح معلوم ہے" میں نے بھی چلا کے کہا۔

"نہیں' یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے تم۔ سب سے غلط بیانی کی تم نے کہ چندا تم سے نفرت کرتی ہے اور تم اس سے متنفر ہو۔ لیکن دوسری طرف تم اس سے چھپ چھپ کے ملتے رہے۔ دوغلے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن یہ فطرت بن گئی ہے تمہاری۔ تم بیک وقت شاہ عالم اور ناصر عظیم ہونے کا دلچسپ کھیل ہم سب کے ساتھ بھی کھیل رہے ہو اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "شبنم۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں تمہیں وہاں آ کے ماروں گا۔"

"ہاں۔ اور کر بھی کیا سکتے ہو تم۔ لیکن کیا اس سے وہ سچائی بدل جائے گی جو مجھے معلوم ہو گئی ہے۔"

"کیسی سچائی؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ خدا کے لیے مجھے بھی کچھ سمجھاؤ شبنم۔ تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اب تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ چندا نے مجھے سب بتا دیا ہے" وہ سخت زہریلے لہجے میں بولی۔

"کیا بتا دیا ہے' یہ تو بتا دو۔"

"یہی کہ تم دونوں ایک ساتھ لندن جا رہے ہو۔ تم دونوں اسپتال کے توسیعی منصوبے کے لیے سامان کی خریداری کرنے جا رہے ہو۔ ایک کروڑ روپے کا عطیہ دیا ہے تم نے کمال اسپتال کو۔ ہاسپٹل ایکوپمنٹ کی خریداری کے لیے اور ظاہر ہے یہ پروگرام اچانک ایک دن میں نہیں بن گیا۔ اس کے لیے پلاننگ ہو رہی تھی۔ تم اور ڈاکٹر کمال۔ قمر اور چندا' سب نے مل کے ہر کام کیا ہو گا۔ کوٹیشن مانگی تھیں تم نے۔ پھر سلیکشن ہوا اور اب تم جا رہے ہو ڈیل کو فائنل کرنے لیکن ہم سب سے تم نے کیا کہا تھا؟"

میرا دماغ گھومنے لگا "دیکھو شبنم۔ اس وقت میں فون پر تم کو کیسے سمجھاؤں' مجھے یہ بتاؤ کہ کیا چندا نے فون کیا تھا تمہیں؟"

"ہاں۔ ورنہ مجھے کیا الہام ہوتا کہ تمہارا اصل پروگرام کیا ہے۔ وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسی کیا پریشانی لاحق ہو گئی آدھی رات کو۔ ناصر کی کیا ضرورت پڑ گئی اچانک۔ تب اس نے بتایا کہ اسے پروگرام فائنل کرنا تھا تمہارے ساتھ مل کے۔ کہنے لگی کہ ہم لندن جا رہے ہیں نا۔"

میں نے چندا کو ایک گالی دی "اس سے تو بعد میں نمٹوں گا میں۔ تم یہ بتاؤ کہ اور کیا بکواس کی اس نے؟"

"اس نے وہ سب بتا دیا جو سچ تھا۔ کل رات کو تم وہاں کیا کر رہے تھے آخر؟ جب میں نے تمہیں اس کے ساتھ جاتے ہوئے پکڑا تھا تو تم نے کتنی ڈھٹائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تمہیں چھوڑنے جا رہی تھی۔ تم وہیں تھے مگر کمال نے جھوٹ بول دیا مجھ سے کہ تم وہاں نہیں ہو۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

"جھوٹ کمال نے نہیں بولا تھا" میں نے چیخ کے کہا "اس ذلیل عورت نے بولا تھا' چندا نے۔"

"میں اب متاثر ہونے والی نہیں ہوں ناصر۔ تمہارے رویے میں تبدیلی کی وجہ میری سمجھ میں اسی وقت آ گئی تھی۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ تمہاری محبت میں اب وہ پہلے جیسی وارفتگی اور طلب نہیں رہی۔ وجہ اب معلوم ہو گئی۔"

"شبنم۔ شبنم! خواہ مخواہ غلط فہمی کو دل میں جگہ مت دو۔"

"نہیں ناصر! اب نہ کوئی غلط فہمی ہے نہ خوش فہمی۔ تم نے بڑے خوبصورت لفظوں سے مجھے فریب دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اب تمہارے دل میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ تمہیں شبنم کی نہیں' ایک صحافی کی' ایک ایڈیٹر کی مدد کی ضرورت تھی۔ تم نے مجھے استعمال کیا' پہلے جسمانی طور پر کرتے رہے۔ اب مجھ سے دل بھر چکا ہے تمہارا۔ محبت تم نے ہمیشہ چندا سے کی' تم اسے کبھی بھلا نہیں پائے۔"

جتنا غصہ مجھے شبنم کی باتوں پر آ رہا تھا' اس سے کہیں زیادہ چندا پر آیا تھا جس نے جانتے بوجھتے یہ آگ لگائی تھی۔ کچھ عرصے سے اس نے میرے خلاف اپنے جارحانہ رویے والی پالیسی بدل دی تھی۔ اب وہ مجھے نفسیاتی طور پر محصور کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کئی بار جھوٹ سے میرے اور شبنم کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ اپنے غلط سلوک پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے مفاہمت پر آمادہ ہے اور اپنے ذلت آمیز رویے پر نادم ہے۔ لیکن میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس لطف و عنایت کے پردے میں بھی اپنی شکست کو میری شکست بنانے کی آرزو پنہاں ہے۔

شبنم سے فون پر کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ جس لڑکی کے بارے میں میرا دعویٰ تھا کہ اس کی محبت غیر مشروط' حسد سے بے نیاز اور بے طلب ہے' اس نے ایک دائمی سچائی کو قبول کرتے ہوئے میرے دعوے کی نفی کر دی تھی کہ عورت اپنی محبت میں غیر مشروط ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اپنے محبوب پر مکمل اختیار اور بلا شرکت غیرے اپنا تسلط مانگتی ہے۔ ایسا ہی چندا نے ثابت کیا تھا مگر اس نے اپنے جذبات پر کوئی مصلحت کا پردہ نہیں ڈالا تھا۔ جو کہنا تھا کھل کے کہہ دیا تھا۔ جبکہ شبنم نے اب تک اپنے حسد اور رقابت کے جذبات کو چھپائے رکھا تھا۔ وہ ظاہر یہ کرتی رہی کہ اسے کسی کی پروا نہیں۔ اگر میں شاہ عالم کی طرح اسے چھوڑ کے کسی اور سے شادی کر لوں تب بھی وہ مجھے یکطرفہ طور پر اسی طرح چاہتی رہے گی جیسے کہ پرخشی کی موجودگی میں چاہتی رہی تھی۔ حقیقت ایسی نہیں تھی۔ وہ بھی ایک عام عورت تھی۔ کم سے کم محبت کے معاملے میں۔ چندا کی پیش قدمی نے اسے اذیت پہنچائی تھی اور خطرے کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا مگر وہ میرے رویے سے مطمئن تھی اس لیے خاموش تھی۔ اب غلط فہمی کی بنا پر اسے یہ لگا کہ میرا جھکاؤ پھر چندا کی طرف ہے بلکہ یہ یقین آنے لگا کہ دل سے میں چندا کو کبھی نہیں بھلا پایا تھا۔ تو اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ یہ رقابت کے جذباتی ردِ عمل کی طوفانی لہر تھی جو اسے مخالف سمت میں بہا کے لے گئی تھی۔ جب اس کا زور ٹوٹے گا تو وہ خود ہی اپنے الفاظ پر شرمسار ہو گی۔ اسے احساس ہو گا کہ سوچے سمجھے بغیر اور تصدیق کیے بغیر اس نے یکطرفہ طور پر چندا کی بات کو سچ مان لیا اور مجھ پر الزام عائد کر دیا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں میں ناراض نہ ہو جاؤں۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ چند لمبی گہری سانسیں لیں اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ کیا مجھے ابھی جا کے شبنم کو منا لینا چاہیے یا لندن سے واپسی تک اس سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ تب تک وہ اس جذباتی بحران سے نکل آئے گی اور غصہ جب اترے گا تو ردِ عمل سے پشیمانی کا شکار ہو گی۔

بالآخر عقل کا فیصلہ غالب آیا اور میں نے شبنم سے بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چندا سے بات کرنا ضروری تھا۔ میں نے کمال کے گھر کا فون ملایا۔ سونی سب کچھ سن رہی تھی اور میری حالت سے پریشان بھی تھی۔

اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "کیا مسئلہ ہے آخر۔ مجھے بتاؤ پہلے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "بتا دوں گا۔ پہلے میں اس الو کی پٹھی چندا سے تو بات کر لوں' ہاتھ ہٹاؤ۔"

کمال نے بالآخر فون اٹھا کے ہیلو کہا۔

میں نے کہا "کمال۔ ذرا چندا کو بلا کے لاؤ۔ اس کے پاس تو فون نہیں ہے۔"

"نہیں ہے مگر یہ کیا دورہ پڑ گیا ہے تجھے آدھی رات کے بعد۔ پتا ہے کیا وقت ہوا ہے؟" وہ غنودگی میں بولا۔

"معلوم ہے۔ تو جا اسے جگا اور پکڑ کے لا۔ نہیں تو قبر سے کہہ۔"

"پہلے معلوم ہونا چاہیے مجھے کہ مسئلہ کیا ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو صبح نہیں کی جا سکتی۔" کمال نے ناراضی سے کہا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات۔ اس نے جھوٹ بولا کہ میں اس کے ساتھ لندن جا رہا ہوں۔ شبنم کو بدگمان کیا۔"

"بدگمانی کی اولاد" کمال نے مجھے ایک گالی دی "ایسی کی تیسی تیری اور شبنم کی" اور فون ایک طرف رکھ کے سو گیا۔

میں نے پھر نمبر ڈائل کیا تو فون "ٹوں ٹوں" کی ٹون دیتا رہا۔ میں

نے غصے میں فون پٹخا اور کھڑا ہو گیا۔ "سونی میں جا رہا ہوں۔"

وہ بولی "تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے۔ شاید نیلم باجی آجائیں۔"

میں نے کہا "میں نیلم کے لیے ساری رات نہیں جاگ سکتا۔ اس کا کیا ہے وہ صبح تک نہ آئے۔ ویسے بھی میں تمہیں ایک بات سمجھانے کے لیے آیا تھا۔"

"تم اس وقت جاؤ گے کیسے؟"

میں نے غرا کے کہا "تم فکر مت کرو۔ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا جاؤں گا۔ گاڑی ہے میرے پاس۔"

وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا دماغ شبنم کی وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت میں سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ میں کسی سے بھی لڑ سکتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت پہلے چندا کے پاس جا کے اسے خوب سناؤں۔ پھر شبنم کو اتنا بے عزت کروں کہ وہ رو پڑے اور مجھ سے معافی مانگے۔ ایک نے جھوٹ بولا تھا اور دوسری نے اس پر یقین کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

جیٹ فائٹر گاڑی کے ڈیک پر پنجابی ڈسکو بھنگڑا سن رہا تھا۔ میں نے اسے بہت ڈانٹا۔ "یہ کیا واہیات موسیقی سنتے ہو تم۔ بھنگڑا لوک رقص ہے اور پنجاب کی عوامی موسیقی کا ڈسکو سے کیا رشتہ۔ یہ تو اتنی ہی بے تکی بات ہے جیسے بریانی کا کیک بنایا جائے اور قورمے کی پڈنگ۔"

اس نے دبے دبے لہجے میں کہا "سوری سر!" اور ٹیپ آف کر دیا "آپ شاید بھول گئے مجھے نیلم سے ملوانا۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو' میں اتنا بھلکڑ ہوں۔ نیلم ابھی شوٹنگ سے نہیں لوٹی ہے۔ میری ملاقات نہیں ہوئی اس سے تو تمہیں کیسے ملواتا؟"

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر لگا دیا اور سوچنے لگا کہ آخر میں ایسے کیوں BEHAVE کر رہا ہوں۔ شبنم نے چندا کے جھوٹ کو سچ مان لیا اور جذباتی ہسٹریا میں مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں تو اس سے کون سی قیامت آ گئی۔ جب صورتِ حال واضح ہو گی تو شبنم کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور چندا مزید ذلیل ہو گی۔ ایسی چھوٹی موٹی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن ان سے زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔

ہوٹل پہنچنے تک میرے دماغ کا آتش فشاں سرد پڑ چکا تھا۔ میں نے جیٹ فائٹر سے معذرت کی "میں MENTALLY کچھ ڈسٹرب تھا" میں نے کہا اور پھر اسے تحفۂ حسنِ کارکردگی کے طور پر سو روپے انعام میں دیے۔

ہوٹل کے اسٹاف نے مجھے مسکرا کے ویلکم کیا۔ میرے مہربان اور شناسا اسسٹنٹ منیجر نے مجھے بڑی رازداری سے مطلع کیا "آج بھی لوگ آپ کی تلاش میں پریشان ہوتے رہے اور پریشان کرتے رہے۔"

میں نے کہا "کیا بہت لوگ آئے تھے؟"

وہ بولا "وہی میڈیا کے لوگ تھے سر۔ زیادہ تر کو میں پہچانتا ہوں۔ انہیں ٹالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کچھ ہمیشہ بیک ڈور سے انفارمیشن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویٹرز سے یا ان مہمانوں سے جو ہوٹل میں مقیم ہیں' آپ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ دراصل آج آپ کا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے ایک اخبار میں۔"

میں نے کہا "ہاں' وہ ایک مصیبت پیچھے لگ گئی تھی۔"

وہ مسکرایا "وہ مصیبت یہاں تک آپ کے پیچھے آئی تھی سر!"

میں نے ناگواری سے کہا "وہ فرزانہ علی' ایڈیٹر روزنامہ خبردار؟"

"یس سر۔ ان کا اصرار تھا کہ انہیں ملنے والی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ آپ کی پارٹی نے ایک وائس چیئرمین ہیں مسٹر قریشی' آپ نے خود انہیں بتایا تھا کہ آپ کا قیام یہاں ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"خاتون نے یہ بھی کہا کہ آپ نے انہیں فون کیا تھا اور اس نے ایکس چینج سے معلوم کرا لیا تھا کہ کال یہاں سے کی گئی تھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "اچھا! بڑی EFFICIENCY ہے بھئی۔"

"میں تو سمجھ گیا تھا سر کہ وہ بلف کھیل رہے ہیں میرے ساتھ۔ میں نے رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیا کہ آپ خود ملاحظہ فرما لیں۔"

"اور اگر وہ دیکھ لیتی.... پھر...."

"کیسے دیکھ لیتی سر۔ وہ پچھلے مہینے کا رجسٹر تھا۔ اس نے بس تاریخ دیکھی اور مہمانوں کے نام پر انگلی رکھ کے صفحے پلٹتی گئی۔"

"وہ چالاک عورت ہے۔ شاید اس نے ہر اچھے ہوٹل میں ایسے ہی ڈراما کیا ہو گا۔"

"یہاں سے انہوں نے ایک دو جگہ فون بھی کیے اور اس کی موجودگی میں ہی کسی نے فون پر کہا کہ وہ وزارتِ داخلہ

کا اسسٹنٹ سیکریٹری وقار احمد ہے اور اسے ایک شخص شاہ عالم کے بارے میں انفارمیشن چاہیے۔ وہ ایک سابق سیاست داں ہے جو متعدد مقدمات میں ملوث تھا اور فرار ہو کے لندن چلا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ سر ہم ٹیلی فون پر کچھ نہیں بتا سکتے۔ آپ آفیشلی پوچھیے یا خود یہاں آ کے معلوم کیجیے۔ بات یہ ہے سر کہ فون پر تو کوئی کچھ بھی کہہ سکتا ہے خود کو۔ کہ وہ کمشنر ہے یا گورنر ہے۔ فرزانہ سخت مایوس ہوئی۔"

میں نے کہا "آپ نے بڑی ڈپلومیسی سے کام لیا' تھینکس۔"

وہ بولا "شام کو مسٹر قریشی کا فون بھی آیا تھا سر۔ اور کوئی شمس صاحب بھی پوچھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے ہر ہوٹل سے پوچھ رہے ہیں لوگ اپنے اپنے طور پر۔ ہم نے ابھی تک مکمل رازداری برتی ہے سر' لیکن...."

میں نے کہا "لیکن یہ آسان نہیں ہو گا۔"

"اتنے لوگ آپ کو آتے جاتے دیکھ رہے ہیں اور پھر اسٹاف کے سو فیصد لوگوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خریدے نہیں جا سکتے۔ اگر یہ راز کسی وجہ سے فاش ہوا تو قصوروار مجھے نہ سمجھیں آپ۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ کل تک میں بھی چلا جاؤں گا۔"

اس نے کہا "کسی ٹریول ایجنسی سے مسٹر صدیقی بھی آئے تھے۔ وہ صبح دس بجے پھر آئیں گے۔"

تھکن سے میرا برا حال تھا۔ یہ تھکن جسمانی بھی تھی اور ذہنی بھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ گرم پانی سے شاور لینے کے بعد میرے کشیدہ اعصاب خاصے پُرسکون ہو گئے اور کپڑے بدل کے میں بیڈ پر گرا تو کسی چندا یا شبنم کا خیال آنے سے پہلے مجھے نیند نے آ لیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ منیجر نے بڑے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا "مسٹر فرید عباسی بات کرنا چاہتے ہیں سر۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی ہدایات کیا ہیں مگر انہوں نے کہا کہ ہدایات کو گولی مارو اور اگر وہ سو رہے ہیں تو انہیں بھی گولی مار کے اٹھا دو۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو دس بجنے والے تھے "ٹھیک ہے بات کرا دو۔"

فرید عباسی غصے میں بھرا ہوا تھا "جتنی گالیاں دینی ہیں وہ میں بالمشافہ دوں گا۔"

میں نے کہا "زہے نصیب۔ لیکن آپ اتنے فارغ کیوں ہیں آج؟"

وہ بولا "اچانک کورٹ میں وکیل اسٹرائیک کر بیٹھے ہیں۔ آج کوئی سماعت نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھا ہوا تو فوراً آ جا۔ مجھے بھی بہت سے معاملات پر بات کرنی تھی۔"

"میں نے سوچا کہ آنے سے پہلے بتا دوں۔ کہیں تو نکل گیا کل کی طرح تو میں کہاں ڈھونڈوں گا۔ کل آدھی رات تک دس بار فون کیا اور ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ ابھی نہیں آئے۔ آج بھی صبح نو بجے سے کوشش کر رہا تھا۔ میں آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔"

اس کے آنے سے پہلے ہی ٹریول ایجنسی کا نمائندہ صدیقی حاضر ہو گیا "یو آر ویری لکی سر۔ عام طور پر اتنے کم وقت میں ویزے اور فلائٹ کنفرمیشن کا کام ہوتا نہیں۔ جو ہم نے آپ کے لیے کر دکھایا۔"

میں نے کہا۔ "پھر اس میں میری لک کا کیا سوال۔ یہ تو تمہارا کارنامہ ہوا۔"

"کل رات ہو گی آپ کی فلائٹ اسلام آباد سے۔ ساڑھے بارہ بجے اور اس کے لیے آپ کو دس بجے ائرپورٹ پہنچنا ہو گا سر!" اس نے اپنا بریف کیس کھولا "اب یہ فرما دیں کہ لاہور سے اسلام آباد کیسے جانا پسند کریں گے۔ بائی ائر یا کار سے۔ ایک اوپن ٹکٹ ہے۔"

میں نے کہا "پھر میں ہوائی جہاز سے ہی جاؤں گا۔"

"ویری گڈ سر! ہمارا نمائندہ آپ کو ائرپورٹ پر ملے گا۔ آپ کے سارے ڈاکومینٹس ہوں گے اس کے پاس۔ ساری FORMALITIES وہ پوری کر دے گا۔ اگر لندن میں آپ کو کوئی بھی پرابلم ہو۔"

میں نے کہا "نو.... تھینکس۔ میں لندن سے پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں لیکن ایک کام ہے۔"

"یس سر!"

میں نے کہا "یہ معلوم کرو کہ آج رات لندن جانے والوں میں مس چاندنی خان نام کی کوئی خاتون ہیں؟"

اس نے فون اٹھا لیا "میں ابھی بتاتا ہوں۔"

میں جتنی دیر میں غسل سے فارغ ہوا اور کپڑے بدل کے اپنے لیے ناشتے کا آرڈر دیا اتنی دیر میں فرید عباسی بھی آ گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چندا کا نام لندن کی پسنجر لسٹ میں نہیں ہے۔

کافی پیتے ہوئے فرید نے مجھے غور سے دیکھا "بہت مایوسی ہوئی آپ کو یہ جان کر کہ وہ آپ کی ہم سفر نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا "کیا شبنم نے تیرے کان بھرے ہیں؟"

"تو بتا یہ سچ ہے یا غلط؟"

میں نے کہا "کیا سچ ہے' یہ کہ میں چندا کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لندن جا رہا ہوں؟"

"میں نے رنگ رلیاں منانے کی بات نہیں کی" وہ بولا۔

"اس نے تو کی تھی۔ میری ایک نہیں سنی۔ چندا کی بات پر اتنی آسانی سے یقین کر لیا۔ میں یقین دلا رہا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے تو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ پتا نہیں کیا کیا بکتی رہی غصے میں۔ تم چندا سے محبت کرتے ہو' چھپ چھپ کے ملتے ہو۔ اسے دل سے نکال نہیں پائے۔ مجھے دھوکا دیتے رہے۔"

فرید خاموشی سے سنتا رہا۔ "سچ کیا ہے؟"

میں نے کہا "چندا جا رہی ہے لندن مگر میرے ساتھ نہیں۔ ایک بڑی نیک دل' نیک سیرت اور نیک نیت خاتون ہیں۔ کوئن ہے اس کا نام۔ شروع سے وہ کمال کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کے شوہر کو میں کنگ ایڈورڈ کہتا ہوں۔ چندا جا رہی ہے ایڈورڈ کے ساتھ۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا اور کمال نے بھی کہ تم ساتھ چلے جاؤ۔"

"کیونکہ تم DONOR ہو۔"

"کیونکہ میں ڈونر ہوں' رائٹ۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ میری کمٹ منٹ مالی ضرورت پوری کرنے کی حد تک تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی اور سچی بات تو یہ ہے کہ چندا نہ جاتی تو میں کمال کی بات مان لیتا۔ میں ویسے بھی لندن جا رہا تھا۔ مجھے وہاں کے بزنس CONTACTS سے بہت مدد ملتی اور میں یہ کام کر سکتا تھا۔ شاید چندا سے بہتر طور پر کر سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ابھی یہ پتا چلتا کہ کل رات چندا بھی اسی فلائٹ پر ہوگی تو میں اپنی سیٹ کینسل کرا دیتا۔"

فرید نے غور فرما کے کہا "آخر جھوٹ کیوں بولا چندا نے؟"

"یہ آپ چندا سے پوچھیں۔ پہلے بھی ایسے کئی جھوٹ بول کے اس نے مجھے شبنم سے اور شبنم کو مجھ سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ کمال کہتا ہے کہ میری وجہ سے وہ ایک نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ڈراما کرتی ہے۔ اپنی مظلومیت کا پرچار کرنے کے لیے۔ مجھے TORTURE کرنے کے لیے۔ اور اب اس نے ایک نیا گیم شروع کیا ہے۔ وہ اچانک بڑی FRIENDLY اور بہت نارمل ہو گئی ہے۔ انتہائی COMPROMISING جیسے کہ ہمارے درمیان کوئی کشیدگی یا جذباتی خلیج تھی ہی نہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو کیا یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ ایک مثبت تبدیلی ہے۔" فرید بولا "تیرا REACTION بھی اتنا ہی POSITIVE ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "تو سمجھتا ہے یہ REAL ہے۔ یعنی واقعی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے؟ کہ میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ..."

"چلو توبہ تو کی۔ اب تو بھی ذرا شرافت سے کام لے۔ اتنا الرجک ہونے کی ضرورت نہیں چندا سے۔ وہ بہرحال ایک جذباتی صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ تیری مدد اہم ہے کیونکہ تو اس کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ جذباتی طور پر' اس کا دوست' غمگسار' ساتھی' محبوب سب کچھ تو ہی تھا۔ اب اگر شبنم نے اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے' کسی بھی وجہ سے۔"

میں نے کہا "خود چندا کے رویے کی وجہ سے ایسا ہوا۔"

"چلو' کسی وجہ سے بھی ہوا لیکن وہ سنبھلنا چاہتی ہے۔ اب اس کا دادا کرنل خان بھی نہیں ہے جو اس کے لیے ماں باپ' بہن بھائی اور سارے رشتوں کا نعم البدل تھا۔ تو اسے کون سہارا دے گا؟ وہ تیری طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہے اور تو جھٹک دے گا تو کیا ہوگا؟"

"اسے احساس ہو جائے گا اپنی غلطی کا۔"

"یعنی اب آپ اس سے انتقام لیں گے۔ اس نے زیادتی کی آپ کے ساتھ تو اب آپ زیادتی کریں گے اس کے ساتھ؟" فرید خفا ہونے لگا۔

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"تو پھر کیا بات ہے؟ تیری وجہ سے تو اس سے نفرت کرنے لگی ہے کیونکہ وہ تیری بہن ہے اور ایک روایتی نند کے جذبات رکھتی ہے۔ اس تمام عرصے میں ایک ڈاکٹر کمال کا رویہ قابلِ تعریف تھا۔ اس نے پوری طرح چندا کو سپورٹ کیا اور اس نے ہمدردی کو ترجیح دی۔ رئیس خان کسی شمار و قطار میں نہیں۔ آپ نے تو محض نفرت کے جواب میں نفرت کی۔ یہ سمجھے بغیر کہ چندا کا ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔ تیرے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا "یار' میں مانتا ہوں مگر اب مجھے یقین نہیں کہ وہ واقعی شرمندہ ہے۔ یہ اس کی نئی چال ہو سکتی ہے۔"

"یہ ذہنی تعصب ہے۔ تو دیکھ کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا کرتی ہے۔ پہلے سے طے مت کر کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا "یار' میں پھر کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"تو کسی مشکل میں نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ہو سکتا ہے تیری مدد سے اس کی مشکل زندگی آسان ہو جائے۔ یار' کتنے سال تم ایک ساتھ صرف ایک دوسرے کے لیے تھے۔ پھر یہ اچانک غیریت اور بے گانگی بلکہ دشمنی چہ معنی دارد۔ کیا اب تم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن کے نہیں رہ سکتے؟ چلو وہ محبت نہ سہی جس کا انجام شادی اور خانہ آبادی پر ہوتا ہے۔ مگر ایک دوسرے کو جتنا تم دونوں سمجھتے ہو اتنا اور کوئی نہیں سمجھتا۔ تم ایک دوسرے کا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اوکے۔ اوکے' میں مانتا ہوں لیکن کل کو میں دو کشتیوں کا مسافر بن کے ڈوب گیا۔"

"ابے ہم بچالیں گے تجھے ڈوبنے سے اور تو ڈوب گیا تو کون سی قیامت آجائے گی دنیا میں۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے' جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں' ادھر ڈوبے' ادھر نکلے' ادھر نکلے' ادھر ڈوبے۔ مگر میں کہاں کا اہلِ ایمان' نہ میرا نام خورشید۔"

اس نے مجھے ڈانٹا "تو جائے گا لندن چندا کے ساتھ اور اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی بے ہودگی' بے وقوفی وغیرہ نہیں کرے گا۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے تیری سپورٹ کی ضرورت ہے تو یہ تیرا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کی مدد کرے۔"

میں نے کہا "اور شبنم کے مسئلے سے کون نمٹے گا؟"

"شبنم ٹھیک ہو جائے گی" اس نے کہا "کچھ تو واقعی غلط فہمی کا معاملہ ہے اور کچھ تو نے اسے HURT کیا۔ رات تک اس کی خبر نہیں لی۔ وہ بہت زیادہ دہشت زدہ ہے ابھی تک۔ مگر ایک بات بہت عجیب ہے۔"

میں نے کہا "اب اس کی ہر بات عجیب ہے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی ہے۔ ایک تو چندا کے نام سے چڑنے لگی ہے' ایسا پہلے نہیں تھا۔"

"اس کا بھی رونا یہی ہے کہ تو پہلے ایسا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اس نے کہا ہوگا کہ میں پھر چندا کی طرف ملتفت ہو رہا ہوں اور اس کے ساتھ بے اعتنائی برتنے لگا ہوں۔ لیکن اصل بات اس نے نہیں بتائی ہوگی تجھے۔"

"اصل بات کیا ہے؟"

"وہ بات ایسی ہے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس نے تجھ سے ضرور کہا ہوگا کہ میں چوری چھپے سارا دن چندا کے ساتھ رہا اور کمال نے جھوٹ بول دیا کہ میں وہاں نہیں ہوں۔ اس نے رات کے وقت مجھے چندا کے ساتھ گاڑی میں جاتے ہوئے پکڑ لیا۔ شاید ہم جا رہے تھے رنگ رلیاں منانے۔"

"ہاں۔ یہ آخری بات چاہے غلط ہو' مگر اس سے پہلے والی بات غلط نہیں۔"

میں نے کہا "برادر' وہ ہے صحافی۔۔۔ خبر کو اور سچ کو اپنی مرضی کے مطابق بدل کے توڑ موڑ کے اور بنا سنوار کے یا بگاڑ کے پیش کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ اسے ANGLING کہتے ہیں۔ تیری رائے کو اس نے قاری کی طرح BIASED کر دیا۔ میں بتاتا ہوں اس رات کیا ہوا تھا۔ یہ ایسی بات ہے کہ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اس نے مجھے چندا سے جھگڑا کر کے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ پہلے تو بحث ہوئی ہماری۔ جب میں نے وضاحت کر دی اور وہ مطمئن ہو گئی تو اس نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سمن آباد والے گھر چلو۔ وہاں کوئی نہیں ہے جو ہمیں روکے' رات ایک ساتھ گزارتے ہیں۔"

فرید دم بخود رہ گیا "ایسا خود کہا اس نے؟"

"ہاں یار۔ اس نے مجھے ورغلایا۔ انگریزی میں کہتے ہیں SEDUCE کیا بہت کھل کے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ اس نے بڑے گھٹیا طریقے پر یہ ظاہر کیا کہ وہ شراب کے نشے میں ہے۔"

فرید اچھل پڑا "شراب۔۔!"

"ہاں شراب۔ میرا تو دماغ گھوم گیا۔ میں نے اس کی خواہش کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ وہ بگڑ گئی کہ تم مجھے ٹھکرا رہے ہو اور اب تمہیں دلچسپی نہیں رہی مجھ میں۔ میرا جسمانی استحصال کر چکے تم۔ اب تمہیں چندا جیسی پاک صاف لڑکی چاہیے۔ میں نے دیا ایک جھانپڑ۔ تو نشے کا ڈراما کیا اس نے اور بعد میں ہنسنے لگی کہ میں تو آزما رہی تھی تمہیں۔ الو کی پٹھی' کیوں آزما رہی تھی مجھے آخر؟"

"تو نے اس سے پوچھا؟"

"پوچھا اور اس نے ادھر ادھر کی باتوں سے مجھے مطمئن کرنے کی فضول سی کوشش بھی کی مگر سچی بات یہ ہے یار کہ اس وقت مجھے نفرت ہو گئی تھی شبنم سے۔ یہ بہت ہی گھٹیا حرکت تھی۔ اور میرے دل میں ابھی تک اس کے رویے کی ایک کسک ہے۔ جب خیال آتا ہے اس حرکت کا تو مجھے لگتا ہے کہ اس میں اور فرزانہ میں کوئی فرق نہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ ۔۔۔ شبنم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح وہ تیری نظر سے گر جائے گی۔"

"اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کمزور غلانے پر خوشی سے دُم ہلاتا اس کے پیچھے چل پڑوں گا۔ اس نے مجھے شاہ عالم سمجھ رکھا ہے۔ شاہ عالم ایسا ہی کرتا تھا۔ مگر میں ناصر عظیم ہوں۔ اس نے یہ مان لیا ہے کہ یہ ناصر عظیم ہی تھا جو شاہ عالم بن گیا تھا اور جب شاہ عالم بن کے زندہ رہنا اس کے لیے مشکل ہوا تو وہ پھر بھاگ کے اپنے ماضی میں چلا اور ناصر عظیم بن کے محفوظ ہو گیا۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس شاہ عالم کی فطرت کیسے بدل گئی۔ اس کے شبنم کے ساتھ جسمانی مراسم تھے۔ نہ شبنم کو کسی کی پروا تھی اور نہ شاہ عالم اسے برا سمجھتا تھا۔ اب اچانک ناصر عظیم ایک باکردار اور باضمیر مخلص بن کے صرف محبت' خالص افلاطونی محبت پر کیسے اکتفا کرتا ہے؟ کچھ دن اس نے صبر کیا یا برداشت کیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ چندا اس کے لیے خطرہ بن رہی ہے تو اس نے ترغیب کا جال پھیلایا اور اس میں خود کو چارا یعنی BAIT بنا کے ڈال دیا۔ مگر شکار قابو میں نہ آیا۔ عورت کتنی تذلیل محسوس کرتی ہے اگر اس کو یوں مسترد کر دیا جائے۔"

فرید کچھ دیر خاموش رہا "یار ناصر۔ ایسی عورت کے ساتھ کیسے گزارا ہو گا تیرا۔ یا سوال کو الٹ لے' اس عورت کا گزارا کیسے ہو گا تیرے ساتھ؟"

میں نے کہا "وہ گزارا کرے گی کیونکہ وہ مجبور ہے۔ شاہ عالم کر چھوڑنا اس کے اختیار کی بات ہی نہیں تھی۔ شاہ عالم اس کی کمزوری تھا۔ مجبوری تھا یا ضرورت تھا۔ ویسے ہی ناصر عظیم رہے گا کیونکہ وہ تو سمجھتی ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے اور اس نے نام بدل کے پھر پرانی زندگی اختیار کر لی ہے۔ وہ ناصر عظیم کو بھی ہر حال میں قبول کرلے گی۔ جیسے اس نے رخشی کے ساتھ قبول کرلیا تھا ایسے ہی مجبوری میں وہ مجھے چندا کے ساتھ بھی قبول کرے گی۔ لیکن اس کی پہلی کوشش یہ ہے کہ چندا کا پتا بالکل کاٹ دے۔ اس کی جگہ بھی خود اپنے پاس رکھے۔ شاہ عالم کی زندگی میں اسے جو ثانوی حیثیت حاصل تھی' ناصر عظیم کی زندگی میں ایسا نہ ہو۔ شاہ عالم کی طرح میں بھی اس کا استحصال کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں کہ چندا کو رخشی کی جگہ دے دوں اور شبنم کو رکھوں اسی پرانی جگہ پر۔ داشتہ کی طرح۔ لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا اور پھر حالات نے خود شبنم کو شریکِ حیات کے مقام پر پہنچا دیا۔ چندا خود میری زندگی سے نکل گئی۔ تو میں کیا کروں؟"

خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ آیا۔ پھر فرید بولا "میرا تو مشورہ یہی ہے دوست کہ حالات کی باگ دوڑ کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش چھوڑ دے۔ یہ مسئلہ اہم ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ اس پر زندگی کے سارے فیصلے قربان کر دیے جائیں۔ یہ معاملہ ٹاس کرنے سے بھی طے نہیں ہو سکتا' اس لیے بہتر ہے کہ سب تقدیر پر چھوڑ دے۔"

میں نے کہا "چل چھوڑ۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ مجھے بتا' رئیس کا سراغ کیسے ملا' وہ کہاں ہے اور کیا حال ہے اس کا؟"

"شکر ہے تجھے اس کا خیال تو آیا۔"

میں نے کہا "طعنے مت دے عورتوں کی طرح۔ رئیس مجھ سے الگ نہیں ہے اور میں جو اس کی طرف سے بے فکر نظر آتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بھول گیا ہوں۔ میں نے وہ سب کیا جو میرے امکان میں تھا اور پھر اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ کوشش نیلم نے بھی بہت کی تو نے اور شبنم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھے سب پر بھروسا تھا۔"

"اسے ایک نجی جیل میں رکھا گیا تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی ایک مخبر نے کی اور میں نے ہائی کورٹ کے بیلف کے ساتھ وہاں چھاپا مارا۔ اب یہ مخبر بھی تو دو غلے ہوتے ہیں۔ ادھر انہوں نے مجھ سے اطلاع کی قیمت وصول کی تو دوسری طرف سے بھی خود کو نمک حرامی کے الزام سے بچا لیا۔ وہ جگہ شیخوپورہ' فیصل آباد کے درمیان ہے اور سڑک سے کافی فاصلے پر ہے۔ ایک ٹیکسٹائل مل کی عمارت ہے جو برسوں سے بند پڑی ہے۔ خالی بیرکس میں سے مشنری وغیرہ سب نکال لی گئی ہے۔ شیڈ جہاں سے مال اتارا اور چڑھایا جاتا تھا' ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ ایک ریلوے لائن بھی لوگ اکھاڑ کے لے گئے ہیں جو اندر تک جاتی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے مالک کروڑوں کا قرضہ ہڑپ کرکے بیرون ملک جا چکے ہیں۔ انہوں نے فیکٹری میں نئی مشینری لگانے اور اس کی توسیع کے لیے سترہ کروڑ کا قرض لیا۔ اس فیکٹری کے اثاثے پیداوار اور گڈ ول کو گروی رکھا گیا۔ اثاثوں کی مالیت کا تعین کرنے والے قومی بینکوں کے کرپٹ افسران تھے۔ انہوں نے تقریباً ایک کروڑ کی رشوت لی اور اثاثوں کی مالیت اصل سے کئی گناہ زیادہ دکھا دی۔ بعد میں مل اونر کو یہ سہولت دی گئی کہ یہاں سے ساری مشینری نکال کے اپنے دوسرے پروجیکٹ میں لگا دے۔ وہ ایک ایک چیز نکال کر لے گئے۔ یہاں ایسبٹوس شیٹ کی چھت والے شیڈ رہ گئے اور خالی بیرکس' زمین اور عمارات کی مجموعی مالیت پچاس لاکھ بھی نہیں بنتی۔ انہوں نے دوسری فیکٹری لگا کے سترہ کروڑ سے ستر کروڑ بنا لیے ہوں گے۔ بینکوں کو قرض کا ایک پیسہ واپس نہیں ملا۔ عدالتی کارروائی برسوں بعد شروع ہوئی اور برسوں بعد اثاثے بحق سرکار واگزار کر لیے گئے۔ قرض لینے والے اپنا سب کچھ بیچ کر اربوں روپے سمیٹ کے کینیڈا چلے گئے اور محفوظ ہیں۔ قرضہ دینے والے فیکٹری کا ڈھانچا لیے بیٹھے ہیں اور ڈھانچا بھی کھنڈر بن رہا ہے۔ اس کے دروازے کھڑکیاں تک غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ خیر' رئیس کو اس کھنڈر میں رکھا گیا تھا اور اس کی نگرانی کر رہے تھے' دو افراد سادہ کپڑوں میں' دو پولیس والے جو تفتیش کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ نہیں پکڑے گئے خبیث!"

"مخبروں نے یہی تو حرامی پن کیا۔ بیلف کے پہنچنے سے ذرا دیر پہلے اپنے آقاؤں کو خبردار کر دیا کہ جنابِ عالی' کسی نمک حرام نے دشمنوں کو آگاہ کر دیا اور وہ پہنچ رہے ہیں عدالت کے بیلف کے ساتھ۔ یہ کم سے کم دو گھنٹے کی مسافت تھی۔ رب نواز نے ڈی ایس پی خورشید کیانی سے کہا کہ وہ کچھ کرے اور اس نے فوراً قیدی کو کہیں اور شفٹ کرنے کے انتظامات کیے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بیلف نے چھاپا مار کے رئیس کو برآمد کر لیا تھا۔"

"بیلف کے ساتھ کون گیا تھا؟۔۔ تو خود؟"

"نہیں' میں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیج دیا تھا۔ جو سادہ کپڑوں والے وہاں رئیس کو حراست میں رکھنے پر اور تفتیش پر مامور تھے وہ بھی بروقت اطلاع ملنے پر فرار ہو گئے۔ رب نواز کو یہ خبر ڈیڑھ گھنٹے پہلے پہنچائی گئی ہو گی تو دونوں پولیس والوں کو شاید دس منٹ پہلے۔ کورٹ کے بیلف کا سن کے ان کو نوکری کی فکر پڑی ہو گی۔ وہ رئیس کی ہتھکڑیاں بھی کھول کے ساتھ لے گئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہوں اور چھپ کے سب دیکھ رہے ہوں۔ بعض اوقات اطلاع جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ شیر آیا۔ شیر آیا' مگر شیر نہیں آتا۔ بیلف کو انہوں نے دور سے آتا دیکھ لیا ہو گا۔ گرد و نواح میں کوئی آبادی نہیں ہے اور قریبی گاؤں ایک میل دور ہے۔ وہاں سے کوئی ادھر کیوں آئے گا۔ وہاں جانی ہوں گی جانی پہچانی گاڑیاں۔ ایک اجنبی گاڑی دیکھتے ہی انہیں بھاگنا پڑا۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ اپنے آقاؤں کو بتاتے۔ ہتھکڑیاں پولیس کی تھیں اس لیے ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ بیلف نے رئیس کو دیکھا تو وہ بالکل آزاد تھا۔ اسے وہ گاڑی میں بٹھا کے واپس چل پڑے۔ بیلف نے جو دیکھا وہی رپورٹ میں لکھا۔ رئیس پولیس کی تحویل میں نہیں تھا۔ ایک ویران مل کے اندر زندہ سلامت موجود تھا۔"

"اور اس کی حالت کیا تھی؟"

"حالت ظاہر ہے کہ اچھی نہیں تھی۔ یہ کوئی اے کلاس قید نہیں تھی اور اس سے پوچھ گچھ بھی کی گئی تھی۔ تفتیش کرنے والوں نے اپنا ہاتھ ذرا ہلکا رکھا تھا اور مارا کم تھا دکھایا زیادہ تھا۔ رئیس ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہے اس نے دونوں کام کیے تھے۔ ان سے سودا بھی کر لیا تھا جس میں نقد انعام کے علاوہ کچھ اور فوائد شامل تھے۔ ان میں سے ایک اپنی پوسٹنگ اپنے علاقے میں چاہتا تھا۔ اوکاڑہ کی طرف کسی گاؤں کے تھانے میں جس کی حدود دس میل میں ہر طرف تھی۔ وہاں اس کی حیثیت کسی وڈے تھانے دار سے کم نہ ہوتی اور اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو لامحدود فوائد حاصل ہوتے۔ ان کی زمین کی طرف بری نگاہ ڈالنے کی ہمت کوئی نہ کرتا لیکن وہ دشمنوں کی زمین پر پٹواری کی مدد سے قبضہ کر سکتے تھے۔ ان کی فصلیں اور عورتیں محفوظ ہو جاتیں۔ وہ باری کے بغیر پانی لگاتے اور مونچھوں پر تاؤ دے کر چلتے۔ مخالفین کو کسی وجہ کے بغیر بھی وہیں ڈک دینے کی تڑی دیتے اور مقامی فیصلوں میں ان کی رائے اہم ہو جاتی۔ دوسرا اپنی پروموشن کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرانا چاہتا تھا۔ رئیس خان نے اپنا تفصیلی تعارف کرا دیا تھا کہ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ آدم خور شیر کا دشمن بھی آدم خور شیر ہی ہوتا ہے۔ کوئی چوہا نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ رب نواز اور ڈی ایس پی میں تو مقابلے کا دم ہے مگر وہ تو حشرات الارض ہیں جو ہاتھیوں کی لڑائی میں پس جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ڈی ایس پی صاحب کی مرضی کے خلاف کیسے جا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اسے اٹھوانے کا مقصد کیا تھا آخر؟"

"وہی پرانا قصہ۔ رب نواز یہ جاننا چاہتا تھا کہ داڑھی والا جن کون ہے جو سونی کے ساتھ آیا تھا اور اس کے بیٹے کو گھر کے اندر سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ کیا وہ چراغ علی ولد باغ علی تھا اور کیا وہی شبنم کا ڈرائیور تھا؟"

"رئیس نے کیا بتایا اسے؟"

"کچھ نہیں' داڑھی والے جن کے بارے میں اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چراغ علی ولد باغ علی کے بارے میں پولیس زیادہ جانتی ہے جس نے اسے پکڑا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔ شبنم کے ڈرائیور کی صورت اس سے کیوں ملتی تھی؟ خدا کی قدرت۔ وہ نہیں جانتا کہ شبنم کے اس ڈرائیور کا کیا نام تھا۔

کہاں سے آیا تھا اور کہاں گیا۔ شبنم اس سے کبھی کبھی ملنے آتی تھی۔ وہ ایک اخبار کی رپورٹر ہے۔ پہلے بھی ملتی تھی جب وہ سیاست میں فعال کردار ادا کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "انہوں نے مورتی کے سر کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ یہ بھی شک تھا رب نواز کو کہ مورتی کا سر رئیس کے پاس ہے اور شبنم اس کا سودا کرا کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اس لیے رئیس خانے میں آگ لگوائی گئی تھی کہ افراتفری میں اس کے آدمی اندر گھس جائیں اور سب دیکھ لیں۔ مورتی کا سر تلاش کریں۔ داڑھی والا جن اندر چھپا بیٹھا ہو تو اسے پکڑلائیں۔ وہ سوتی اور چراغ علی ولد باغ علی کے درمیان کوئی تعلق بھی تلاش کر رہے تھے۔ اپنی ناکامی سے چراغ پا ہو کے انہوں نے رئیس کو پکڑلیا اور اس پر دہرے قتل کا الزام عائد کردیا۔ صرف اسے ڈرانے کے لیے اور قانونی دباؤ ڈالنے کے لیے۔ رئیس نے انہیں کچھ بتا کے نہیں دیا۔ اگر اس کے خلاف ایف آئی آر نہ ہوتی اور مجسٹریٹ سے اس کا ریمانڈ نہ لیا گیا ہوتا تو شاید وہ رئیس کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ بازیابی کے وقت وہ سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ واپسی میں رئیس کو میو اسپتال پہنچادیں مگر ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ انہیں رب نواز کے آدمی ملے۔ بیلف کے ساتھ پولیس گارڈ بھی گئی تھی مگر یہ ڈیوٹی ان کے لیے تو بیگار تھی جس میں کچھ ملنا ملانا نہیں تھا۔ وہ اپنی رائفلوں کا بوجھ ڈھوتے مجبوراً گئے تھے۔ راستے میں چائے تو در کنار پانی تک پینے کو نہیں ملا۔ جب رب نواز کے بندوں نے حملہ کیا تو سب سے پہلے گارڈ فرار ہوئے۔ یہ شور مچاتے ہوئے کہ ڈاکو آگئے' ڈاکو آگئے۔ انہوں نے کافی فاصلے پر جا کے مورچا سنبھالا اور ضابطے کی کارروائی پوری کرتے ہوئے گولیاں بھی چلائیں لیکن ان میں سے ایک بھی ڈاکوؤں کے پاس سے نہیں گزری۔ کورٹ کا بیلف بے چارہ کیا مقابلہ کرتا۔ یہی حال وکیل کا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف ہو گئے۔ حملہ آور ان کو گاڑی میں لے گئے اور رئیس کو بھی۔ وکیل بیلف اور گارڈ سب سڑک تک پیدل گئے۔ وہاں سے ایک بس میں سوار ہو کے لاہور پہنچے تو کورٹ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مجھے رات کو ایس ایچ او کا پیغام ملا کہ آپ کا بندہ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں فوراً تھانے پہنچا تو رئیس حوالات میں موجود تھا۔ انچارج تھانہ نے بڑی مکاری سے کہا کہ ملزم تھانے کی حدود سے باہر نہیں گیا۔ مجسٹریٹ نے سات دن کا جسمانی ریمانڈ دیا تھا۔ ہم تفتیش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس نے اعتراف نہیں کیا اور اس کے خلاف ثبوت بھی کوئی نہیں ملا۔"

"ایف آئی آر فوراً کاٹ دی" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ویسے چوری' ڈکیتی ہو جائے تو سو چکر لگواتے ہیں اور رپورٹ نہیں لکھتے۔ میں سمجھ گیا کہ اب پولیس یہ کھیل ختم کرنا چاہتی ہے۔ رئیس نے کہا کہ اگلی پیشی پر ضمانت کی درخواست منظور ہو جائے گی۔ اور دو چار پیشیوں کے بعد سیشن سے مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ کیس میں کوئی دم نہیں تھا اور اوپر والوں کے دباؤ کی وجہ سے پولیس بھی پریشان تھی۔ رب نواز نے پیغام بھجوادیا تھا کہ بات کو بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کورٹ کے بیلف کو رات کے وقت گھر جا کے ڈرایا دھمکایا گیا۔ اس کی ایک بیٹی کی شادی ہے دو ہفتے بعد۔ اسے کہا گیا کہ تمہارے ہونے والے داماد کو پکڑلیا جائے گا شادی سے پہلے۔ اسلحے یا منشیات کا کیس بن گیا تو بڑا ٹائم لگے گا اسے باہر آنے میں۔ بے چارہ بیلف ڈر گیا۔ ممکن ہے کہ دھمکی کے ساتھ ہی اسے بیٹی کی شادی کے لیے ملک صاحب کی طرف سے کوئی تحفہ بھی بھیجا گیا ہو۔ یا نقد رقم پیش کی گئی ہو۔ اس نے فون پر مجھے بتایا' معلوم نہیں نمبر کس سے لیا۔"

میں نے کہا "نمبر بھی انہی لوگوں نے دیا ہوگا۔"

"ہاں' ہو سکتا ہے۔ میرے پاس تھانہ انچارج کا فون بھی آیا کہ آپ کا بندہ تو ادھر حوالات میں ہی ہے۔ اور بڑے آرام سے رکھا ہے ہم نے۔ تھوڑی بہت تفتیش تو کرنی پڑتی ہے افسران بالا کی تسلی کے لیے اور جب ملک رب نواز جیسا بندہ پیچھے لگا ہو تو ہماری مجبوری بڑھ جاتی ہے۔ آپ بے شک اس سے مل لو۔ خیر' میں تھانے گیا اور رئیس سے ملا۔ اسے حوالات سے نکال کے ایک کمرے میں بستر پر لٹا رکھا تھا اور کچھ علاج معالجہ بھی کیا تھا کہ وہ ٹھیک نظر آئے۔ میرے ساتھی وکیل نے بتایا تھا کہ بازیابی کے وقت اس کے جسم پر سوجن تھی اور خون کے داغ اس کے کپڑوں سے جھانک رہے تھے۔ تھانے میں وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ فرید صاحب' دفع کرو قانونی کارروائی کو۔ جو ہونا تھا ہو گیا' پولیس کا یا رب نواز کا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جتنی جلدی یہاں سے جان چھٹ جائے اچھا ہے۔"

"ان لاشوں کا کیا ہوگا جو رئیس کے سر زبردستی تھوپ دی گئی تھیں؟"

"ناصر صاحب، رئیس نے انہیں سچ مچ قتل کیا ہو تا تب بھی دبانے والے کیس دبا دیتے۔ جھوٹے سچے کیس پولیس بناتی ہے تو بنتے ہیں ورنہ ختم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے' میں اس سے ملوں؟"

فرید نے نفی میں سرہلایا "کیا فائدہ۔ کہیں کسی نے پہچان لیا اور پولیس کو یاد آگیا کہ شاہ عالم کے خلاف کتنے کیس تھے تو آدھی زندگی تفتیش اور پیشیاں بھگتنے میں اور باقی آدھی اپنے جرائم کی سزا کاٹتے ہوئے جیل میں گزر جائے گی۔ شاہ عالم کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ وہ سب تلاش کرتے پھر رہے ہیں اسے۔ ان میں آگے آگے ہیں ملک رب نواز اور فرزانہ علی۔"

میں نے کہا "ایک انٹرویو چھپنے سے بڑی مشکل ہو گئی ہے میرے لیے۔ خود ہوٹل والے پریشان ہیں کہ میری موجودگی کو کب تک راز رکھیں۔ اور کیسے چھپائیں۔ اخبار والے چکر لگا رہے ہیں اور سیاسی لوگ الگ ہیں۔"

"پرانے حساب بے باق کرنے والے بہت ہوں گے اور پولیس کو بھی بالآخر ہوش آئے گا کہ اوہو' یہ وہی مفرور شاہ عالم ہے۔ کیسی دیدہ دلیری سے پاکستان آیا ہے اور انٹرویو دیتا پھر رہا ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ اب تو چپکے سے نکل جا۔ اور لندن میں اپنی موجودگی ثابت کرکے پھر آجا۔ ناصر عظیم کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ابھی تو شاہ عالم ہے۔"

باتوں کے دوران میں ہم نے ایک بار چائے منگوا کے پی پھر دوپہر کے بعد میں نے لنچ کے لیے ہال میں ہونے کو ترجیح دی۔ فرید عباسی کا خیال تھا کہ مجھے مجمع کو AVOID کرنا چاہیے مگر میں کمرے میں بیٹھ کے بور ہو گیا تھا۔ میں لباس بدل کے نیچے چلا گیا۔

اخباری نمائندے مسلسل تین دن سے میری جستجو میں تھے اور آج بھی زیادہ مستقل مزاج قسم کے صحافی میری سن گن لینے کی کوشش میں ناکام ہو کے جا چکے تھے۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا اور میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ لنچ کے لیے آنے والوں میں کوئی میڈیا کا آدمی بھی موجود ہے یا نہیں۔ شاہ عالم کو سب صحافی پہچانتے تھے مگر میں دو چار کے سوا کسی کی صورت سے آشنا نہیں تھا۔

میں نے احتیاطاً ایک کارنر منتخب کیا اور ہم کھانا لے کر ایک طرف چلے گئے۔ اس وقت تک میں نے اخبار نہیں دیکھے تھے۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میرے جاگنے سے پہلے ہی نزیول ایجنسی کا نمائندہ پہنچ گیا تھا اور وہ رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ فرید عباسی آگیا تھا۔ پھر میں نے ناشتا کیا اور ویٹر جو اخبارات لے کر آیا تھا وہ کارنر ٹیبل پر رکھے رہ گئے۔

مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ شبنم نے کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر' کچھ مجھے تحفظ فراہم کرنے کے لیے اور کچھ خبر کے لیے میرا ایک انٹرویو شائع کر دیا ہے۔ اس انٹرویو کے بارے میں شبنم نے فرنٹ پیج پر تین کالمی سرخی لگائی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس نے شاہ عالم کا یہ انٹرویو لندن سے ٹیلی فون لائن پر ریکارڈ کیا تھا۔ اس میں شاہ عالم کے پاکستان آنے کی خبر کو بنیاد بناتے ہوئے فرزانہ کے انٹرویو کو بوگس قرار دیا گیا تھا اور یہ وضاحت کی گئی تھی کہ شاہ عالم نجی نوعیت کے مختصر دورے پر اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آئے تھے۔ وہ ایک دن کے لیے لاہور بھی آئے تھے۔ اپنے ایک دوست کرنل غلام مصطفیٰ کے سوا لاہور میں انہوں نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ ایک اخبار کی ایڈیٹر کا یہ دعویٰ لغو اور بے بنیاد ہے کہ انہیں شاہ عالم کے ساتھ ڈنر کا موقع ملا تھا اور انہیں شاہ عالم نے کوئی خصوصی انٹرویو دیا تھا۔ سستی شہرت کے لیے جھوٹا انٹرویو چھاپنے پر شاہ عالم اس اخبار کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایک دو روز میں لندن میں پریس کانفرنس میں اپنی پوزیشن واضح کریں گے۔

یہ انٹرویو میں نے بعد میں پڑھا۔ لنچ کرتے ہوئے ہم پروفیسر ہاشم رضا کے تجربات اور ان معلومات پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے جو مجھے رب نواز سے حاصل ہوئی تھیں۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں مکمل اتفاق رائے تھا کہ نیلم کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والا لڑکا اور شبنم کے دفتر پر حملہ کرنے والی لڑکی غالباً جمو اور لالی کے سلسلے کی اگلی کڑی تھے۔ جن کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

اچانک میں نے فرزانہ کو ہال میں آتے دیکھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میری نظر دروازے کی طرف تھی۔ اگر میں فرید عباسی کی پوزیشن میں ہوتا تو اس کی طرف میری پیٹھ ہوتی۔ وہ بڑی تیزی سے اندر آئی اور اس نے ایک متلاشی نگاہ ان سب پر ڈالی جو وہاں لنچ میں مصروف تھے۔ دو دو چار چار کے گروپ بنائے باتیں کر رہے تھے اور گردوپیش سے بے نیاز تھے۔ یہ زیادہ تر کاروباری لوگ تھے۔ کمپنیوں کے ایگزیکٹو تھے یا سرکاری افسران تھے جو لنچ آور میں کھانے کے بہانے ملاقات کرنے آگئے تھے۔

فرزانہ پر نظر پڑتے ہی میں چونکا اور ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا "ابے یار۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ دیکھ' میں اب کھسکتا ہوں یہاں سے۔ تو اسے سنبھال۔"

فرید نے حیرانی سے پلٹ کے دیکھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "وہی' جس نے میرا انٹرویو چھاپا تھا۔ آج تو وہ کیمرا بھی لے کر آئی ہے اور ٹیپ ریکارڈر بھی ہو گا اس کے پاس۔"

فرزانہ کی نظر سے بچنا ایک مشکل کام تھا مگر میں آہستہ آہستہ ایک نیم دائرے کی صورت میں کھسکتا گیا اور اس کی نظر سے اوجھل رہنے کے لیے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کی آڑ لیتا رہا۔ وہ کاؤنٹر پر جاکے کھڑی ہو گئی تھی اور ایک کلرک سے باتیں کرتے ہوئے مجمع کو بھی دیکھ رہی تھی۔

وقتی طور پر میں اسے ڈاج دینے میں کامیاب رہا مگر اس نے فرید کو دیکھ لیا اور تیر کی طرح سیدھی اس کی طرف گئی۔ میں مشکل سے بیس فٹ کے فاصلے پر ایک آرائشی ستون کی اوٹ میں تھا چنانچہ میں نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو واضح طور پر سنی۔

فرزانہ نے ایک بڑی عیار مسکراہٹ کے ساتھ پیش قدمی کی۔ "ہیلو کرنل۔ آپ سے دوبارہ ملاقات کرکے خوشی ہوئی۔"

فرید نے انجانے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

فرزانہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا "آپ نے پہچانا نہیں مجھے کرنل صاحب! میری آپ کی ملاقات دو دن قبل ہوئی تھی۔ میں فرزانہ ہوں۔"

فرید نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کیا "آپ کسی شدید غلط فہمی کا شکار نظر آتی ہیں مس فرزانہ!"

"مسز فرزانہ علی!" اس نے خفیف ہو کے ہاتھ پیچھے کر لیا "میں روزنامہ خبردار کی ایڈیٹر ہوں۔"

"لیکن میں کرنل نہیں ہوں۔ ان فیکٹ میرے خاندان میں سو سال میں کوئی کیپٹن تک نہیں بنا۔"

فرزانہ کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"آف کورس۔ آپ کو خدا نے جیسا بنا دیا' بنا دیا" فرید بولا۔

وہ سخت جزبز ہوئی "کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ آپ شاہ عالم کو جانتے ہیں؟"

فرید نے کھانا جاری رکھا "نہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں جانتا ہوں' بہت اچھی طرح شاہ عالم کو۔ کوئی کام ہے آپ کو اس سے؟"

وہ فرید کو گھورنے لگی "مجھے ملنا ہے اس سے' کہاں ملے گا وہ؟"

فرید نے پلیٹ پر نظر رکھی "اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آپ کو کوئی پرابلم ہے؟"

وہ چیخ کے بولی "پرابلم مجھے نہیں' اس کی چہیتی چھمک چھلو شبنم کو ہے۔"

فرید مسکرایا "اس کی بیوی کا مسئلہ ہے؟ مگر اس کا نام تو کچھ اور ہے۔"

"ہو گا۔ اس نے ایک اور شادی کر لی ہے' مجھے معلوم ہے۔ مگر میں بات کر رہی تھی اس کی جو سو بیویوں کی ایک بیوی ہے کسی نکاح کے بغیر۔ اس نے جو کچھ اخبار میں لکھا ہے' میرے خلاف۔"

فرید نے حیرت کا اظہار کیا "دیکھیے میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا اس کی بیوی نے آپ کے خلاف اخبار میں کوئی بیان دیا ہے؟ وہ تو ایک بے وقوف قسم کی گھریلو عورت ہے' معمولی پڑھی ہوئی۔ اخبار پڑھتی تک نہیں۔"

"اوہ۔ کرنل صاحب! واٹ از دس؟" فرزانہ عاجز آگئی۔

"خاتون میں بتا چکا ہوں میں کرنل نہیں ہوں۔ میں ایک وکیل ہوں' فرید عباسی۔ آپ کیا بولے چلی جا رہی ہیں؟" فرید نے درشتی سے کہا۔

"اتنے انجان مت بنیے' شاہ عالم ابھی آپ کے ساتھ یہاں تھا۔ اس کا انٹرویو لیا تھا میں نے آپ کی موجودگی میں' لیا تھا یا نہیں؟"

"شاہ عالم کا انٹرویو؟" فرید جیسے دم بخود رہ گیا۔

"جی۔ اس روز جب آپ ڈنر کر رہے تھے۔ آپ کے سامنے بات ہوئی تھی اور شبنم نے آج اس کا لندن سے آن لائن انٹرویو چھاپ کے مجھے جھوٹا ثابت کیا ہے۔"

فرید نے ہاتھ اٹھایا "اسٹاپ دس نان سنس۔ آپ کس شاہ عالم کی بات کر رہی ہیں۔ کون ہے یہ شاہ عالم؟"

"آخر کتنے شاہ عالم آپ کے شناسا ہیں؟"

"صرف ایک۔ اور وہ ایک الیکٹرک کنٹریکٹر ہے۔ میرے گھر میں بھی ساری فٹنگ اسی نے کی تھی۔ دس بارہ سال سے جانتا ہوں میں اسے۔ میرے کہنے سے اور بھی لوگوں نے اس کو الیکٹرک فٹنگ کے کام دیے۔ میں سمجھا آپ کو اس سے کوئی شکایت ہے۔"

فرزانہ کی حالت دیکھ کے مجھے ہنسی آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے غلط فہمی میں اس نے کسی اجنبی کو دوست سمجھ کے بے تکلفی میں گالی دے دی ہو۔ مگر وہ چالاک عورت تھی اور

اچھی طرح سمجھتی تھی کہ غلط فہمی ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ فرید عباسی ہی کرنل بنا ہوا تھا اور آج فرید عباسی ایڈووکیٹ بن گیا ہے۔

"مسٹر فرید عباسی۔۔۔ کیا ثبوت ہے اس کا کہ آپ کرنل غلام مصطفیٰ نہیں بلکہ فرید عباسی ایڈووکیٹ ہیں؟ اور شاہ عالم کو بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول رہے ہیں؟"

فرید نے کہا "ایک منٹ!" اور جیب سے والٹ نکال کے فرزانہ کو اپنا کارڈ تھمادیا "یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر میرے آفس کا پتا اور میرے فون نمبر سب موجود ہیں۔ کبھی ضرورت پڑے تو ضرور یاد فرمایئے لیکن اس وقت میں معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہے۔"

فرزانہ جھنجلاہٹ میں اپنے ناخن کترتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ "کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے غلط اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ ڈائننگ ہال میں موجود ہے پھر یہاں آپ کا نظر آنا بھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔"

فرید باہر نکل گیا تو فرزانہ سخت مایوسی کا شکار اور مشتعل تھی۔ وہ پاؤں پٹختنے کے انداز میں چلتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف گئی۔ ایک جگہ ٹکرانے سے اس کا کیمرا گر گیا اور اس نے ٹکرانے والے سے کچھ کہہ دیا۔ وہ کوئی غیر ملکی تھا اور اس نے مڑ کر جواب میں کوئی زیادہ سخت بات کی۔ فرزانہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر شاید اس نے بات نہ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کاؤنٹر پر جا کے ایک کلرک سے باتیں کرتی رہی۔

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ فرزانہ کے دفع ہونے تک میں اپنی پوزیشن بدل نہیں سکتا تھا۔ میرا پیٹ بھر گیا تھا مگر صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو' میں آہستہ آہستہ کھانے میں مصروف رہا۔ دیکھنے والوں نے مجھے بالکل اہمیت نہیں دی تھی۔ انہوں نے بھی سمجھا ہوگا کہ میں اکیلا ہی ہوں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہاں میرے جیسے بہت تھے جو کسی کے ساتھ نہیں تھے۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ کہیں میرے آس پاس کے لوگوں میں سے کوئی مجھے پہچاننے والا سامنے نہ آجائے۔ وہ اچانک مجھے دیکھتا تو حیرانی اور گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے ملتا۔ پُرجوش مصافحہ کرتا یا مجھ سے گلے ملتا تو مجھے ستون کی اوٹ سے سامنے آنا پڑتا اور کاؤنٹر پر مستقل مزاجی سے کھڑی ہوئی فرزانہ مجھے یقیناً تاڑ لیتی۔ وہ اپنی نظروں کو دوربین کی طرح گھماتے ہوئے ہر چہرے پر فوکس کر رہی تھی۔ اس نے عملے کے کسی رکن کو رشوت دے کر اس کام پر مامور کیا ہوگا کہ شاہ عالم جیسے ہی نظر آئے' اسے فون کردے۔ اگر وہ ہال میں گھوم پھر کر مجھے تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیتی تو میں چھپ نہیں سکتا تھا مگر وہ ایک ہی جگہ سے ہال میں موجود ہر شخص کے چہرے کو دیکھ سکتی تھی' چنانچہ وہ وہیں کھڑی رہی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ ممکن ہے آج وہ اپنے مخبر سے میرے کمرے کا نمبر بھی معلوم کرلے۔ میرا کمرا فرسٹ فلور پر تھا۔ آنے جانے میں لفٹ کا استعمال نہیں کرتا تھا مگر اس وقت فرزانہ کی نظر میں آئے بغیر زینے تک پہنچنا دشوار تھا۔ لفٹ تک جانے کے لیے بھی میں نے اپنی پشت فرزانہ کی طرف رکھی اور آہستہ آہستہ آگے کھسکتا گیا۔

ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چند سیکنڈ سوچتا رہا کہ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے' دروازہ کھولے بنا چارہ نہ تھا۔ ذہنی طور پر فرزانہ کو ریسیو کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو کے میں نے دروازہ کھولا تو ایک ویٹر کافی کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کافی کا آرڈر نہیں دیا تھا لیکن ویٹر کو کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا۔ وہ کافی ٹیبل پر رکھ کے پلٹا ہی تھا کہ فرزانہ دروازے میں نمودار ہوئی اور میں نے دیکھا کہ اس نے واپس جاتے ہوئے ویٹر کو ایک شکرگزاری کی پُراسرار مسکراہٹ سے نوازا۔

"آپ نے دیکھا سر' اتنا چھپنے کے باوجود آپ چھپ نہیں سکے۔ وہ کیا شعر ہے۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔ تو ہم نے بھی ڈھونڈ لیا آپ کو۔"

میں نے کہا "ابھی جب ایک ویٹر کسی آرڈر کے بغیر کافی لے کر آیا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارا گائیڈ ہے' خیر بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔ "آخر کیا ضرورت تھی آپ کو مجھ سے ایسے چھپنے کی؟ اور وہ آپ کے دوست جو اس دن کرنل غلام مصطفیٰ کا رول کر رہے تھے' وہ بھی جھوٹ بولنے کے ماہر ہیں۔"

میں نے کہا "جو جھوٹ تم نے میرے بارے میں شائع کیا ہے' اس کے بعد ماہر تو تم ہی کہلاؤ گی۔"

"اس جھوٹ کے بارے میں کیا خیال ہے جو شبنم نے اپنے اخبار میں لکھا ہے؟"

میں نے کہا "وہ سچ ہے۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا "یعنی یہ سچ ہے کہ تم نے لندن سے اسے ٹیلی فون لائن پر انٹرویو دیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ اس لیے بھی سچ ہے کہ میں اسے جھوٹ نہیں کہتا۔"

وہ تلخ لہجے میں بولی "سچ کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔ اس نے بند دروازوں کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں لیا ہوگا یہ انٹرویو۔"

"اتنا پرسنل ہونے کی ضرورت نہیں۔ سچ وہ ہوتا ہے جسے عدالت میں ثابت کیا جاسکے۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

وہ روہانسی ہوگئی "ثبوت تو اس بات کا بھی نہیں ہے میرے پاس کہ تم ہی میرے بچے کے باپ ہو۔"

"پھر کیا ضرورت ہے ایسا کہنے کی۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات تمہارے شوہر کے کانوں تک پہنچ جائے۔"

اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جانتا ہے۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ فراخ دل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس نے خود ایک قابلِ عمل اور وسیع البنیاد سمجھوتا کرلیا ہے کہ نام نہاد شوہر وہ کہلائے گا اور ولدیت کے خانے میں کسی اور کا نام لکھے جانے پر معترض نہیں ہوگا تو دنیا اسے بے غیرت کہے یا کچھ اور۔۔۔ تمہاری ازدواجی زندگی اچھی گزرے گی۔"

وہ بولی "شاہ جی۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں نے اس انٹرویو کو ریکارڈ نہیں کیا تھا اور اس وقت کیمرا نہیں تھا میرے پاس۔ ورنہ تم انکار نہیں کرسکتے تھے۔"

"میں نے دیکھا تھا تمہیں ایک فوٹوگرافر کے ساتھ آتے ہوئے لیکن اس وقت میں جارہا تھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے اپنی صحافت کی دکان چمکانے کے لیے اتفاق سے ہونے والی ایک ملاقات کو خصوصی انٹرویو بنادیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ نجی نوعیت کا دورہ ہے اور میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا کہ میں پاکستان میں ہوں۔ تم نے سارے زمانے میں ڈھول پیٹ دیا۔"

وہ اپنے دانتوں سے ناخن کترتی رہی "شاہ جی۔ میری بہت بے عزتی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ جو شبنم نے چھاپ دیا ہے' جھوٹ وہ بھی ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اس نے لندن سے ٹیلی فون لائن پر کیسے انٹرویو لیا جبکہ تم یہاں بیٹھے ہو پاکستان میں؟" وہ تیز لہجے میں بولی "تم نے تو کہا تھا کہ اس سے ملو گے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "میں اس سے نہیں ملا۔ تم مانو یا نہ مانو۔ ہاں فون پر بات ضرور کی تھی میں نے۔"

"اور کیا تم نے یہ کہا تھا کہ تم لندن سے بول رہے ہو؟"

میں نے سوچ کے جواب دیا "ہاں' یہ کہنا ضروری تھا۔ فون پر کیا پتا چلتا ہے کہ آدمی لندن سے بات کر رہا ہے یا لاہور کی نمک منڈی سے۔"

اس کی آنکھیں پُرامید ہوگئیں "کیا اس نے فون پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی تھی؟"

"ضرور کی ہوگی۔ وہ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہے اور کوئی موقع ضائع نہیں کرتی۔"

حسنِ صورت اور جسمانی دلکشی کے اعتبار سے فرزانہ کسی بھی مرد کی پارسائی کے دعوے کو باطل کرسکتی تھی۔ شاہ عالم کوئی عابد و زاہد نہیں تھا' اس نے فرزانہ جیسی بہت سی لڑکیوں کو دولت' شہرت اور عزت کے خواب دکھا کے بھرپور استحصال کیا تھا۔ نادانی اور ناتجربہ کاری کے باعث نقصان اٹھانے والی بہت سی لڑکیاں زندگی میں ایک ٹھوکر کھا کے سنبھل گئی ہوں گی مگر فرزانہ ابھی تک اسی راہ پر چل رہی تھی جس پر وہ شاہ عالم کی ہمسفر تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ تجربہ کار اور پُرکشش ہوگئی تھی۔ شرم و حیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اس نے اپنے حسن و شباب کی غارت گر قوت کا بھرپور استعمال کیا تھا اور بوالہوس پیشہ مردوں کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا کے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔

تاہم شاہ عالم کو پھر تسخیر کرنے کی خواہش ہنوز تشنہ کام تھی۔ آج وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا عزم لے کر آئی تھی اور اس کے لیے پوری طرح مسلح تھی۔ کمرا اس کے وجود کی سحر آفریں خوشبو سے بھر گیا تھا اور یہ عجیب ہیجان خیز قسم کی خوشبو تھی جو حواس کو ایسے گرفت میں لیتی تھی جیسے مکڑی اپنے جالے میں مکھی کو بے بس کردیتی ہے۔ فرزانہ اگر چاہتی تو ایک کامیاب ماڈل بھی بن سکتی تھی مگر اس کے پاس عقل و ذہانت بھی تھی چنانچہ اس نے اختیار و اقتدار کا راستہ چنا۔ اس کے بال غیر معمولی طور پر لمبے' گھنے سیاہ تھے۔ ان کے ریشمی اور چمکیلے ہونے میں کسی ہمہ صفت شیمپو اور فرزانہ اسپرے وغیرہ کی کرشمہ سازی نظر آتی تھی۔ لباس کے سلیقے میں بھی سترپوشی سے زیادہ خود نمائی کے اسباب کو مدِنظر رکھا گیا تھا چنانچہ ساڑی کے ساتھ جو بلاؤز تھا وہ۔۔۔ ہرچند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔ والی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت بھی عاشق کے گریبان جیسی تھی کہ دونوں طرف سے چاک تھا اور نہ صرف اس کے مرمریں بازو اور

شاتوں کا سارا گداز نگاہ کو خیرہ کرتا تھا بلکہ آگے پیچھے سے جہاں تک نظر پھسل کر جاسکتی تھی' دعوتِ دید دیتا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ حشر سامانی ویسے تو صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔ لیکن اس وقت یہ اہتمام بطور خاص میرے قتل کی تمہید تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب ہوتی جارہی تھی لیکن میں اس کی پیش قدمی کو اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

وہ کچھ دیر ریشمی ساڑی کے پھسل جانے والے پلو سے بے نیاز مجھے تشنگی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کردیے۔ "شاہ جی' میں آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔"

میں نے خود کو چھڑالیا اور دُور جا بیٹھا "پلیز فرزانہ۔۔!"

اس نے مجروح لہجے میں پوچھا "کیا اب میں اچھی نہیں لگتی تمہیں؟"

میں نے کہا "اب تم کسی اور کی بیوی ہو۔ یہ طوائفوں والے حربے مجھ پر مت آزماؤ۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑگیا "میں چاہتی ہوں کہ تم شبنم کے بیان کی تردید کردو۔ کم سے کم اتنا کہہ دو کہ تم نے لندن سے کوئی انٹرویو ریکارڈ نہیں کرایا کیونکہ تم اس روز لندن میں نہیں' پاکستان میں تھے۔"

"یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے' تم جانتی ہو۔"

وہ خود کو سنبھال کے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگی "میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت تم ہوٹل کے روم نمبر ایک سو ایک میں مقیم ہو۔"

میں نے کہا "لیکن یہ سب آن ریکارڈ نہیں ہے کہ تم ہوٹل کا رجسٹر خود دیکھ چکی ہو۔ کیا اس میں تمہیں میرا نام نظر آیا تھا؟"

"لیکن میں خود سب کو بتاسکتی ہوں۔ صحافیوں کو بلا کے دکھاسکتی ہوں کہ تم یہاں چوروں کی طرح چھپے بیٹھے ہو؟" وہ اونچی آواز میں بولنے لگی۔

میں نے کہا "ول یو پلیز' شٹ اپ!"

وہ چلانے لگی "میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں شاہ جی۔ تم ایک مفرور مجرم ہو' سب کی نظروں میں دھول جھونک کے تم پاکستان میں پھر رہے ہو۔"

میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا "میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

وہ چیخی "ذلیل آدمی۔ میں برباد کردوں گی تجھے۔ تو ساری زندگی جیل میں چکی پیستا رہے گا کمینے' میرا نام فرزانہ ہے۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں اسے ناک آؤٹ کرکے خاموش کرادوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا ہی تھا کہ میں نے ایک ہاتھ مار کے اسے گرادیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح لڑکھڑا کے نیچے گری اور بے حس ہوگئی۔

صورتِ حال اچانک سنگین ہوگئی تھی۔ وہ کردار کی جیسی بھی تھی مگر ایک خطرناک عورت اور صحافی تھی۔ اب مجھے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا تھا۔ میں نے اس کا بیگ کھول کے دیکھا۔ اس میں ہتھیلی کے سائز کا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چل رہا تھا۔ وہ اپنی اور میری ساری گفتگو ریکارڈ کررہی تھی۔ بیگ میں سے ایک دھاگے جیسا تار نکلا ہوا تھا جس کے آخری کنارے پر چنے کی دال کے برابر مائیکروفون تھا۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر میں سے کیسٹ نکال لیا۔ گفتگو کے کچھ حصے یقیناً قابلِ اعتراض تھے اور خود فرزانہ کی نیک نامی کو متاثر کرسکتے تھے لیکن جس کا عقیدہ بھی یہ ہو کہ۔۔۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اسے یہ کیسٹ کسی کو سنواتے ہوئے بالکل شرم نہ آتی لیکن اس میں جو کچھ میں نے کہا تھا وہ یقیناً میرے خلاف استعمال ہوسکتا تھا۔

بیگ میں ایک لاکھ روپے بھی تھے۔ معلوم نہیں وہ بینک سے نکلوا کے لائی تھی یا کسی سے رازداری کی قیمت وصول کرکے آئی تھی۔ میں نے رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس میں ایک بہت قیمتی چھوٹا سا کیمرا تھا جو اندھیرے میں بھی صاف تصویر اتار سکتا تھا۔ اس کی ڈائری' نوٹ بک' کچھ آرائش کا سامان اور باقی ایسی چیزیں تھیں جن کا میرے نزدیک کوئی مصرف نہ تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ فرزانہ کو فرش سے اٹھا کے بیڈ پر لٹانے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ مجرمانہ خیال بھی آیا کہ میں اس کی کچھ ایسی تصویریں بنالوں جو بعد میں اس کا منہ بند رکھنے کے لیے کافی ہوں مگر پھر مجھے اپنے خیال پر خود ہی شرم آئی۔ فرزانہ کو شاید اپنی تصویریں دیکھ کے بھی شرم نہ آتی۔

سب کچھ سیٹ کرنے کے بعد میں نے روم سروس کو فون کیا "ابھی کچھ دیر پہلے وی آئی پی روم نمبر ایک سو ایک میں کافی کس نے منگوائی تھی؟"

"آپ نے نہیں منگوائی تھی سر؟"

"میں نے منگوائی ہوتی تو تم سے کیوں پوچھتا۔ واٹ از دس' تم زبردستی بل بناتے ہو' کون لے کر آیا تھا وہ کافی؟"

"میں معلوم کرتا ہوں سر۔ ویسے آرڈر تو نہیں لکھا ہوا ہے میرے پاس۔" وہ متفکر لہجے میں بولا۔

"اس ویٹر کو میرے پاس بھیجو۔"

ویٹر نے کمرے میں قدم رکھا تو فرزانہ کو محوِ خواب دیکھ کے ٹھٹکا۔ وہ مجرم تھا چنانچہ ڈرا ہوا تھا اور میرے گھورنے سے نروس ہورہا تھا۔

"میں نے ابھی روم سروس سے کنفرم کیا ہے' ان کے پاس میرا کوئی آرڈر نہیں تھا۔ پھر تم یہ کافی یہاں کیسے لے آئے تھے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"عبدل" وہ ہکلانے لگا "دراصل۔۔۔ سر! میڈم نے کہا تھا۔۔ کہ میں روم نمبرون او ون میں جارہی ہوں۔ میرے لیے کافی لے آؤ۔"

"اگر وہ کہتیں کہ میرے لیے شراب لے آؤ۔۔ یا ہیروئن لے آؤ تو تم لے آتے؟" میں نے کہا "بولو' کون ہے یہ عورت؟ اسے جانتے ہو تم عبدل؟"

"جی۔۔۔ نہیں' میں تو۔۔۔ انہوں نے آپ کو پوچھا تھا۔"

میں نے کہا "اور کتنے پیسے دیے تھے؟"

وہ سٹپٹا گیا "پیسے۔۔۔ کس بات کے سر؟"

میں نے کہا "عبدل۔ اس کافی میں کیا ملایا تھا تم نے؟"

وہ اچھل پڑا "کافی میں۔۔۔ خدا کی قسم کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "بچی ہوئی کافی رکھی ہے عبدل۔ اگر یہ کیس پولیس نے لے لیا تو وہ سب معلوم کرلیں گے۔ تمہاری نوکری بھی جائے گی اور پھر تم جیل جاؤ گے۔"

وہ ہاتھ جوڑنے اور گھگیانے لگا "سر' میں غریب آدمی ہوں۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو لالچ میں غلط کام کر بیٹھے۔ کافی پی کے یہ عورت بے ہوش ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ یہ کچھ اور ہی کہانی ہے۔ شاید کوئی مجھے پھنسانا چاہتا تھا عبدل لیکن میں بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں۔"

وہ رونے لگا "سر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پانچ سو روپے لیے تھے میں نے یہ بتانے کے کہ آپ روم نمبرون او ون میں ہیں۔ خدا کی قسم' میں نے کافی میں زہر نہیں ملایا' کیا یہ مرگئی ہیں؟"

میں نے سوچتے اور ٹہلتے ہوئے کہا "ابھی تو نہیں لیکن مرگئی تو بہت بُرا ہوگا عبدل! میری گواہی بھی تمہارے خلاف ہوگی۔ پھانسی ہوجائے گی تمہیں۔"

اس پر لرزہ طاری ہوگیا "پھانسی۔۔۔ نہیں سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "یہ فیصلہ منیجر کو کرنے دو۔"

تھوڑی دیر میں منیجر آگیا "عبدل۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

میں نے انگریزی میں کہا "میں بتاتا ہوں' کسی نے اس عورت کو میرے پیچھے لگا رکھا تھا۔ اس کا نام عبدل بھی نہیں جانتا۔ کیا آپ جانتے ہیں اسے؟"

منیجر نے غور سے فرزانہ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلانے لگا "عورت کچھ دیکھی ہوئی ضرور لگتی ہے سر' شاید کوئی ماڈل ہے۔"

میں نے کہا "اس نے عبدل کو پانچ سو روپے رشوت دے کر میرا روم نمبر معلوم کیا۔ پھر یہ خود ہی کافی لے کر آیا۔ کسی آرڈر کے بغیر۔ اس عورت نے یہاں بیٹھ کے کافی پی اور جب میں آیا۔"

منیجر چونکا "یعنی۔۔ آپ نہیں تھے کمرے میں اور یہ اندر آگئی؟ مگر کیسے؟"

میں نے کہا "آئی ڈونٹ نو۔ میں نیچے ڈائننگ ہال میں بوفے لنچ کررہا تھا اپنے دوست فرید عباسی ایڈووکیٹ کے ساتھ۔ وہ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی گئے ہیں۔ کمرے کا دروازہ ماسٹر کی سے کھول سکتے ہیں آپ لوگ۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا "بے شک ماسٹر کی ہوتی ہے ہمارے پاس لیکن وہ ایسے استعمال نہیں کی جاتی سر!"

میں نے کہا "اب یہ جیسے بھی ہوا لیکن یہ عورت اندر آگئی۔ زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ کافی پینے کے بعد یہ عورت بے ہوش ہوگئی۔ کیونکہ کافی زہر آلود تھی۔"

منیجر نے گھبرا کے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے سر؟"

"تم دیکھ سکتے ہو۔ عورت مری نہیں ہے لیکن ہوش میں نہیں ہے۔ یہ مجھے کوئی بہت گمبھیر معاملہ لگتا ہے۔ یہ سازش ہوسکتی ہے مجھے بلیک میل کرنے کی۔ میں کسی طرح بھی اس میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔"

"شامل ہونا تو ہم بھی گوارا نہیں کرسکتے سر۔ یہ ہماری گڈول کا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "ویسے تو یہ پولیس کیس ہے لیکن پولیس کے آنے سے جتنی پریشانی میرے لیے پیدا ہوگی اس سے زیادہ تمہارے لیے ہوگی۔"

"پولیس نہ آئے اس کیس میں تو اچھا ہے سر!"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ میرا مطلب ہے تم کیا کروگے؟"

"میں سب ٹھیک کرلوں گا سر۔ اگر آپ تھوڑا سا تعاون کریں۔" اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

"کھل کے بتاؤ مجھے' کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"اگر آپ اسی وقت چیک آؤٹ کر جائیں تو میں خاتون کو کسی دوسرے کمرے میں شفٹ کردیتا ہوں۔ یہاں ایک شخص ہے' میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا جس کا کمرا ہر ہفتے اور اتوار کو بک رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہر بار ایک نئی مسز آتی ہیں۔ اس نے آج فون پر بتایا تھا کہ کوئی خاتون میرے حوالے سے آئیں تو انہیں کمرے میں پہنچا دیا جائے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم آدمی ہوشیار نظر آتے ہو۔"

وہ مسکرایا "سر۔ ایک اچھے ہوٹل کو اچھی طرح چلانا ذمّے داری کا کام ہوتا ہے۔ میں آپ کے چیک آؤٹ کرنے کا وقت کچھ بھی دکھا سکتا ہوں۔ جو بارہ بجے سے پہلے ہوگا۔"

اس کے بعد میں نے اپنی تمام مشکلات کا بار منیجر کے کندھوں پر منتقل کردیا اور خود سبکدوش ہوکے ہوٹل سے باعزت طریقے پر چلا گیا۔ بعد میں کیا ہوا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اس بارے میں نہ کچھ اخبارات میں دیکھا اور نہ سنا۔ ہوش میں آنے کے بعد فرزانہ نے ضرور ہنگامہ کیا ہوگا اور بتایا ہوگا کہ وہ کون ہے اور منیجر یہ جان کے یقیناً پریشان ہوا ہوگا کہ وہ کوئی ایسی ویسی عورت نہیں جس سے وہ کوئی بھی کہانی منسوب کرسکے۔ اچھا بُرا' چھوٹا بڑا جیسا بھی تھا' وہ ایک اخبار تھا جس کی فرزانہ ایڈیٹر تھی۔ شاہ عالم کے معاملے میں تو اس نے خود ہی اپنے لیے مجبوری پیدا کرلی تھی۔ اسے کہنا پڑا ہوگا کہ وہ یہاں ٹھہرے ضرور تھے مگر صبح چلے گئے۔ ان کے STAY کو چھپانا خود مسٹر شاہ عالم کی خواہش تھی۔ ہوٹل کی انتظامیہ کسی مہمان کو ناخوش نہیں کرسکتی۔ رہی یہ بات کہ وہ اس کمرے میں کیسے آئیں۔ تو یہ وضاحت خود محترم خاتون بہتر طور پر کرسکتی ہیں۔

فرزانہ نے سمجھ لیا ہوگا کہ شاہ عالم اس کو چکر میں ڈال کے نکل گیا اور اب یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ شاہ عالم پر دست درازی کا' دھوکا دہی کا یا اس کے پرس سے کچھ چوری کرنے کا الزام لگاسکے۔ اس نے ہوٹل کے ایک ویٹر کو ساتھ ملا کے شاہ عالم تک رسائی حاصل کی تھی۔ شاہ عالم نے منیجر کو ساتھ ملا کے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ سیر کو سوا سیر اسے ہی کہتے ہیں۔

میرے لیے ایک ہوٹل سے نکل کے دوسرے ہوٹل میں جانا لا حاصل تھا۔ میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ یہ ریکارڈ پر آگیا تھا کہ شاہ عالم نے وہاں قیام کیا اور اس کے گواہ بھی بہت تھے۔ ابھی مجھے لندن جانے سے پہلے ایک پورا دن گزارنا تھا۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ ہوٹل کی لابی سے میں نے شبنم کو فون کیا تو وہی ہوا جو فرید کے ساتھ ہوا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔

میں نے ایک ٹیکسی میں سامان رکھا اور اسے گلشن آباد چلنے کے لیے کہا۔ وہ گھر شبنم نے بڑی محبت اور محنت سے آراستہ کیا تھا مگر آباد نہ ہوا تھا۔ گھر کے مکین ادھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ رئیس گرفتار ہوکے حوالات پہنچ گیا تھا۔ سونی بدستور نیلم کے ساتھ تھی۔ میرا لندن جانا طے تھا اور شبنم کچھ بدگمانی اور کچھ آزاد صاحب کی بیماری کے باعث الگ تھی۔

آزاد صاحب کی بیماری کا خیال آیا تو میں نے اس کے آفس سے پوچھا اور پھر اسپتال فون کیا۔ وہ وہیں تھی اور مزید خفا تھی کہ کسی نے بھی اس سے ملنے اور آزاد صاحب کو دیکھنے کے لیے اسپتال آنے کی زحمت نہیں کی۔ آدھے گھنٹے بعد میں اسپتال میں تھا۔ آزاد صاحب اسپیشل روم میں تھے اور دل کے پہلے دورے کو انجوائے کررہے تھے۔ یہ دورہ جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا مگر آزاد صاحب پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔

میرے پوچھنے پر وہ مسکرائے "بھئی' وہ کیا ہے گویا کہ اب تو ہر سُو غلغلہ ہے اکیسویں صدی کی آمد آمد کا اور اپنا یہ دل بیسویں صدی کے آغاز کی مصنوعات کا نمونہ گویا۔ بہت ساتھ چلا اپنے مگر اب ہم تھک گئے تو یہ بھی نڈھال ہے گویا۔"

میں نے کہا "آپ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔"

وہ ہنسے "برخوردار۔ دل کے خوش رکھنے کے کو ایسے خیال بہت ہیں گویا لیکن بقول شاعر۔ وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے۔ اس کے بعد دل کیوں ساتھ دے گا ہمارا۔ صد شکر کئی سو سال کی عمر پائی ہم نے' پوچھو کیسے؟"

میں نے کہا "کیسے؟"

بولے "بھئی زندگی نام ہے عمر کے تجربات کا تو ہم پر اس ایک زندگی میں جو بیتی وہ جگ بیتی تھی گویا۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں تھا۔ جیے تو مر مر کے جیے اور بقول شاعر۔ رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو رو رو شام کیا۔ ہر شب اپنی شبِ فراق رہی کہ جس کی طوالت۔"

میں سنتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ بولنے کے عادی تھے اور اب کچھ اور سنکی ہوگئے تھے۔ انہیں بڑا گلہ تھا کہ آزاد نے زمانے کی وکالت کی مگر عدالت میں زمانے نے ان سے نظریں پھیر لیں۔ انہیں شبنم کی فکر تھی کہ اس نے صحافت چھوڑ کے حماقت کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ غالباً ان کی مراد محبت سے

تھی۔ اخبار بمشکل تمام ان کی بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ اب تو بالکل ہی بیٹھ جائے گا... بلکہ لیٹ جائے گا گمنامی کے دفن میں۔

میں نے کہا "آپ مایوس کیوں ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"انشاء اللہ۔ بس ہر کام انشاء اللہ پر ہی چل رہا ہے گویا اس مملکت خداداد کا بھی۔ بندہ تو چاہتا ہے کہ نہ چلے مگر اللہ ہے چلانے والا۔ میاں صحافت کوئی شوق نہیں ہے رئیسوں کا کہ جی چاہا تو مجرا کرالیا۔ جی چاہا تو مرغے لڑائے' یہ تو دشتِ جنوں ہے گویا' اور مجنوں ہی چاہیے اس کے لیے۔ جو آبلہ پا اس کے ہر خار سے رشتۂ وفا کو استوار رکھے۔"

میں نے کہا "چشم بددُور۔ شبنم بڑی باصلاحیت ہے اور کیوں نہ ہو۔ آخر آپ کی شاگرد ہے اور آپ کے زیرِ سایہ تربیت پائی ہے۔ آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے گی۔"

وہ خفا ہوگئے "برخوردار۔ تم تو بس رہنے دو شبنم کی وکالت گویا۔ اسے تم سے بہتر ہم سمجھتے ہیں۔ آخر کیوں چلے وہ ہمارے نقشِ قدم پر۔ ہماری پرواز تو بڑی محدود تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کا جہاں ستاروں سے آگے ہو۔ صحافت کے آخری اُفق تک ہو اس کی راہ گزر جس پر وہ خود اپنے نقوشِ پا ثبت کرے۔ زمانہ اس کی تقلید کرے۔ وہ کیا کہتے ہیں' یعنی باپ سے جو کام نہ ہو' وہ بیٹا کرد کھائے۔"

میں نے کہا "آپ دیکھتے جایئے۔ ایسا ہی ہوگا۔"

"اجی خاک ایسا ہوگا۔ تم سے بھی ایک امید وابستہ کرنے کی حماقت فرمائی تھی ہم نے گویا۔ لیکن تم تو وہ ہو... یوسفِ بے کارواں عرف گواچی گاں (گمشدہ گائے) کہ نہ منزل ہے اور نہ منزل کا نشاں ہے۔"

میں نے سخت اکورڈ محسوس کیا۔ شبنم بھی کرسی پر بیٹھی اپنے پیروں کو دیکھتی رہی اور انگوٹھے سے چپس کے فرش کو کریدتی رہی۔ آزاد صاحب ڈپریشن کا شکار تھے اور صاف ظاہر تھا کہ انہیں اخبار کی نہیں' شبنم کی فکر زیادہ ہے۔ شبنم ایک بیٹی کی حیثیت سے ان کی ذمّے داری تھی لیکن بیٹی کے باپ ہونے کے ناتے وہ مجھ سے کھل کر نہیں کہہ سکتے تھے کہ محبت کرتے ہو تو تذبذب و انتظار کس بات کا۔ اس کا ہاتھ تھام لو تاکہ ہم سبکدوش ہوکے رخصت ہوں۔ وہ میرے اور شبنم کے روز و شب کی مصروفیات اور ہماری ایک دوسرے کے لیے جذباتی رفاقت اور ڈیوشن کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے۔ کچھ دن پہلے شاید میں ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتا تھا کہ شبنم کی فکر آپ مت کریں۔ وہ اب میری ذمّے داری ہے لیکن شبنم کے رویے میں محسوس ہونے والی ایک تبدیلی نے میرے جذبات پر برف سی پھیلادی تھی۔ نظر نہ آنے کے باوجود اس کے اور میرے درمیان ایک کھنچاؤ کی خلیج حائل ہوگئی تھی' چنانچہ میں خاموش رہا۔

چھ بجے اسپتال میں ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ آزاد صاحب کو دو ہفتے تک اَشد ضرورت کے سوا بیڈ سے اُترنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ ان کا سارا وقت ٹی وی پر خبروں کے بلیٹن دیکھنے میں یا مختلف اخبارات چاٹ کے گزرتا تھا۔ وہ خبروں کی دنیا کے آدمی تھے اور دنیا کے کسی بھی کونے میں کچھ ہو' وہ بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ اچانک ان کا رابطہ ساری دنیا سے ٹوٹ گیا تھا۔ ان کے مداح' دوست اور شاگرد کہلانے والے عدیم الفرصت ہوگئے تھے۔ دل نے انہیں تنہا اور بے کار کردیا تھا۔

میں اور شبنم چلنے لگے تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا "بھئی کبھی کبھار ہماری بھی خبر لیتے رہا کرو۔ ہم زمانے کی خبر لیتے تھے مگر اب بقول شاعر۔ کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا۔"

میں نے ان کے ہاتھ پر تھپکی دی "آپ جلدی سے ٹھیک ہوکے آجائیں اپنی ایڈیٹر کی کرسی پر۔ جائے استاد خالی است۔ چلبلی بھی آپ کے لیے چشم براہ ہے۔"

وہ مسکرائے "میاں' چلبلی ہماری ہونے والی بیوہ ہے گویا' ہماری نشانی سمجھ کے اس کا خیال رکھنا۔ چاندنی بخواب تیرے حوالے۔"

میں نے کہا "چلبلی کا اور آپ کا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اسپتال سے گھر آپ کو وہی لے جائے گی۔ خود لینے آئے گی آپ کو۔"

باہر آتے آتے شبنم رونے کے قریب ہوگئی تھی "کیسی باتیں کرنے لگے ہیں پاپا۔"

میں نے اسے تسلی دی "یہ بالکل نیچرل ہے اس آدمی کے لیے جس نے بڑی بھرپور' مصروف اور مسلسل جدوجہد والی زندگی گزاری ہو۔ یہ معذوری اور بے عملی کی سزا ان کے اعصاب کو متاثر کررہی ہے۔ ذہنی طور پر وہ آج بھی اتنے ہی مستعد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اخبار سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"انہیں آرام کی ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "یار' ان جیسے آدمی کے لیے کام ہی آرام ہے۔ اور یہ کوئی سرکاری نوکری تو نہیں ہے تاکہ ساٹھ سال کو پہنچے اور ریٹائرمنٹ کا پروانہ تھمادیا گیا۔ اخبار اور خبروں کی

دنیا سے لاتعلق رہ کے وہ نہیں جی سکتے۔ انہیں مصروف رہنا چاہیے۔"

شبنم کے ایک پاؤں میں تکلیف تھی مگر وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی چال سے لنگڑاہٹ ظاہر نہ ہو۔ ہم نے اسپتال کے لیے کوریڈور کو واپس جاتے ہوئے بہت سے ملاقاتیوں کے ساتھ خاموشی سے طے کیا۔ اسپتال کی عمارت سے کار پارکنگ ایریا کا فاصلہ بھی کم نہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتی رہی۔

گاڑی تک پہنچ کے اس نے چابی مجھے دی اور سکون کا گہرا سانس لے کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی "ناصر۔ تم ابھی تک خفا ہو مجھ سے؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا "آئی ایم سوری۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے ؟"

میں نے کہا "کس بات پر؟"

"میں نے تم کو جھوٹا کہا تم پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ میری غلطی تھی۔ سارا قصور چندا کا تھا۔ جھوٹ اس نے بولا تھا۔"

میں نے منہ پھلا کے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں کل اس کے ساتھ لندن جا رہا ہوں۔ رنگ رلیاں منانے۔"

وہ ہنسنے لگی "نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ لندن جانے والوں میں کسی چندا کا نام پسنجرز لسٹ میں نہیں ہے۔ میں نے فون کیا تھا۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ فون پر کسی نے کچھ بھی کہہ دیا تو تم نے مان لیا۔ میرے جذبات کو کتنا مجروح کیا تم نے؟"

وہ بولی "مجروح صاحب۔ زخمی تو میں بھی ہوں' یہ دیکھیے" اس نے شلوار کا پائنچہ اوپر اٹھا کے مجھے دائیں ٹانگ پر ایک نیل دکھایا "کیوں نہ ہم مجروحین کہیں بیٹھ کے اس درد کا کوئی درماں کریں۔ میں نے چائے نہیں پی ہے ابھی تک' چلو شیزان چلیں۔ لیکن تمہیں ایسی جگہ نہیں جانا چاہیے۔ اصولاً تو تمہیں اسپتال بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"نہ آتا تو تمہاری ناراضی کیسے برداشت کرتا؟" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ کھل اٹھا "کیا خیال ہے اپنے گھر چلیں؟ ایک دوسرے کی تیمارداری اور نازبرداری کے لیے؟"

شبنم ایک بار پھر پہلے والی شبنم بن گئی تھی۔ اس نے کافی بنائی اور ہم نے لان میں بیٹھ کے پی۔ گزشتہ رات کے واقعات دہراتے ہوئے وہ پھر دہشت زدہ ہو گئی۔ "پہلے سمجھی ہی نہیں تھی ناصر۔ لیکن میرے سامنے آ کے اس نے ایک عجیب سی آواز نکالی جو کسی بندر کی غراہٹ انسانی چیخ سے ملتی جلتی تھی اور اس وقت میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کسی وحشی جانور کی درندگی نظر آئی۔ دو دن پہلے نیلم کے پڑوس میں جو واقعہ پیش آیا تھا' اس کی یاد مجھے اچانک آئی۔ پتا نہیں کیوں' شاید اسی کو چھٹی حس وارننگ کہتے ہیں۔ اگر مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو وہ دبوچ لیتی۔ میں تم سے بات کر رہی تھی' فون پھینک کے میں نے اس پر اور خود غوطہ مار کے میز کے نیچے گھس گئی۔ وہ تو واقعی شیطانی بلا تھی۔"

ایک گھنٹے میں اس نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اور اپنے تاثرات اور تبصرے کے ساتھ وہ سب مجھے بتایا جو مجھے کل لال دین سے معلوم ہو چکا تھا لیکن میری طرح وہ بھی بے حد کنفیوژن کا شکار تھی۔ "جنہوں نے دیکھا تھا یہ سب ان کی بات اور ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ ایسی کسی مخلوق کی بات سن کے مسکرانے لگتے ہیں جو بن مانس یا گوریلے اور انسان کی نسلی صفات کی حامل ہو۔"

میں نے کہا "اگر میری رب نواز سے اس مسئلے پر بات نہ ہوتی تو میں بھی ایسی بات کو گپ سمجھتا اور سائنس فکشن مانتا۔ لیکن پروفیسر ہاشم رضا کی سائنسی تحقیق کا ایک تاریخی پس منظر موجود ہے۔ جانوروں کے بعد انسان کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کا کام ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں پاکستان میں' ریسرچ کی ایسی جدید سہولتیں ہمارے پاس کہاں؟ میں نے آج مزید معلومات حاصل کی ہیں۔ بھارت میں کافی کام ہو رہا ہے اور کچھ سائنس داں تکوسیا میں کامیابی کے بہت قریب ہونے کے دعوے دار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سن دو ہزار تک وہ انسان کی کلوننگ کر لیں گے۔ حال ہی میں' غالباً گزشتہ ماہ ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ چونسٹھ سال عمر کی ایک بوڑھی عورت نے مصنوعی طریقے سے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ یہ جینیاتی سائنس میں بہت نمایاں پیش رفت قرار دی گئی تھی۔"

میں نے کہا "جس لڑکے نے نیلم کے پڑوسی حمید اللہ بیگ کے گھر میں گھس کر کوشش کی تھی کہ دیوار پھاند کر نیلم کے گھر میں داخل ہو جائے' اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ وہ ایک سیکورٹی گارڈ کی گولی کا نشانہ

بنا تھا۔ موت کا سبب اسی کو قرار دیا گیا۔"

"مگر یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس کی لاش اسلام آباد جائے گی اور پمز کے سائنس داں اس پر تحقیق کریں گے؟"

"PIMS نے اس کی تردید کر دی تھی۔ یہاں ایک میڈیکل بورڈ نے' جس میں کچھ ٹاپ کے فزیشن اور سرجن شامل تھے' اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور یہ بیان جاری کیا کہ اس میں کسی قسم کی غیر معمولی صفات نہیں پائی گئیں جن کی بنا پر قیاس آرائی ممکن ہو۔ وہ ایک عام انسان تھا۔"

میں نے کہا "کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ حملہ تم پر ہوا اور اس سے پہلے نیلم پر۔ آخر کیوں؟ اگر ہم فرض کر لیں کہ ان حملوں کے پیچھے رب نواز کا ہاتھ تھا اور اسے یہ دو نمونے ہاشم رضا نے فراہم کیے تھے۔ تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیوں؟"

"شاید یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ مجوبہ' جسے تفریحاً نام دے دیا گیا ہے گورمن اور گوروین۔ پروگرام کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں؟ اور کس حد تک اپنے ٹارگٹ اور مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ میں اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔"

میں نے کہا "ٹیک اٹ ایزی۔ میں بھی کم انٹرسٹڈ نہیں ہوں مگر ہمیں یہ کام خاموشی سے اور مکمل رازداری کے ساتھ کرنا ہوگا۔ فی الحال اس معاملے کو دبا دو۔ اسے پبلک ایشو بنانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے سونی سے کہہ دیا ہے کہ وہ نیلم کا گھر چھوڑ دے۔"

"کیوں' تمہیں شک ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں۔ نیلم کے ساتھ رب نواز کی کوئی دشمنی نہیں۔ اسے سونی کی تلاش ہے لیکن جب سے یہ خبر پھیلی ہے سونی ایک دن شوٹنگ پر نیلم کے ساتھ نظر آئی تھی' وہ نیلم کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

شبنم نے سوچتے ہوئے کہا "مجھے بھی شک ہے کہ وہ جنگلی لڑکی مجھے مارنے نہیں آئی تھی۔ اس نے جو سامان اٹھا کے ادھر ادھر پھینکا اور جس طرح میزوں اور الماریوں کو الٹا' اس سے یہ لگتا تھا کہ وہ کچھ اور تلاش کر رہی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ وہ کھوپڑی؟"

"ہاں۔ رئیس خانے کو آگ لگوانے کا مقصد بھی اور کچھ نہیں تھا۔ رب نواز کو وہ مورتی کا سرچاہیے۔ وہ تین کروڑ کے نقصان کو بھلا نہیں سکتا۔ ناصر' کیوں نہ ہم اس کی چیز دے دیں اسے۔"

"میں کوئی فیصلہ عجلت میں کرنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں نے دو طرف سے رب نواز کو گھیرا ہے۔ میں نے اسے پرانے کاروباری رشتے پھر استوار کرنے کی پیشکش کی تھی جو اس نے قبول کر لی ہے۔ میں نے اسے سیاسی رشوت کے طور پر پارٹی کا پلیٹ فارم پیش کیا ہے کہ وہ چاہے تو ہم اسے الیکشن کے لیے ٹکٹ دے سکتے ہیں۔"

"یہ کب ہوا؟"

"میں شاہ عالم کی پاکستان تشریف آوری کے گواہ پیدا کرنے کے لیے اس کی پارٹی کے لوگوں سے ملنے گیا تھا۔ شمس اور قریشی شاہ عالم کی پارٹی پی جے ایف کے نائب صدور تھے۔ ان دونوں کو میں نے یہی تاثر دیا کہ میں اور کسی سے نہیں ملا۔ رہی سہی کسر فرزانہ نے میرا انٹرویو چھاپ کے پوری کر دی۔"

"تم نے دیکھا نہیں۔ میں نے اسے کیسا ذلیل کیا ہے' جھوٹا ثابت کر کے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "دیکھا... دیکھا ہی نہیں آج بھگتا بھی۔ تمہاری اس تردید سے اس کی بڑی بے عزتی ہوئی۔"

"بے عزتی اس کی ہوتی ہے جس کی عزت ہو۔"

"آج وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح پہنچ گئی میرے پاس" میں نے کہا اور پھر اسے وہ سب بتا دیا جو فرزانہ کے آنے کے بعد ہوا تھا۔

"او مائی گاڈ! کیا ضرورت تھی تم کو یہ سب کرنے کی؟ آخر اتنا ڈرنے کی کون سی بات تھی۔ سیکورٹی والوں سے کہہ کے نکلوا دیتے اسے اپنے کمرے سے۔"

میں نے کہا "بابا' وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ کون ہاتھ لگا سکتا تھا اسے۔ اس کے ایک ٹیلی فون پر تمہاری صحافی برادری کا جلوس وہاں پہنچ جاتا۔ ان کے ساتھ پولیس آ جاتی۔"

"معلوم نہیں بعد میں اس نے ہوٹل والوں کے لیے کیا مصیبت کھڑی کی ہوگی۔ وہ خطرناک عورت ہے۔"

"خیر جو ہوٹل چلاتے ہیں وہ ہر قسم کے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی ساکھ دیوارِ چین سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ وہاں کیا نہیں ہوتا اور کیا نہیں ملتا۔ شراب سے شباب تک۔ لیکن کیا آج تک کسی نے وہاں چھاپا مارا؟ ان کے ڈائننگ ہال رمضان میں بھی دن رات کھلے رہتے ہیں۔ کسی نے ان پر احترام رمضان آرڈیننس کا کیس بنایا؟ وہاں سے کسی کو کھاتے پیتے پکڑا۔ تمہاری صحافی برادری ہو یا نام نہاد اسلام پرست' سب اس حد سے آگے

جانے کی ہمت نہیں رکھتے جو فائیو اسٹار ہوٹلوں کو عام ہوٹلوں سے جدا کرتی ہے۔"

شبنم نے اچانک گھڑی دیکھی اور گھبرا کے کھڑی ہو گئی "آٹھ بج گئے۔ مجھے جانا ہو گا حالانکہ دل تو نہیں چاہتا۔"

میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی "کل میں کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سوائے تمہارے انتظار کے۔"

وہ مسکرائی "میں صبح آجاؤں گی' شب بخیر۔"

میں نے بیٹھے بیٹھے کہا "شب بخیر اور خدا حافظ!"

وہ جانتے بوجھتے زیادہ لنگڑا کے ایک قدم چلی اور رک گئی "یہ کتنی بداخلاقی ہے۔ تم مجھے چھوڑنے بھی نہیں جاؤ گے؟ دیکھ رہے ہو کہ میری ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چلتا ہوں بابا۔ اس لیے کہ کہیں ایکسی ڈنٹ کر دیا تو دوسری بھی ٹوٹ جائے گی۔ تمہیں گود میں اٹھا کے کون پھرے گا ساری عمر۔"

وہ ایک دم مجھ سے چمٹ گئی "عمر بھر کا روگ تو ہوں میں۔ لیکن سچ بتاؤ' تم اب ناراض تو نہیں ہو مجھ سے؟"

میں نے اسے چوم کے کہا "نہیں۔ مگر میرے اور تمہارے درمیان چندا کو پھر نہیں آنا چاہیے۔ کبھی نہیں' میں اسے بھلا چکا ہوں۔"

یہ بات کہتے ہوئے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں گردشِ حالات کس طرح میرے خلاف ایک سازش کو کامیاب کر دیں گے۔ میرا اپنا کہا ہوا خود میرے خلاف ایک فردِ جرم بن جائے گا اور میرا سچ ایک بار پھر جھوٹ بن کر سامنے آئے گا۔

اس رات میں شبنم کو چھوڑ کے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ شبنم نے اپنے آفس فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گی۔ ہم نے ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ کے رومان آفریں ماحول میں رات کا کھانا کھایا۔ اس نے آفس سے کچھ فاصلے پر ہی گاڑی میرے حوالے کر دی اور مجھ سے کہا کہ وہ صبح ٹیکسی لے کر آجائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں اسلام آباد تک ہوائی جہاز سے جانے کا ارادہ منسوخ کر دوں کیونکہ وہ اپنی کار میں خود مجھے اسلام آباد چھوڑنے جائے گی۔ یہ محض اس کا جذباتی پاگل پن تھا۔ وہ تھوڑی سی تفریح چاہتی تھی اور میرے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جا کے کچھ ریلیکس کرنے کے موڈ میں تھی ورنہ سوزوکی ایف ایکس میں ایک سو اسی میل کا یک طرفہ سفر آسان ہرگز نہ تھا۔ جاتے ہوئے ڈرائیونگ میں کر سکتا تھا مگر واپس تو اسے اکیلے آنا تھا۔ میرے سمجھانے کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نے ضد ترک نہ کی تو وہ اسلام آباد تک نہیں لندن تک میرے ساتھ جائے گی۔

رات گئے میں نے فرید سے بات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ رئیس بالکل ٹھیک تھا۔ اسے اب جلد از جلد رہائی کی امید تھی۔ اس کے خلاف جارحانہ عزائم رکھنے والے خود ہٹ گئے تھے اور ضابطے کی کارروائی کے مطابق کیس واپس لینے والوں کو اس کارِ خیر میں تاخیر نہ کرنے کے لیے معاوضہ بھی ادا کروا دیا گیا تھا۔ چنانچہ آئندہ ہفتے میں رئیس خان کی باعزت واپسی یقینی تھی۔

پھر رات بارہ بجے میں نے کمال کو فون کر کے چندا کی شکایت کی۔ "پتا ہے اس نے کیا جھوٹ بولا شبنم سے؟"

میری ساری بات سن کے کمال نے حیرانی ظاہر کی "اس لڑکی کا رویہ بھی بڑا عجیب ہے۔ وہ تو چلی گئی آج۔"

"خدا کے لیے میرا پتا مت بتانا۔"

کمال ہنسنے لگا "الّو کے پٹھے۔ پتا میں کیسے بتاؤں گا جب خود مجھے معلوم نہیں کہ تو لندن میں کہاں ہو گا۔ ویسے اچھا تھا اگر تو چندا سے مل لیتا اور اس کی کچھ مدد کر دیتا تو تم دونوں کو اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ۔ میں اکیلا ہی بھلا۔ کہیں وہ میرے ساتھ جاتی اور شبنم دیکھ لیتی تو بس ہو جاتا خانہ خراب۔"

"خانہ خرابی نصیب میں لکھی ہو بیٹے تو خانہ آبادی کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں۔ اور ہوتے ہیں' تو چندا کا فون نمبر اور پتا لکھ لے۔ وہ لندن میں اپنے کزن کے گھر ٹھہرے گی۔"

میں نے کہا "اگر میں جواب میں عرض کروں کہ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے ساتھ چندا۔ تو امید ہے آپ برا نہیں مانیں گے" میں نے فون بند کر دیا۔

شبنم نے صبح آٹھ بجے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ جب تک میں دروازے تک پہنچا' مسلسل بجنے والی بیل جل جل کے خاموش ہو گئی تھی۔

میں نے اسے آنکھیں مل کے دیکھا "وقت اچانک کتنا پیچھے ہو گیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے آج پھر وہی حشر انگیز لباس پہن رکھا تھا جو ایک زمانے میں اس کی پہچان بنا ہوا تھا۔ بلیک مردانہ کالر والی شرٹ جس کا سامنے والا اوپر کا ایک بٹن ہمیشہ کھلا رہتا تھا یا ہوتا ہی نہیں تھا۔ جینز اور جاگرز' کالا چشمہ

شولڈر پر ایک بیگ۔

"کیا تمہیں اچھا نہیں لگا میرا یہ انداز؟" وہ اندر آ کے بولی۔

"اچھی تو مجھے تم لگتی ہو۔ لباس کا کیا ہے' کچھ بھی ہو یا کچھ بھی نہ ہو" میں نے کہا "لیکن آفس سے صرف لباس بدلنے تم گھر گئی تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "کل رات یہاں سے میں پہلے گھر گئی تھی وہ کپڑے دو دن سے پہنے پھر رہی تھی میں۔ اتفاق سے کل رات ہی مجھ سے بہت لوگ ملنے آ گئے۔ میرے پرانے ساتھی اور ہم پیشہ۔ وہ کل کے واقعے' میرا مطلب ہے پرسوں جو کچھ ہوا' اس پر اپنی تشویش ظاہر کرنے آئے تھے۔ اور کچھ تجسس کے جذبات سے مغلوب ہو کے۔ ان سب نے بھی یہی کہا۔"

"کیا کہا ۔۔۔؟" میں اسے کمر میں ہاتھ ڈال کے اندر لے گیا۔

"یہی ۔۔۔ کہ اس گیٹ اپ میں بہت اچھی لگتی تھی میں۔ اب اتنی اولڈ فیشن کیوں ہو گئی ہوں؟"

"اولڈ فیشن! مائی فٹ۔ تم کیا جانو کہ ایک پاکستانی لڑکی اپنے خالص مشرقی انداز میں کسی شاعر کی غزل لگتی ہے۔ اور برا مت ماننا' اس لباس میں' بابا بلیک شیپ ۔۔۔ اچھا' اب میں غسل کر کے آتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں ناشتا بناؤ۔"

اس نے بیگ پھینک دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم رات بھر اینڈتے رہے ہو۔ تم بناؤ ناشتا' میرے اور اپنے لیے۔ یہ اچھی بدمعاشی ہے تم مردوں کی۔ عورت رات بھر جاگ کے اور کام کر کے لوٹے تب بھی ناشتا وہی بنائے۔"

میں نے کہا "بدمعاشی ہے تو بس ہے۔ زنانہ کام اگر مرد کریں تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔"

"پھر بیٹھے رہو بھوکے' مجھے تو آ رہی ہے نیند!"

مجبوراً طائرِ لاہوتی کو پورا ناشتا بنانا پڑا لیکن میں ناشتا لے کر آیا تو وہ واقعی سو چکی تھی اور گہری نیند میں تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ناشتا کر کے میں اس کی گاڑی میں ٹیونر چیک بنوانے چلا گیا۔ میں نے کچھ ضروری شاپنگ نمٹائی۔ اپنے لیے دو شرٹس اور دو ٹائیاں خریدیں۔ وہاں اچانک مجھے شبنم کے لیے ایک ڈریس پسند آ گیا اور مجھے اس کا مطلوبہ سائز بھی مل گیا۔ بارہ بجے میں واپس پہنچا تو اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

"بارہ بج گئے۔ تم نے اٹھایا بھی نہیں مجھے۔" اس نے ایک انگڑائی لے کر مجھے دیکھا "تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے ڈریس اس کے سامنے رکھ دیا "بس یہ لینے گیا تھا۔"

اس نے پیکٹ کھول کے دیکھا اور کچھ حیران ہوئی "یہ اتنا ضروری تھا؟ شاید یہ میرا لباس اچھا نہیں لگا تمہیں' تم واقعی دقیانوسی ہو۔"

"دقیانوسی کی بات نہیں۔ میں نے دیکھا تو مجھے پسند آ گیا۔ اسے پہننا تو پڑے گا تمہیں" میں نے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ میرے رویے نے اسے مایوس کیا تھا مگر اس نے اپنے رویے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بادلِ ناخواستہ ہی سہی میرا حکم مان لیا۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی کہ شبنم اپنی پسند کے لباس میں میرے ساتھ جاتی تو ہر نظر اس کی طرف اٹھتی لیکن پھر شاید میں اس کے ساتھ جانا پسند نہ کرتا۔

شبنم مجھے اسلام آباد جا کے سی آف کرنے کے ارادے پر قائم تھی۔ ہم دوپہر کے بعد نکلے تو ڈرائیونگ شبنم کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دو آفس دکھائے جو اس کو پسند آئے تھے۔

میں نے کہا "اس سے بہتر جگہ کہاں ملے گی۔ تم ڈیل فائنل کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے واپس آنے تک میں آفس کو ڈیکوریٹ بھی کر لوں گی۔"

میں نے کہا "بہتر ہو گا کہ اگر یہ کام تم کسی انٹیریر ڈیکوریٹر سے کراؤ۔"

وہ برا مان کے بولی "کیوں؟ میرے حسنِ ذوق پر بھروسا نہیں تمہیں؟"

میں نے کہا "بابا' یہ پروفیشنل معاملہ ہے۔ تمہاری جگہ کوئی انٹیریر ڈیکوریٹر تمہارا کام کر سکتا ہے۔"

تین بجے ہم لاہور سے نکل گئے۔ اسلام آباد تک کا سفر ایک بڑا پُرلطف تجربہ ثابت ہوا۔ ہم نے ٹرک ڈرائیورز کے لیے مخصوص روڈ سائڈ ہوٹل میں کھانا کھایا جہاں تنور کی گرم روٹی کے ساتھ دال ماش فرائی کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں نے ہمیں ایک نیا شادی شدہ جوڑا سمجھا تو قصور ان کا نہیں' ہمارے ایک دوسرے کے لیے وارفتگی کے جذبات کا تھا جن پر خود ہمارا اختیار نہ تھا۔

ڈرائیونگ اب میں کر رہا تھا اور پرانی ہونے کے باوجود شبنم کی چھوٹی سی گاڑی بڑے جوش و خروش کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ شبنم باہر کے نظاروں میں گم تھی اور بار بار

مسکرا کے میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی بلندی کی جانب مائل تو کبھی نشیب کی طرف رواں۔ اس راستے پر جہلم سے پہلے ہی سطح مرتفع پوٹھوہار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جن کی گہرائیوں میں ان گنت کھائیاں' غار اور وادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شام کے ڈھلتے سورج کی روشنی میں ان بے آب و گیاہ زرد خیالے رنگ کی خاموش پُراسرار وسعتوں کا نظارہ اور بھی دلفریب ہو گیا تھا۔

رات اسلام آباد کے کوہساروں پر اپنا دامن پھیلا چکی تھی جب میں نے کار کو ائرپورٹ کے احاطے میں پارک کیا۔ چھ گھنٹے کی ساری ڈرائیونگ میں نے کی تھی چنانچہ میرا تھکن سے بُرا حال تھا مگر مجھے زیادہ فکر شبنم کی تھی۔

"تم نے بلاوجہ ساتھ آنے کی ضد کی۔"

"بلاوجہ کیوں؟" وہ بولی "وجہ تو تھی۔"

"ایسی کیا وجہ تھی؟"

"وجہ تھے تم" وہ بولی "چلو ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اب تم واپس کیسے جاؤ گی' اکیلی؟"

وہ ہنسی "یہی سڑک ہو گی۔ یہی گاڑی' ڈرائیونگ مجھے آتی ہے اور اس راستے میں نہ بھوت پریت ہیں اور نہ ڈاکو۔ ساری رات ٹریفک چلتی ہے' پھر ڈر کیسا؟"

میں نے کہا "کاش' تم لندن میں بھی میرے ساتھ ہوتیں؟"

"ہو سکتی تھی۔ لیکن تم نے ایک بار بھی کہا؟ بولے تو یہاں آ کے بولے جب کچھ نہیں ہو سکتا" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"چلو چند دن کی تو بات ہے۔ میں ایک ہفتے میں واپس آجاؤں گا۔ اگلی مرتبہ ہم ساتھ چلیں گے۔"

"لندن نہیں۔ سوئزرلینڈ چلیں گے" وہ خوش ہو کے بولی۔

"یس میڈم۔ جیسا آپ کا حکم۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں" میں نے کہا۔

وہ مجھے ڈیپارچر لاؤنج تک چھوڑنے گئی۔ کسی یورپی یا امریکی ائرپورٹ پر میں اُسے لپٹا کے اور چُوم کے خدا حافظ کہہ سکتا تھا مگر یہاں میں زیادہ سے زیادہ اس کا ہاتھ تھام کے اور اس کی آنکھوں میں جھانک کے کوئی فلمی قسم کا رومانٹک ڈائیلاگ بولنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ آخری اعلان سن کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر کہیں اور تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی اور آنکھوں میں ہولناک ویرانی اتر آئی۔

میں نے اس کو چٹکی بجا کے متوجہ کیا "اے۔۔۔ ادھر کیا دیکھ رہی ہو' کوئی بھوت نظر آ گیا ہے کیا؟ میری طرف دیکھو۔"

"دفع ہو جاؤ" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی "میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی دوبارہ۔ تم ایک جھوٹے' ذلیل اور کمینے آدمی ہو' مکار۔۔۔ فریبی!"

میں بھونچکا رہ گیا "شبنم' کیا ہو گیا ہے تمہیں اچانک؟"

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول سکتے ہو۔ میں جا رہی ہوں" وہ روتی چلاتی بھاگی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی "شبنم! پلیز' بات سنو میری۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟"

لیکن وہ دوڑتی ہوئی باہر کی طرف جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ اس کے چلانے کی وجہ سے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں ایک تماشا بن کے رہ گیا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شبنم کے پیچھے دوڑنا چاہیے یا ڈیپارچر لاؤنج سے اندر چلا جانا چاہیے۔ پانچ منٹ بعد میں یہ فلائٹ مس کر دیتا تو پھر نہ جانے کب لندن جا پاتا۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کسی وجہ کے بغیر اچانک شبنم پر نفرت کے اتنے شدید ردِ عمل کا شکار کیوں ہو گئی تھی؟

آخری مسافر اندر جا چکا تھا اور ڈیپارچر لاؤنج کے لوگ ٹرانزٹ لاؤنج میں جا رہے تھے۔ شبنم میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور شاید روتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔

بالآخر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

میرا ذہن شبنم کی برہمی کا کوئی سبب تلاش کرنے سے قاصر تھا۔ وہ صبح سے میرے ساتھ تھی اور اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بلکہ ڈیپارچر لاؤنج تک وہ انتہائی خوش گوار' خاصے رومینٹک موڈ میں تھی۔

میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ چندا کی وجہ سے ہمارے جذباتی اعتماد کے آئینے میں جو بال آ گیا تھا' اس کا وجود شاید خیالی تھا۔ شبنم آج بھی میرے قریب تھی اور جیسے زمین کششِ ثقل کے باعث سورج کے گرد اپنے مدار پر گھومتے

رہنے پر مجبور تھی اور چاند کے لیے زمین کی کشش سے دور جانا ممکن نہ تھا' ایسے ہی میں اور شبنم اپنی اپنی محبت کے محدود دائرے سے دور کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ زندگی کے راستوں پر ناراضی اور خوشی تو دھوپ چھاؤں کی طرح ملتی ہے۔

لیکن پھر اچانک کچھ ہو گیا۔ میں نے کوئی دلآزار بات نہیں کی تھی جس سے اچانک اس کا موڈ اتنا خراب ہو جاتا۔ ڈیپارچر لاؤنج میں کسٹم اور امیگریشن کے کاؤنٹرز پر روانگی سے قبل FORMALITIES پوری کرتے ہوئے میں سخت الجھن کا شکار رہا۔ کہاں تو محبت میں دیوانگی کی یہ انتہا کہ وہ مجھے لاہور سے اسلام آباد تک چھوڑنے آئی۔ محض میرے ساتھ ایک لانگ ڈرائیو کو انجوائے کرنے کے لیے اور اب اکیلی واپس جائے گی۔ رات بھر ڈرائیونگ کرے گی اور صبح تھکن سے بے حال لاہور پہنچے گی اور کہاں یہ نفرت کا شدید ردِ عمل کہ اس نے سب کے سامنے مجھے ذلیل کیا' گالیاں دیں اور میری شکل دوبارہ نہ دیکھنے کا عہد کر کے چلی گئی۔ آخر کیوں؟

کیا ہو گیا تھا شبنم کو۔ کیا دیکھ لیا تھا اس نے؟ ائرپورٹ پر میرے ساتھ چلتے چلتے اس پر یہ دورہ کیوں پڑ گیا؟ اس کی اور میری قربت اب نئی نہیں رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے موڈ اور مزاج' عادات و فطرت کی خوبیوں خامیوں کو پرکھ چکے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ شبنم کا رویہ کبھی اس حد تک UNPREDICTABLE نہیں رہا تھا کہ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ۔

ٹرانزٹ لاؤنج میں داخل ہونے والا میں آخری شخص تھا۔ باقی مسافر طیارے میں سوار ہونے کے لیے جا چکے تھے۔ اگر مجھے دس منٹ دیر ہو جاتی تو جہاز کے دروازے بند ہو جاتے اور میں فلائٹ مس کر دیتا۔ شبنم کے پیچھے دوڑتا اور اس سے ناراضی کی وجہ معلوم کرتا' اسے سمجھاتا' قائل کرتا اور مناتا' یہ سب دس منٹ کا کام یقیناً نہیں تھا۔

میں نے اچھا ہی کیا جو اسے جانے دیا۔ جہاز کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا۔ میرے واپس آنے تک وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی ورنہ میں لندن سے فون پر بات کر کے اس پاگل پن کے دورے کا سبب پوچھ لوں گا۔ اس کا دماغ آج کل کچھ زیادہ ہی خراب ہونے لگا ہے۔ بات بات پر بگڑ جاتی ہے اور رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہے۔ میں نے اس کا کچھ علاج نہ کیا تو یہ پاگل پن میرے لیے زندگی کا عذاب بن جائے گا۔

جہاز میں بیٹھنے تک مجھے شبنم پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے ائرپورٹ پر موجود لوگوں کا خیال کیے بغیر مجھے بے عزت کیا۔ یہ نہیں سوچا کہ نہ میں کوئی گمنام شخص ہوں اور نہ وہ کوئی عام لڑکی ہے۔ کچھ لوگ شاہ عالم کو بھی پہچانتے تھے اور اخبار کی ایڈیٹر شبنم کو بھی۔ کیا سوچا ہو گا انہوں نے میرے بارے میں اور خود شبنم کی نیک نامی کا امیج خراب ہوا ہو گا۔ کہیں روزنامہ "خبردار" کو خبر مل گئی تو ایک چٹپٹی سُرخی۔ شاہ عالم کی محبوبہ کا ائرپورٹ پر ہنگامہ۔ صحافی خاتون لندن جانے کا ارادہ ترک کر کے واپس چلی گئیں۔

اور بہت سی باتوں کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں شبنم کی تلون مزاجی کے یہ دورے اعصابی تو نہیں؟ مسلسل دباؤ کا شکار رہنے سے اعصاب بالآخر جواب دے جاتے ہیں۔ مرد تو پھر بھی برداشت کرتے ہیں مگر عورتوں پر فوراً ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا ہے جو اس لحاظ سے اچھا ہے کہ رو پیٹ کے یا چیخ چلا کے وہ دل کی بھڑاس نکال لیتی ہیں۔ یہ دورے پڑتے جائیں تو پاگل پن جیسی علامات بھی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ کیا شبنم کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے؟

"او نہیں جی!" میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تربوز جیسے شخص نے کہا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور گولائی برابر تھیں اور وہ ایک قدیم وضع کا دھاری دار سوٹ پہن کے بیٹھا ہوا تھا جس کا رنگ پرانا ہو کے تربوز جیسا ہو گیا تھا۔

میں چونک پڑا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ کیا اس نے میرے ذہن میں آنے والا خیال پڑھ لیا تھا یا میں بے خیالی میں اونچا بول گیا تھا؟ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے تربوز مسکرایا۔ "معاف کرنا' مجھے اپنے آپ سے بولنے کی عادت ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ائرہوسٹس سے کافی طلب کی۔ تربوز نے ہونٹوں پر زبان پھیری "ہم بھی کچھ حلق تر کر لیں۔ ادھر تو مفت کی ملتی ہے۔"

ائرہوسٹس نے مطلب سمجھنے کے باوجود کہا "کیا چیں گے آپ؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ یہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے 'آپ جائیں'۔"

تربوز اچھلا "کیسی بات کرتے ہو جی آپ! میں ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن ابھی خود آپ نے مجھے بتایا تھا۔۔۔"

ظاہر ہے اس کے بعد ہمارے تعلقات میں سرد مہری آگئی اور میں نے خدا کا شکرادا کیا کہ مجھے تنہائی میسر آئی لیکن کافی آنے سے پہلے ہی چندا نمودار ہوئی۔ اس نے تربوز سے مخاطب ہوکے انتہائی شیریں لہجے میں مسکرا کے درخواست کی۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو وہاں چلے جائیں' میری سیٹ پر۔"

تربوز کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ جو سیٹ چندا نے چھوڑی تھی اس کے برابر والی سیٹ پر ایک غیر ملکی خاتون بیٹھی تھی جس کے رخصت طلب کرتے شباب کا نظارہ غروب آفتاب کے منظر کی طرح نظر نواز تھا۔ "کیوں نہیں جی۔ آپ سوبار ادھر تشریف رکھو۔"

ظاہر ہے' چندا کو دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا تھا اور جب تک وہ میرے ساتھ بیٹھی' تب تک میں اپنی حیرت کے شاک کو جھیل چکا تھا اور چندا کے سازشی مقاصد کی کامیابی پر غصے کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس کی کوئی ذاتی وجہ نہ ہوتی تو میں تربوز سے زیادہ خوش ہوتا۔ دوسرے بہت سے مسافر ضرور میری خوش قسمتی پر رشک میں مبتلا ہوں گے کہ تربوز جیسے بے ہنگم اور بے ہودہ ہم سفر کی جگہ میری ہم نشیں چندا جیسی حسینہ ہوئی جس کے حسن کی تابانی ہر نظر کو خیرہ کرتی تھی۔

ایک مدت کے بعد میں نے اسے پھر دھوپ سے زیادہ اُجلے اور بے داغ سفید شلوار قمیص اور دوپٹے میں دیکھا۔ اپنی بڑی بڑی کاجل جیسی قدرتی سیاہی رکھنے والی آنکھوں اور اماوس کی رات سے زیادہ کالے بالوں کے ساتھ سفیدی کا یہ امتزاج اس کے حسن کو ایک ملکوتی سحر آفرینی کا انداز عطا کرتا تھا۔ اس نے بالوں میں چاندی کا کلپ لگا رکھا تھا جو پھولوں کے گلدستے جیسا تھا اور کانوں میں سفید چاندی کے آویزے پہن رکھے تھے جو بالکل موتیے کے پھول لگتے تھے۔ کمال کے اسپتال میں اس کو مسلسل نرس کی وردی میں اور گھر پر بالکل سادہ لباس میں میک اَپ کے بغیر دیکھنے کے بعد اس کی جلوہ نمائی کا یہ انداز میرے دل میں گزارے ہوئے وقت کی بہت سی حسین یادوں کو جگانے کا سبب بن گیا۔

اس نے میری گھورتی ہوئی خاموش نگاہوں سے گھبرا کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ لوگوں کی نظر صرف ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی نیت اور حقیقت کو نہیں۔"

وہ آہستہ سے بولی "تم خوش نہیں ہو میرے ساتھ بیٹھنے سے؟"

میں نے بداخلاقی سے کہا "اعتراض تو میں تربوز کے یہاں بیٹھنے پر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ میرا ذاتی جہاز نہیں ہے لیکن تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "یہ محض اتفاق ہے۔"

"دیکھو۔ زیادہ چکر مت دو مجھے۔ جسے تم اتفاق قرار دے رہی ہو وہ ایک سازش تھی تمہاری۔ تم سب کی۔ وہ الو کا پٹھا کمال اور کوئن بھی شامل ہیں اس سازش میں۔ میں نے صاف انکار کردیا تھا کہ تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس کے باوجود تمہیں مجھ پر مسلط کردیا گیا۔"

وہ مجروح لہجے میں بولی "نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں کوئن کے شوہر ایڈورڈ کے ساتھ ہی جاتی۔"

"لیکن تمہیں معلوم ہوگیا کہ میں بھی لندن جارہا ہوں اور میری بدقسمتی کہ میرے جانے کا ٹائم بھی COINCIDE کرگیا لیکن مس چاندنی' میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی خوش فہمی رہے۔ لندن میں اترتے ہی تمہارے اور میرے راستے الگ ہوجائیں گے۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سرہلایا "تم بہت خفا ہو۔"

میں نے تلخ اور طنزیہ لہجے میں کہا "جی نہیں۔ میں بہت خوش ہوں اور بہت شکرگزار ہوں آپ کے ہر جھوٹ کا۔ جو آپ نے میری زندگی میں زہر گھولنے کے لیے بولا۔ اس تمام ذلت کے بعد جو تم نے مجھے دی اور اس رسوائی کی اذیت کے بعد جو میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائی۔ تمہارا یہ سوال میرے زخموں پر نمک پاشی کے سوا کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی "تم کہتے ہو تو میں واپس چلی جاتی ہوں اپنی سیٹ پر۔"

اس سے پہلے کہ میں "یس پلیز" کہہ سکتا ائرہوسٹس نے اسے اور مجھے کافی تھمادی "اور کچھ سر!"

میں نے ایک گہری لمبی سانس لے کر کہا "نو' تھینک یو!" اور پھر چندا کی طرف دیکھا "خدا کے لیے اب رونا مت شروع کردینا۔"

چندا کوشش کرکے آنسوؤں کو پی گئی۔ ہمارے درمیان

رنجش اور دلآزاری کے جذبات کی ایک خلیج حائل ہوگئی تھی۔ میں اس سے سخت ناراض تھا کیونکہ اب ائرپورٹ پر شبنم کی اچانک خفگی کا سبب مجھ پر عیاں ہوگیا تھا۔ اس کی نظر نے وہ دیکھ لیا تھا جو میں نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے یقیناً ڈیپارچر لاؤنج سے اندر جانے والوں کی قطار میں چندا کو دیکھ لیا تھا۔ میرے اِدھر اُدھر دیکھنے سے پہلے ہی چندا لاؤنج کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے مسافروں کے ہجوم میں گم ہوچکی تھی۔

اچانک شبنم کو احساس ہوا تھا کہ اس کو بے وقوف بنایا گیا۔ اس سے جھوٹ بولا گیا۔ میں نے اس کے سر کی قسم کھائے کہا تھا کہ میں چندا کے ساتھ لندن نہیں جارہا ہوں۔ میں اس کی بدگمانی پر بہت مشتعل ہوا تھا مگر میرا وہ غصہ ہی جھوٹ تھا۔ اس نے تصدیق کے لیے ائرلائن سے معلوم کیا تو اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ چندا یا چاندنی خان کے نام سے لندن جانے والی کوئی مسافر خاتون نہیں لیکن یہ بھی جھوٹ تھا۔ چندا نے جانتے بوجھتے اپنے اصل نام کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا۔ شاید اس نے نیا پاسپورٹ کسی اور نام سے حاصل کیا تھا۔ شاید وہ مسز ناصر عظیم کے نام سے سفر کررہی تھی اور یہ انتظام میں نے چندا کے ساتھ مل کے کیا تھا۔ شک' حسد اور رقابت کی چنگاریاں اس کے دل میں پہلے ہی روشن تھیں۔ چندا کو اسی فلائٹ کے مسافروں میں دیکھ کر شبنم کے جذبات میں ایک دھماکے سے آگ لگ گئی۔

اس کے بعد جو شبنم نے کیا' وہ ایک فطری نفرت کا ردِعمل تھا۔ اب میں اسے کیسے یقین دلاؤں گا کہ میں نے اس سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں تو خود ایک سازش کا شکار ہوا تھا۔ میں کیسے اسے قائل کروں گا کہ چندا کے بارے میں جو کچھ وہ سوچتی ہے' محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں اسے ڈبل کراس نہیں کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چندا کے ساتھ پینگیں نہیں بڑھا رہا تھا اور اُس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لندن نہیں جارہا تھا۔

مجھے کمال پر بھی سخت طیش آرہا تھا جس نے میرے ساتھ شبنم کو جانتے بوجھتے نتھی کیا۔ میرے واضح انکار کے باوجود اسے میرے پروگرام میں شامل کردیا اور اسی فلائٹ پر اس کے لیے بھی سیٹ لے لی جس سے میری روانگی طے تھی۔ حیرانی مجھے فلائٹ انفارمیشن دینے والوں پر تھی۔ انہوں نے کنفرم کیا تھا کہ پیسنجرز لسٹ میں چندا کا نام شامل نہیں ہے۔

کافی کا مگ چندا کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کے کونے سے ایک قطرۂ اشک کو ٹپکنے سے پہلے ہی صاف کردیا جو اس کے ضبط کی کوششوں کو شکست دے کر آنکھوں سے نکل آیا تھا۔

"میں۔ اپنی سیٹ پر چلی جاتی ہوں" چندا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

میں نے کچھ ندامت محسوس کی اور تربوز کا تصور کیا "اب آگئی ہو تو بیٹھی رہو لیکن ایک بات بتاؤ مجھے۔ تم کس نام سے سفر کررہی ہو۔"

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "اپنے نام سے۔ اپنے پاسپورٹ پر۔"

میں نے کہا "عجیب بات ہے۔ فلائٹ انفارمیشن والوں نے بھی مجھ سے جھوٹ بولا۔ کل میں نے معلوم کیا تھا۔ تمہارا نام پیسنجرز لسٹ میں نہیں تھا۔"

"اگر ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

"شاید اپنی سیٹ کینسل کرادیتا۔ ایک ہفتے بعد جاتا۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ تم سے کسی نے نہیں بولا۔ میں کل ہی آگئی تھی لیکن میری سیٹ چانس پر تھی۔ کل مجھے جگہ نہیں ملی۔ آج خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مل گئی۔ مجھے تو یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ تم بھی اسی فلائٹ پر ہو اور اگر تم لیٹ نہ ہوتے تو شاید ہماری ملاقات ٹرانزٹ لاؤنج میں ہوجاتی۔ میں نے تمہیں جہاز میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں چار قطاریں چھوڑ کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔"

مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہوئی۔ دنیا اتنی جھوٹی نہیں تھی جتنا میں نے اسے فرض کرلیا تھا۔ "تم۔۔ اکیلی کیوں جارہی ہو؟"

"ایڈورڈ کو اچانک فلو کا اٹیک ہوگیا۔"

"اس الو کے پٹھے کمال نے کہا ہوگا کہ تم جاؤ۔ جہاز میں تمہیں ناصر مل جائے گا' اسے پکڑلینا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ناصر عظیم نہیں' شاہ عالم ہو" وہ تلخی سے بولی۔

"لندن میں تمہارا ایک کزن بھی تو ہے؟" میں نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہے۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میرا کزن مجھے ریسیو کرنے آئے گا۔"

باہر ایک تاریک آسمان کے سوا دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ "تم جانتی ہو' میں لندن کیوں جارہا ہوں؟"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم میرے ساتھ نہیں

جا رہے ہو۔ یہ دہری زندگی تم کیوں گزار رہے ہو ناصر' کیا مجبوری ہے؟"

میں نے کہا "تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ مجبوری ہے؟"

"یعنی تم جو بھی کر رہے ہو' اپنی مرضی اور خوشی سے کر رہے ہو۔ پہلے تم اپنی مجبوری کا رونا روتے تھے۔ قسمیں کھاتے تھے اور معافیاں مانگتے تھے مجھ سے کہ تم مجبور ہو شاہ عالم بننے پر؟"

"تم نے کون سا معاف کر دیا تھا" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"بے شک وہ غلطی تھی میری لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ میں تمہاری مجبوری کا عذر قبول کر لیتی تو اس سے بھی کیا فرق پڑتا پھر ناصر عظیم بن کے کون سا تم لوٹ آتے۔"

میں نے کہا "غلط بات مت کرو۔ یہ بات ابھی اتنی پرانی نہیں ہوئی ہے کہ تم جو چاہو کہہ دو اور میں مان لوں۔ میں تو بار بار لوٹ کے آیا تھا چندا۔ مسلسل دستک دیتا رہا لیکن تم نے اپنے دل کے دروازے ایسے بند کر لیے تھے کہ تمہارے کانوں تک میری آواز ہی نہیں گئی۔"

اس نے کچھ دیر بعد کہا "اب اگر مجبوری نہیں تو تم شاہ عالم کیوں بنے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ اس دلدل سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں پھر آج خود اسی دلدل میں کیوں اترے ہو؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "کیا کرو گی تم یہ جان کے؟"

"نہ بتانا چاہو تو تمہاری مرضی" وہ آہستہ سے بولی۔

خاموشی کا ایک اور طویل وقفہ آیا جس میں وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ شاید اس وقت کے بارے میں جسے واپس لانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ میں کھڑکی سے باہر کے اندھیرے میں اس وقت کی پرچھائیاں دیکھتا رہا جس کا ہر لمحہ میری یادوں کے عجائب خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اسے مٹایا جا سکے اور میں مٹانا بھی نہیں چاہتا تھا کسی شاعر نے ویسے تو حقیقت بیان کی تھی کہ۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب' چھین لے مجھ سے حافظہ میرا لیکن اس عذاب میں بھی تسکین کے کتنے اسباب ہیں۔ لوگ بچھڑ جانے والوں کو گزری ہوئی منزلوں کو' پرانے لوگوں کو' ان چیزوں کو جو کبھی ان کے پاس تھیں' اور انہیں بہت عزیز تھیں۔ جب میں اسکول میں تھا تو مجھے سالگرہ پر ایک سائیکل ملی تھی تحفے میں اور وہ پہلی کار جو میں نے خریدی۔ ایک کتا کئی سال ہمارے ساتھ رہا۔ کتابوں میں رکھے ہوئے پھول۔ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط۔ ان سب کو بھولنا کون چاہتا ہے۔ سرحد پار سے آنے والے آج بھی ان گلیوں کو یاد کرتے ہیں جہاں ان کا بچپن بیتا۔ پردیس میں وطن کی یاد آتی ہے۔ جتنا تڑپاتی ہے اتنا ہی سکون بھی دیتی ہے۔ NOSTALGIA کا الگ نشہ ہے جس کا مقابلہ شاید کوئی اور نشہ نہیں کر سکتا۔ پرانے خواب بار بار دیکھنے کا لطف اٹھانے کے لیے ہر شخص پرانی تصویروں کے البم کھول کے بیٹھتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور وقت کے کون سے حصے میں ہے۔

ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ چندا کو پھر پرانے روپ میں دیکھا۔ اس کے قرب کو پھر محسوس کیا۔ اس کے وجود کی سحر آفریں خوشبو نے پھر حواس کو چھیڑا۔ اس نے پھر گزرے ہوئے وقت کی بات کی تو جیسے یادوں کے سب دریچے کھل گئے۔ پرانے البم کے صفحے ایک ایک کر کے پلٹتے ہوئے مجھے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔

اچانک چندا نے کہا "ناصر۔ تمہیں یاد ہے۔"

میں چونکا "کیا؟"

"ایک بار۔ جب خان جی بیمار تھے۔ مسلسل کوما میں تھے اور تم انہیں دیکھنے آئے تھے تو انہوں نے تم سے باتیں کی تھیں۔"

میرے حلق میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی "بہت اچھی طرح یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ ایک ایک لفظ یاد ہے اور یہ بھی میں نہیں بھولا کہ تم نے ان کے کہے ہوئے ہر لفظ کو جھٹلا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ میری مجبوری کے عذر کو تسلیم کر لیا تھا انہوں نے۔ انہوں نے اعتبار کر لیا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں' ہمیشہ تھا اور رہوں گا اور کتنی سفاکی کے ساتھ تم نے کہہ دیا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہے کہ مجھے کتنا دکھ ہوا تھا؟ کتنا گر گیا تھا میں خود اپنی نظر میں۔ کیا میں خان جی سے کوئی جھوٹ منسوب کر سکتا تھا۔ اپنے فائدے کے لیے۔ نعوذ باللہ۔ یہ تو میرے نزدیک ایسا ہی گناہ عظیم ہوگا جیسے میں کسی دنیاوی فائدے کے لیے کسی کو حدیث گھڑ کے سنا دوں۔ کتنا رویا تھا میں اور کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے کہ ایک بار' صرف ایک بار خان جی کو ہوش آجائے اور وہ تمہارے سامنے کہہ دیں کہ چندا' ناصر نے جو کہا سچ تھا۔ یہ زخم آج بھی تازہ ہے میرے دل میں۔ میں آج بھی جھوٹا ہوں تمہاری نظر میں۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا "نہیں۔ تم نے سچ کہا تھا۔"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا "رہنے دو چندا۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "تم چاہو تو بدلہ لے سکتے ہو۔ آج مجھے جھوٹا کہہ کے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ میرے بس کی بات ہوگی۔ اگر کتا مجھے کاٹ لے تو میں کتے کو نہیں کاٹ سکتا۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں اس نے دو بار میری طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے چندا کے پاس الفاظ نہیں تھے یا وہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے مجھ سے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں۔ میں بے نیازانہ انداز میں منتظر رہا۔

بالآخر اس نے کہا "ناصر۔" اور کچھ دیر دوپٹے کے کونے کو اپنی ایک انگلی پر لپیٹتی کھولتی رہی۔ "میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔"

میں نے کہا "غالب کا ایک شعر سناؤں؟۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔"

وہ بولی "تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟"

میں نے طنز سے کہا "دیکھو مس چاندنی خانم! اول تو میں دل میں کسی کے خلاف کینہ رکھتا نہیں۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ تم اپنی زندگی جی رہی ہو' میں اپنی جی رہا ہوں۔ اب اس سے کیا فرق پڑے گا۔ اگر میں کہوں کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔"

"فرق مجھے پڑے گا۔"

میں نے تلخی سے کہا "اگر تم سمجھتی ہو کہ اس کے بعد سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا۔ میں ساری باتیں بھلا کے لندن میں تمہارے ساتھ چل پڑوں گا۔ تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میری اور تمہاری زندگی کے راستے جدا ہو چکے ہیں۔"

"راستے کہاں جدا ہوتے ہیں۔ ہم وقت کی ایک ہی راہ گزر پر ہیں۔ خون کے رشتوں کی طرح ایک رشتہ وقت کی مسافت کا بھی ہوتا ہے۔ کتنا عرصہ ہم ایک دوسرے کی ہم سفری ... میں گزار چکے ہیں۔ اس وقت سے انکار کیسے ممکن ہے کہ وہ ہماری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ ہم تو اس وقت بھی ساتھ ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میں چاہتا تو دلائل سے اس کو غلط ثابت کر سکتا تھا مگر اس کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ میں بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتا تھا اور یہ اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا کہ میرے اس کے درمیان شناسائی کا رشتہ جیسا پہلے تھا وہی آج بھی ہے۔

وہ اچانک بولی "تم خوابوں پر یقین رکھتے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے خوابوں کی نفسیات پر۔ سگمنڈ فرائڈ کی کتاب کچھ لوگوں کے لیے مستند ہوگی' میں اس سے متفق نہیں۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں جانتے بوجھتے ہر بات کا الٹا جواب دے رہا ہوں "میری مراد تھی خوابوں کی تعبیر سے۔ تم نے کبھی خان جی کو خواب میں دیکھا؟"

میں سنبھل گیا "ہاں۔ یاد نہیں پڑتا کتنی بار۔"

"تم جانتے ہو دنیا میں خدا کے بعد مجھے ان کے سہارے پر کتنا بھروسا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے لیے ان کے بغیر جینا ممکن ہوگا۔ جب تم ساتھ تھے تو مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ جس دن خان جی نہیں ہوں گے اس دن میں کیا کروں گی۔ بعد میں خان جی نے باتوں باتوں میں مجھے اکثر سمجھایا کہ۔ خیر چھوڑو' ان باتوں کا اب کوئی مطلب نہیں۔ خان جی نہیں ہیں اور میں زندہ ہوں۔ اس لندن جانے والی فلائٹ پر ہوں اور اتفاق سے تم بھی ساتھ ہو۔"

میں نے پہلو بدل کے کہا "تم خواب کی بات کر رہی تھیں۔"

"ہاں' ان کے انتقال کے بعد میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ جو ایک قدرتی بات تھی۔ میں ہر وقت روتی رہتی تھی۔ رات کو سو نہیں سکتی تھی۔ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ خان جی کی چیزوں کو سامنے رکھے گھنٹوں چپ بیٹھی رہتی تھی۔ خیر' وہ وقت گزر گیا۔ کمال نے میرا علاج کیا۔ قمر نے بہت سہارا دیا ہے اور کمال نے بھی بڑی محنت سے علاج کیا۔ سکون آور دوائیں کھانے والے ان کے عادی ہو جاتے ہیں پھر ان دواؤں کے بغیر جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا مگر کمال نے واقعی کمال کر دیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ مجھے پھر نارمل لائف کی طرف لایا۔ شاید پوری طرح نارمل اب بھی نہیں ہوں میں لیکن اب مجھے احساس ضرور ہے کہ میں نارمل نہیں ہوں اور یہ خواہش بھی رکھتی ہوں کہ نارمل ہو جاؤں۔ تم پھر کہو گے کہ خوابوں کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ میں پرانے دکھڑے رونے بیٹھ گئی۔ یہ بات نہیں' دراصل میں جو بتا رہی ہوں اس کا میرے خوابوں سے تعلق ہے۔ میں نے کبھی خان جی کو خواب میں نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ خیال آتا تھا کہ وہ ناراض ہیں مجھ سے اور اس لیے وہ میرے خوابوں میں نہیں آتے۔ کمال نے مجھے

سمجھایا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو سکتا ہے۔ خان جی کی روح تمہاری حالت دیکھ کے یقیناً بے چین ہوگی مگر وہ تمہارے خواب میں اس لیے نہیں آئے کہ تم خواب میں انہیں دیکھوگی اور ان سے باتیں کروگی تو تمہاری پُرسکون زندگی پھر انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ شاید اس لیے کہ ایک دوست' ہمدرد اور مسیحا کے طور پر میں پوری طرح کمال پر DEPENDANT تھی۔ وہ زندگی کی طرف میری راہنمائی کر رہا تھا۔ میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ میں اسے غلط سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اتنی ہمت کہاں تھی مجھ میں کہ خود کچھ کر سکوں لیکن گزشتہ ہفتے میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔"

میں نے کہا "اب تو خوش ہوں گے وہ؟"

"نہیں۔ وہ مجھ سے خفا تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سائے کی طرح دروازے میں کھڑے ہیں۔ ان کے پیچھے تیز روشنی تھی مگر سامنے تاریکی تھی۔ میں ان کا چہرہ صاف نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انہوں نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سفید پتلون' سفید ٹی شرٹ اور جاگرز۔ میں کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ خان جی' اندر آجائیں تو وہ بولے کہ نہیں۔ میں اندر نہیں آسکتا۔ میں نے ان کی آواز سے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ وہ کچھ نہیں بولے اور پلٹ کر چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے دوڑی اور میں نے انہیں آواز دی۔ خان جی' خان جی' کچھ بتایئے تو سہی۔ اس وقت تک وہ باہر والے گیٹ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ ہمارا پرانا گھر تھا۔ ان کی پرانی ملٹری ماڈل انیس سو باون کی جیپ بھی وہاں موجود تھی۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "وہ جیپ کہاں گئی؟"

"کمال نے دے دی کسی کو۔ شاید اسی نے لی تھی جس نے ہمارا مکان خریدا تھا۔ کمال نے سب دے دیا تھا۔ میرے پاس ایک تو پرانا فریج ہے' ایک سلائی مشین۔ ایک ایکسر سائز مشین۔ ٹی وی' ریڈیو اور کچھ برتن۔" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بولی "باہر بھی عجیب سی روشنی تھی لیکن اس روشنی میں اور کچھ نظر نہیں آیا مجھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خلا میں ہیں اور خلا کو روشنی نے بھر دیا ہے۔ کچھ عجیب سا خواب تھا۔"

میں نے کہا "خواب عجیب ہی ہوتے ہیں۔"

"خان جی نے ایک بار پلٹ کے دیکھا مجھے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ اور ناراضی کے جذبات تھے۔ کوئی جواب دیے بغیر وہ غائب ہو گئے لیکن جیسے کسی نے اچانک روشنی گل کر دی ہو۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑی رہ گئی۔ میں نے انہیں بہت آوازیں دیں۔ خان جی' خان جی مگر وہ جا چکے تھے پھر میری آنکھ کھل گئی اور مجھے ایسا لگا کہ میں خود اپنی آواز سے جاگی ہوں۔ شاید میں خان جی خان جی چلا رہی تھی۔ میرا جسم کانپ رہا تھا اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کے پانی پیا اور پھر ساری رات سو نہیں سکی۔ مجھے شدت سے اپنے اکیلے ہونے کا احساس ہوا۔ میری آواز پر کوئی اٹھ کے نہیں آیا تھا۔ کوئی مجھے تسلی دینے والا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "اس تنہائی کی زندگی کا انتخاب خود تم نے کیا ہے۔"

"ہاں۔ میں کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ اپنے آپ کو اکیلا کرنے والی میں خود ہوں۔ آج تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ قمر مجھ سے بدگمان ہے۔ رئیس بھی میرے پاس نہیں آتا۔ کمال کو ضرور ہمدردی ہے مجھ سے مگر میں جانتی ہوں کہ یہ ہمدردی ایک مریض کے لیے ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک ساتھی کے لیے جو بیمار ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے جو طبعاً شریف اور اس کا دل سب کے لیے ہمدردی کے جذبات سے معمور ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط سوچ ہے۔ زندگی نے ہم سب کو جس رشتے سے باندھ رکھا ہے' وہ حالات اور صدمات سے ٹوٹنے والا نہیں ہے۔"

وہ پھر کچھ دیر سوچتی رہی۔ "صبح میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا مگر کمال نے محسوس کر لیا کہ میں کچھ چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی ہوں۔ اس نے اصرار سے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ وہاں کوئن بھی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے دعا کرنی چاہیے اور خدا سے سکون اور استطاعت مانگنی چاہیے۔ جب میں پریشان ہوتی ہوں تو چرچ میں جا کے اپنی پریشانی خدا کو بتا دیتی ہوں اور خدا میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ وہ ہمیشہ میرے کام آتا ہے۔ آج میں چرچ جاؤں گی اور تمہاری بات کروں گی خدا سے۔ مجھے کوئن کی بات اچھی لگی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ہم نے اسپتال میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا۔ سب مریض اور اسٹاف کے لوگ شریک ہوئے۔ میں نے کمال نے اور قمر نے مل کے ایک قرآن ختم کیا۔ رات کو میں نے خان جی کی مغفرت کے اور روح کی آسودگی کے لیے دعا مانگی لیکن دوسری رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ خان جی دروازے تک آکے رک گئے۔ میں نے پھر ان سے اندر آنے کے لیے کہا مگر وہ نہیں آئے۔ فرق صرف یہ پڑا کہ مجھے ان کے چہرے پر دکھ اور ناراضی کے جذبات کی جگہ ایک شفیق مسکراہٹ نظر آئی۔ انہوں نے مسکرا کے کہا کہ آج نہیں' پھر کبھی آؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ پھر کب؟ تو وہ جاتے جاتے پلٹ کے بولے۔ چندا' تم نے کسی کا دل دکھایا ہے' کیا تمہیں اس کا احساس ہے؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خان جی؟ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلے گئے۔ میں پھر جاگ اٹھی اور پھر صبح تک جاگتی رہی۔"

میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ بالکل نامعلوم طریقے پر مجھے چندا سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف جذبات رنجش اور کدورت پر مبنی تھے' ان کو نفرت کا نام دیا ہی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس لڑکی سے نفرت کرنا میرے اختیار کی بات ہی نہیں تھی جس کے نام میں نے اپنی زندگی کر دی تھی لیکن اپنی ایک غلطی پر اس کے حاسدانہ' معاندانہ اور ذات آمیز رویے نے مجھے اس سے بہت دور کر دیا تھا۔ میں سخت مایوس تھا اور اپنے آپ سے بھی خفا تھا۔ مجھے چندا سے سخت شکایت تھی کہ اس نے مجھے معاف نہیں کیا اور مجھ پر واپسی کے دروازے اتنی بے رحمی کے ساتھ بند کیے کہ میں لوٹ کر ایک اجنبی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم یہ امید میں نے کم نہیں کی تھی کہ ایک دن چندا کو میرے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا احساس پشیمان ضرور کرے گا۔

مجھے یوں لگا جیسے اچانک مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں رہا کیونکہ مجھے معاف کرنے کے بجائے اب وہ الٹا مجھے معاف نہ کرنے پر مجھ سے معافی مانگ رہی ہے اور یہ احساس اس کے لیے ایک آزار بن گیا ہے۔ مجھے اس پر ترس آیا اور مجھے فرید عباسی کی بات یاد آئی۔ شاید اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ چندا کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کی مدد نہ کی تو وہ ساری دنیا کی ہمدردی بھی اسے ناکافی ہوگی۔ اپنے احساسِ جرم کی خلش اس کے لیے ایک نیا روگ بن جائے گی۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ "دوسرے دن کمال نے مجھے ایک گولی دے دی۔ وہ میں پہلے بھی استعمال کر چکی تھی۔ دماغ کو متاثر کرنے والی دوائیں بھی بڑی عجیب تاثیر رکھتی ہیں۔ ایک زمانے میں مجھے ڈراؤنے خواب پریشان کرتے تھے۔ یہ گولی کھانے سے وہ خواب غائب ہو گئے تھے لیکن اس دن میں نے جانتے بوجھتے وہ گولی نہیں کھائی۔ مجھے ایسا لگا کہ گولی کھا کے میں اس دروازے کو مقفل کر دوں گی جس کی دہلیز تک آکے خان جی دو بار لوٹ گئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی ناراضی دور ہو۔ وہ اندر آئیں' مجھ سے بات کریں۔ اگر میں نے خوابوں کا در بند کر دیا تو وہ کیسے آئیں گے۔ ایک خواب کا مسلسل دو دن نظر آنا یقیناً کوئی معنی رکھتا تھا۔ اچانک میرے لیے اس خواب کی بہت اہمیت ہو گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے پیچھے کوئی الہامی اشارہ ہے تو دستِ غیب اس کی وضاحت بھی کرے گا۔ خان جی مجھے ضرور بتائیں گے کہ وہ مجھ سے کیوں خفا ہیں اور میں نے کس کا دل دکھایا ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں میرا خیال نہیں آیا؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرمسار التجا تھی۔ اعتراف تھا اپنی کوتاہی کا اور اظہار تھا اپنی کم آگاہی کا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا "بالآخر آیا' دیر سے آیا مگر آیا۔ میں سونا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ کوئی خلش تھی جس کے باعث میں کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ میں سونا چاہتی تھی تاکہ خان جی کو پھر خواب میں دیکھوں مگر سونا مشکل ہو رہا تھا۔ میری کیفیت کو غالب نے ایک شعر میں بیان کیا تھا۔ وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے۔ ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے۔"

میں حیران رہ گیا حالانکہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ چندا کا شعری ذوق ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اسے دیوان کے دیوان ازبر تھے' مارشل آرٹ میں مہارت کی طرح۔ اس معاملے میں بھی اکثر میں اس سے مار کھا جاتا تھا۔ آج وہ پھر پہلے کی طرح باتیں کر رہی تھی اور میں پہلے کی طرح بے خودی میں سن رہا تھا۔ اچانک ہمارے درمیان گزرے ہوئے وقت کا فاصلہ بے معنی ہو گیا تھا۔ قیدِ زمان و مکاں کا وجود نہیں رہا تھا۔ میرے آس پاس پی آئی اے کی لندن جانے والی فلائٹ' طیارے کے اندر کی دنیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر' جہاز کی روشنیاں' وہ فلم جو دکھائی جا رہی تھی اور جسے مسافر ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سیٹ جس پر میں اور چندا ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سب کا مفہوم ہی نہیں رہا تھا۔ میرے سامنے وہ تھی۔ اس کا پیکرِ حسن و رعنائی تھا۔ اس سے وابستہ یادوں کا مہرباں سلسلہ تھا اور اس کی آواز کی نغمگی کا بہتا آبشار تھا اور میں مسحور بیٹھا تھا۔

"۔۔۔ پھر میرا خیال ہے کہ ذرا دیر کے لیے میری آنکھ لگی یا شاید اس وقت بھی میں جاگ رہی تھی جب میں نے تمہیں اپنے روبرو دیکھا اور تمہاری آواز بھی سنی۔ تم نے کہا۔ چندا' آخر کب آئے گا تمہیں یقین کہ تم نے میرا دل دکھایا تھا اور میں چونک پڑی۔ مجھے اپنے آپ سے اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس خیال پر کہ آخر مجھے یہ

خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی جو خان جی کو کہنا پڑی۔ میں خاموش لیٹی چھت کو گھورتی رہی اور سوچتی رہی۔ بہت سی باتیں یاد آئیں۔ مجھے جو بہت تکلیف دہ تھیں۔ مجھے وہ رویہ یاد آیا جو میں نے تمہارے ساتھ روا رکھا تھا اور ہر غلطی جسے میں نے پہلے غلطی نہیں سمجھا تھا۔ مجھ پر ایسے واضح ہوتی گئی جیسے سورج نکلتا ہے تو دھوپ بڑھنے کے ساتھ دھند اور کہر میں ڈوبے ہوئے منظر جو نگاہوں سے اوجھل تھے' رفتہ رفتہ صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اپنے ہر فعل کو میں نے تمہاری نظر سے دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں ایسا بھی کر سکتی تھی لیکن میں نے جو کیا وہ پاگل پن تھا۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ میں بہت پچھتائی اور میں نے جتنا سوچا اتنا ہی میری نظر میں میرا جرم سنگین سے سنگین تر ہوتا گیا۔ میں نے طے کیا کہ اب جیسے بھی ہوگا میں تم سے معافی مانگوں گی اور ظاہر ہے کہ مجھے آسانی سے معافی نہیں ملے گی۔ کفارے کے طور پر مجھے اس سے زیادہ ذلت کا عذاب برداشت کرنا ہوگا۔ جتنا تم نے جھیلا تھا لیکن میں اس کے لیے تیار تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ خواہ تم مجھے ٹھکراؤ' دھتکارو' مجھے سے دور بھاگو۔ مجھ سے نفرت کا اظہار کرو' میں اس وقت تک اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی جب تک مجھے یقین نہ آجائے کہ اب تمہارے دل پر میری طرف سے کوئی غبار نہیں رہا۔ تم چندا کے لیے وہی ناصر عظیم ہو جو تھے اور چندا تمہارے لیے پھر وہی ہوگی کہ جو تھی۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟ میں نے سوچا مگر جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے اور آدمی کوشش کرے تو خدا کو بھی پالیتا ہے۔ جیسے خدا پر بندے کا یقین ابدی و ازلی ہے کہ وہ تھا' ہے اور رہے گا اور یہ کہ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ ایسے ہی تمہاری ذات پر میرا اعتماد ہے کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے' تم مجھ سے نفرت نہیں کرسکتے۔ تم مجھے نظرانداز کرسکتے ہو۔ بھلا نہیں سکتے۔ تم مجھے غصے میں برا بھلا کہہ سکتے ہو۔ تھپڑ بھی مار سکتے ہو مجھے۔ مجھ سے بات کرنا بند کرسکتے ہو اور مجھے نظر سے گرا سکتے ہو مگر میری سزا کو تم تمام عمر کے لیے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ایک بار پھر غالب کی زبان میں کہوں۔ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے۔ آخر گنہگار ہوں' کافر نہیں ہوں میں۔"

میں پھر حیران رہ گیا۔ حالانکہ اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی۔ چندا آج پھر وہی زبان بول رہی تھی جو اس کی مادری زبان تھی۔ لغوی معنوں میں ۔ کیونکہ یہ ذوق اور فنکارانہ مزاج اسے اپنی ماں کی طرف سے ملا تھا۔ اس ذوق و شوق کی نشوونما میں خان جی کی حوصلہ افزائی ضرور شامل تھی

مگر انہوں نے چندا کو شعروادب یا موسیقی کی طرف مائل نہیں کیا تھا۔ خان اعظم جتنے بڑے انسان تھے' اتنے ہی مزاج کے اعتبار سے پیشہ ور یعنی پروفیشنل سولجر تھے۔ انہوں نے بڑے نظم اور سلیقے کے ساتھ مجھے اور چندا کو مارشل آرٹ کی تعلیم دی تھی اور ایک نظریاتی ڈسپلن سکھایا تھا۔

بیشتر مسافر اب سوگئے تھے یا سونے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ ہمارے آگے دو کاروباری ہم سفر' دنیا بھر کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو اور یورپی ممالک کے ٹیکسٹائل کوٹا سے ڈبلیو ٹی او تک کے مسائل پر بحث کرتے کرتے تھک گئے تھے اور ان میں سے ایک کے خراٹے پیچھے تک سنائی دے رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال مخالف سیاسی نظریات رکھنے والے دو پارٹی لیڈرز کا بھی تھا جو ملکی سیاست کے کسی اہم معاملے پر صلاح مشورے کے لیے لندن جارہے تھے۔ پیچھے دو متحارب مذہبی عقائد کے حامل علما کی بحث کچھ دیر شائستگی کے دائرے میں رہی پھر دونوں کی قوت برداشت جواب دینے لگی تو انہوں نے ایک دوسرے پر ذاتی حملے شروع کیے۔ ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ وہ آپ جناب سے تو تکار پر آگئے پھر ایک دوسرے پر چلانے لگے اور اگر فوری طور پر سامعین دخل اندازی نہ کرتے تو شاید وہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچتے اور کپڑے پھاڑتے۔ انہیں الگ الگ بٹھانے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ وہ خاموش ہوجانے والے آتش فشاں کی طرح ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے دھواں دے رہے تھے۔

ہمارے علاوہ صرف ایک اور جوڑا تھا جو اپنی باتوں میں اتنا مگن تھا کہ انہیں اردگرد کی دنیا کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز میں اگر ہائی جیکر آجاتے تب بھی شاید وہ ایک دوسرے کے شانوں سے شانے ملائے اسی طرح ہنستے اور باتیں کرتے رہتے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اور وہ ہنی مون منانے نکلے ہیں۔ اس عمر میں اور اس زمانے میں سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ جو نہیں کرتے پچھتاتے ہیں کیونکہ بعد میں تو ساری شادیاں صرف ازدواجی ذمے داریاں رہ جاتی ہیں' خواہ وہ لو میرج ہوں یا ARRANGED۔

ان کے علاوہ ہم تھے۔ ابھی تک چندا بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ بالآخر وہ تھک گئی اور اس نے اپنا سر پیچھے کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ائرہوسٹس کو طلب کیا اور اس سے کافی کے لیے درخواست کی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے رات کے آسمان کو دیکھا جو

تاریکی کا ایک صحرا تھا اور پھر نیچے زمین کو دیکھا جہاں سمندر بھی اتنا ہی تاریک تھا۔ اس اندھے خلا میں جہاز ایک اڑنے والا روشنی کا جزیرہ تھا جس پر دو ڈھائی سو انسانوں کی ایک آبادی باقی دنیا سے بالکل الگ تھی۔ صبح کے پونے چار بجے تھے اور اجالا ابھی کئی گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔

میں نے کہا "خان جی اس کے بعد خواب میں دکھائی نہیں دیے؟"

اس نے کافی ختم کی "کتنی عجیب ہے یہ واردات۔ شاید کسی اور کے لیے ناقابل یقین ہوگی میری ہر بات۔ مسلسل تیسری رات میں نے انہیں پھر خواب میں دیکھا۔ وہ جیسے روشنی کی ایک سرنگ میں سے نمودار ہوئے اور دروازے کے فریم میں ایک سائے کی طرح رک گئے۔ میں نے کہا کہ خان جی' آپ اپنے ہی گھر میں کیوں نہیں آتے؟ انہوں نے کہا کہ گھر تو تمہارا ہے اب۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے دکھی کررہے ہیں۔ وہ مسکرائے اور بولے نہیں۔ دکھی تم خود کررہی تھیں اپنے آپ کو اور میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لیے آیا تھا میں کہ تم سمجھ جاؤ اور کتنی اچھی بات ہے کہ تم سمجھ گئیں۔" پھر وہ آگے آئے اور انہوں نے میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور مجھے گلے لگا کے پیار کیا۔ میں رو پڑی۔ انہوں نے کہا کہ ندامت اور عجز کے اعتراف میں بہنے والے آنسو بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ تم نے کیا شعر سنایا تھا مجھے ایک بار۔ میں نے وہ شعر پڑھ دیا۔ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے۔"

میں نے کہا "خواب میں بھی شعر سنادیا؟"

"انہوں نے کہا تو سنادیا۔ بس اس کے بعد وہ چلے گئے اور جاتے جاتے کہہ گئے تم نے بڑا اچھا فیصلہ کیا۔ اپنا بوجھ بھی اتار دیا اور میرا بھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس رات میں جاگی نہیں۔ میں انہیں دروازے میں سے باہر جاتا ہوا دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ سایہ بن کے اندھیرے میں گم ہوگئے۔ صبح میں نے اپنے آپ کو بہت بدلا ہوا محسوس کیا۔ بالکل پہلے کی طرح ہلکا پھلکا اور آزاد۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے ذہن میں ایک مکڑی کا جالا تھا جس نے میرے خیالات کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ صاف ہوگیا ہے۔ میں بہت پُرسکون اور مطمئن تھی۔ کیا کبھی تمہیں اس کا احساس ہوا؟"

میں چونکا "کس بات کا؟"

"یہی کہ تمہاری زندگی اچانک بدل گئی ہے۔ تم وہ نہیں جو کبھی تھے۔ تمہارے اندر کوئی ایسی تبدیلی آئی ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ محسوس کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"کیوں ۔ جب تم نے شاہ عالم رہنے کے بعد پھر ناصر عظیم بننے کا فیصلہ کیا تھا تو کیسا لگا تھا تمہیں؟"

"کیا تم مجھے شرمندہ کرنے کے لیے یہ پوچھ رہی ہو؟"

وہ جلدی سے بولی "نہیں ناصر۔ چلو جانے دو اس بات کو۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں تمہارے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اس لیے تمہیں ایسا لگا۔ میں جو کچھ کررہا تھا اسے ایکٹنگ کہا جاسکتا ہے۔ میں شاہ عالم بنا نہیں تھا' اس کا رول کررہا تھا۔ اندر سے میں وہی ناصر عظیم تھا جو کہ میں پیدائش سے ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔ تمہارا احساس بھی ایک ذاتی تجربہ تھا۔ کسی اور کو فرق تمہارے رویے میں محسوس ہوسکتا تھا۔ وہی فرق جو ایک نارمل اور ابنارمل شخص کے رویے میں ہوتا ہے۔"

"تم بھی پاگل سمجھتے تھے مجھے؟"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ تم دنیا کا ہر کام ذمے داری اور عقل و شعور کے ساتھ کررہی تھیں۔ صرف میرے معاملے میں تمہارے جذبات بدل گئے تھے۔"

اس نے ایک آہ بھری "یہ پاگل پن ہی تو تھا۔"

میں نے کہا "تم کچھ دیر آرام کرلو' سوجاؤ۔"

اس نے بچوں کی طرح میری بات مان لی "اچھا" کہہ کے میرے کندھے پر سر رکھا اور دو منٹ میں سوگئی۔

اگر میں چندا کے سوال کا صحیح جواب دیتا تو کہتا کہ ہاں' یہ تجربہ مجھے ابھی ابھی ہوا ہے۔ میں اس تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہوں کیونکہ تمہارے لیے میرے جذبات اور میرے خیالات اچانک بدل گئے ہیں اور میں بھی بہت ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کررہا ہوں۔ جیسے میرے سر پر قرض کے احساس جیسا کوئی بوجھ تھا جو اتر گیا ہے۔ جس نے میرے پورے وجود کو مکڑی کے جالے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑ رکھا تھا' ٹوٹ گیا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہوا اور اس معاملے میں قصوروار میرے سوا کوئی نہیں۔ اس کے ابنارمل ہونے کے اسباب بہت واضح تھے۔ وہ دہرے صدمے سے بدحال تھی۔ پہلے میں نے اسے چھوڑ دیا پھر خان جی چلے گئے۔ وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہوگئی۔ جب اسے میری رفاقت اور سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو میں اس کے پاس نہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں کتنی دور چلا گیا ہوں۔ مجھے چندا کو رعایت

دینی چاہیے تھی۔ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ وہ نارمل نہیں مگر میں تو نارمل ہوں۔

یہ باتیں مجھے سب نے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں نے سمجھنے سے انکار کردیا تھا۔ سب نے دلیل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ چندا کو ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اسے غمگساری چاہیے تاکہ اس کا اعتماد بحال ہوسکے۔ وہ سنبھل سکے اور اس جذباتی بحران سے نکل آئے لیکن میں کسی دلیل سے قائل نہیں ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا تھا کہ چندا نے مجھے معاف نہیں کیا اور مجھے ذلیل کیا۔ حالانکہ وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ مجھے معاف کرسکتی۔ غصے میں ایک پاگل آدمی قتل بھی کردے تو یہ قتل نہیں سمجھا جاتا اور اس کی کوئی سزا نہیں ہوتی پھر میں نے چندا کو کیوں سزا دی؟

اپنے خیالات کی اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔ یکلخت چندا مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے لگتی تھی۔ میں اپنے آپ سے پشیمان تھا کہ اتنا عرصہ بلاوجہ اس سے الرجک رہا اور خود کو بھی خواہ مخواہ کے عذاب میں مبتلا کیا۔

وہ اجالا پھیلنے تک سوتی رہی اور میں جاگتا رہا۔ ایک ہی پوز میں بیٹھے بیٹھے میرے شانے بازو اور ٹانگیں سب اکڑ گئے تھے۔ میں نے گزرتی ہوئی ائرہوسٹس سے کافی کے لیے کہا تو چندا آنکھیں کھول کے ایک دم اٹھ بیٹھی "میرے لیے بھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم سو رہی تھیں یا سونے کی ایکٹنگ کررہی تھیں؟"

اس نے مسکرا کے انگڑائی لی اور چہرے پر آجانے والے بالوں کو سمیٹا "آئی ایم سوری' مجھے اچانک نیند آگئی۔ تم ایسے ہی بیٹھے رہے رات بھر؟"

میں نے کہا "رات بھر کہاں۔ چار تو بج گئے تھے باتیں کرتے ہوئے اور ویسے بھی مجھے ٹرین یا جہاز میں نیند نہیں آتی۔"

ناشتے کے بعد ایک فلم کا ٹائٹل دیکھ کے میں نے سوچا ہی تھا کہ کانوں پر ہیڈ فون چڑھالوں مگر اسی وقت پیچھے کوئی ہنگامہ شروع ہوگیا۔

ایک بڑے بڑے بالوں اور موٹے شیشوں کی عینک والا دانشور ٹائپ شخص چلانے لگا "مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔"

ایک خرانٹ' مہندی رنگ کے چھدرے بالوں اور مینج کرتی ہوئی داڑھی والے پچاس سال سے اوپر کے شخص نے غرا کے جواب دیا "تم خود کالے ہو' دال کے بچے!"

"یہ دونوں تمہاری بیویاں نہیں ہیں" دانشور نے کہا۔

"پھر کیا تمہاری بیویاں ہیں اور تم ہوتے کون ہو مجھ سے ثبوت مانگنے والے ورنہ میں اپنا نکاح نامہ دکھا سکتا تھا۔"

"میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ اس وقت تم منہ کھولے پڑے تھے اور خراٹے لے رہے تھے۔"

دانشور کو ایک اور شخص کی حمایت حاصل ہوگئی جو نسبتاً جوان اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ "کیا سنا تھا آپ نے؟"

"یہ شخص ایک کو بیوی بنا کے اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔ دوسری اس کی ماں ہے۔ ایک بیوی ہے تو دوسری کو ساس ہونا چاہیے مگر یہ دونوں کو بیویاں بتا رہا ہے۔"

غیر قانونی تارکین وطن کی حیثیت اختیار کرلینے والا مسافر شور مچانے لگا "یہ بکواس کرتا ہے' پوچھ لو ان دونوں سے۔"

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ساری بات سن لی ہے خود اپنے کانوں سے۔ تم نے ماں کو سبز باغ دکھا کے لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ لڑکی کو ڈر ہے کہ تم اسے لندن میں کسی غیر اخلاقی کام پر لگادو گے۔" دانشور نے چلا کے کہا اور اس طرح دوسرے مسافروں کو بھی متوجہ کرلیا۔

اس کا ساتھ دینے والے نوجوان نے کہا "بھائی صاحب۔ یہ کیا چکر ہے؟"

داڑھی والا چیخ کے بولا "تو بیٹھ چپ کرکے۔ اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔"

نوجوان مشتعل ہوگیا "تم جیسے لوگ پاکستانیوں کو بدنام کرتے ہو۔ ہماری بھی بے عزتی ہوتی ہے۔ یہاں تو میں چپ ہوجاؤں گا لیکن لندن کی پولیس کو تم کیسے چپ کراؤ گے۔"

"وہ میرا کام ہے۔ پولیس تم سے نہیں پوچھے گی کہ یہ تمہاری کیا لگتی ہیں اور ان کے منہ میں زبان ہے' یہ بتادیں گی۔"

دانشور بولا "یہاں کیوں گونگی بنی بیٹھی ہیں یہ۔ کیوں بی بی' مجھے بتاؤ کیا تمہاری بیٹی کا نام الفت جان نہیں ہے؟"

داڑھی والا غصے سے بے قابو ہوگیا "اوئے مجھ سے بات کرکتے!"

دانشور نے خواتین سے خطاب جاری رکھا "بتاؤ' کیا اس شخص نے تمہارے شوہر کو اور اس لڑکی کے باپ کو ایک لاکھ روپیہ نقد ادا نہیں کیا تھا۔ بولو۔۔۔ اور کیا تم خود اس کے

ساتھ نہیں جارہی ہو مگر میں بتادوں کہ یہ شخص تمہیں بھی پھنسادے گا۔ تم خاک حفاظت کروگی۔"

داڑھی والا اچھل کے پیچھے گیا "تو ایسے نہیں مانے گا۔"

"گالی دیتا ہے بے غیرت" دانشور چلایا۔

اس کا حامی نوجوان بروقت بیچ میں نہ آتا تو دانشور یقیناً پٹ جاتا کیونکہ وہ ہم عمر ہونے کے باوجود داڑھی والے سے کمزور تھا "اسٹاپ اٹ! یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔ یہاں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم لندن پہنچ کر دیکھ لیں گے۔"

"ان عورتوں سے پوچھا جائے ابھی' یہ نقاب اٹھا کے اپنا چہرہ دکھادیں۔ جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا" دانشور نے ہنگامہ جاری رکھا۔

داڑھی والا پھر اس پر حملہ آور ہوا "پردہ دار عورت کا چہرہ دیکھے گا تو' تیری تو۔"

نوجوان نے اسے پیچھے دھکیل کر نفرت سے کہا "بیٹھ جا آرام سے پہلوان۔ پردے کی آڑ میں ہی ہوتے ہیں ایسے دھندے۔ سب پتا چل جائے گا۔"

داڑھی والا شور مچانے لگا "اس حرامی کی بات مان رہا ہے تو۔ میری زبان پر کیوں اعتبار نہیں کرتا۔"

دانشور بولا "ائرہوسٹس کو بلاؤ۔ وہ انہیں ٹائلٹ میں لے جاکے بات کرسکتی ہے۔ کپتان کو بتاؤ' غیر قانونی دستاویزات کے ساتھ مسافروں کو لے جانے پر ائرلائن کو بھی ذمے دار سمجھا جاتا ہے۔"

داڑھی والا واضح طور پر پریشان نظر آنے لگا تھا اور کھا جانے والی نظروں سے دونوں برقع پوش عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی زبان درازی کی وجہ سے بھی یہ فساد کھڑا ہوا تھا۔ اگر وہ بک بک نہ کرتیں تو کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہوتا۔ وہ جاہل اور بد اخلاق تھا اور ہر مجرمانہ ذہن رکھنے والے کی طرح ہر اصولی بات کہنے والے کے خلاف جارحانہ انداز اختیار کرلیتا تھا۔ کہیں اور ایسی صورتِ حال میں وہ فوراً بدمعاشی اور مارپیٹ پر اتر آتا اور ریوالور نکال کے جان سے ماردینے کی دھمکی دینے سے بھی دریغ نہ کرتا لیکن جہاز کے اندر وہ مجبور تھا۔ اچانک رائے عامہ اس کے خلاف ہوگئی تھی۔ ہر شخص اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ جہاز کے اتنے مسافروں میں سے ایک اسی کا مشتبہ نظر آنا بے سبب نہیں ہوسکتا تھا اور دانشور ٹائپ شخص کو نہ اس سے ذاتی دشمنی تھی اور نہ بلاوجہ پنگا لینے کی عادت۔ اس نے یقیناً کچھ سنا تھا اور غلط نہیں سنا تھا۔

مسئلہ بالآخر ائرہوسٹس کی آمد نے حل کیا۔ اس نے کپتان کی طرف سے درخواست کی "پہلے آپ آئیے میرے ساتھ۔ میں VARIFY کروں گی۔"

"آپ کو کس نے اختیار دیا ہے جی!" داڑھی والا بولا۔

ائرہوسٹس نے متانت سے کہا "اختیار کی بات مت کریں۔ ہم لندن سے پہلے روم میں اترتے ہی آپ کو پولیس کے حوالے کرسکتے ہیں۔"

کسی نے داڑھی والے کو مشورہ دیا کہ وہ معاملہ یہیں طے کرلے۔ میں نے اسے واضح طور پر آنکھ مارتے دیکھا۔ اگر وہ داڑھی والے کا ساتھی نہیں تھا تو پھر ایک سیانا' جہاں دیدہ اور دور اندیش شخص تھا جو بڑے سے بڑے غیر قانونی مسئلے پر مک مکا کو ہر مشکل کا آسان حل سمجھتے ہیں۔ اوجی پہلے ہی ادھر کی پولیس ہے کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ جیل سے نکالے تو جہاز پر بٹھا کے واپس۔ وہاں استقبال کرے اپنے پیارے وطن کی پولیس اور ان کے ڈرائنگ روم کی خاطر تواضع سے تو دشمن کو بھی بچائے۔ پہلے سو پیاز اور پھر سو جوتے۔ بندہ چمڑی پہلے دے' پھر دمڑی اور اس کے بعد جائے چکی پیسنے کے لیے جیل۔ اس سے اچھا نہیں کہ ادھر ہی سودا کرلے؟ تم بھی راضی' ہم بھی راضی۔ آرام سے بیٹھے قاضی۔

چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے ایسا ہی ہوا۔ ائرہوسٹس دس منٹ بعد خاتون اول کے ساتھ لوٹی تو اس کے لبوں پر ایک مختلف انداز کی مسکراہٹ تھی۔ دوسری عورت کے ساتھ صرف آنا جانا ہوا۔ میرا اندازہ ہے کہ پہلے ماں گئی تھی اور اس نے بقائے باہمی کے لیے ائرہوسٹس کے ساتھ کوئی پُرامن معاہدہ کرلیا۔ ممکن ہے اس نے ادائیگی نقد کی ہو یا اپنی خدمات مستعار دے دی ہوں۔ ائرلائن کے لوگوں کو کسی COURIER کی تلاش رہتی ہے جو ان کے لیے سامان لا اور لے جاسکیں۔ ایسے کوریئر قربانی کے بکرے کی طرح ہوتے ہیں کہ پکڑے جائیں تو ائرلائن والے ان کو پہچاننے سے بھی انکار کردیتے ہیں ورنہ دونوں کا کام چلتا رہتا ہے۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی اور بلبل عیش کرے۔ کاروباری معاملے میں جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ائرہوسٹس نے اعلان کیا "میں نے VARIFY کرلیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ مطمئن رہیں۔"

دانشور ٹائپ شخص کے لیے یہ حسن انتظام بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ ائرہوسٹس نے اس کے کانوں کی سنی

ہوئی بات کو غلط اور اسے جھوٹا قرار دے دیا تھا اور ایک مجرم کے حق میں بے گناہی کا فیصلہ دے دیا تھا۔ وہ بہت تلملایا لیکن رائے عامہ کسی پرائے پھڈے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"ابھی یہ جھگڑا ختم ہی ہوا تھا کہ سامنے ایک نیا کیس ہوگیا۔ عرفِ عام میں "سین پاٹ" ہوگیا۔ گزشتہ رات سے گوری میم اور تربوز کے مراسم بظاہر ٹھیک ہی جا رہے تھے اور میں نے انہیں کئی بار بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہوا کہ گوری میم نے تربوز کے ایک ہاتھ رسید کردیا۔ چناخ سے آواز آئی اور میں نے تربوز کو اپنے گال سہلاتے دیکھا۔ وہ چلانے لگی "ائرہوسٹس' اس کالے بھینسے کو کہیں اور بٹھاؤ ورنہ میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔"

تربوز کی حالت غیر ہوگئی۔ اس نے اردو میں کہا "سالی کے نخرے تو دیکھو' پیسے فٹ رکھ لیے جیب میں اب ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔"

"کرنٹ مارتی ہے ہاتھ لگانے سے" پتا نہیں آگے سے کس نے کہا اور لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

ائرہوسٹس چاہتی تھی کہ چندا اپنی سیٹ پر جائے اور تربوز کو پھر میرے ساتھ رکھ دیا جائے "اب آپس کی بات نہیں رہی تو مسئلے کا یہی حل ہے۔"

میں نے کہا "خاتون۔ ہمیں جدا کرنے سے زیادہ سنگین مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ تربوز' میرا مطلب ہے ان صاحب کو کہیں اور بٹھادیں۔"

وہ مسکرا کے چلی گئی اور بالآخر ایک ایسا انتظام کرنے میں کامیاب رہی جس کے مطابق گوری میم کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا باکسر ٹائپ نیگرو جا بیٹھا جو مسلسل پیتا رہا تھا اور باقی سفر میں میم کے ساتھ پیتا اور بہکتا رہا۔ تربوز کو ایک میمن بھائی کے ساتھ رکھ دیا گیا جو نیگرو سے جان چھڑا کے اتنا ہی خوش تھا جتنا نیگرو اس میم کے ساتھ۔

چند منٹ بعد روم میں اسٹاپ اوور کا اعلان ہوگیا۔ روم میں ایک گھنٹے کا قیام بڑھ کر ڈھائی گھنٹے ہوگیا کیونکہ جہاز میں کوئی معمولی سی فنی خرابی پیدا ہوگئی تھی جسے فلائٹ انجینئر نے دور کرلیا۔ مسافروں کو لاؤنج تک جانے کی اجازت مل گئی تھی اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے علاوہ وہ روم کے ائرپورٹ کو دیکھنے کی اس مہلت سے بھی بہت خوش تھے۔

میں نے چندا کے ساتھ کچھ دیر ائرپورٹ کے اندر ڈیوٹی فری شاپ اور سووینئرز کی دکانیں دیکھیں۔ وہاں مختلف قوموں اور ملکوں کے سیاح بھرے پڑے تھے لیکن کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سوائے چند ایشیائی باشندوں کے جو لباس کے معاملے میں کفایت شعاری کے مقابلے میں شریک ہر ولایتی حسینہ کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے نظر آتے تھے۔

ہم ایک گھنٹے تک پھرتے رہے۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ مرد تو مرد' انڈین اور پاکستانی عورتیں بھی چندا کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک جاتی تھیں اور مڑ مڑ کے دیکھتی رہتی تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا احساس چندا کو نہ ہوتا۔ اس کے ظاہری انداز بے نیازی میں غرور حسن کی تمکنت واضح نظر آرہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں اپنی قوتِ تسخیر پر ناز جھلکنے لگتا تھا۔ ایک انگریز نے بھی جس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے چلنے والی شریکِ سفر نے دو بالشت کی فیشن کے مطابق پھٹی ہوئی جینز کی نیکر کے ساتھ اوپر ایک رومال کو گانٹھ دے کر باندھ لینا کافی سمجھا تھا۔ سیٹی بجا کے کہا کہ سفید لباس میں یہ لڑکی کتنی TERRIFIC لگتی ہے اور اس کی ساتھی نے کہا "او لیس۔ DAZZLING مگر تم ادھر مت دیکھو ورنہ مجھے بھول جاؤ گے۔"

میں نے کوئی خریداری نہیں کی۔ سوائے ایک پرفیوم کے جو چندا کو ہمیشہ سے پسند تھی مگر بہت عرصہ ہوا پاکستان میں آسانی سے دستیاب نہیں تھی۔ اس نے جواب میں مجھے ایک پرفیوم گفٹ کی۔ ہم دونوں سے بہتر ایک دوسرے کی پسند ناپسند سے کوئی واقف نہیں تھا۔

ائرپورٹ لاؤنج میں کئی ریسٹورنٹ اور بار تھے۔ تھک کر ہم ایک اوپن ائر کافی ہاؤس میں جا بیٹھے جہاں گھاس کے خوبصورت قالین کا رنگ گہرا سبز تھا اور اس پر رنگین کرسیاں اور چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا "چندا۔ یہ لندن میں تمہارا کون سا کزن پیدا ہوگیا' میں اسے کیوں نہیں جانتا؟"

وہ جوتے اتار کے گھاس پر بیٹھ گئی "جانتی تو میں بھی نہیں تھی۔"

"کیا یہ کوئی بہت دور کا کزن ہے' ساتویں پشت کا؟"

"نہیں۔ وہ میرا سگا ماموں زاد بھائی ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "اور تم ابھی تک اس کے وجود سے ناواقف تھیں؟"

"ہاں۔ بہت سی باتیں خان جی نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔ جو مجھے ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوئیں۔"

"ان کی کسی ڈائری سے؟"

"نہیں۔ وہ ڈائری نہیں لکھتے تھے۔ مجھے کچھ خطوط ملے

اور انہیں پڑھ کے میری حالت اور خراب ہوگئی۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات تھی ان خطوں میں' کس کے خطوط تھے؟"

"میرے والد کے اور میری ماں کے۔ میری پیدائش سے بھی پہلے کے خطوط تھے۔ صرف ایک خط تین سال پہلے کا تھا۔ اس پر ۲۷ جنوری ۱۹۹۰ء کی تاریخ تھی۔ میری ماں نے سابق مشرقی پاکستان کے شہر کے کسی بازار سے لکھا تھا مگر اس پر نام کے ساتھ کوئی پتا نہیں تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا "تمہاری ماں۔ تین سال پہلے تک زندہ تھی' بنگلہ دیش میں تھی؟"

"ہاں' لیکن مجھے معلوم نہیں تھا اور معلوم ہونے سے بھی فرق نہ پڑتا۔"

"کیوں۔ تم اپنی ماں سے ملنے کی کوشش نہ کرتیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان رشتہ بھی کیا تھا۔ نہ پیار کا نہ جذبات کا۔ نہ مذہب کا نہ ملک کا۔"

مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"خان جی نے بہت اچھا کیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہونے دیا۔ جو جھوٹ انہوں نے زندگی بھر بولا وہ میری بقا کے لیے ناگزیر تھا۔ سچ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں اس کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ خان جی اگر چاہتے تو ان خطوں کو..... جلا کے راکھ کرسکتے تھے مگر شاید وہ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد حقیقت میرے سامنے آجائے ورنہ بعد میں کسی مرحلے پر ننھیال والوں نے مجھ سے رابطہ کرلیا تو وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کے پیش کریں گے یا سچ میں جھوٹ ایسے ملائیں گے کہ مرنے کے بعد میرے دادا کی خود میری نظر میں کوئی عزت نہ رہے۔ میرا ایک ماموں ڈھاکا میں ہے۔ اس کا لندن والا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ جب میں خان جی کے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر کمال کے ساتھ دنیا بھر کے ڈاکٹروں سے رابطہ کررہی تھی تو اتفاق سے اس کا پتا چلا۔ ڈاکٹر کمال کے پاس جو فون آئے اور خطوط آئے ان میں اس کا بھی ایک خط تھا۔ وہ لندن کے کراموبل اسپتال میں نیورو سرجن ہے۔ ہم نے اسے خان جی کی پوری ہسٹری بھیجی تھی۔ جب خان جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے سختی سے منع کردیا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے مگر دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے ساری خط و کتابت لیٹے لیٹے پڑھی اور پھر انکار کردیا۔ ان کی آنکھوں میں ناپسندیدگی بلکہ نفرت اتنی واضح تھی کہ میں مجبور ہوگئی۔ اس نے لندن سے کئی فون کیے جو کمال نے ریسیو کیے۔ اس کا آخری فون مجھے خان جی کے انتقال کے دو مہینے بعد موصول ہوا تھا۔ خان جی کی موت کی خبر سن کے اس نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ میں خدائی کا دعوے دار تو نہیں لیکن تم انہیں لے آتیں میرے پاس تو شاید کچھ ہوجاتا۔ اگر اخراجات کا مسئلہ تھا تب بھی تم مجھے بتاسکتی تھیں۔ اپنی کزن کے لیے میں اتنا تو کرہی سکتا تھا کہ اسپتال کے تمام اخراجات اٹھاؤں۔ میں نے کہا کہ یہ تم کیا بک رہے ہو۔ میں تمہاری کزن کیسے ہوگئی۔ وہ بولا کہ یہی تو مذاق کیا ہے تقدیر نے ہمارے ساتھ۔ ہمارے بزرگوں نے بہت جھوٹ بولا مگر ہم تو سچ بول سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میری پھوپی زاد بہن ہو اور میں تمہارا ماموں زاد بھائی ہوں۔ میں نے اسے خوب سنائیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ یقیناً شراب کے نشے میں پاگل ہو رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا نام ہے تمہارے اس کزن کا؟"

چندا نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "ڈاکٹر راج موہن مکرجی۔"

میں اچھل پڑا اور کافی میرے کپڑوں پر گری "وہ۔۔۔ ہندو ہے؟"

چندا نے آہستہ سے سر ہلایا "ہاں۔"

"تو کیا۔ تمہاری ماں۔۔۔؟"

"وہ بھی ہندو تھی۔ اس کا نام تھا شانتی مکرجی۔ اس کا باپ چندر موہن مکرجی ہماری وزارت خارجہ میں سیکشن افسر تھا۔"

میرا دماغ گھومنے لگا "چندا۔ تم مذاق کررہی ہو؟"

"اس سے بڑا سچ نہیں ہوسکتا ناصر اور اس سے زیادہ بے رحم سچ بھی نہیں ہوسکتا۔ میری ماں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اس کا اسلامی نام زلیخا رکھا گیا تھا۔ شاید میرے والد کی پسند پر کیونکہ ان کا نام یوسف تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ کیپٹن یوسف خاں اکتر کی جنگ میں شہید ہوا تھا لیکن خان جی کے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ وہ یوسف کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس آنے والے ایک پرانے ساتھی نے باتوں باتوں میں اس کا حوالہ دیا کہ وہ بڑی بہادری کے ساتھ بھارتی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اسے کوئی تمغۂ جرات نہیں دیا گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تھا کہ خان جی کی حالت غیر ہوگئی تھی اور انہوں نے اپنے دوست سے بڑی سختی کے ساتھ کہا تھا کہ پھر کبھی اس کا ذکر مت کرنا میرے سامنے۔"

"انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی اس بات سے۔ بہت

پہلے انہوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر گئے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیسے تو انہوں نے کہا کہ ایک حادثے میں لیکن آئندہ کبھی ان کے بارے میں کوئی سوال مت کرنا اور میں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ جس بات سے خان جی کو تکلیف پہنچنے کا ذرا بھی احتمال ہو اس سے احتراز کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ اکلوتے بیٹے کی اذیت ناک موت کا صدمہ خان جی کو آج بھی خون کے آنسو رلاتا ہوگا۔ یہ خان جی کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ وہ بہادر آدمی تھے۔ وہ سپاہی جو موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے اور وہ مجاہد جس کے لیے کہا گیا ہے کہ۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی۔"

میں نے کہا "چندا۔ ایک بات پوچھوں۔ یہ ذوق و شوق موروثی نہیں ہے۔ خان جی کو شاعری اور موسیقی وغیرہ سے کوئی شغف نہیں تھا جو تمہاری فطرت کا حصہ ہے۔"

اس نے سر ہلایا "یہ سب مجھے ماں کی طرف سے ملا ہے۔ خان جی کے پاس ایک خاندانی البم تھا۔ اس میں ان کے بچپن کی تصویریں بھی تھیں اور دادی کی بھی۔ وہ آپس میں کزن تھے۔ خان جی کی ایک بہن تھی' ایک بھائی تھا کسی کی صورت مجھ سے نہیں ملتی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میری صورت بھی اپنی ماں جیسی ہے۔"

"تم نے اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی؟"

"نہیں۔ خان جی نے اس کے خط بھی ایک خاص مقصد کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ شاید انہیں احساس ہوگا کہ اپنی ماں سے مجھے دور رکھنے کا فیصلہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ اپنی زندگی میں وہ اس پر کاربند رہے اور انہوں نے مجھے بھی اس کا پابند کیا مگر میرے بالغ ہو جانے اور ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد وہ فیصلے کا اختیار مجھے دینا چاہتے تھے لیکن میں بھی سمجھتی ہوں کہ ان کا فیصلہ درست تھا اور میں آج بھی اس پر کاربند ہوں۔"

میں نے کہا "لیکن ــ تم اپنے کزن سے ملوگی۔ جو تمہاری ماں کے بھائی کا بیٹا ہے۔"

اس نے نظریں جھکالیں "وہ ــ جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے۔ یہ ناممکن تھا میرے لیے۔"

میں نے کہا "پھر کہاں جاؤگی' کہاں رہوگی؟"

"کسی بھی اچھے ہوٹل میں۔ لندن میں ایک بچہ بھی اکیلا اور محفوظ رہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن تم اکیلی' میرا مطلب ہے تم لندن میں اکیلی' یہ سب کیسے کروگی اور لندن کے علاوہ شاید تمہیں جرمنی اور ہالینڈ بھی جانا پڑا پھر؟"

"پھر کیا۔" اس نے بیگ اٹھالیا "جاؤں گی۔ ہر جگہ کسی فرم کا کوئی نمائندہ مجھے ریسیو کرے گا اور میں بہرحال نادان بچی نہیں ہوں۔ اب چلو' جہاز کی روانگی میں صرف آدھا گھنٹا رہ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہیں بیٹھے رہ جائیں۔"

میں نے کہا "ہمارے بغیر جہاز کیسے اڑ سکتا ہے اور جاتا ہے تو جائے۔ سیر کے لیے روم سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "سر۔ تفریح کے لیے آپ نکلے ہیں۔ میں کام سے آئی ہوں۔ میری تو DATES ہیں پہلے سے۔"

"معلوم ہے لندن میں ڈیٹ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

"معلوم ہے" اس نے ہنس کے کہا۔

سفر کا پھر آغاز ہوا تو چندا نے مجھے اپنے ماضی کی باقی کہانی سنائی جو اس داستان ماضی سے یکسر مختلف تھی جو خان جی مجھے وقتاً فوقتاً ٹکڑوں کی صورت میں سناتے رہے تھے اور جن کو جوڑ کے میں نے چندا کی عمر رفتہ کا کچھ اور ہی نقشہ بنا رکھا تھا۔

○☆○

خان اعظم یعنی کرنل خان کا ایک ہی بیٹا یوسف خان بھی باپ کی طرح فوجی تھا۔ درحقیقت خان جی کا پورا خاندانی پس منظر ایسا ہی تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کے زمانے سے لوگ یا تو زمیندار تھے یا فوج میں خدمات سرانجام دے چکے تھے اور شاندار خدمات کا قابلِ فخر ریکارڈ رکھتے تھے۔

یوسف خاں اپنے باپ کی طرح ایک وجیہہ اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے دوست احباب اسے ہیرو بھی کہتے تھے اور مذاق میں دلیپ کمار بھی کیونکہ دلیپ کمار کا اصل نام بھی یوسف خان تھا۔ اس نے سن پینسٹھ کی جنگ کے بعد فوج میں کمیشن لیا اور ابتدائی دو سال اسکول آف سگنل راولپنڈی میں رہا۔ لیفٹیننٹ ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ وہ ایک یونٹ میں رہا۔ پھر اسے اسپیشل سروس گروپ جوائن کرنے کا موقع ملا جہاں کے تربیت یافتہ عام طور پر کمانڈوز کہلاتے ہیں۔ ایس ایس جی کی ٹریننگ اس نے ہرات ۱۹ بلوچ کے ساتھ کی اور یہ زمانہ مشرقی پاکستان میں بہت پرآشوب تھا۔ انیس سو ستر کے انتخابات کے بعد عوامی لیگ نے کھلم کھلا بغاوت کا اور علیحدگی کی تحریک چلانے کا اعلان کردیا تھا۔ جب نوجوان کیپٹن یوسف خان کی پوسٹنگ کومیلا میں ہوئی تو حالات زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ لیکن اس زمانے میں یوسف خان کی ملاقات بڑے فلمی انداز میں شانتی مکرجی

سے ہوئی جو ایک مقامی کالج میں بی اے کی طالبہ تھی۔ بڑی اچھی ڈانسر تھی اور باپ کی وجہ سے موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔

بنگال میں رقص و موسیقی کو وہاں کے طرزِ معاشرت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندو گھرانوں میں تو موسیقی کو عبادت کا حصہ سمجھا جاتا ہے مگر اس پورے کلچر میں مسلمان بھی الگ نظر نہیں آتے۔ بیشتر گھرانوں میں لڑکیوں کا گانا ناچنا قابلِ تعریف مانا جاتا ہے اور اس میں مہارت لڑکی کے لیے اتنی ہی اہم تسلیم کی جاتی ہے جتنی ہمارے گھروں میں امورِ خانہ داری کی تعلیم۔

شانتی کسی انٹر کالج ڈانس پرفارمنس میں شریک ہو کے آرہی تھی کہ ایک جگہ اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ اس نے سائیکل رکشا لے لیا۔ اسی فنکشن سے آنے والے کچھ لڑکے موٹر سائیکلوں پر شانتی کے پیچھے لگ گئے۔ وہ سب آوارہ اور غنڈے قسم کے نوجوان تھے۔ رکشے والے نے انہیں منع کیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے رکشے کو ٹکر ماری اور پھر رکشے والے سے جھگڑا کرنے لگے۔ دبلا پتلا فاقہ کش رکشے والا ایک لڑکی کے لیے ان سب سے اپنی ہڈیاں نہیں تڑوا سکتا تھا۔ وہ رکشا چھوڑ کے بھاگ گیا۔

نوجوانوں میں سے دو نے شانتی کو موٹر سائیکل پر بٹھا کے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی۔ اگر ایک ہوتا تو جان چھڑانے کے لیے شانتی یہ آفر قبول کر لیتی مگر وہ آپس میں لڑنے لگے۔

اسی وقت یوسف خان کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے دو نوجوانوں کو مار پیٹ کرتے دیکھا۔ وہاں چار لڑکے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیے پاؤں زمین پر رکھے کھڑے تھے اور رکشے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ یوسف خان کے پوچھنے پر چار لڑکوں نے اسے دھکے دیے اور گالیاں دینے لگے "چل ادھر سے سالا پنجابی۔"

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس زمانے میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کو پنجابی ہی کہا جاتا تھا اور عوامی جذبات کو اس طرح ابھار دیا گیا تھا کہ وہ ہر اردو بولنے والے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ نفرت پولیس اور فوج کے معاملے میں اور زیادہ شدت اختیار کر لیتی تھی۔

یوسف خان اپنی وضع قطع خصوصاً ہیئر اسٹائل سے فوج یا پولیس کا افسر ہی لگتا تھا۔ یوسف خان ایک تو پٹھان' پھر فوجی اور مزید یہ کہ کمانڈو۔ وہ کہاں تک ضبط سے کام لیتا۔ جب اس کی سمجھانے بجھانے کی کوشش ناکام ہو گئی اور خود لڑکی مدد کے لیے درخواست کرنے لگی اور یہ بتانے لگی کہ کس طرح اسے یہ غنڈے بہت دیر سے گھیرے ہوئے ہیں تو یوسف خان نے ان کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے دونوں لڑنے والوں کو گردن سے دبوچ کے الگ کیا اور ایک ایک مکا رسید کر کے انہیں مخالف سمتوں میں پھینک دیا۔ ان کے باقی ساتھی بیک وقت یوسف خان سے چمٹ گئے۔ یوسف اگر تربیت یافتہ کمانڈو نہ ہوتا تو تب بھی ان کا مقابلہ کر لیتا۔ جب اس نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں ان کی گوشمالی شروع کی تو چند منٹ میں وہ سب فرشِ خاک پر آڑے ترچھے پڑے نظر آئے۔ پھر نہ جانے کہاں چھپا ہوا رکشے والا بھی سامنے آگیا۔ کچھ لوگ دور کھڑے حقیقی زندگی میں ایک فلمی فائٹ دیکھ رہے تھے جس میں ایک ہیرو نے سچ مچ چھ ولن لٹا دیے تھے۔

موٹر سائیکل کی ٹکر سے رکشے کا اگلا پہیا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یوسف نے خوف سے کانپتی لرزتی شانتی کو رکشے سے اتارا تو اسے یہ دیکھ کے مزید غصہ آیا کہ اس کی ساڑی اور بلاؤز بھی پھٹے ہوئے تھے۔ شانتی نے روتے روتے بتایا کہ یہ انہی بدمعاشوں کی حرکت تھی اور اگر یوسف نہ آتا تو معلوم نہیں یہ لوگ کیا کرتے۔ اتنے لوگ تھے دیکھنے والے مگر آگے بڑھ کر اسے بچانے کوئی نہیں آیا۔

یوسف نے اسے تسلی دی اور ایک ٹیکسی میں بٹھا کے گھر چھوڑنے گیا۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا کہ زمین پر پڑے ہوئے نوجوانوں میں سے کتنے خوف سے دم سادھے پڑے تھے۔ کتنے واقعی بے ہوش تھے اور کتنے مکاری کر رہے تھے۔ وہ خود معاملہ بڑھنے سے پہلے اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ پولیس آجاتی تو اس کے لیے بھی مسئلہ ہو جاتا۔ فوجی افسروں کو سختی سے ممانعت تھی کہ وہ شہری علاقوں میں اشد ضرورت کے بغیر تنہا نہ جائیں اور کسی جھگڑے میں نہ پڑیں۔

شانتی کے باپ نے بیٹی کو ڈانٹا ڈپٹا کہ ایسے حالات میں وہ اکیلی کیوں گھر سے نکلتی ہے لیکن اس نے یوسف کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس نے الٹا یہ شکوہ کیا کہ اب وہ زیادہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اچھا ہوتا اگر وہ اس معاملے میں نہ پڑتا۔ ایسے آوارہ لڑکے تو ہر جگہ ہوتے ہیں اور ان سے دشمنی مول لینا مہنگا پڑتا ہے۔ شانتی کو روز کالج بھی جانا ہوتا ہے۔

یوسف کو سخت غصہ آیا مگر وہ پی گیا۔ شانتی کی ماں البتہ بہت شائستہ اور خوش اخلاق عورت تھی۔ وہ انتہائی حسین بھی تھی اور شانتی جیسی دو لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود ان کی بڑی بہن لگتی تھی۔ یوسف کو بعد میں معلوم ہوا کہ رقص کی تعلیم اسے ماں نے دی تھی۔ باپ گانے کو برا نہیں سمجھتا

تھا لیکن اسے بیٹیوں کی پبلک پرفارمنس پر اعتراض تھا۔

یوسف واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے کھڑکی اوپر والی ایک کھڑکی میں شانتی کو دیکھا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ اس نے لباس بدل لیا تھا۔ اب وہ ایک سیاہ بغیر آستین والی شرٹ میں تھی۔ اس کے ناقابلِ یقین حد تک لمبے گھنے اور سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور آگے پیچھے بکھرے ہوئے تھے۔

یوسف نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کھڑکی کے فریم میں وہ پیکرِ رعنائی کسی شاعر کی غزل اور مصور کے خیال کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر مسحور کھڑا رہتا مگر اچانک اس کے کانوں میں ایک گالی کے ساتھ گولی کی آواز آئی "شالا۔۔۔ حرامی!"

یوسف نے اپنے بازو میں انگارہ سا پیوست ہوتا محسوس کیا۔ اوپر سے شانتی نے چیخ ماری اور یوسف نے موٹر سائیکل پر فرار ہونے والے نوجوان کو ایک جست لگا کے دبوچ لیا۔ وہ فائر کرتے ہی پلٹ کے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اسے ریوالور جیب میں رکھ کے موٹر سائیکل کو موڑنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔

یوسف نے بازو کی تکلیف کو نظرانداز کرتے ہوئے نوجوان کو کھینچ لیا اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ پے در پے پڑنے والے مکوں سے وہ بے جان ہو کے گر گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہاں پچاس ساٹھ مرد عورتیں اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایک "پنجابی" فوجی کے ہاتھوں ایک بنگالی "چھاترو" یعنی طالب علم کی پٹائی پر مشتعل تھے۔ اوپر چلاتی ہوئی شانتی کو اس کے گالیاں بکتے ہوئے باپ نے پیچھے گھسیٹ کر کھڑکی بند کر دی تھی لیکن ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ فساد شانتی کے سبب ہو رہا ہے۔

خون یوسف کی آستین کو تر کر چکا تھا۔ اس نے ریوالور نکال کے مجمع سے کہا۔ اس نے پاکستان آرمی کے ایک افسر پر گولی چلائی ہے۔ میں اسے دہشت گردی اور تخریب کاری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اگر کسی نے میرا راستہ روکا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

یوسف کا راستہ کسی نے نہیں روکا۔ اس نے فائر کرنے والے نوجوان کو تھانے میں بند کر دیا اور اس کے خلاف قاتلانہ حملے کی رپورٹ لکھوا دی۔ پولیس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کپتان صاحب کو ٹال سکتی۔ تھانے سے وہ آرمی اسپتال گیا اور زخم کے بارے میں میڈیکل رپورٹ حاصل کی۔ گولی اس کے بازو کے نچلے حصے کے گوشت میں پیوست ہو کے رہ گئی تھی۔ زخم گہرا تھا مگر خطرناک نہیں تھا۔ گولی نکالنے کے لیے معمولی سا آپریشن ضروری تھا چنانچہ یوسف کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

اس کا خون گولی لگ جانے کے بعد کی جدوجہد اور تھانے جانے کی وجہ سے کافی ضائع ہو گیا تھا۔ اگر وہ سیدھا اسپتال چلا جاتا تو شاید ڈاکٹر اسے دو گھنٹے میں فارغ کر دیتے۔ وہ زخم کی ڈریسنگ کرا کے چلا جاتا لیکن اب اسے ANESTHESIA کے ساتھ ہی خون کی ضرورت بھی پڑی۔ اس کے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے علاوہ کچھ ساتھی اسے دیکھنے آئے تو وہ نیم غنودگی میں تھا اور اس کے بیڈ سائڈ پر ایک طرف خون اور گلوکوز کی بوتلیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں اور دوسری طرف ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہاتھ میں پھول پکڑے آنسو بہا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی یقین دہانی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یوسف کی حالت بہت سیریس ہے۔

اس ایک ملاقات کے بعد یوسف اور شانتی کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے درمیان صرف معاشرتی اقدار۔ سیاسی نظریات اور بنگالی اردو کے تعصبات کی سرحدیں ہی حائل نہیں تھیں۔ سب سے بڑی خلیج مذہب کی تھی۔ یوسف خان کو اس کے ساتھیوں نے بھی خبردار کیا کہ اس معاملے میں وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ چند ایک نے تو صاف مشورہ دیا کہ بھائی لڑکی پکے پھل کی طرح جھولی میں آ گری ہے تو منہ میٹھا کرو اور ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو جاؤ مگر یوسف کو شدید ترین عشق کے وائرس نے جکڑ لیا تھا جس کی نہ کوئی دوا تھی اور نہ ویکسین۔ سوائے شربتِ وصل کے جس کا ملنا خیال است و محال است و جنوں۔ والی بات تھی۔

شانتی پر مرض کا حملہ زیادہ شدت سے ہوا تھا۔ وہ یوسف خان کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ شانتی نے ماں کو رازدار بنا لیا تھا۔ اس نے شانتی کو سمجھایا کہ اس کا باپ کبھی نہیں مانے گا اور موجودہ حالات میں یہ شادی فساد کا سبب بن جائے گی۔ ہاں اگر وہ کپتان اپنا مذہب چھوڑ دے تو پھر مغربی پاکستان کے ایک فوجی افسر سے شادی کو مذہب پرستوں کی حمایت حاصل ہو جائے گی اور یہ کہا جا سکے گا کہ کپتان تو دو قومی نظریے سے ہی منحرف ہو گیا ہے اور بنگلہ دیش کی سیاسی تحریک میں شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف داری کرتا ہے۔

ظاہر ہے یوسف خان کے لیے یہ سب ناممکن تھا۔ وہ شانتی کے لیے اپنی جان تو دے سکتا تھا مگر اس کی خاطر اپنا

آبائی مذہب، اپنا وطن اور اپنا فرض نہیں بھول سکتا تھا۔ بالآخر تناور درخت اپنی جڑوں کے ساتھ زمین سے رشتہ استوار رکھے کھڑا رہا اور نازک شاخِ گل ٹوٹ کے شجر سے الگ ہو گئی۔ شانتی نے یوسف خان سے شادی کے لیے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام زلیخا خاتون رکھا گیا۔ حالات کے تقاضوں کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے شادی میں دیر نہیں کی۔

شانتی کے باپ نے بڑا ہنگامہ کیا۔ اس نے یوسف خان پر الزام لگایا کہ اس نے شانتی کو ورغلایا۔ یہ دعویٰ کیا کہ وہ ابھی نابالغ ہے چنانچہ یوسف کے خلاف اغوا اور ریپ کا کیس بنایا جائے مگر شانتی نے مجسٹریٹ کی عدالت میں بیان دے کر باپ کے سب دعوے جھٹلا دیے اور عدالت کی مرضی سے یوسف خان کے ساتھ چلی گئی۔

یوسف نے اس شادی کی اطلاع اپنے باپ کو دی تو خان اعظم کو یقین نہ آیا کہ ان کا اتنا فرمانبردار اور سیدھا سادہ بیٹا ایسی غلطی بھی کر سکتا ہے اور عشق میں اس حد تک دیوانہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فراخ دل انسان تھے اور ان کے نزدیک کسی لڑکی کے بنگالی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زبان کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ اچھی بات ہے لیکن اس کے بیک گراؤنڈ کو قبول کرنا خان جی کے لیے مشکل ہو گیا۔ وہ لڑکی ریڈیو پر گاتی تھی۔ اسٹیج پر ڈانس کرتی تھی۔ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ وہ یوسف کے لیے ایک مثالی بیوی کیسے بنے گی۔ جیسی وہ یوسف کے لیے تلاش کر رہے تھے اور کسی حد تک اپنی تلاش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک پرانے ساتھی اور دوست سندھ کے ریٹائرڈ بریگیڈیئر عبدالرحیم سومرو کی بیٹی انہیں پسند آ گئی تھی اور انہوں نے اپنے دوست کو اپنی پسند سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔

شکار کے سلسلے میں وہ ایک مہینے سے بریگیڈیئر عبدالرحیم کے ساتھ اس آبائی حویلی میں مقیم تھے اور سیزن ختم ہونے تک ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ دونوں دوست جیپ لے کر نکل جاتے تو تین تین دن گھر نہیں لوٹتے تھے۔ وہ اپنی ریٹائرڈ لائف کو پوری طرح انجوائے کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر رحیم کی دونوں بیویوں کی اولادیں مل کے زمین باغات اور فصلوں کی پیداوار کے مسائل سے نمٹتی تھیں۔ کرنل خان کا اکلوتا بیٹا بھی مشرقی پاکستان میں تعینات تھا اور وہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے وہ اس کی طرف سے مستقل فکرمند رہتے تھے مگر ایک پروفیشنل سولجر کی حیثیت سے وہ سمجھتے تھے کہ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔

بریگیڈیئر رحیم نے کئی سال پہلے کوشش کی تھی کہ کرنل خان اپنا گھر پھر آباد کر لے مگر خان نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج اس نے پھر اپنے دوست کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک پورا دن شکار میں گزار کے لوٹے تھے۔ بعض دن شکار کے لیے اچھے نہیں ہوتے تھے اور یہ بھی ایسا ہی دن تھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار سیون چلے گئے۔ ان کے پیچھے نوکر شکاری کتوں کی زنجیریں پکڑے چلتے رہے۔ چار ملازم دو کتوں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ چار دائیں بائیں پھیلی ہوئی جھاڑیوں کو لمبے لمبے ڈنڈوں سے کھنگالے جا رہے تھے۔ اس امید میں کہ کہیں سے خرگوش نکل کے بھاگے تو کتے اس کے پیچھے چھوڑے جائیں لیکن خرگوش تو جیسے غائب ہو گئے تھے۔ دوپہر گزر گئی تو ایک خرگوش بڑی مشکل سے ہاتھ آیا۔ شکاری کتے اس کے پیچھے لپکے۔ خرگوش جان بچانے کے لیے دائیں بائیں ہوتا جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا آگے بھاگتا رہا۔ وہ گھوڑے بھگاتے کتوں کو شہ دیتے گئے۔ ایک میل کے اندر ہی کتوں نے خرگوش کو گھیر لیا اور دانتوں میں دبوچ کر لے آئے۔ ملازموں نے اسے فوراً ذبح کر کے صاف کر لیا۔ شام تک انہیں ایک خرگوش اور ہاتھ لگا۔

اب نوکر الاؤ جلا رہے تھے تاکہ خرگوشوں کو بھون کے گوشت کی تِکی بنائی جائے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کے ٹینٹ کے باہر فولڈنگ کرسیوں پر بیٹھے چائے پی کر دن بھر کی تھکن اتار رہے تھے۔

بریگیڈیئر رحیم نے کہا "خان۔ کیا یوسف کی کوئی خیر خبر ملی۔"

"نہیں۔ خط آئے ہوں گے گھر پر۔ میرا خیال ہے کل واپس چلا جاؤں۔"

بریگیڈیئر رحیم نے کہا "کیوں؟ کیا ہے اس گھر میں؟ کون ہے تیری راہ دیکھنے والا۔ پاگل ہو جائے گا اکیلا رہتے رہتے۔"

"نہیں یار۔ اب تو عادت ہو گئی ہے۔"

رحیم بولا "اوئے عادت کے گھوڑے، پہلے تو نے کہا تھا کہ یوسف چھوٹا ہے۔ سوتیلی ماں۔۔۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیسے پیش آئے۔ وہ ذمے داری پوری کر دی تو نے۔ اب یوسف اپنی دیکھ بھال خود کر سکتا ہے مگر تیری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ اب کر لے شادی۔"

کرنل خان ہنس پڑا "اونہیں یار۔ اب تو وقت گزر گیا۔"

"وقت شادی کے لیے ہمیشہ رہتا ہے۔ دل جوان ہونا چاہیے ورنہ مرد تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہم کو دیکھ لے۔ دو کی جگہ ابھی خالی ہے۔"

کرنل خان نے نفی میں سرہلایا "اب اپنی نہیں 'یوسف کی شادی کرنی ہے۔"

"وہ بھی کرلیتا۔ باپ بیٹا کیا ایک ساتھ شادی نہیں کرسکتے؟ اس کی بیوی سے تجھے کیا۔ وہ اس کا گھر آباد کرے گی۔ تیرا خیال کون رکھے گا؟"

"وہ میرا بھی خیال رکھے گی۔ میری بہو" خان نے خوابناک لہجے میں کہا۔

"ایسی امیدیں مت باندھ خان جو پوری نہ ہوں تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ ایسی بہوئیں اب نہیں ہوتیں۔"

خان مسکرایا "ہوتی ہیں۔ اور میں نے دیکھ لی ہے۔ پوچھ کون ہے وہ؟"

"کیا میں جانتا ہوں اسے۔"

کرنل خان نے کہا "ہاں 'وہ تیری بیٹی ہے۔ سندس 'کیا خیال ہے تیرا۔"

بریگیڈیئر رحیم بولا "میرا خیال کیوں پوچھتا ہے خان!"

"اس لیے کہ تو باپ ہے اس کا۔"

بریگیڈیئر ہنسنے لگا "مگر شادی تو سندس کو کرنی ہے۔ یوسف سے پوچھا ہے تونے یا اس کی طرف سے بھی تو یکطرفہ طور پر خود مختار بنا ہوا ہے۔"

"کمال کرتا ہے تو۔ کیا ہم اتنا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ ہم اپنے بچوں کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔ جو کریں گے اچھا ہی کریں گے۔"

بریگیڈیئر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہم تو اچھا ہی سوچ کے کریں گے مگر کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ان کے حق میں برا ہوجائے۔ کوئی فیصلہ ہم نے زبردستی مسلط کردیا تو وہ ساری عمر ناخوش رہیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن کی شادی ہے پہلے ان سے پوچھ لے۔ ان کی زندگی ہے 'ہماری نہیں۔"

کرنل خان کچھ مایوس نظر آنے لگا "میرا خیال تھا تو بہت خوش ہوگا۔"

"دیکھ یار۔ بات کو سمجھو۔ یہ میری خوشی کا معاملہ نہیں ہے۔ میاں بیوی راضی ہوں تو پھر... ہم تم صرف بینڈ بجانے والوں میں شامل ہیں۔ کیا فرق ہے یوسف اور سندس میں۔ تو پوچھ لے یا میں 'ایک ہی بات ہے" وہ اچانک سیریس ہوگیا "دراصل میں نہیں چاہتا کہ جو سزا ہم نے اس فرمانبرداری کے چکر میں کاٹی 'وہی ہماری اولاد بھی کاٹے۔ ایک تجربہ کافی ہے۔ اپنی ناکامی کا انتقام میں اپنی ہی بیٹی سے لوں 'یہ ناممکن ہے۔ ویسے تو جتنا بھروسا تجھے یوسف پر ہے اس سے زیادہ مجھے سندس پر ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف چوں تک نہیں کرے گی۔ مگر خود مجھ سے یہ ظلم نہیں ہوگا۔"

بریگیڈیئر کی بات غلط نہیں تھی۔ اس نے جوانی میں جس لڑکی کو چاہا تھا اس کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور ساری زمین کی تنہا وارث۔ غیر سے شادی کا مطلب یہ ہوتا کہ زمین غیروں کے پاس چلی جائے چنانچہ اس کی شادی ایک چچا زاد سے طے کردی گئی جو پہلے ہی شادی شدہ تھا۔ لڑکی نے یہ جبر خاموشی سے سہہ لیا مگر رحیم۔ جو اس زمانے میں کپتان تھا۔ اپنے دل سے اس کا خیال نہ نکال سکا اور چوری چھپے اس سے ملنے کے لیے جاتا رہا۔ ایک رات لڑکی کو اس کی سوتن نے پکڑا دیا۔ نتیجہ اس کے لیے خاطر خواہ نکلا۔ کیپٹن رحیم تو فرار ہونے میں کامیاب رہا مگر لڑکی کو اس کے شوہر نے وہیں قتل کردیا۔ کاروکاری کے لیے معاشرے میں رعایت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ خاندان کی عزت کا معاملہ تھا اس لیے خاندان تک ہی محدود رہا۔ عدالت تک کوئی نہیں گیا۔ کیپٹن عبدالرحیم سومرو جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک مضبوط قبیلہ تھا چنانچہ وہ بچ گیا۔ ایک سال بعد اس نے اپنی محبت کے قاتل کو ٹھکانے لگادیا مگر اس سے کیا فرق پڑسکتا تھا۔ دو زندگیوں کو برباد ہونا تھا سو ہوگئیں۔

ایک مہینے بعد جب کرنل خان اپنے گھر پہنچا تو اسے اپنے بیٹے کے چار خط ایک ساتھ ملے جو دو اور تین دن کے وقفوں سے لکھے گئے تھے۔ پہلے خط میں اس نے اپنے باپ کو شانتی کے بارے میں بتایا تھا۔ دوسرے میں اعتراف کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ تیسرے میں کہا تھا کہ شانتی اس کے لیے اسلام قبول کرنے کو تیار ہے اور چوتھے میں اطلاع دی تھی کہ شادی کے بعد وہ اور زلیخا اپنے یونٹ کے اندر ہی رہنے لگے ہیں۔ اس نے باپ کو شانتی کی دو تصویریں بھی بھیجی تھیں 'ایک شادی سے پہلے کی اور دوسری شادی کے بعد کی۔

کرنل خان کے سینے میں دل جیسے آگ میں جلنے والے شیشے کے برتن کی طرح چٹخ کے ٹوٹ گیا۔ انہیں یقین نہ آیا کہ ان کا بیٹا اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے کے بارے میں ان کے وجود کی اہمیت کو ایسے نظرانداز کرسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو بیک وقت ماں اور باپ بن کے پالا تھا لیکن اس سے

یوسف کو فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے اپنے رویے سے کہہ دیا تھا کہ کرنل صاحب 'جتنی محبت شفقت اور توجہ آپ نے مجھے دی وہ آپ کا فرض تھا۔ کوئی قرض نہیں کہ اس کے بدلے میں مجھے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں گروی رکھنی لازمی ہوں۔

بریگیڈیئر رحیم ان کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ ان کی زندگی ہے 'ہماری نہیں۔ اور یہ حقیقت بہت جلد سامنے آگئی تھی۔ بچے بہت جلد بڑے ہوجاتے ہیں لیکن ماں باپ کو ایسا نہیں لگتا۔ وہ انہیں چھوٹا ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ ماں باپ کو حاصل جنرل پاور آف اٹارنی کینسل کرکے اچھی زندگی کے سب فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اور یہ ثابت بھی کردیتے ہیں کہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ ثابت ہونے تک اور بعض اوقات اس کے بعد بھی وہ ناخلف 'نافرمان اور باغی رہتے ہیں۔

کرنل خان بھی اس تلخ سچائی کے گھونٹ کو جو تقدیر کا فیصلہ تھا 'اتنی آسانی سے قبول نہ کرسکے جتنی آسانی سے وہ اگلے مورچوں پر جاکے مرنے مارنے کا حکم بلا چون وچرا قبول کرلیتے تھے۔ وہ رات بھر ٹہلتے رہے اور سوچتے رہے۔ یوسف نے ان سے اجازت نہیں لی تھی۔ مشورہ نہیں مانگا تھا اور ان کی رائے طلب نہیں کی تھی۔ اس نے بس ایک واقعاتی رپورٹ ارسال کی تھی۔ جیسے محاذ جنگ سے کوئی اپنے ہیڈکوارٹرز کو رپورٹ بھیجتا ہے کہ سر 'ایسا ہوا۔ پھر ایسا ہوا اور اب ایسا ہوگیا ہے۔

اس نے انتہائی عجلت میں اور جذبات کی رو میں بہہ کے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس پر وہ صرف ماتم کرسکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ایسی لڑکی جو ریڈیو 'ٹی وی پر گاتی ہو اور آرٹس کونسل کے اسٹیج پر کلاسیکل ڈانس ہی سہی مگر پبلک کے سامنے ناچتی ہو 'یوسف خان کی مثالی بیوی کیسے بن سکتی تھی جس کا ایک امیج انہوں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا اور جس پر بریگیڈیئر عبدالرحیم کی بیٹی سندس سو میں سے نوے نمبر لے کر پوری اترتی تھی۔ یہ نتیجہ انہوں نے بڑے سخت EXAMINER کی حیثیت سے ایک مہینے تک سندس کو آبزرویشن پر رکھ کے اور اس کے کئی انٹرویو لینے کے بعد اخذ کیا تھا۔

لیکن یہ سب اکارت گیا تھا۔ وہ اب بریگیڈیئر عبدالرحیم کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ بے شک اس نے رشتے کی آفر کو منظور نہیں کیا تھا مگر جو کچھ اس نے کہا وہ کسی منظوری سے کم نہ تھا۔ کیا فرق ہے سندس میں اور یوسف میں۔ میں پوچھوں یا تو پوچھ لے ایک ہی بات ہے۔ عبدالرحیم نے تو ان کے حق میں بلینک چیک کاٹ دیا تھا مگر وہ خود ہی اسے کیش نہ کراسکے۔ اب بریگیڈیئر عبدالرحیم یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ خان 'تونے دیکھا 'میری بات کتنی سچ تھی۔ اگر ہم ان کے مستقبل کا فیصلہ کردیتے تو یہ بڑا ظلم ہوتا۔

یوسف خان نے جانتے بوجھتے اپنی بیوی کے فیملی بیک گراؤنڈ کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ وہ کون لوگ تھے۔ ان کی سماجی حیثیت کیا تھی۔ انہوں نے اس شادی پر کیا ردعمل ظاہر کیا تھا۔

تین دن بعد بریگیڈیئر عبدالرحیم لاہور آیا۔ اسے ایک نئی گاڑی دیکھنی تھی جس کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ وہ ریگستانی اور پہاڑی علاقوں کی لگژری کوچ ہے اور شکار کے علاوہ سیروسیاحت کے لیے بہترین ہے۔ وہ سارا دن مختلف شورومز میں گھوم پھر کے ٹیسٹ ڈرائیو کرتے رہے اور بالآخر ایک گاڑی کا سودا کرلیا۔ یہ وہ گاڑی نہیں تھی جو بریگیڈیئر عبدالرحیم بڑے شوق سے خریدنے آیا تھا۔

شام کو نئی گاڑی میں گھومتے ہوئے اس نے کہا۔ "یار خان! تو آج سارا دن اندر سے کچھ خاموش رہا۔ تو یوسف کی طرف سے پریشان ہے؟"

کرنل خان نے کہا "ہاں۔ یہی سمجھ لے۔"

"دیکھ یار۔ جہاں تک سوال ہے سندس کے ساتھ اس کی شادی کا تو یہ خیال تو دل سے نکال دے۔ میں نے پوچھا تھا اس سے لیکن اس کے ساتھ میڈیکل کالج میں کوئی لڑکا پڑھتا ہے۔ اس کے ساتھ سندس کی کچھ UNDERSTANDING ہوگئی ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "کیسا لفظ منتخب کیا ہے اس نے۔ مجھے پسند آیا پیار محبت وغیرہ ذرا CHEAP الفاظ ہوگئے ہیں۔ لیکن UNDERSTANDING از ویری گڈ۔ میڈیکل کالجوں میں یہی ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں پہلے سے مستقبل کو پلان کرکے ایک ٹیم بنالیتے ہیں۔ ازدواجی زندگی اور پروفیشن کو ایک ساتھ کیسے چلائیں گے۔ سندس سے تو میں نے کہہ دیا کہ میری طرف سے اوکے۔ یہ بڑا آئیڈیل ARRANGEMENT ہوتا اگر ہماری دوستی سمدھیانے کے رشتے میں بدل جاتی مگر افسوس! لائف از ویری REAL اس میں چاہنے سے سب نہیں ملتا۔"

"یو آر ڈیم رائٹ بریگیڈیئر۔" کرنل خان نے ایک

ٹھنڈی سانس لی "یوسف نے بھی شادی کرلی ہے۔ ایک ہندو بنگالی لڑکی سے۔"

چاروں خط پڑھنے کے بعد عبدالرحیم نے کرنل خان کو وہی مشورہ دیا جس کے سوا کوئی اور مشورہ دینا دوستی نہیں دشمنی کہلاتا۔ اس نے کہا کہ اب جو ہونا تھا ہوگیا۔ ان کو اپنی BLESSINQ بھیجو۔ یہ لکھو کہ تم خوش تو ہم خوش' ہمارا خدا خوش اور سارا جہاں خوش۔ ہوسکے تو خود چلے جاؤ۔"

کرنل خان کے لیے فوری طور پر ایسٹ پاکستان جانا ممکن ہی نہ تھا۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو حالات کی ایک مختلف تصویر سامنے آئی۔ یوسف خان کے یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر نے اسے بتایا کہ اس شادی نے بڑے سنگین مسائل پیدا کردیے تھے۔ یوسف اور اس کی بیوی زلیخا کو ہم نے دوسری جگہ بھیج دیا ہے۔ اگر یہ پوسٹنگ نہ کرائی جاتی تو شاید کسی دن وہ مارے جاتے۔ اسی طرح جیسے لڑکی کے ماں باپ اور بہن بھائی سب مکتی باہنی کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان پر اپنی بیٹی کو ایک پاکستانی فوجی کے ساتھ بیاہنے کا الزام تھا۔ حالانکہ وہ اس جرم میں ذرا بھی شریک نہیں تھے۔

کرنل خان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکی عدالت میں پیش ہوئی تھی اور اس نے جو بیان دیا وہ شانتی مکرجی کی حیثیت سے دیا تھا لیکن یہ کہا تھا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے کیپٹن یوسف خان کے ساتھ شادی کرچکی ہے۔ ان کی کورٹ میرج پہلے ہوئی۔ پھر اس نے اسلام قبول کرکے یوسف خان سے نکاح کیا۔

پہلے کورٹ میرج اور پھر قبول اسلام۔ یہ بات کرنل خان کے دل میں زہریلے کانٹے کی طرح پیوست ہوگئی۔ ان کے بیٹے نے ایک ہندو سے شادی کرلی تھی اور شادی کے بعد اسے مسلمان کیا؟ کوئی جانتے بوجھتے ناپاکی کی حالت میں پہلے نماز پڑھ لے اور پھر وضو کرلے تو کیا نماز ہوجائے گی؟ ہرگز نہیں۔ آخر یوسف نے اسے پہلے مسلمان کیوں نہیں کیا۔ کورٹ میرج بھی میرج ہی ہوتی ہے اور ان کے بیٹے نے ایک ناقابلِ معافی گناہ کا ارتکاب کیا کہ شانتی مکرجی سے شادی کرلی۔ اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

کرنل خان نے بیٹے کو ایک مختصر خط لکھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ ایک حلف نامہ بھیج دیا جس کی رو سے انہوں نے یوسف خان کو اپنی ولدیت سے خارج کردیا تھا اور یہ عہد کیا تھا کہ اگر کبھی وہ پھر یوسف کو اپنا بیٹا کہیں تو وہ کافر۔ ان کے باپ دادا کافر۔ ان کی عاقبت خراب ہو اور ان کی مغفرت نہ ہو۔

یہ ایک غصے کی آگ میں سلگتی اور نفرت کے زہر سے بھری ہوئی جذباتی تحریر تھی جس پر بعد میں کرنل خان ہمیشہ پچھتاتے رہے۔ یوسف خان اپنے باپ کو جانتا تھا۔ اس نے بھی ثابت کیا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ اس کا پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس نے معافی نہیں مانگی۔

کورٹ میرج والی بات غلط تھی مگر کمانڈنگ آفیسر نے یہ بات اخباروں میں پڑھی تھی۔ عدالت میں یوسف کی بیوی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شانتی مکرجی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شانتی مکرجی تھی مگر اب زلیخا یوسف خان ہے۔ کمانڈنگ آفیسر ہر جگہ خود نہیں گیا تھا اور اس نے ہر بات ذاتی طور پر VERIFY نہیں کی تھی۔ اگر کرنل خان مزید انکوائری کرتے یا یوسف سے ہی پوچھ لیتے تو اتنی بڑی زندگی کو تباہ کرنے والی غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔

بدقسمتی سے صرف تین مہینے بعد یوسف انڈین آرمی سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ یہ اطلاع کرنل خان کو جی ایچ کیو سے ملی۔ اس نے ایک آنسو نہیں بہایا۔ اس نے کہا "شہید مرتے نہیں' زندہ رہتے ہیں۔"

اس نے یہ نہیں کہا کہ یوسف میرا بیٹا نہیں تھا۔

اس زمانے میں جب کرنل خان یہ طے کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اب اسے جینا چاہیے یا نہیں۔ بظاہر جینے کے لیے کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا۔ تو بریگیڈیئر عبدالرحیم نے اس کی مدد کی۔ اس نے کرنل خان کو اپنے ساتھ رکھا اور ذاتی کوشش سے اس کا رابطہ زلیخا سے ہوگیا۔ اس نے کرنل خان کو ملنے والی اس اطلاع کو غلط بتایا کہ یوسف نے شادی پہلے کی تھی اور اس نے اسلام بعد میں قبول کیا تھا۔ وہ نکاح سے پہلے مسلمان ہوگئی تھی۔ عدالت میں وہ نکاح کے بعد پیش ہوئی تھی۔ کورٹ میرج والی بات سراسر بے بنیاد ہے۔

صورتِ حال اب بدل چکی تھی۔ کرنل خان بیٹے کو جلد باز سمجھتا تھا۔ اب اپنی جلد بازی نے اسے خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیا۔ بریگیڈیئر رحیم نے کہا کہ اب بہو کو اپنے پاس بلالو۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ تمہارے پاس زندہ رہنے کے لیے اس سے بڑا مقصد کیا ہوگا کہ تم اپنے بیٹے کی اولاد کو پالو۔ آخر وہ تمہارا ہی خون ہوگا۔

بالآخر کرنل خان مان گیا اور اس نے زلیخا کو اپنے پاس بلانے کے لیے رضامندی ظاہر کردی لیکن ابھی مشرقی پاکستان کے حالات سازگار نہیں تھے۔ وہاں جو کچھ ہورہا تھا' اسے بنگالی جنگِ آزادی کہتے تھے۔ مغربی پاکستان کا حکمراں ہر سیاسی ٹولہ اسے علیحدگی پسندی کی تحریک اور بغاوت کا نام دیتا تھا اور

دنیا خانہ جنگی سمجھتی تھی۔ عوام نے فوج کے خلاف ہتھیار اٹھالیے تھے اور فوج انہیں ماررہی تھی۔

بالآخر سولہ دسمبر انیس سو اکہتر کو پاکستان کی مختصر تاریخ کا سیاہ ترین دن طلوع ہوا جب پاکستانی فوج کو بھارتی فوج نے محصور کرلیا اور ان سے ہتھیار رکھوالیے۔ پاکستان کے قابلِ اعتماد کہلانے والے دوست اس موقع پر خاموش تماشائی بنے رہے۔ بنگلہ دیش بن گیا اور انہوں نے سولہ دسمبر کو اپنا یومِ آزادی قرار دیا کہ چودہ اگست کو ہم نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کی تھی' پھر مغربی پاکستان کے فیوڈل لارڈز' فوج اور بیوروکریسی کی تکڈم نے ہمیں غلام بنالیا تھا بالآخر ہم آزاد ہیں۔

اس وقت تک زلیخا ایک بچی کی ماں بن چکی تھی اور اس نے کرنل خان کو یہ بتادیا تھا کہ اس کے باپ کی خواہش کے مطابق بچی کا نام چاندنی بیگم رکھا گیا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اسپتال کے سرٹیفکیٹ میں دس نومبر انیس سو اکہتر لکھی ہوئی تھی۔ مارچ سن بہتر تک سیاسی فضا قدرے بہتر ہوئی۔ بنگلہ دیش سے اردو بولنے والے دوسری ہجرت کررہے تھے۔ جو سیانے اور دوراندیش تھے وہ حالات کا صحیح اندازہ لگاچکے تھے اور برا وقت آنے سے قبل ہی اپنا سب کچھ سمیٹ کر مغربی پاکستان آگئے تھے۔ باقی اپنا سب کچھ گنوا کے اور جان بچا کے بھاگے تو بڑی کس مپرسی کی حالت میں نیپال کے راستے مہاجر بن کے پاکستان پہنچے (یہ لوگ یہاں بھی بہاری کہلائے) جو رہ گئے ان کو غیر بنگالی قرار دے کر کیمپوں میں ڈال دیا گیا جہاں وہ آج بھی پاکستانی ہونے کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

ابھی تک دونوں ممالک میں ذرائع آمدورفت بند تھے لیکن کرنل خان اور بریگیڈیئر عبدالرحیم نے کوشش کرکے زلیخا کو وہاں سے نکالنے کا انتظام کرلیا۔ زلیخا کی طرف سے آخری خط چھ مہینے پہلے موصول ہوا تھا۔ کرنل خان نے اسے زلیخا کی مجبوری سمجھا۔ ڈاک کی سہولت ہی دستیاب نہ تھی تو وہ خط کیسے لکھتی۔

لیکن مقررہ تاریخ پر یوسف خان شہید کا ایک دوست کیپٹن جعفر رضا اپنی بیوی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے کہا "میں آپ کے قابلِ فخر شہید بیٹے کا دوست ہوں جو آخری وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ میری بدقسمتی کہ شہادت اس کو ملی اور میں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ میری پوسٹنگ واپس مغربی پاکستان میں ہوچکی تھی لیکن میں ابھی پہنچا ہوں اور آپ کی امانت آپ کے سپرد کرنے حاضر ہوگیا ہوں۔"

اس کی بیوی نے پانچ ماہ کی چاندنی کو کرنل خان کے حوالے کیا "یہ آپ کی پوتی ہے۔"

"اور اس کی ماں؟" کرنل خان کا چہرہ تاریک ہونے لگا۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "وہ نہیں آئی۔ اس نے یہ خط دیا ہے آپ کے نام۔"

بیوی نے جلدی سے کہا "اب ہم چلتے ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد دادا نے اپنی پوتی کو دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت اور معصوم تھی۔ جیسے کہ سب بچے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس کو چوما اور پھر خط کھولا۔

زلیخا نے لکھا تھا کہ وہ اپنے سابق شوہر کی نشانی کو ان کے پاس بھیج رہی ہے۔ اس کی پرورش ان سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ خود اب اپنے ماضی کی ہر یاد کو اپنی زندگی سے خارج کردینا چاہتی ہے۔ یوسف سے شادی اس کی ایک سنگین جذباتی غلطی تھی جس کا کفارہ اس نے اپنے پورے خاندان کی قربانی دے کر ادا کیا۔ اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑا اور غدار بھی کہلائی مگر اس سے حاصل کچھ نہ ہوا اور نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ یوسف اسے چھوڑ کے چلا گیا اور اب وہ محسوس کرتی ہے کہ خدا نے اسے اس غلطی کی بہت بڑی سزا دی ہے۔ اگر یہ بچی اس کے پاس رہے گی تو اس کی بدقسمتی کی سزا اسے بھی ملے گی۔ وہ اس سے بھی کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر چلی گئی ہے اور اب پھر شانتی مکرجی ہے۔ اس کا ایک ماموں بنگلہ دیش کی نئی حکومت میں اہم عہدے پر فائز ہے۔ اس کی وجہ سے وہ محفوظ ہے ورنہ غداری کے جرم میں اسے بھی ماردیا جاتا۔ ماموں نے اس کا رشتہ ایک بنگالی اسسٹنٹ کمشنر سے طے کرادیا ہے جو سلہٹ میں تعینات ہے۔"

کرنل خان کے دل کے سب مندمل ہوجانے والے زخم پھر ہرے ہوگئے۔ چاندنی کی ماں نے ان زخموں کو بڑی بے رحمی سے کھرچ دیا تھا۔ وہ یوسف کی موت پر نہیں روئے تھے مگر چاندنی کو دیکھ کر بہت روئے۔ تقدیر نے ان کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کیا تھا۔ غلطی ان کے بیٹے اور چاندنی کے باپ کی تھی یا اس کی ماں کی لیکن اس کی سزا کسی طرح بھی معصوم چاندنی کو نہیں دی جاسکتی تھی۔

پانچ مہینے کی بچی کو پالنا ایک صبر آزما اور کٹھن ذمے داری تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ان کی مدد کرسکتی۔ خان اعظم نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ اچانک ان کے لیے زندہ رہنے کی ضرورت بے حد اہم ہوگئی تھی اور انہیں جینے کے لیے ایک عظیم مقصد مل گیا تھا۔

وہ ہر دو تین گھنٹے بعد اسے بوتل سے دودھ پلانے لگے۔ ہر بار دودھ پلانے سے پہلے بوتل کو دھونا اور ابالنا ضروری تھا۔ وہ بچی کے سب گندے کپڑے خود دھوتے تھے اور اس کے ساتھ ہی سوتے جاگتے تھے۔ چاندنی بڑی ہوتی گئی۔ وہ بستہ لے کر نرسری اسکول جانے لگی۔ پھر اسکول اور اس کے بعد کالج جانے لگی۔ اس نے بی اے کرلیا تو خان اعظم نے اطمینان اور سکون کا سانس لیا۔ وہ خدا کے بے حد شکر گزار تھے جس نے انہیں چاندنی کے جوان اور بالغ ہونے تک جینے کی مہلت دی اور اس فرض سے سبکدوش ہونے کی استطاعت عطا کی۔

خان اعظم نے اپنی زندگی کا وقت' پیار اور شفقت ہی نہیں بلکہ وہ سب چاندنی کو دے دیا جو انہوں نے اس زندگی سے حاصل کیا تھا۔

☆

جہاز نے لندن ائرپورٹ پر لینڈ کیا تو میری نظروں کے سامنے چاندنی کا نیا روپ تھا۔ میرے دل میں خان اعظم کی عظمت کا نقش پہلے سے زیادہ روشن تھا اور میں پہلے سے زیادہ شرمسار تھا۔

میں نے کہا "چاندنی۔ تمہاری وہ ماں اب کہاں ہے؟"

"میری ماں نہیں۔ یہ پوچھو شانتی کہاں ہے؟" وہ تلخی سے بولی "اس عورت کو کیا حق ہے میری ماں کہلانے کا جو مجھے پیدا کرکے پچھتا رہی تھی۔ جس نے مجھے اپنی زندگی کے آئینے پر سے ایک بدنما داغ کی طرح دور کردیا تھا۔ وہ عورت مرچکی ہے۔ اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ اسے ہیپی ٹائٹس سی کی انفیکشن تھی جو عدم توجہی سے لیور کینسر بن گیا۔ اب اس کے پاس زندگی کے مشکل سے چھ مہینے ہیں۔ اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ اگر کرنل خان کو یہ منظور نہیں تو کم سے کم میری ایک تصویر اسے روانہ کردیں۔ لیکن انیس سال بعد وہ انسانی ہمدردی کے نام پر بھی کسی رعایت کی مستحق نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ خان جی نے اس کے خط کا جواب بھی نہیں دیا ہوگا۔"

"اس خط میں شانتی کا کوئی ایڈریس نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اس نے بڑی تفصیل سے اس وقت کو یاد کیا تھا جو یوسف خان کے ساتھ گزرا تھا لیکن اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"کیا اکیس سال تک وہ کرنل خان سے رابطے میں تھی؟"

"ممکن ہے رہی ہو' مجھے معلوم نہیں۔ اس کے تین خط سن بہتر کے تھے۔ چوتھا اور آخری انیس سال کے وقفے سے لکھا گیا تھا۔"

مسافر اب اترنے لگے تھے۔ میں نے بیگ اٹھالیا "یہ جو تمہارا کزن ہے۔ ماے وا چٹر۔ اس کا پتا تو تمہیں اتفاق سے چلا لیکن تم اس کا حوالہ کیوں دیتی رہیں بعد میں۔"

"تمہیں جلانے اور مشتعل کرنے کے لیے۔ میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہوں گی" وہ میرے آگے آگے چلتی گئی۔

میں نے کہا "اکیس سال ہوگئے اس بات کو مگر وہ پچھلی نسل کی غلطی تھی۔ میں تو اسے غلطی بھی نہیں مانتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک حادثہ تھا کہ شانتی کو یوسف سے محبت ہوئی اور یوسف نے تمام مذہبی قانونی' اخلاقی اور معاشرتی ضابطوں کا خیال رکھتے ہوئے اس سے شادی کرلی۔ آج اگلی نسل کو نفرت کے کسی قرض پر سود ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس ڈاکٹر کی یہ نیکی کم ہے کہ اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی خان جی کی جان بچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کردی تھیں اور اس معاملے میں انتہائی مخلص تھا۔"

"میں اس کا شکریہ ادا کرسکتی ہوں۔"

میں ہنس پڑا "ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ تم اس کی صورت نہیں دیکھو گی؟"

وہ خفت سے بولی "وہ۔۔۔ بس غصے میں کہہ گئی ہیں۔ آخر میری رگوں میں بھی خان جی کا خون ہے۔ انہوں نے کیسا سخت خط لکھ مارا تھا بیٹے کو غصے میں۔"

ائرپورٹ سے باہر آنے میں آدھا گھنٹا لگا۔ میں اس سے پہلے کئی بار لندن آچکا تھا۔ چندا کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ کسٹم اور امیگریشن والوں کی مستعدی پر حیران تھی۔ پاکستان میں باہر سے آنے والوں کو کسٹم حکام کم سے کم بھی دو گھنٹے خوار ضرور کرتے تھے۔ نذر نذرانہ دینے والے بھی ایک گھنٹے سے پہلے باہر نہیں آپاتے تھے۔

میں نے کہا "اب تم کہاں جاؤ گی؟"

اس نے نظریں اِدھر سے اُدھر دوڑانا جاری رکھا "میں دیکھ رہی ہوں کہ مجھے لینے کون آیا ہے۔ میری بکنگ ضرور ہوگی کسی ہوٹل میں۔ تم کہاں ٹھہرو گے؟"

"جہاں تم ٹھہرو گی" میں نے کہا "میں تمہیں لندن میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تم پہلی بار آئی ہو۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا "میں بہت ڈری ہوئی ہوں ناصر۔ اکیلی کبھی لاہور سے گوجرانوالہ نہیں گئی' میں چاہتی

تھی تم یہ کہو۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں؟ خود کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔"

"نہیں' ڈر لگتا تھا کہ تم انکار کردو گے۔"

ایک پستہ قد اور گنجا گورا بڑی مستعدی سے آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس پر ہارڈ بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پلے کارڈ پر لکھا ہوا تھا "مس خان فرام پاکستان!"

میں نے اسے چٹکی بجا کے بلالیا "یہ ہیں مس خان!"

اس نے ایک خوشامدانہ قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے کیا "میں جوناتھن سوفٹ ہوں۔ مختصراً جونی۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "جونی۔ تم کس ہوٹل کے ایجنٹ ہو؟"

"نو سر۔ میں لمبارٹ اینڈ آرنلڈ کا نمائندہ ہوں لیکن میں ہوٹل کے انتخاب سے بہترین نائٹ کلب تک آپ کی ہر جگہ راہنمائی کرسکتا ہوں۔ آپ کی پاکٹ کے مطابق۔"

میں نے کہا "فی الحال تم یہ بتاؤ کہ اپنی کلائنٹ کو تم کہاں لے جاؤ گے اور کیا یہ ممکن ہے کہ اس ہوٹل میں مجھے بھی جگہ مل جائے۔"

وہ ہنسا "جیب میں پیسہ اور ہوٹل میں کمرا خالی ہو تو اس سوال کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پلیز کم ودمی۔ ڈاکٹر خان' جونی ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ میں آپ کو لندن میں ہر جگہ ڈرائیو کرکے لے جاؤں گا۔ کار کمپنی نے آپ کی ڈسپوزل پر رکھی ہے۔ ڈرائیور یا کار آپ کو پسند نہ ہوں تو آپ دوسری لے سکتی ہیں۔"

وہ بہت باتونی مگر خوش اخلاق اور ہوشیار آدمی تھا۔ چاندنی نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارا اچھا گزارا ہوگا لیکن ایک غلط فہمی دور کرلو۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

اس نے حیرانی سے سر کھجایا۔ "پھر آپ ایک میڈیکل سپلائی کمپنی سے کیسے ڈیل کریں گی؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ ایک کسٹمر ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میرا کام تو آپ کا خیال رکھنا ہے۔"

ایک انتہائی پُرتکلف اور شاہانہ انداز رکھنے والی رولز رائس باہر ہماری منتظر تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہمارے لیے دروازہ کھولا اور جب تک ہم بیٹھ نہیں گئے' باادب کھڑا رہا۔ یہ اتنی لمبی کار تھی کہ پچھلے حصے میں ہم پاؤں پھیلا کے بیٹھ بلکہ لیٹ سکتے تھے۔ ڈرائیور والے حصے کو شیشے کی پارٹیشن سے الگ کردیا گیا تھا تاکہ پیچھے بیٹھنے والوں کو پرائیویسی حاصل رہے۔

برطانیہ کے لوگوں کی قدامت پسندی ان کی زندگی میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ وہ پرانی چیزوں کو ان کی اصلی حالت میں برقرار رکھتے ہیں۔ پرانی قدروں پر کاربند رہتے ہیں اور انتہائی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود وضع داری میں دقیانوسی ہیں۔ رولز رائس ان کی قدامت پرستی کا ایک نمونہ ہے۔ اگر اس کی شکل وصورت ہر سال ایک نئے ماڈل کی صورت میں بدلتی رہتی تو شاید یہ بھی مرسیڈیز کی طرح دنیا بھر میں پسند کی جاتی مگر وہ ظاہر سے زیادہ باطن کی خوبیوں کی قدر کرتے ہیں۔ دنیا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

چاندنی کے لیے برامپٹن کے علاقے میں کیرج روڈ پر واقع ہوٹل تھری ایس میں ریزرویشن تھی۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ میں اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں میرا قیام عموماً نائٹس برج ہوٹل میں رہتا تھا جو نائٹس برج اسٹیشن کے قریب تھا۔ اس کے پیچھے مشہور عالم ہائیڈ پارک تھا جہاں عام دنوں میں بھی مجمع لگانے والے کسی نہ کسی مسئلے پر اظہار خیال فرما کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔

ہائیڈ پارک کو برطانوی جمہوریت کی ایک نشانی کے طور پر خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں آپ کسی بھی موضوع پر جب دل چاہے تقریر کرنے کے لیے تشریف لاسکتے ہیں اور کسی کو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ہنگامہ آرائی کے مرتکب نہیں ہوتے تو قانون آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ یہاں آپ حکومت کو' چرچ کو امریکی صدر یا چینی وزیر اعظم کو دل کھول کے گالیاں دے سکتے ہیں۔ ایک بار میں بھی تفریح کے لیے گیا تو مختلف مقامات پر لوگ اپنے اپنے اسٹول اور کرسی یا لکڑی کے باکس پر چڑھے ہاتھ میں میگافون لیے خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ایک جگہ ایک صاحب تاریخ کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ حضرت عیسیٰ نام کا کوئی شخص کبھی تھا ہی نہیں اور اسے سولی چڑھانے کا ڈراما جھوٹا ہے۔ دوسری جگہ برطانوی وزیر اعظم کی نجی زندگی کے شرمناک راز فاش کیے جارہے تھے۔ لوگ سن رہے تھے اور مزے لے رہے تھے۔ پولیس خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔

یہاں بہت سے ممالک کے سفارت خانے تھے۔ آسٹریا' ڈنمارک' ناروے اور جرمنی کے سفارت خانے بیل گریو اسکوائر میں بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ دوسری طرف مشہور رابرٹ دکنز ہال تھا جہاں سمفنی آرکسٹرا کی پرفارمنس دیکھنے اور سننے کے لیے دنیا بھر کے لوگ آتے تھے لیکن یہاں داخلے

کے لیے ریزرویشن ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اسی علاقے میں ایک ہی جگہ چار میوزیم تھے۔ ان میں نیچرل ہسٹری میوزیم۔ سائنس میوزیم اور جیولوجی میوزیم موضوعاتی تھے۔ وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم عام میوزیم تھا۔ انہی کے آس پاس تین مشہور کالج' امپیریل کالج' رائل کالج آف میوزک اور رائل کالج آف سائنس اینڈ آرٹس ہونے سے اس علاقے کی ثقافتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مجھے یہ جگہ لندن میں سب سے زیادہ اسی لیے پسند تھی۔

ہوٹل کے مرکزی دروازے سے کچھ فاصلے پر میں نے ایک شخص کو اپنا ہیٹ الٹا کر کے کشکول کی طرح زمین پر رکھے وائلن بجاتے دیکھا۔ یہ لندن میں بھیک مانگنے کا ایک مہذب انداز ہے۔ حیرانی مجھے وائلن پر بجائی جانے والی دھن سے ہوئی۔ وہ مہدی حسن کے گانے "جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ" کی دھن بڑی مہارت سے بجا رہا تھا۔ ظاہر ہے لندن کے رہنے والے اور سیاح اس دھن کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگر وہ کوئی انڈین گانا بجا رہا ہوتا تو شاید بھارتی اور پاکستانی دونوں متاثر ہوتے مگر پاکستانی گانے کی دھن نے مجھے فوراً متوجہ کر لیا اور میں ذرا سی دیر کے لیے اس کے ہیٹ میں ایک سکہ ڈالنے کے لیے رکا۔ جونی نے راستے میں ہمارے لیے برطانوی کرنسی میں ایک ہزار پاؤنڈ کا ٹریولر چیک کیش کرا دیا تھا۔ جونی کے ساتھ چندا ہوٹل کی لابی میں نظر آئی اور اندر چلی گئی۔

میں چلنے ہی والا تھا کہ فقیر نے وائلن بجانا روک کے مجھے مخاطب کیا "ایک منٹ شاہ جی!"

میں چونک کے رکا "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

وہ وائلن ایک ہاتھ میں اور گز دوسرے ہاتھ میں تھام کے آگے آیا "کیا بات ہے۔ اب تو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے میری طرف؟"

میں نے کہا "کون ہو تم؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔"

وہ اونچی آواز میں بولا "تم مجھے نہیں جانتے' غور سے دیکھو۔ تمہاری وجہ سے ہی میں اس حال کو پہنچا ہوں کہ سڑکوں پر بھیک مانگتا پھر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم شاید نشے میں ہو۔"

فقیر نے میری آستین پکڑ لی "نہیں' میں نشے میں نہیں ہوں۔ نشے میں شاہ جی نظر آتے ہیں کہ رحمان کو نہیں پہچان رہے۔ اب تم یہ کہو گے کہ کون رحمان۔ میں تو کسی رحمان کو نہیں جانتا لیکن یہ ڈراما نہیں چلے گا شاہ جی!"

میں نے اپنی آستین ایک جھٹکے سے چھڑا لی "بند کرو اپنی یہ بکواس۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ پھر تم نے میرا ہاتھ پکڑا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

وہ چلانے لگا "کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ ٹھیک تھا؟"

میں نے کہا "ہٹو' راستہ چھوڑو میرا۔"

اس نے اور شور مچایا "تم نے مجھ سے میرا سب کچھ لے لیا اور اب دھکے دے رہے ہو۔ کب سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا ہوگا مگر لندن میں قدم رکھتے ہی میں شاہ عالم کے قرضے چکانے کے چکر میں پڑ سکتا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اب اس فقیر نے جو اپنا نام رحمان بتاتا تھا مجھے ہوٹل میں جاتے دیکھ لیا ہے اور وہ خوف گیٹ کے باہر موجود ہے تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہوگا۔ وہ آتے جاتے مجھے پریشان کرے گا۔

ابھی تک وہاں سے گزرنے والوں میں سے کسی نے ہمارے جھگڑے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ برطانوی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور پرائے پھڈے میں نہ پڑنے والے مشہور ہیں۔ معلوم نہیں یہ لطیفہ تھا یا حقیقت مگر مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ لندن کے کسی سپر اسٹور میں کوئی شخص خریداری کرتے کرتے گرا اور مر گیا۔ سامان سے بھرے شلف کی گلیوں میں پھرنے والے "ایکس کیوز می سر" کہہ کے اس کے اوپر سے گزرتے رہے۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ جناب آپ یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہیں اور زندہ ہیں یا گزر گئے۔

اگر فقیر کے ساتھ میری مارپیٹ بھی شروع ہو جاتی تو انگریز محض ناگواری سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے لیکن لندن پولیس کی فرض شناسی اور مددگاری کا جذبہ بھی اتنا ہی مشہور ہے۔ وہ پبلک کا دوست سمجھا جاتا ہے اور لوگ اسے پیار سے بوبی کہتے ہیں۔

ایک پولیس مین فوراً ٹہلتا ہوا آ گیا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں سر کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "آفیسر' یہ فقیر مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔"

فقیر نے شور مچایا "یہ شخص جھوٹا ہے۔"

میں نے اپنا پاسپورٹ نکال لیا "تم دیکھ سکتے ہو۔ میں ابھی سیدھا ہیتھرو ائرپورٹ سے آ رہا ہوں۔ میری وائف اندر ہوٹل میں جا چکی ہے مگر اس نے میرا راستہ روک لیا

ہے۔ میں ابھی پاکستان سے آیا ہوں۔"

پولیس مین نے میرا پاسپورٹ دیکھا اور مطمئن ہو کے واپس کر دیا "آپ جائیں سر۔ اس سے میں نمٹ لوں گا۔"

فقیر نے مجھ سے اردو میں کہا "شاہ جی' میں چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔"

پولیس مین نے وارننگ کے انداز میں ڈنڈا ہلایا "چلو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ اپنے ساتھ لے جا کے قید کر دوں گا۔"

لابی میں چندا میری منتظر تھی۔ "کیا ہوا' کیا بات کر رہے تھے اس فقیر سے؟"

میں نے اسے ٹال دیا "اسے شک تھا کہ وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی؟ وہ ہوٹل سے معلوم کرے گا تو اسے پتا چل جائے گا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی سے بات کرنے لگا۔ مجھے عین چندا کے برابر والا کمرا بھی مل سکتا تھا مگر میں نے نہیں لیا اور نیچے والے فلور کو ترجیح دی۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے کوئی بھی ڈسٹرب کرے۔ "نو وزیٹر' نو فون کال پلیز!"

کاؤنٹر کلرک نے شائستگی سے کہا "یس سر!"

تھکن اور نیند کی کمی سے میرا حال خراب تھا۔ گرم پانی سے غسل کے بعد میں جو پڑ کے سویا تو رات کو چندا کی دستک پر جاگا۔ اسے فیشن ایبل اسٹائل کی ساڑی میں دیکھ کے میرے ذہن کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ چندا اندر آ گئی۔ "سونے آئے ہو اتنی دور؟"

میں نے جماہی لی "تم نے تو رات بھر میرے کندھے کو تکیے کی طرح استعمال کیا اور سوتی رہیں مزے سے۔ لیکن یہ تم نے کیا پہن لیا ہے؟"

وہ ہنسنے لگی "جیسا دیس ویسا بھیس۔ تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

میں نے کہا "میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ پھر بھی تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہاں اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے ہندوستانی عورتیں ساڑی پہنتی ہیں اور پاکستانی خواتین شلوار قمیص۔ لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔"

وہ بولی "یہ بات ہے تو میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔ چلو' کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

ڈائننگ ہال میں کافی لوگ تھے مگر ہمیں اپنی پسند کی الگ میز مل گئی۔ چندا مینیو کارڈ کا مطالعہ کر رہی تھی جب میں نے کچھ فاصلے پر ایک شخص کو دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ پھر اچانک مجھے یاد آ گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو جہاز میں بیک وقت دو عورتوں کو اپنی بیویاں بتا رہا تھا حالانکہ وہ ماں بیٹی تھیں۔ میں نے چندا کو اس کی طرف متوجہ کیا تو وہ بھی حیران ہوئی۔

"لگتا تو وہی ہے مگر اتنی جلدی حلیہ بدل لیا اس نے؟"

میں نے کہا "جیسا دیس ویسا بھیس۔ یہ تم نے ہی کہا تھا۔"

چندا ہنسی "کیا یہ بھی ٹھہرا ہوا ہے یہاں؟"

"اور ٹھہرا ہے تو اس کے ساتھ جو عورتیں تھیں' وہ کہاں گئیں؟"

چندا نے کہا "پردہ دار خواتین تھیں۔ کمرے میں بند کر کے آیا ہوگا مگر ہمیں کیا۔ تم اس کے بارے میں نہیں کھانے کے بارے میں سوچو۔ مجھے تو سینڈوچ کے سوا یہاں ہر چیز مشتبہ لگتی ہے۔"

میں نے کہا "چکن' آلو اور مچھلی یا انڈا ہر جگہ کھایا جا سکتا ہے۔ گوشت کی کوئی ڈش پوچھ کر کھائی جا سکتی ہے۔ یہاں اب مسلمان اتنے زیادہ تعداد میں ہو گئے ہیں کہ حرام حلال کا خیال رکھا جاتا ہے۔"

چندا پہلی بار لندن آئی تھی اور اتفاق سے اسے میرے جیسا گائیڈ بھی میسر تھا۔ وہ سارا لندن گھومنا چاہتی تھی۔ تاریخی اور قابل دید مقامات دن میں ہی دیکھے جا سکتے تھے۔ رات کے وقت فلم یا تھیٹر کے علاوہ اوپیرا یا میوزک کنسرٹ اور نائٹ کلب میں اچھی تفریح ملتی تھی لیکن وہاں میں چندا کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے کچھ بازار دکھائے اور ملکہ کی رہائش گاہ بکنگھم پیلس کی طرف سے وکٹوریہ میموریل دکھاتا ہوا دریائے ٹیمس پر ویسٹ منسٹر برج پر لے گیا جہاں سے اس نے پارلیمنٹ ہاؤس اور بگ بین کلاک ٹاور دیکھا لیکن یہ سب مقامات دن میں دیکھنے کے تھے۔ اس نے شاہی محل پر گارڈز کی تبدیلی کے بارے میں سن رکھا تھا مگر اس کا ایک وقت تھا۔

واپسی پر تھکن سے ہمارا برا حال تھا مگر چندا خوش تھی اور اسے خوش دیکھ کے میں مطمئن تھا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ مجھے ایک بار بھی اتنی خوش دکھائی نہ دی تھی۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا TENSE اور نروس۔ اعصابی کشیدگی کا شکار اور ذہنی انتشار میں مبتلا دیکھا۔ وہ خوش باش' خوش ذوق اور خوش پوش۔ ہنستی مسکراتی' چھیڑ چھاڑ کرتی۔ شوخ اور

زندہ دل۔ کبھی خزاں کی ہوا کی طرح بے چین تو کبھی نسیم سحری کی طرح پُر سکون چندا جو خاموش رات کی چاندنی میں ستار کے تاروں سے کھیلتی تھی تو ستارے پلک جھپکانا بھول جاتے تھے۔ جو بارش میں چھت پر بال کھولے کھڑی رہتی تھی اور جو مارشل آرٹ کی پریکٹس کے ہر مقابلے میں مجھ سے ہار جانا پسند کرتی تھی۔ وہ چندا نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

اچانک وہ چندا مجھے پھر مل گئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کبھی مجھ سے دور نہ تھی۔ ہمارے درمیان وقت کی کوئی دل گداز خلیج کبھی حائل ہی نہ تھی۔ چندا ابھی وہی ہے، میں بھی وہی ہوں۔ سب کچھ وہی ہے کہ جو تھا۔ وہ وقت جب شبنم میرے جذبات اور حواس پر چھائی ہوئی تھی، ایک خواب جیسی کیفیت تھی۔ ایک واٹر کلر کی تصویر تھی جس کے سب رنگ دُھل جانے والے تھے۔ اس کے ساتھ میری قربت ایسے تھی جیسے کوئی نشے میں اپنا گھر بھول جائے اور ایک رات کسی پارک میں پڑ کے سو جائے۔

ہوٹل کی لابی سے گزرتے ہوئے میں نے یا چندا نے اِدھر اُدھر دیکھا بھی نہیں۔ شاید یہ آزاد ماحول میں ہونے کا غیر شعوری احساس تھا کہ میں نے ایک بازو چندا کے شانوں کے گرد حمائل کرکے اسے اپنے قریب کر رکھا تھا اور وہ مجھ سے لگ کے ایسے چل رہی تھی کہ پاکستان میں نئے شادی شدہ جوڑے بھی نہیں چلتے۔ یہ احساس تین گھنٹے گھومتے پھرتے ایسے مناظر دیکھنے کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا جو بہت زیادہ رومانی تھے۔ لفٹ میں بھی مجھ سے لگی کھڑی رہی۔ میں نے اسے ہوٹل کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے شب بخیر کہا اور لفٹ کے بجائے زینے سے اتر کے نیچے اپنے کمرے میں آگیا۔ نیند نہ مجھے آ رہی تھی اور نہ چندا کو۔ میں اسے کافی کے لیے اپنے کمرے میں بُلا سکتا تھا یا خود اس کے کمرے میں رک سکتا تھا مگر میں نے خود کو روک لیا۔

اپنے کمرے میں جوتوں سمیت بستر پر لیٹ کے میں بہت دیر تک اپنے جذبات اور خیالات میں آنے والے اس انقلاب کی وجوہ اور اسباب پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا ہونا بالکل فطری تھا اور ناگزیر تھا۔ ایسا بہت پہلے ہو جاتا اگر چندا نے مجھے سزا دینے کے لیے ٹھکرایا نہ ہوتا۔ اِدھر اُدھر کے سہارے اور عارضی پناہ کے رشتے میں نے صرف اس لیے تلاش کیے کہ وقتی طور پر میں چندا سے دور ہو گیا تھا۔ گھر سے نکل کے آدمی دنیا بھر کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہے جہاں عیش و آرام کے اسباب گھر سے ہزار گنا زیادہ ہوں مگر لوٹ کے گھر کی سکون عافیت، طمانیت اور پیار دینے والی چھت کے نیچے کون نہیں آنا چاہتا۔

چندا نے پھر اپنے دل کے دروازے کھول دیے تھے اور پھر مجھے بلا لیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں لوٹ کے کہیں اور جا سکتا۔ غلیل سے پھینکا ہوا پتھر۔ کمان سے نکلا ہوا تیر۔ بندوق کی گولی، راکٹ اور میزائل اور سپر سانک جیٹ طیارے کتنی بھی رفتار سے آسمان کی طرف اٹھیں۔ بالآخر زمین کی کشش سب کو واپس کھینچ لیتی ہے۔

ایسے ہی میں چندا کی طرف لوٹ آیا تھا۔

میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ میں نے حالات کی تصویر کو پھر دیکھا۔ اپنے اور چندا کے رویوں پر غور کیا۔ اس کے اور اپنے ماضی کو ساتھ ساتھ رکھا۔ اس کے اور اپنے جذبات کا پھر تخمینہ لگایا تو سخت لاجواب ہوا کیونکہ وہ جواب از خود میرے سامنے آگیا جو منطق اور ریاضی کے اصولوں کے مطابق تھا۔ اٹل اور واحد جواب.... کہ ایک شادو کے سوا جواب اس دنیا میں نہیں، دنیا کی کوئی بھی لڑکی چندا جیسی نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ تو پھر اس کی جگہ کیسے لے سکتی تھی؟

اس کے برعکس سوچنا میری غلطی اور نا سمجھی کی انتہا تھی۔

لندن میں صبح کے تین بجے۔ گرین وچ مین ٹائم کے مطابق پاکستان میں رات کے دس بج رہے تھے جب میں نے شبنم کو کال کیا۔ اس نے ہیلو کہا اور پھر کسی کو آواز دی اور پھر بولی "یس!"

میں نے کہا "شاہ عالم کالنگ فرام لندن!"

"بولو کیا بات ہے۔ میں سخت مصروف ہوں۔ تم جانتے ہو؟"

میں نے کہا "جھوٹ مت بولو، اخبار تو بازار میں آچکا ہو گا۔ میری طرف سے تم اور تمہارا اخبار، دونوں جہنم میں جاؤ۔ جب فرصت ہو تو مجھے ہوٹل تھری ایس میں فون کر لینا۔" میں نے کہا اور فون بند کرکے سو گیا۔ مجھے شبنم کے غیر جذباتی اور بے گانگی والے رویے پر سخت طیش آیا تھا۔ مگر وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ اسے منانے کے لیے یہ وقت بالکل موزوں نہیں تھا۔

اگلی صبح چندا کو اس کام کے لیے نکلنا تھا جس کے لیے وہ لندن آئی تھی۔ اس نے مجھے بھی آٹھ بجے جگا دیا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"یس میڈم!" میں نے کہا "لیکن تیار ہونے سے پہلے میں بتا دوں کہ تم اس لباس میں بے حد حسین لگ رہی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لباس کے بغیر حسین نہیں

لگوگی۔"

اس نے لال ہو کے کہا "جاؤ تیار ہو جاؤ۔ میں ناشتا منگوا رہی ہوں یہیں۔"

میں باتھ روم میں ہی تھا کہ شبنم کا فون آیا۔ چندا نے اسے وہی بتا دیا جو سچ تھا اور دس منٹ بعد فون کرنے کے لیے کہا۔ اس نے ٹھیک دس منٹ بعد پھر فون کیا "یہ چندا تمہارے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟"

میں نے کہا "ناشتا!"

اس نے تلخ لہجے میں کہا "بہت صبح جاگ گئے تم دونوں۔ کیا وہ پہلے باتھ روم ہو آئی تھی۔"

اس کا مطلب سمجھ کے غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا چنانچہ میں نے دہاڑ کے کہا "بالکل صحیح خیال ہے تمہارا۔ ایک تو یہ لندن ہے میڈم اور پھر ہم ہیں ہوٹل میں۔ آزادی ہے۔"

اس نے چیخ کے کہا "کتنا صحیح لفظ استعمال کیا تھا میں نے مگر تم نے کتنا غصے کا اظہار کیا تھا۔ تم واقعی رنگ رلیاں منانے گئے ہو اس کے ساتھ۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ اس کو یقین دلانے کے لیے کوئی بھی دلیل کافی نہ ہوتی۔ اس نے مان لیا تھا کہ میں چھپ کے چندا سے ملتا تھا۔ میں نے چندا کے ساتھ لندن کا دورہ رکھا مگر شبنم کو جانتے بوجھتے بے خبر رکھا اور اس سے مسلسل جھوٹ بولتا رہا۔ اس جھوٹ میں چندا اور ڈاکٹر کمال برابر کے شریکِ جرم تھے۔ میں نے آخری وقت تک اسے بے وقوف بنایا اور اگر وہ میرے ساتھ اسلام آباد جا کے مجھے سی آف کرنے کا فیصلہ نہ کرتی تو اسے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اس نے صاف کہا کہ میں اور چندا ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں قیام پذیر ہیں۔

میں نے جواب میں اس کو شکی مزاج، حاسد اور پھر آوارگی کی حد تک آزاد خیال کہا۔ یہ کہا کہ وہ محبت کا مطلب صرف ہوس سمجھتی ہے چنانچہ میں اس کے نزدیک احمق ہوں یا نامرد۔ وہ بڑی توپ ایڈیٹر ہے تو مجھے کیا، میں کیا کسی سے کم ہوں۔

ظاہر ہے اس قسم کی گفتگو تعلق کو مزید خراب ہی کر سکتی تھی۔ چندا نے کئی بار مجھے روکنا چاہا مگر میں نے بھی دل کی بھڑاس نکالی اور شبنم نے بھی۔ اس نے میری بے عزتی کی تھی۔ میں نے اس کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچائی اور انجام وہی ہوا کہ اس نے رونا شروع کر دیا اور میں نے فون رکھ دیا۔

چندا نے کہا "یہ سب میری وجہ سے ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں، مجھے معلوم ہے مگر یہ غلط نہیں ہوا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں اور چندا نیچے اترے تو ایک پولیس مین میرا منتظر تھا "تم شاہ عالم ہو، فرام پاکستان؟"

میں نے کہا "یس۔ واٹ از دی پرابلم؟"

اس نے پوچھا "یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تمہاری گرل فرینڈ یا وائف؟"

میں نے ضبط سے کام لیا "جسٹ اے فرینڈ!"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "اوکے۔ جسٹ اے فرینڈ۔ مجھے اپنے اور ان کے بارے میں بتاؤ، لندن میں تمہارا کیا کام ہے؟"

میں نے وضاحت کر دی "یہ اپنے اسپتال کے لیے میڈیکل سپلائی اور ایکوپمنٹ کی خریداری کی ڈیل فائنل کرنے آئی ہیں۔ میں کاروبار کے سلسلے میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ تم میرا پاسپورٹ دیکھو گے؟"

اس نے پاسپورٹ کے اندراجات پر غور کیا "تم اس مرتبہ کون سی ڈیل کرو گے۔ کوئی حوالہ ہے تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "نہیں لیکن پہلے میں اس تفتیش کی وجہ جاننا چاہوں گا۔ اس کے بغیر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔"

وہ بولا "بائی چانس تم پاکستان کے کسی مسٹر رحمان کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں، کون ہے وہ؟"

وہ مجھے شکی نظروں سے دیکھتا رہا "کل تمہارا کسی فقیر سے جھگڑا ہوا تھا۔ ایک پولیس مین مداخلت نہ کرتا تو وہ تمہیں مار دیتا یا تم اسے مار دیتے۔"

"یہ غلط ہے۔ مبالغہ آرائی ہے۔"

"تمہارے اور اس کے درمیان جھگڑے کی وجہ کیا تھی مسٹر عالم؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ میں جب لندن آتا ہوں، اسی ہوٹل میں قیام کرتا ہوں اور وہ اکثر مجھے نظر آتا ہے۔ ایک پاکستانی ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ اسے شرمندہ کرتا ہوں کہ وہ بھیک مانگ کے اپنے ملک کی بدنامی کر رہا ہے۔ لیکن اسے کچھ دیتا ضرور ہوں۔ کل بھی یہی ہوا تھا۔ کیا اس نے کچھ اور بتایا ہے؟"

"وہ کیا بتائے گا۔ ہی از ڈیڈ۔ رحمان اسی کا نام تھا۔"

"ہی از ڈیڈ؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا "پھر کیا یہ تفتیش

قتل کے شبے میں ہو رہی ہے۔"

اس نے کندھے اچکائے "آئی ڈونٹ نو۔ ابھی وہ رپورٹ میں نے نہیں پڑھی۔ کیا تم بتاسکتے ہو کہ رات آٹھ بجے سے بارہ بجے تک تم کہاں تھے۔"

میں نے اسے بتادیا "اگر تم گواہی مانگو گے تو میں صرف مس خان کا نام لے سکوں گا ورنہ وہ میرا۔"

وہ کچھ سوچتا رہا "یہ فقیر کل رات ایک گاڑی کے نیچے آگیا مگر یہ حادثہ نہیں لگتا۔ گاڑی بے قابو بھی نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی نے اس کو پیچھا کرکے مارا۔ گاڑی نے اسے فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیان کچل دیا اور نکل گئی۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ تم قادر بخش کو بھی نہیں جانتے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا "میں لندن کے ہر پاکستانی کو نہیں جانتا۔"

"اس نے تمہارے ساتھ سفر کیا تھا۔ ایک ہی فلائٹ پر اس کے ساتھ دو بیویاں بھی آئی تھیں۔ اسی ہوٹل میں اس کا بھی قیام تھا۔"

میں نے کہا "اچھا وہ۔"

"اس کا مطلب ہے تم اسے جانتے ہو' میرے سامنے جھوٹ مت بولو۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ نہیں ہے آفیسر۔ اس فلائٹ میں جتنے لوگ تھے سب ہی قادر بخش کو اس حوالے سے جانتے ہوں گے۔"

پھر میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ سب لکھتا گیا اور سرہلاتا رہا "جس گاڑی نے رحمان کو مارا' وہ قادر بخش نے کرائے پر لی تھی۔ اس کی دونوں بیویاں لندن آنے کے بعد سے غائب ہیں۔"

"مجھے شک ہے کہ ان دونوں کو وہ کسی غلط مقصد سے لندن لایا تھا۔ شاید وہ انہیں بیچ کے پیسے کھرے کرچکا ہوگا۔ شادی ایک دھوکا تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ماں اور بیٹی دونوں کو اپنی بیوی بتائے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ماں بیٹیاں تھیں؟"

میں نے کہا "جہاز کے سب مسافروں نے سنا تھا۔ سب جانتے ہوں گے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے مسٹر عالم؟" اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھادیا "یہ ترجمہ ہے۔ اصل پیغام پولیس کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔"

میں نے پرزے کی تحریر کو پڑھا "شاہ جی۔ میں نے جیمس کو بلایا ہے۔ وہ تم سے ملے گا' اپنی ہڈیوں کی فکر کرو۔"

میں نے پرزہ اسے واپس کردیا "اس فضول پیغام کا میرے نزدیک کوئی مطلب نہیں۔"

"تم ہی شاہ جی بھی کہلاتے ہو" وہ بولا۔

"ہاں مگر صرف بے تکلف دوستوں کے حلقے میں۔ ویسے لندن میں سیکڑوں شاہ جی ہوں گے۔"

"ایک ویٹر نے قبول کیا ہے کہ یہ پیغام تم تک پہنچانے کے لیے اس نے فقیر سے ایک پاؤنڈ لیا تھا۔ وہ فقیر جانتا تھا کہ تم جیمس کو جانتے ہو۔ لندن میں دس ہزار جیمس ہوں گے۔ اس جیمس کا پورا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں نہیں جانتا' اس لیے بتا ہی نہیں سکتا۔ اگر دس ہزار میں سے ایک بھی جیمس میرا واقف ہوتا تو میں بلا تامل تمہیں اس کے پاس بھیج سکتا تھا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں بھی انتظار کروں۔ کہ وہ کب میری ہڈیاں توڑنے آتا ہے۔ امید ہے وہ ایسا کرنے سے پہلے مجھے سبب ضرور بتائے گا کہ آخر وہ صرف میری ہڈیوں میں کیوں INTERESTED ہے۔"

سارجنٹ کچھ سوچتا رہا۔ "اس فقیر' قادر بخش' جیمس اور تمہارے درمیان کوئی لنک ضرور ہے جو ہم تلاش کرنا چاہتے ہیں اور تمہیں پولیس سے تعاون کرنا چاہیے۔ تمہارا قیام کتنا ہے لندن میں؟"

"ایک ہفتہ یا دس دن۔ ضرورت پڑنے پر میں ایک مہینے بھی رک سکتا ہوں۔"

وہ بولا "ضرورت پڑے گی مسٹر عالم۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پولیس کو اپنی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔"

"تم مجھے گرفتار کرنا چاہو تو الگ بات ہے ورنہ تم مجھے کسی بات کا پابند نہیں کرسکتے۔ قانونی تقاضے پورے کرنے کے علاوہ تمہیں میرے ملک کے سفارت خانے کو بھی بتانا ہوگا۔ میں پاکستان کا ایک شہری ہوں جس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں۔ میں ایک معتبر سیاسی حوالہ بھی رکھتا ہوں۔ اب آفیسر' اگر تم اجازت دو تو میں مس خان کے ساتھ جاؤں۔ ہم پہلے ہی لیٹ ہوگئے ہیں۔"

میں نے چندا کا بازو تھام لیا "اگر جیمس مجھ سے ملے گا تو وہ بہت کچھ جان لے گا۔ جو وہ ابھی تک نہیں جانتا۔ مثلاً یہ کہ میری ہڈیاں کتنی مضبوط ہیں اور اس کی کتنی کمزور اور یہ کہ مس خان نے میری پرسنل سیکیورٹی کی ذمّے داری سنبھال رکھی ہے۔"

وہ کچھ حیران ہوا "شاید تم الٹا کہہ گئے؟"

"تو۔ میری ہڈیوں کی سالمیت کی ضامن مس خان ہے۔

یہ بات میں تمہیں بتارہا ہوں۔ گڈ ڈے آفیسر۔"

چندا نے اب تک ہونے والی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی مگر باہر آتے ہی وہ پھٹ پڑی "یہ کیا مصیبت ہے ناصر!"

"شاہ عالم!" میں نے اس کی تصحیح کی "کسی اور نام سے مخاطب کرکے مجھے مزید مشکل میں مت ڈالو۔ یہ سارے چکر شاہ عالم کے ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ مجھے یہ امید تھی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑجائیں گے۔ میں یہاں آیا تھا شاہ عالم کے چکر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے لیکن آتے ہی ایک چکر شروع ہوگیا تو اسے بدقسمتی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"تم واقعی اس فقیر کو یا کسی جیمس کو نہیں جانتے؟"

"میں پولیس سے یا تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ شاہ عالم ضرور جانتا ہوگا انہیں۔ میں ابھی تک ان سے متعارف نہیں ہوں لیکن تعارف یقیناً بہت جلد ہوگا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ شام کو فراغت ہوگی؟"

اس نے مجھے پکڑلیا "تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے اپنے کام ہیں" میں نے کہا "تم جاؤ۔"

"میں تم کو اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لوں گی۔ تمہاری ہڈیوں کی سلامتی میری ذمّے داری ہے۔" وہ مسکرائی۔

"فضول بات مت کرو۔ وہ میں نے پولیس سے مذاق میں کہا تھا۔ اپنی حفاظت میں خود بھی کرسکتا ہوں۔"

جونی نے گاڑی کا دروازہ بہت دیر سے تھام رکھا تھا "یہ فیصلہ تو آپ لوگ گاڑی میں بیٹھ کے بھی کرسکتے ہیں۔"

گاڑی میں تھوڑی سی بحث ہوئی جو چندا کی ترایٹ کی وجہ سے میری شکست کی صورت میں ختم ہوئی۔ اس نے یکطرفہ طور پر دوٹوک فیصلہ کردیا کہ کام میرا ہو یا اس کا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ جائے گی اور مجھے ہر جگہ اپنے ساتھ لے جائے گی۔ "تم نے خود ہی دعویٰ کیا تھا کہ تمہارا کاروباری تجربہ مجھ سے زیادہ ہے اور تمہارے تعلقات بھی ہیں۔ اب تم میری مدد کرنے کے پابند ہو۔"

"اوکے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ دو تین دن میں تمہارا کام ختم ہوجائے گا پھر تم واپس جاؤ' میرا کام لمبا ہے۔"

"میں نے کہہ دیا ناکہ اکیلے کہیں نہیں جانا۔ پاکستان بھی نہیں۔"

میں نے کہا "آخر اسپتال کو کب تک چھوڑ سکتی ہو تم؟"

"جب تک ضروری ہو۔ ایک مہینہ بھی لگ جائے یہاں تو میری غیرحاضری شمار نہیں ہوگی۔ تنخواہ نہیں کٹے گی میری۔"

"لیکن تمہارے فرائض۔؟"

وہ اڑی رہی "مجھے میرا فرض مت بتاؤ' مجھے سب معلوم ہے۔"

میں نے ہار مان کے کہا "جونی۔ تم سب سن رہے ہو؟ اچھی بات یہ ہے کہ سمجھ کچھ بھی نہیں رہے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مشکلات سے نمٹنے میں تمہارا کوئی سابق تجربہ ہے؟ خطرات کا سامنا کرسکتے ہو؟"

میں نے اس کی حسِ مزاح کی تعریف کی "میرا مطلب تھا ایک فلمی قسم کے خطرات سے۔ اگر کوئی ہمارے پیچھے لگ جائے تو تم اسے ڈاج دے سکتے ہو۔ اگر ماردھاڑ کی نوبت آجائے۔"

"میں دونوں کاموں میں ماہر ہوں۔ فرار ہونے میں بھی اور مار کھانے میں بھی۔ تاہم میں بتا سکتا ہوں کہ اس وقت بھی ایک گاڑی ہمارے تعاقب میں ہے۔ اس میں چار کالے نظر آرہے ہیں۔ پلٹ کر دیکھنا خطرناک ہوگا۔ گاڑی کا نمبر الٹا نظر آرہا ہے مگر میں پڑھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین ہے؟"

"اتنا ہی جتنا اپنی گاڑی کے نیچے چار پہیوں کی موجودگی کا۔ یہ گاڑی ہوٹل کے باہر موجود تھی اور وہیں سے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ اچھے ڈرائیور کی نظر جتنی آگے ہوتی ہے اتنی ہی پیچھے۔"

میں نے کہا "ویل جونی! کیا ہم ان سے تنہائی میں مل سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ انہیں ہوٹل میں بلایا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ آگے کہیں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی ہمیں مار کھاتا ہوا نہ دیکھے۔ کوئی خالی بیک یارڈ یا احاطہ۔"

اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا "ہر جگہ لکھا ہوتا ہے کہ بلا اجازت داخل ہونا منع ہے۔ کیوں نہ ہم سیدھے پولیس کے پاس چلے جائیں۔ بجائے اس کے کہ ہم گرفتاری کے بعد لے جائے جائیں۔"

میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا "بہتر ہے کہ ان سے مل لیا جائے یہیں۔"

جونی نے گاڑی کو ایک سائڈ میں کیا ہی تھا کہ پیچھے والی گاڑی نے اس کا راستہ بلاک کردیا۔ ایک ہٹا کٹا نیگرو اگلی

سیٹ پر سے اُترا۔ دوسرا پیچھے سے نکلا۔ ان کے رنگ' گنجے سر' موٹے ہونٹ' کپڑوں کے شوخ رنگوں' چیونگم چبانے کے اور بدمعاشی کے انداز میں اتنی یکسانیت تھی کہ وہ بھائی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک میری طرف آ کے کھڑکی میں جھک گیا' دوسرا جونی کی کھڑکی میں آدھا اندر گھس گیا۔ یہاں تک کہ جونی کو کہنا پڑا کہ کیا تم مجھے چومنے کی کوشش کر رہے ہو؟

میں نے سوالیہ انداز میں دوسرے کو دیکھا "یس؟"

نیگرو جبڑے ہلاتا رہا "بگ باس تمہیں دیکھنا چاہتا ہے' ابھی۔ اگر تم راضی خوشی نہیں جاؤ گے تو ہم تمہیں بنڈل کی طرح اٹھا کے لے جائیں گے۔"

دوسرے نے ڈرائیور کی بات کا جواب دیا "تمہاری بل ڈاگ جیسی شکل کے مقابلے میں چومنے کے لیے یہ لڑکی کیا بُری ہے؟"

میں نے پہلے اسے جواب دیا "تم کوشش کر کے کیوں نہیں دیکھتے۔ تمہیں اتنا مزہ آئے گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے" پھر دوسرے سے کہا "اگر تمہارے باس کا منحوس چہرہ بھی ایسا ہی ہے جیسا تمہارا تو آئی ایم سوری!"

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نے مجھے باہر کھینچنے کی کوشش کی اور دوسرے نے پیچھے والے دروازے سے اندر گھسنے کی۔ چندا نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا اور جب اس کا ریچھ جیسا منہ صحیح فاصلے پر تھا تو اس نے اس کی ناک پر وار کیا اور اس نے پورا سانس لینے کے لیے منہ کھولا تو نیچے سے اس کی ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا مارا۔ اس کی زبان دانتوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے مشتعل ہو کے گالی دی "بلڈی بچ!" چندا نے اس کی آنکھوں میں دو انگلیاں گھسا دیں۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔

اس کا ساتھی دروازہ کھولنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کے گر گیا۔ میں نے جونی سے کہا کہ گاڑی آگے بڑھائے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ساری کارروائی مکمل ہو گئی تھی۔ ابھی تک نہ کوئی پولیس مین نظر آیا تھا اور نہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔ جونی نے کار کو تھوڑا سا پیچھے کر کے نکال لیا۔ وہ سخت نروس تھا۔ "اصولاً ہمیں پولیس کے آنے تک رکنا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "اصولاً انہیں ہمارا راستہ ہی نہیں روکنا چاہیے تھا۔ یہ بڑی بے اصول دنیا ہو گئی ہے جونی پھر ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن فکر مت کرو' ان سے پھر ملاقات ہو گی۔"

چندا نے اردو میں بات کی "یہ بگ باس کون ہے؟"

میں نے کہا "یہاں تم باس ہو۔ یہ بتاؤ' پہلے کہاں جانا ہے؟"

اس نے بے حد خفگی سے کہا "جہنم میں مگر پہلے بتاؤ مجھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم کیوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو۔ یہ پاکستان نہیں برطانیہ ہے۔"

میں نے اسے ٹالنا چاہا "تم نے اچھا کیا مجھے بتا دیا۔"

"مذاق مت کرو۔ پولیس پہلے ہی تمہیں تفتیش میں شامل کر چکی ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا تو۔"

میں نے کہا "کوئی جھوٹ نہیں بولا میں نے ابھی تک۔"

"کیوں؟ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ میرا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں؟ اگر تحقیقات کا سلسلہ پاکستان تک پھیل گیا یا یہاں سفارت خانے سے پوچھا گیا تو معلوم ہو جائے گا کہ شاہ عالم ایک مفرور اور مطلوب مجرم تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو چندا' یہاں جو کچھ ہوا اس میں نہ میری مرضی کو دخل تھا اور نہ ارادے کو۔ میں تو یہاں صرف اور صرف اس لیے آیا تھا کہ یہ شاہ عالم کا چکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ تاکہ ناصر عظیم کا مستقبل باعزت اور محفوظ ہو جائے۔ اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ ایک پلان تھا میرے ذہن میں۔ اگر اس سے پہلے ہی میں شاہ عالم کے پرانے معاملات میں INVOLVE ہو گیا تو اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ میرا کیا قصور ہے اس میں؟"

"مگر تم صورتِ حال کو زیادہ پیچیدہ بنا رہے ہو۔ COMPLICATE کر رہے ہو۔ جان چھڑانے کے بجائے تم اور پھنس جاؤ گے شاہ عالم کے معاملات میں۔"

میں نے بگڑ کے کہا "تم جانتی ہو کہ میں جانتے بوجھتے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو بالکل الگ اور گمنام رہنا چاہتا تھا۔ اس فقیر نے مجھے پہچان لیا۔ خدا کی قسم میں اسے یا کسی قادر بخش اور جیمس کو نہیں جانتا۔"

"مگر وہ شاہ عالم کو جانتے ہیں۔ کہہ دو ان سے کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "پاگل ہو تم۔ میں نے شاہ عالم بن کے زیول کیا ہے۔ یہاں ہوٹل کے رجسٹر میں شاہ عالم ہے میرا نام۔ تم کیا چاہتی ہو' میں جعلسازی اور دھوکا دہی کے جرم میں پہلے یہاں پکڑا جاؤں اور پھر پاکستان میں سزا پاؤں۔ اگر تم ان معاملات کو سمجھتی نہیں ہو تو خواہ مخواہ بولنے اور فضول مشورے دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟ خاموش تماشائی کی حیثیت سے تمہیں مشکل میں پڑتا دیکھتی رہوں۔"

میں نے کہا "مت دیکھو۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ تم جاؤ' اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے کنفیوز اور DISCOURAGE مت کرو۔"

وہ خاموش ہو گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

اب جونی بولا "سر' خدا کرے کسی نے گاڑی کا نمبر نہ دیکھا ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر کوئی پولیس کو اطلاع کر دیتا ہے اور وہ آدھے گھنٹے میں گاڑی کو ٹریس کر لیتے ہیں لیکن تمہارا کوئی قصور نہیں۔ راستہ انہوں نے روکا تھا۔ بدمعاشی انہوں نے دکھائی تھی اور خاتون کے ساتھ بدتمیزی بھی کی تھی۔ ان حالات میں تمہارا مشتعل ہونا فطری تھا۔ تم نے جو کیا وہ غلط نہیں سمجھا جائے گا۔"

میں نے کہا "کیا تم نے ان کی گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟"

"گاڑی ترچھی تھی اور وہ بلیک باسٹرڈ بدمعاشی پر تلا ہوا تھا ورنہ میں ضرور دیکھ لیتا۔"

میں نے کہا "جونی۔ تم ایک کمپنی کے ملازم ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر میری وجہ سے کوئی مصیبت آئے۔ تم اپنی ASSIGNED ڈیوٹی کرو۔ میڈم کو ہر جگہ لانے لے جانے کی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن کسی ایسے ڈرائیور کو جانتے ہو تو مجھے بتاؤ جو تمہاری طرح نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کچھ خطرات پسند ADVENTURE کا شوقین اور DEVIL-DARE ٹائپ۔"

"میں سمجھ گیا سر۔ ایک سکھ ہے بلونت سنگھ۔ اسے بل یعنی بیل اور BULLY بھی کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے مطلب کا آدمی ثابت ہو گا۔"

دن کا باقی حصہ چندا کے ساتھ دو مختلف کمپنیوں کے ساتھ مذاکرات میں گزرا۔ ان کے درمیان اسپتال ایکوپمنٹ سپلائی کا سخت مقابلہ تھا۔ میڈیکل ٹیکنالوجی کی پیش رفت بہت تیز تھی اور دنیا بھر میں DIAGNOSIS کے جدید ترین طریقے اپنانے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر علاج سے پہلے ہر قسم کی رپورٹ پر انحصار کر کے وقت بچا رہے تھے اور رسک کم کر رہے تھے۔ یورپی ممالک کے ساتھ جاپان اور کوریا جیسے نئے صنعتی ممالک کا مقابلہ تھا لیکن یہ مقابلہ کوالٹی سے زیادہ قیمت کے فرق کا تھا۔ یورپ میں برطانیہ' جرمنی اور ہالینڈ کوالٹی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

پہلے ہم ایک کمپنی میں گئے۔ انہوں نے اپنی پراڈکٹ کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دینے کے بعد عملی DEMONSTRATION کا انتظام کیا۔ بلاشبہ ایک ڈاکٹر ہی یہ سب بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ سیلز اور کلائنٹ سروس کے سب لوگ بہت کوالیفائڈ تھے مگر یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ چندا خود ڈاکٹر نہیں ہے ان کا رویہ نہیں بدلا۔ نہ انہوں نے چندا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی کم علمی کا مذاق اڑایا۔ وہ اسے اتنی ہی اہمیت دیتے رہے اور ہر بات عام فہم انداز میں بتاتے رہے۔

چندا بالکل بلینک نہیں تھی۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کمپنی کے بروشر اور بنیادی انفارمیشن دینے والے لٹریچر کا مطالعہ کر چکی تھی اور ڈاکٹر کمال سے ہر قسم کی مشینوں کے بارے میں یہ سمجھ چکی تھی کہ اسے مشینوں کی کارکردگی کو کیسے جج کرنا ہو گا۔ دوپہر کے بعد کمپنی نے لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس میں سیلز اور مارکیٹنگ ایگزیکٹوز کے ساتھ خود چیئرمین نے بھی شرکت کی۔

ہماری شام دوسری کمپنی کے ساتھ گزری جہاں سب کچھ پہلی کمپنی جیسا ہی تھا۔ ٹیکنیکل معاملات پر چندا نے بات کی تو کاروباری امور پر میں نے۔ ہر کمپنی کی TERMS الگ تھیں۔ کہیں لانگ ٹرم لیزنگ کی سہولت بہتر تھی تو کہیں آفٹر سیل درائی' فوری طور پر فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ہم رات کو دوسری کمپنی کے ڈنر سے فارغ ہوئے تو بہت تھک گئے تھے۔

لندن کے راستوں سے کم واقفیت کی بنا پر میں جونی کو ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔ ڈرائیونگ مشکل نہیں تھی اور کہیں راستہ بھول جانے یا بھٹکنے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ قدم قدم پر موجود پولیس مین ہر جگہ آپ کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن مجھ سے ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی ہو سکتی تھی۔ اپنے پاکستان میں تو سب چلتا ہے مگر یہاں غلط طریقے سے اوورٹیک کرنے' لین بدلنے یا موڑ کاٹنے کا خمیازہ بھی جرمانے کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ ون وے ٹریفک کہاں ہے اور پارکنگ کہاں ممنوع ہے۔ یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا۔

رات کے دس بجے میں نے جونی سے پوچھا "تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہو گی؟"

وہ بولا "آٹھ گھنٹے کے بعد اوور ٹائم ڈبل ریٹ پر ملتا ہے۔ رات بارہ بجے تک مجھے دو دن کی اضافی ادائیگی ہو گی۔ اگر ایک ہفتہ ایسے ہی گزرے تو ہمارے بہت سے مالی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہاں بارہ بجے کے بعد میری بیوی کو میری ضرورت ہوتی ہے اور مجھے گھر کے آرام کی۔ تاکہ صبح میں پھر آ سکوں۔"

رات دس بجے میں نے فون پر معلوم کیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرے لیے دو ٹیلی فون پیغامات ہیں جو مجھے سنوائے جا سکتے ہیں۔ ایک فون فرید عباسی کا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ رئیس کی ضمانت پر رہائی ہو گئی ہے۔ دوسرا شبنم نے کیا تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی تھی اور اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار کیا تھا پھر یہ اطلاع دی تھی کہ وہ میرے لیے آفس کو ڈیکوریٹ کرنے والوں سے بات کر چکی ہے اور امید ہے تین ہفتے میں دونوں آفس تیار ہو جائیں گے۔

میں نے ہوٹل والوں کا شکریہ ادا کیا "ان خاتون نے کتنی مرتبہ فون کیا تھا؟"

"چار مرتبہ۔ ایک بار مس خان کو بھی پوچھا تھا۔"

"اور انہیں کیا بتایا گیا؟"

"یہی کہ آپ دونوں صبح سے ابھی تک نہیں لوٹے۔ گئے تو ایک ساتھ تھے۔"

"بیڑا غرق" میں نے اردو میں کہا۔

"جی سر؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں" اور فون رکھ دیا۔

رات بارہ بجے جونی رخصت ہو گیا تو ہم نے ٹیکسی لے لی۔ اس تفریح نے دن بھر کی تھکن اور کوفت دور کر دی تھی۔ چندا بہت خوش تھی اور ہم لندن کی نائٹ لائف کو ایسے ہی انجوائے کر رہے تھے جیسے ہزاروں دوسرے جوڑے۔ مجھے ہر جگہ انڈین اور پاکستانی بھی نظر آئے مگر کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ایک جگہ ہم کافی پی رہے تھے کہ نشے میں دھت ایک لڑکا اور لڑکی فرطِ جذبات میں لڑکھڑا کے ہماری میز سے ٹکرا گئے۔ کافی چندا کے کپڑوں پر گری تو وہ سخت پریشان ہوئی۔ "ان کا تو ستیاناس ہو گیا"

"ہونے دو۔ یہاں کون ہے تمہارے کپڑے دیکھنے والا۔ تم بن کے گھومو تو بھی کوئی نہیں پوچھے گا" میں نے کہا لیکن چندا کی تسلی نہیں ہوئی۔ رہی سہی کسر کچھ دیر بعد پوری ہو گئی جب اس کا پیر کیلے کے ایک چھلکے سے پھسلا اور جہاں وہ گری وہاں فٹ پاتھ پر انجن آئل پڑا ہوا تھا۔ میں نے چندا کو اٹھایا تو خفت سے اس کا برا حال تھا مگر اچھی بات یہ تھی کہ نہ اس کے پاؤں میں موچ آئی اور نہ کوئی ہڈی ٹوٹی تھی۔ مجھے بعد میں جتنا غصہ آیا اس سے زیادہ حیرانی ہوئی کہ یہاں بھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کیلے کھا کے سڑک پر اچھال دیتے ہوں اور سڑک کے کنارے آئل پڑا رہتا ہو لیکن خیریت وہ ایسٹ اینڈ کا علاقہ تھا جہاں ایشیائی باشندے لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں اور وہاں جا کے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ آپ لندن میں ہیں۔ دیسی کھانوں کے مسالوں کی خوشبو سے پان کے لوازمات تک اور چائے خانوں میں بجتے گانوں سے گمان یہی ہوتا ہے کہ آپ گوالمنڈی میں ہیں۔ چنانچہ یہاں اپنے پاکستان کی طرح کوئی بھی کیلے کے چھلکے پر پھسلنا چاہے تو اس کے مواقع بھی دستیاب تھے اور سڑک پر انجن آئل گرانے کے بھی۔

میں نے چھلکا قریب ہی لگے ہوئے ڈسٹ بن میں ڈالا اور اِدھر اُدھر دیکھا مگر سوائے چند شہدوں کے جو چندا کے گرنے پر قہقہے لگا کے فارغ ہو چکے تھے۔ ہماری طرف دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک پولیس مین ٹہلتا ہوا میرے قریب سے گزرا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

میں نے شکایت کی "یہاں تیل پڑا ہوا ہے۔ کیلے کے ایک چھلکے پر پاؤں پھسلنے سے خاتون گر گئیں۔ میں لندن میں یہ EXPECT نہیں کرتا تھا۔"

وہ مسکرانے لگا "یہ تمہارے ہی بھائی بند ہیں جو لندن کو بدنام کرتے ہیں لیکن میں ابھی دیکھتا ہوں کہ اس حرکت کا ذمے دار کون ہے؟" وہ اسی طرح ٹہلتا ہوا پان سگریٹ کی ایک دکان تک چلا گیا جس کے سامنے یہ تیل کا دھبا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کوشش کرکے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل کر لی ہوں گی جس کی بنیاد پر کسی سے جرمانہ وصول کیا جائے۔ لندن پولیس کی مثالی کارکردگی کا تصور کچھ ایسا ہی تھا۔

آدھی رات کے بعد کپڑوں کی خریداری ناممکن تھی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا جب میرے پوچھنے پر ایک خشخشی داڑھی اور ٹوپی والے شخص نے کہا "خیر سے پاکستانی ہو بھائی جی! ابھی آئے ہو لندن اور شادی بھی خیر سے نئی نئی ہوئی ہے۔ ہم تو بھائی جی ایک نظر میں چہرے پر سب پڑھ لیتے ہیں' آجاؤ میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کوئی اسٹور ہے آپ کا؟"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا "او بھائی جی! بندے کا کیا ہے۔ جو ہے اوپر والے کا ہے۔ بالکل نئے تو نہیں پر نئے جیسے کپڑے ہوتے ہیں اپنے پاس۔"

وہ مجھے ایک اپارٹمنٹ کے تہ خانے یا BASEMENT میں لے گیا جہاں ایک خاصے کشادہ ہال میں کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دو افراد ان کپڑوں کی چھانٹی کر رہے تھے۔ ہال کی دیواروں پر ہینگرز میں ہر طرح کے صاف ستھرے اور استری کیے ہوئے کپڑے موجود تھے۔

"لو بھائی جی! آپ پسند کر لو۔ خیر سے اپنے پاکستانی کپڑے بھی ہیں اور اگر چاہیے ولایتی پہننے کو تو اسکرٹ جینز جیکٹ اور ــــ"

میں نے کہا "آپ کا ریڈی میڈ گارمنٹس کا بزنس ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "یہی سمجھ لو بھائی جی۔ آپ دیکھ رہے ہو نا۔ سب ریڈی میڈ ہی ہیں۔ سائز دیکھ کے اٹھا لو کوئی پیس۔"

میں نے کہا "لیکن ــــ یہ پرانے لگتے ہیں۔"

چندا نے کہا "اور کیا۔ تمہیں بو نہیں آ رہی ہے؟"

"بو تو ان میں سے آ رہی ہے۔ یہ جو ابھی آئے ہیں۔ کل یہ بھی دھل کے صاف ہو جائیں گے خیر سے۔ استری کے بعد ایسے ہی نظر آئیں گے" اس نے دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے درجنوں شاید سیکڑوں جوڑوں کی طرف اشارہ کرکے بتایا "آپ بتاؤ بھرجائی جی۔ کوئی اچھا لگا؟"

چندا نے ناگواری سے کہا "رہنے دو۔ مجھے یہی ٹھیک ہیں جو میں نے پہن رکھے ہیں۔ میلے ہیں تو کیا' میرے اپنے تو ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "لو جی' کپڑے وہ اپنے جو اپنے تن پر۔ بندہ لے کر کیا جاتا ہے دنیا سے؟ وہی جو لے کر آتا ہے۔ باقی سب یہاں چھوڑ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ کپڑے کہاں سے آتے ہیں اور جاتے کہاں ہیں؟"

"جاتے تو خیر سے اپنے پاکستان میں۔ آتے ہیں ہر جگہ سے۔ اپنے بندے فرانس' ہالینڈ اور جرمنی میں بھی ہیں۔ پرانا مال اٹھاتے ہیں بھائی جی مفت میں۔ گوروں میں مدد کا جذبہ بہت ہے اور آپ سے کیا پردہ۔ کراچی' لاہور اور پنڈی میں اپنی دکانیں ہیں لنڈا بازار میں۔ میرا بھائی ہے ادھر' اور بھیجے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ خیرات میں کپڑے لے کر بیچتے ہو۔ اگر یہ بات لوگوں کو معلوم ہو جائے؟"

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "کیسے معلوم ہو گا بھائی جی! جس نے پرانے کپڑے دے دیے وہ بھول گیا اور پھر میں خود تو کپڑے نہیں مانگتا پھرتا۔ یہ کام دوسرے کرتے ہیں۔ میں تو ان سے خریدتا ہوں۔ وہ چرچ سے یا رفاہی اداروں سے لیتے ہیں۔ گھروں سے اکٹھے کرتے ہیں۔ ڈرائی کلینرز سے اور مردہ خانوں سے لاتے ہیں۔ بڑی محنت کرتے ہیں بھائی جی' سب چار پیسے کمانے کے لیے آتے ہیں ادھر۔"

میں نے کہا "لعنت ایسی کمائی پر ایسی محنت پر جو مُردوں کے کفن چرا کے بیچ دیتے ہیں' ان کا بھی یہی فلسفہ ہو گا کہ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری اپنی عزت تو کوئی چیز نہیں مگر ہم پاکستانیوں کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہمارا ایک ہم وطن کیا کر رہا ہے۔"

وہ بے غیرت آدمی تھا۔ اس پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔ "لو جی۔ ہم تو خیر سے اپنا سمجھ کے تحفہ دے رہے تھے بھرجائی کو۔ اس میں کون سی کمائی کر رہے تھے۔ آپ شکریہ ادا کرنے کے بجائے لیکچر دینے کھڑے ہو گئے۔"

میں نے چندا کا ہاتھ پکڑا "چلو۔ بڑی غلطی کی ہم نے یہاں آ کے۔"

جب ہم اوپر آ رہے تو اچانک ایک شخص میرے سامنے آگیا جو تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بیک وقت ہم دونوں دائیں بائیں ہوئے پھر میں رک گیا لیکن اتنی دیر میں اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور میں نے اسے۔

میں نے کہا "قادر بخش۔ تم قادر بخش ہو نا؟"

وہ ایک دم انجان بن گیا "آپ کو غلطی لگی ہے جی۔ میرا نام قادر بخش نہیں ہے۔"

میں نے کہا "جھوٹ بولتے ہو تم۔ اسلام آباد سے لندن تک ہم ایک ہی فلائٹ پر تھے اور تم اکیلے نہیں تھے۔ دو عورتیں تھیں تمہارے ساتھ' برقع پوش۔ ان کو تم نے اپنی بیوی بتایا تھا اور ایک شخص سے تمہاری لڑائی بھی ہوئی تھی جو کہہ رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔"

اس نے سلام کے انداز میں ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھا "یا میرے مولا' کیسے کیسے لوگ متھے لگ جاتے ہیں۔ کہہ دیا ایک بار کہ میں قادر بخش نہیں ہوں۔ میرا نام ہے شہاب الدین' شابو کہتے ہیں سب مجھے۔"

لیکن میں اتنی آسانی سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔

میں نے چندا سے کہا "چندا' یہ وہی شخص ہے نا۔"

چندا میرے پیچھے تھی اور لنڈے بازار کا سپلائر اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ چندا کو کراس کرکے آگے آگیا۔ "او بھائی جی! آپ ہم سے پوچھو۔ یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا "چور کا گواہ ڈاکو۔ بکواس کرتے ہو تم بھی۔"

خود کو شابو قرار دینے والا فریادی بن گیا "تم بھی کیسے کیسے بندوں کو لے آتے ہو ادھر حاجی صاحب! مرواؤ گے کسی دن مجھے بھی اور خود بھی مارے جاؤ گے۔"

حاجی نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھو بھائی جی' بندے کو علیکا لگ جاتا ہے۔ یہ اپنا شابو

دو سال سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "بے وقوف مت بناؤ مجھے۔ اس کو دو سو پہچاننے والے مل جائیں گے جو جہاز پر اس کے ساتھ آئے تھے۔"

"مگر یہ تو دو سال سے گھر نہیں گیا۔ ادھر ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھ سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب پولیس آئے گی تو خود ہی معلوم کر لے گی۔"

حاجی نے کہا "پولیس کیوں آئے گی ادھر خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ نہیں۔ قادر بخش کی تلاش ہے انہیں۔ یہ کل تک اسی ہوٹل میں تھا جہاں میرا قیام ہے۔ تھرا اپس ہوٹل میں۔"

"اوئے یہ کیا قادر بخش قادر بخش کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ایک بار کہہ دیا کہ میرا نام شہاب الدین ہے۔ سمجھ میں نہیں آئی" وہ چلانے لگا۔

میں نے کہا "چلاؤ مت ورنہ یہ سمجھ لو کہ میری آواز تم سے اونچی ہوگی اور میں بند بھی کر سکتا ہوں تمہاری آواز۔"

حاجی نے معاملہ فہم ہونے کا ثبوت دیا "چلو بھائی جی' آپ مجھے بتاؤ' کیا الزام ہے شابو پر۔ کیوں تلاش کر رہی ہے پولیس اسے؟"

میں نے کہا "قتل کا الزام ہے اس پر۔ اس نے قادر بخش کے نام سے ایک گاڑی کرائے پر لی تھی پھر اس گاڑی سے کچل کے ایک فقیر کو ہلاک کیا جس کا نام رحمان تھا۔ اور اس فقیر کی جیب سے ایک رقعہ نکلا تھا۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں غصے میں ضرورت سے زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے یہ سب ان کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ پھر پولیس آئے تو میں انہیں یہاں لے آؤں۔

میری بات سن کر حاجی کی صورت پر پریشانی نظر آنے لگی تھی اور شابو کا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا مگر حاجی زیادہ چالاک تھا۔ وہ ہنسنے لگا "اوئے یار شہاب الدین۔ چل جانے دے ان کو۔ اپنے پاکستانی بھائی نے بہت پی لی ہے۔ ادھر تو ملتی نہیں' ولایت آ کے۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "مجھے اپنا ایمان اور اپنا ضمیر اس پیسے سے زیادہ عزیز ہے جو تم دونوں بیچ کے کما رہے ہو۔"

حاجی کی آواز بند ہو گئی۔ "او۔۔۔ بھا۔۔۔ بھائی جی' یہ کیا؟"

چندا نے میرا ہاتھ کھینچ لیا "یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ لوگ الٹا تم پر کیس بنا دیں گے۔ ان کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے حاجی کو چھوڑ دیا اور چندا کے ساتھ اوپر آ گیا۔ جونی کو ہم نے پہلے ہی رخصت کر دیا تھا۔ ہوٹل جانے کے لیے ہم نے ایک ٹیکسی لے لی۔ میں نے اس جگہ کو ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ پولیس کے ساتھ آنا پڑے تو میں بھٹکتا نہ پھروں۔

چندا نے ٹیکسی میں بیٹھ کے مجھے ٹھنڈا کیا "خدا کے لیے ہوش سے کام لو۔ ہمارے پاس وقت کہاں ہے ان چکروں میں پڑنے کے لیے۔"

میں نے کہا "لیکن چندا' اس سؤر کے بچے حاجی نے مجھے شرابی کہا۔ وہ حرام زادہ شابو مجھے ہی جھوٹا بنا رہا تھا اور مجھے پولیس کے چکر میں ڈالنے والا وہی ہے۔"

"میں بھی سمجھتی ہوں یہ بات لیکن تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شاہ عالم یہاں جو بھی کرتا رہا' وہ سب تمہارے خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اب تم ہو شاہ عالم لیکن تمہیں خاک بھی نہیں معلوم کہ یہاں اس نے کیا کیا چکر چلا رکھے تھے۔ تم تو اپنی جان چھڑاؤ۔ لعنت بھیجو حاجی پاجی کے کاروبار پر اور شہاب الدین پر۔"

میرا دماغ ٹھکانے آ گیا "یو آر رائٹ۔ پولیس تو شاید مان جائے کہ میرا کسی قادر بخش یا اس فقیر کے قتل سے کوئی تعلق نہیں لیکن جیمس کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ملنا ہی پڑے گا اس سے۔"

رات کے وقت ہوٹل کی لابی میں بہت کم لوگ تھے۔ چندا کچھ زیادہ ہی CONSCIOUS تھی ورنہ کسی کو اس کے کپڑوں کی خراب حالت سے سروکار نہ تھا۔ ہم تیزی سے گزر گئے۔ میں اسے اپنے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کے جانے لگا تو اس نے مجھے اندر بلا لیا "اندر آتے ہوئے ڈرتے ہو کیا؟"

میں نے دروازہ بند کر کے کہا "ہاں۔ ڈرتا ہوں میں اپنے آپ سے۔"

وہ مسکرائی "مجھ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تمہیں۔ جس دن تم نے بدنیتی سے مجھے چھوا' اس دن میں کیا حالت کروں گی تمہاری۔ یہ جانتے ہو نا؟"

تھکن ہونے کے باوجود ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چندا کپڑے بدلنے گئی تو میں نے روم سروس سے کافی کے لیے کہا۔ ایک صوفے پر نیم دراز ہو کے میں جوتے اتارنے یا نہ اتارنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی اور آپریٹر

نے کہا "لاہور سے آپ کی کال ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ریسیور میں سرسراہٹ بڑھ گئی۔ میں نے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے شبنم نے ہیلو کہا تو میرا دل بیٹھ گیا "یہ غالباً مس خان کا کمرا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں' تم نے کسے فون کیا تھا؟"

"پہلے تمہیں ہی کیا تھا مگر وہاں کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تو میں نے چاندنی کا نمبر مانگ لیا اور خدا کی قدرت دیکھو' چاندنی نہیں ملی مگر تم مل گئے اور کیوں نہ ملتے۔"

میں نے کہا "تم مجھے بھی کچھ کہنے دو گی؟"

اس نے طنز اور تلخ لہجے میں بات جاری رکھی "جہاں چاندنی ہوگی وہاں چاند بھی ہوگا۔ جیسے کہ انگریز کہتے ہیں' جہاں دھواں ہوگا وہاں آگ ضرور ہوگی۔"

میں نے کہا "شٹ اپ شبنم!"

"میرے شٹ اپ کرنے سے کیا ہوگا۔ لندن میں کیا وقت ہوا ہے۔ میں بتا سکتی ہوں کہ تمہاری گھڑی میں ایک بج کر پچاس منٹ ہوئے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے گویا اور تم اپنے کمرے میں نہیں ہو۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ فون رکھ دوں۔ اس وقت شبنم سے بات کرنے کا فائدہ کچھ نہیں تھا۔ الٹا اس کی اور میری تلخ کلامی ہو جاتی اور چندا کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ہمارے درمیان اس کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے۔ دو منٹ بعد میں نے ریسیور پھر اٹھا کے دیکھا۔ شبنم نے مایوس اور مشتعل ہو کے لائن کاٹ دی تھی۔ میں نے کاؤنٹر والوں کو ڈانٹا کہ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے فون کیوں ملایا؟

"آپ کی لائن نہیں دی تھی ہم نے سر!" آپریٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا "لیکن خاتون نے اصرار کیا کہ وہ آپ کی وائف ہیں اور ارجنٹ معاملہ ہے۔ آپ سے پوچھنے کی کوشش کی تو ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ ہم نے خاتون کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' مس خان سے بات کرا دو۔"

قسمت نے میرے ساتھ اتفاقات کا فلمی کھیل شروع کر دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک غلط فہمی شبنم کے اس خیال کو حقیقت بنا رہی تھی کہ میں چندا کے ساتھ لندن میں رنگ رلیاں منانے آیا ہوں۔ اس کے کمرے میں میرا رات کے دو بجے ملنا یہی ثابت کرتا تھا۔ اگر چندا ریسیور اٹھاتی تو شاید صورتِ حال کو سنبھال لیتی۔ میں اسے منع کر دیتا یا وہ خود ہی کہہ دیتی کہ ناصر تو یہاں نہیں ہیں' مجھے پتا نہیں کہاں ہوں گے؟

اب شبنم کو میں کیسے سمجھاؤں اور کیسے وضاحت کروں کہ ایسا کیوں ہوا اور حقیقت وہ نہیں ہے جو اس نے تسلیم کر لیا ہے۔ وہ کہاں مانے گی کہ ہم ابھی چند منٹ پہلے ہی باہر سے آئے تھے اور کافی پینے کے بعد میرا ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا۔ چندا کپڑے بدل کے آئی تو میری صورت دیکھ کے حیران ہوئی "کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟"

میں نے بے اختیار کہا "اس الو کی پٹھی' شبنم کا۔"

"اوہ۔" چندا نے اندازہ کر لیا کہ میرے موڈ کی خرابی کا سبب کیا ہو سکتا ہے "کیا کہا اس نے؟"

"کیا کہہ سکتی تھی وہ۔ رات دو بجے مجھے یہاں پا کے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

چندا کی نظریں جھک گئیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے لبوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ جھلک دکھا کے غائب ہو گئی۔ شاید غلط فہمیوں کا یہ سلسلہ اسے کسی دستِ غیب کی تائید لگا ہوگا۔ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جو وہ چاہتی تھی خود بخود ہو رہا تھا۔ جب تقدیر پلٹتی ہے تو مسلسل پیش قدمی کرنے والا فاتح لشکر قدرتی آفات سے ہارنے لگتا ہے۔ دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھنے والے سکندرِ اعظم کے عزائم کو ایک مچھر نے ناکام بنا دیا۔ وہ ملیریا سے مر گیا۔ جسے کسی غنیم کے لشکرِ جرار کے تیر اور تلوار سے موت نہ آئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا جو ہرگز میری خواہش کے مطابق نہ تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رحمان کی موت بے سبب نہیں تھی اور قادر بخش یا جیمس کے معاملات کا شاہ عالم سے کاروباری رقابت کا کوئی تعلق ضرور تھا۔ اس کا ثبوت آج دن میں ہی مل گیا تھا۔ اب پولیس سے اور کسی نام نہاد بگ باس سے پیچھا چھڑانا آسان نہ تھا۔ چندا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جیمس سے مل کے حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اس کے بغیر مسئلے کو جانے اور سمجھے بغیر اس کا حل کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

میں چھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھا تو بالکل فریش تھا۔ چندا کے آنے سے پہلے ہی میں نہانے چلا گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار کسی نے ناک کیا اور ہینڈل گھمایا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ یہ روم میڈ تھی جو کمرے کو سیٹ کرنے آئی تھی۔ اس نے اخبارات میز پر رکھ دیے تھے۔ جب میں نہا کے نکلا تو وہ بیڈ شیٹ بدل کے جا چکی تھی مگر کمرے میں بگ باس کے وہی چمچے بیٹھے ہوئے تھے جن سے گزشتہ روز ملاقات ہو چکی تھی۔ کم سے کم ان میں سے ایک

وہی تھا۔

میں نے کہا "تم۔ کمرے میں کیسے آئے؟"

وہ مسکرایا "اس طرف سے۔ دروازہ کھلا رکھا تھا تم نے ہمارے لیے مگر دیکھو 'سیکیورٹی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ میں خود تمہیں سڑک پر پھینک سکتا ہوں یہاں سے۔ نیچے کوئی اٹھا لے گا۔"

اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے "نہ میں مسلح ہوں اور نہ لڑنے آیا ہوں۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

دوسرے نے کہا "میں مسلح ہوں مگر میں بات نہیں کروں گا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے دروازے پر دوبارہ ناک ہوئی۔ ایک نیگرو نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ چاندنی اندر آ گئی اور ان دونوں کو دیکھ کے ٹھٹکی "کیا کل کی مار کافی نہیں تھی' کہ تم پھر آ گئے۔"

حبشی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے خوش اخلاقی سے سر جھکایا "ہر حسین لڑکی سے قتل ہونے کے لیے ہم ہر وقت تیار رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ کہو کیا کہنا ہے؟"

پہلے والے نے کہا "پیغام وہی ہے۔ بگ باس تم سے ملاقات کا متمنی ہے۔ جگہ کا چوائس اس نے تم پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ یہاں بھی آنے کے لیے تیار ہو گا۔"

میں نے کہا "پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ اور یہ بگ باس ہے کون باسٹرڈ!"

وہ بُرا مان کے بولا "یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے تم مجھ سے پوچھو کہ تمہارے کتنے باپ ہیں؟"

دوسرے نے وضاحت کی "تمہارے کتنے بگ باس ہیں؟"

میں نے کہا "اتفاق سے دو۔ اسی لیے میں نے پوچھا کہ کیا تمہیں جیمس نے بھیجا ہے۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا "یس۔ جیمس بونڈ۔ اسے تم زیرو زیرو وائٹ کہہ سکتے ہو۔"

چندا نے کہا "واٹ نان سنس! تم سیریس بات کرنے آئے ہو یا مذاق کرنے؟"

وہ پھر شائستگی سے جھکا۔ "مذاق نہیں میڈم! فلموں میں جیمس بونڈ ہے اور وہ ایجنٹ زیرو زیرو سیون کہلاتا ہے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام واقعی جیمس بونڈ تھا اور وہ فون پر اپنا نام نہیں بتاتا تھا۔ زیرو زیرو وائٹ اسپیکنگ کہتا تھا۔

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

پہلے نے کہا "میں مارٹن شراک ہوں۔ اگر تم کو باس سے رابطہ کرنا ہو تو میرے ذریعے سے کرو گے۔ مارٹن بار' ریجنٹ پارک کے پیچھے لندن کے چڑیا گھر کے سامنے پرنس البرٹ روڈ۔ میں باس کا رائٹ ہینڈ ہوں۔"

"پھر میں لیفٹ ہینڈ ہوں۔ باس ہر کام الٹے ہاتھ سے کرتا ہے" دوسرا بولا۔

"یہ SON OF A GUN مارک ہے۔ مارک شیراک۔ ابھی جس روم میڈ نے ہمیں اندر بلایا وہ مارک کی گرل فرینڈ ہے۔ مارک نے ہی اسے تمہارے کمرے کی ماسٹر کی فراہم کی تھی مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی' دروازہ کھلا ہوا تھا۔"

"مجھے بھی حیرانی تھی کہ اس وقت روم میڈ کیسے آ گئی۔ خیر' یہ بتاؤ کہ زیرو زیرو وائٹ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"وہی جو تم اس کے لیے پہلے کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پہلے تم کیا کرتے تھے' اس نے جو کہا وہی میں تم سے کہہ رہا ہوں" مارٹن بولا۔

"آج کل میں کچھ اور کر رہا ہوں' کسی اور کے لیے۔"

"باس کو بھی شک تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرے گا لیکن اس نے کہا ہے کہ تم اس کا نقصان پورا کر دو تو سب ٹھیک رہے گا۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں؟"

"تو پھر ایسے غائب ہو جاؤ گے جیسے کہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ تمہیں دو سال سے تلاش کر رہا تھا۔"

دوسرے نے تصحیح کی "ایک سال ساڑھے تین مہینے سے۔"

چندا نے میری طرف آنے سے پہلے ہی ناشتے کا آرڈر دے دیا تھا۔ ایک بہت کم عمر ویٹریس ناشتے کی ٹرالی چھوڑنے آئی۔ جاتے جاتے اس نے چندا کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ایک نظر میرے بھدے بدصورت اور جنگلی قسم کے ملاقاتیوں پر ڈالی اور حیرانی سے سر ہلا کے رخصت ہو گئی۔

میں نے کہا "بگ باس سے کہو کہ میں آج ہی اس سے ملوں گا۔"

مارٹن نے کہا "تمہیں معلوم ہے' باس کی کیا رائے ہے؟ تمہارے بارے میں؟"

میں نے کہا "میں INTERESTED نہیں ہوں۔"

"اس کا خیال ہے کہ تم ڈرپوک اور احمق ہو" وہ اٹھ کھڑا ہوا "میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا۔ آج ہم

سارا دن تمہاری نگرانی کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ کل جیسی افسوس ناک صورتِ حال پھر پیدا نہیں ہو گی۔ تم نے جس شخص کی دونوں آنکھیں تقریباً پھوڑ دی تھیں میڈم' اس کی ناک بھی خوفناک ہو گئی ہے اور وہ سگریٹ تک نہیں پی سکتا۔"

"اس سے کہنا پھر میرے سامنے نہ آئے" چندا نے کہا۔

میں نے کہا "اور تم بھی مجھ سے اتنی دور رہنا کہ مجھے نظر نہ آؤ۔ اگر میں نے کسی کو پکڑ لیا تو شام تک اس کا پوسٹ مارٹم ہو جائے گا۔"

وہ میری دھمکی پر صرف مسکرائے اور چلے گئے۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ چندا نے کہا "تم نے اچھا کیا کہ انہیں مارا نہیں۔"

"غصہ تو بہت آیا تھا مجھے ان کو کمرے میں دیکھ کے لیکن بات کو بڑھانے سے کیا فائدہ۔ میں جیمس بونڈ سے مل کے معاملات طے کر لیتا ہوں ورنہ یہ لوگ چھوڑیں گے نہیں۔"

"اچھا اب ناشتا کرو۔ آج پھر دیر ہو گئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آج ایک ڈیل فائنل کر دوں۔"

میں نے کہا "تمہارا پروگرام تو ہالینڈ اور جرمنی جانے کا بھی تھا۔"

"نہیں۔ ان کی BID کو ہم نے وہیں ڈراپ کر دیا تھا۔ اب یہی دو رہ گئے تھے جن سے کل بات ہو گئی" وہ بولی اور پھر مجھے اپنے فیصلے کے بارے میں بتانے لگی۔

میں نے کہا "میں تم سے سو فیصد متفق ہوں۔"

"میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے ان کی TERMS بہت ٹھیک لگتی ہیں۔ خصوصاً دوا سٹی اور آفٹر سیل سروس کے معاملے میں۔ کیا تم میری ایک بات مانو گی؟"

وہ چونکی "کیا بات ہے' پہلے بتاؤ؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "پہلے وعدہ کرو' ورنہ رہنے دو۔"

اس نے سوچ کے کہا "بس واپس جانے والی بات نہیں مانوں گی۔ اس کے علاوہ جو کہو گے مانوں گی۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ "تمہارا کام آج ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد میرا کام کچھ ایسا ہے کہ تمہارے ساتھ ہونے سے میری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔"

وہ بولی "سوری' مگر ہم واپس جائیں گے تو ایک ساتھ۔"

میں نے سارا دن کسی نگرانی کرنے والے کی جستجو جاری رکھی اور جونی سے بھی کہا کہ وہ آگے سے زیادہ پیچھے دیکھے مگر ہم کسی تعاقب کرنے والے کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔

یا تو وہ بہت ہوشیار اور پروفیشنل قسم کے لوگ تھے یا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ مارٹن نے صرف ہمیں خوف زدہ رکھنے کے لیے ایک نفسیاتی چال چلی تھی۔

میں چندا کے ساتھ دو کمپنیوں کے درمیان پروفیشنل سروس میں بطور فنانشل ایڈوائزر استعمال ہوتا رہا۔ تیکنیکی طور پر ہر ایک کمپنی کو دوسری پر واضح فوقیت حاصل تھی مگر دوسری کمپنی کے کاروباری ADVANTAGES کہیں زیادہ بہتر تھے۔ جب ہم نے اپنی DEMANDS سامنے رکھیں تو پہلی کمپنی بھی زیادہ مراعات دینے پر راضی ہو گئی۔

میں اور چندا ترمیم شدہ معاہدے کے ساتھ دوبار ایک کمپنی میں گئے اور تین بار دوسری کمپنی میں۔ ہم کوئی بہت بڑے کلائنٹ نہیں تھے مگر یورپی بزنس کمیونٹی یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹے کلائنٹ ہی بڑھ کر بڑے ہو جاتے ہیں اور تعداد میں زیادہ ہونے کی وجہ سے مجموعی منافع زیادہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے کلائنٹ مل کر بڑی گڈول بناتے ہیں جو انگ نرم بزنس STRATEGY میں بہت اہم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کمپنی اس ڈیل کو فائنل کرنے میں کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار تھی۔ اگر یہ ڈیل نہ ہوتی تو دیوالیہ کوئی نہ ہوتا مگر وہ کم سے کم منافع پر بھی کسی کلائنٹ کو کھونا نہیں چاہتے۔

بالآخر تیسرے راؤنڈ میں چندا نے میرے مشورے سے ایک کمپنی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ پہلی SHIPMENT میں ایکس رے مشین اور اس کے لوازمات یعنی ACCESSORIES پورٹیبل ای سی جی مشین اور پیتھولوجیکل لیبارٹری کا سامان شامل تھا۔ اس کے بعد سی ٹی اسکینر۔ ایم آر آئی مشین اور سونوگرافی کے علاوہ انجیوگرافی کا ایکویپمنٹ روانہ کیا جائے گا اور یہ سب سامان چھ ماہ کے اندر اندر پاکستان میں ان کے انشورنس ایجنٹ کی معرفت ڈلیور کر دیا جائے گا۔ کمپنی اس کے بعد مشینوں کی انسٹالیشن اور دو سال تک چیک اپ اور دیکھ بھال کی مکمل ذمّے داری لے گی۔ ادائیگی کے طریقۂ کار پر اتفاقِ رائے ہو گیا۔ ان کے اور میرے بینکر ادائیگی کے شیڈول میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

اس بھاگ دوڑ میں سارا دن گزر گیا۔ شام چار بجے ہم کمپنی کے ڈائریکٹر کے ساتھ ہاتھ ملا کے رخصت ہوئے تو چندا جتنی مطمئن تھی اس سے زیادہ خوش تھی۔

"میرا خیال تھا کہ مجھے ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ کام دو ہی دن میں ہو گیا اور یہ صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہوا۔"

میں نے کہا "مجھے کانٹوں میں مت گھسیٹو۔ چوائس تمہاری تھی۔ مجھے تو ان چیزوں کے بارے میں خاک بھی معلوم نہیں تھا جن کا آرڈر دیا ہے۔"

"ٹیکنیکل باتیں میں بھی نہیں جانتی تھی۔ کمال نے سب پہلے ہی سمجھادیا تھا بلکہ طے کردیا تھا۔ کسی حد تک کہ کون سی کمپنی کی پراڈکٹ بہتر ہے لیکن یہ جو مالی معاملات تھے' یہ مجھے کون سمجھاتا؟"

"چلو اچھا ہے۔ تم ایک ہفتے کی غیر حاضری سے بچ گئیں۔ اب تم کل ہی واپس جاکے اپنی ڈیوٹی RESUME کرسکتی ہو۔"

"ہم دونوں جاسکتے ہیں" اس نے اتفاق کیا۔

میں نے ہنس کے کہا "میں بگ باس کی مرضی کے بغیر کہیں بھی نہیں جاسکتا۔"

"اور میرے بگ باس ہو تم۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبیث جیمس بونڈ سے مل کے میں کیا کہوں گا۔ مجھے وہ شاہ عالم سمجھتا ہے اور میں شاہ عالم کے پرانے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے پاس ان لوگوں کے نام پتے ضرور ہیں جن سے وہ ڈیل کرتا تھا لیکن میں نے کسی کی تصویر تک نہیں دیکھی اور کس سے شاہ عالم کا کیسا لین دین تھا' کتنا تھا یہ سب مجھے معلوم نہیں' کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔"

چندا نے کہا "تم یقیناً پکڑے جاؤ گے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر میں کیا کروں۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔"

وہ سوچ کے بولی "ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ایسے نہیں۔ پہلے وعدہ کرو کہ پھر میرے اکیلے جانے کی بات نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "اوکے' وعدہ!"

چندا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "تم بڑے اچھے ایکٹر ہو۔"

میں نے برا مان کے کہا "تمہارا مطلب ہے میں جھوٹا وعدہ کررہا ہوں تم سے؟"

وہ ہنسی "نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اس ایجنٹ زیرو زیرو ہٹ کے سامنے تم ایسی ایکٹنگ کرو کہ وہ خود تمہیں ہر بات بتانے پر مجبور ہوجائے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا "میں سمجھا نہیں۔"

"تم یہ ظاہر کرو کہ کسی بیماری یا حادثے کے باعث تمہاری یادداشت کچھ عرصہ جزوی طور پر متاثر ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت سی باتیں تمہارے دماغ میں گڈمڈ ہوجاتی ہیں یا بہت یاد دلانے سے یاد آتی ہیں۔"

میں اچھل پڑا "قسم تمہاری چندا! میں چاہوں تو اس بات پر یہیں تمہیں چوم سکتا ہوں لیکن ۔۔۔ میں صرف ہاتھ چومنے پر اکتفا کرتا ہوں فی الحال۔"

وہ مسرت اور حیا سے لال ہوگئی "مانتے ہو استاد!"

میں نے اس کا ہاتھ چوم کے چھوڑ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے برگِ گل کی نرمی' خوشبو اور رنگ میرے ہونٹوں سے چپک گئے ہیں۔ "اب میں محفوظ ہوں۔"

وہ بولی "ڈبل رول کرنے کی پریکٹس بہت ہے تمہیں۔ جہاں ضرورت پڑے ذہنی طور پر غیر حاضر اور بلینک ہوجاؤ۔ بات کرنے والا خود ہی سب بتائے گا۔"

ساڑھے پانچ بجے میں نے نارٹن بار میں فون کیا۔ کسی لڑکی نے بڑی جلدی میں کہا "ہولڈ کرو" اور پھر جیسے ریسیور رکھ کے بھول گئی۔ میں بار کے اندر کی ساری آوازیں سنتا رہا۔ لوگوں کے شاؤٹ کرنے کی۔ لڑکیوں کی مستی بھری چیخوں کی۔ لاؤڈ میوزک کی اور شرابیوں کے گالیاں بکنے کی پھر اس لڑکی نے کہا "ہیلو!" تو میں نے غصے میں کہا "ایک کتے کے بچے سے بات کرنے کے لیے مجھے کتنی بار بھونکنا پڑے گا" تو میرے لہجے نے لڑکی کو ڈرا دیا۔

"آئی ایم سوری سر! میں مصروفیت میں بھول گئی۔ یہاں ہر شخص چیخ رہا ہے ادھر آؤ' جیسے میرے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔"

میں نے کہا "یہ میں وہاں آکے دیکھوں گا کہ تمہارے سامنے کوئی اور نظر کیوں نہیں آتا۔ اب فوراً جاکے نارٹن کو بلا لاؤ۔"

نارٹن فوراً آگیا "بگ باس تمہارا منتظر ہے لیکن تم اکیلے آؤ گے؟"

"کوئی مشورہ نہیں۔ میں اکیلا اس دنیا سے بھی نہیں جاسکتا۔ میری سیکریٹری باڈی گارڈ اور گرل فرینڈ میرے ساتھ ہوگی۔"

"تین لڑکیاں' نو۔۔۔ ایک ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا "اتفاق سے وہ ایک ہی ہے۔ تھری ان ون۔"

چندا نے میرے کہنے پر جونی کو رخصت کردیا۔ ایک ٹیکسی نے پون گھنٹے بعد ہمیں نارٹن بار کے سامنے اتار دیا۔ خلافِ توقع وہ کوئی گھٹیا شراب خانہ ثابت نہیں ہوا۔ اس کے اندر کی آرائش میں نفاست اور قدامت کا خوبصورت امتزاج تھا اور یہاں جو لوگ موجود تھے وہ بھی غل غپاڑا نہیں

کررہے تھے پھر میں نے فون میں جو ہنگامہ سنا تھا وہ کہاں تھا؟ شاید وہ نمبر کسی اور عوامی مے خانے کا تھا۔

میں نے ایک عشوہ طراز حسینہ سے جو ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ نارٹن کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کا دروازہ شیشے کا تھا مگر یہ پولرائزڈ POLARIZED گلاس تھا یعنی اس میں ایک طرف سے ہی نظر آتا تھا۔ کمرے میں سے ہال کا پورا منظر نظر آتا ہوگا مگر ہال میں موجود کوئی شخص اندر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کمرے میں ایک بہت موٹا نیگرو گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن وہ اتنا کالا تھا کہ چھت سے آنے والی روشنی اس کے شفاف سیاہ سر اور چہرے کی چکنی جلد سے منعکس ہورہی تھی اور سوٹ بھی سیاہ رنگ کا تھا چنانچہ اس کے چمکتے سفید دانت یوں نظر آتے تھے جیسے بلیک بورڈ پر سفید چاک کی لکیر۔ سب سے زیادہ چونکانے والا اندر کا منظر تھا۔ ایک کچھ عمر رسیدہ مگر بے حد حسین اور بہت بنی سنوری اور گوری چٹی خاتون اس کی گود میں تشریف فرما تھیں۔

انہوں نے ہماری دخل اندازی کا بالکل برا نہیں مانا۔ خاتون نے اطمینان سے کہا "ہیری۔ بھولنا نہیں" مسکراتی ہوئی اٹھیں اور چندا کو آنکھ مار کے نکل گئیں۔ لندن میں بلکہ پورے یورپ' امریکا میں کوئی رومینٹک سین چند دن بعد کسی ہم جیسے کسی شرمیلے اجنبی کو حیران پریشان نہیں کرتا۔ وہ اس کا عادی ہوجاتا ہے تاہم یہاں معاملہ رومانس سے کچھ آگے کا تھا چنانچہ چندا پر گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔

ہیری نے کہا "یس؟ کوئی پرابلم ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ پرابلم یہ ہے کہ میں نارٹن سے ملنا چاہتا تھا مگر مجھے تمہارے بیڈ روم میں بھیج دیا گیا۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا "کیا کام ہے تمہیں نارٹن سے؟"

میں نے کہا "یہ تو وہی بتائے گا۔ وہ میرا انتظار کررہا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں غلط جگہ پر آگیا ہوں۔ میری فون پر بات ہوئی تھی تو پس منظر میں بہت شور شرابا سنائی دے رہا تھا۔"

وہ مسکرایا "تمہیں ابھی معلوم ہوجائے گا۔ کیا تم اس لڑکی کو یہاں ملازمت کے لیے لائے ہو؟"

میں نے کہا "اس کے برعکس یہ اس جگہ کو خرید لے گی' اگر بات بن گئی۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے کھڑے ہوکے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ دراصل نارٹن بار کے دو حصے ہیں۔ ایک عام لوگوں کے لیے جو تفریح بھی چاہتے ہوں۔ دوسرا یہ جو تم دیکھ رہے ہو۔"

اس نے بار کے آخری حصے میں پیچھے کی طرف ایک دروازہ کھولا اور آگے آگے چلنے لگا۔ یہ ایک پتلا سا کوریڈور تھا جس کے آخر میں پھر ایک دروازہ تھا۔ ہم نے یہ دروازہ عبور کیا تو یکلخت وہ سارا شور میرے کانوں میں پہنچا جو میں نے فون پر سنا تھا۔ میں نے خود کو چندا کے ساتھ ایک بار کاؤنٹر کے پیچھے پایا جہاں ایک بارٹینڈر شراب کی نیچے سے اوپر تک سجی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا تھا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف ایک ہال تھا جس میں پچاس ساٹھ مرد عورتیں شراب خانے کا روایتی منظر پیش کررہے تھے۔ وہ سب نشے میں تھے اور ایک اسٹیج کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے یا کھڑے تھے اور حلق سے ہر قسم کی ناپسندیدہ آواز نکال رہے تھے۔

اسٹیج پر ایک ساتھ چار لڑکیاں ڈانس کررہی تھیں۔ ان کے بے لباس جسموں کی ہیجان خیز بلکہ شرمناک حرکتوں کو رقص کا نام دینا ہی اس فن کی توہین کے مترادف تھا جسے جوش صاحب نے اعضا کی شاعری قرار دے کر گویا بات ہی ختم کردی تھی۔ یہ STRIPTEASE ڈانسرز شائقین کے بے ہودہ جملوں اور حرکات کو اپنے جسم کے لیے بطور خراجِ تحسین وصول کررہی تھیں۔

افسوس مجھے یہ دیکھ کر ہوا کہ نچانے والے تو خیر ولایت کے وہی تاجر پیشہ لوگ تھے جو ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تھے اور مالک بن بیٹھے تھے مگر ناچ دیکھنے والوں کی اکثریت ایشیائی لوگوں کی تھی اور ناچنے والی لڑکیاں بھی اسی خطے سے تعلق رکھتی تھیں جسے ہم برصغیر اور انگریز ساؤتھ ایسٹ ایشیا کہتے ہیں۔ اس ہر موقع پر مجھے ساحر کی نظم کا مصرع یاد آتا ہے۔ ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟ یا وہ بات جو ہم اپنے وطن میں بڑے فخر سے اور منافقت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اے ماؤ بہنو بیٹیو' دنیا کی عزت تم سے ہے۔

چندا نے مجھے ٹہوکا دیا تو میں چونکا۔ ہم بیک اسٹیج سے گزرے۔ ہیری پستہ قد بھی تھا چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاکے چلتا تھا تو لڑھکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے ڈانسرز کا ایک اور گروپ پرفارمنس کے لیے تیار ہورہا تھا۔ میں نے ایک لڑکی کو دیوار کے ساتھ خوف زدہ انداز میں کھڑا دیکھا۔ وہ اچھی خاصی خوبصورت اور دلکش جسمانی خدوخال رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس کا آہوئے صیاد دیدہ کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کوئے ملامت میں نووارد ہے۔

میرے خیال کی تصدیق فوراً ہو گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کے مکروہ صورت گورے نے ہیری کو روک لیا "ہیری۔ یہ پھر مصیبت بن رہی ہے۔"

"اب کیا ہوا؟" ہیری نے رک کے پوچھا۔

"وہی رٹ۔ میں اس سے کم کپڑے پہن کے نہیں ناچوں گی۔"

لڑکی نے جتنے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ واقعی بہت کم تھے یعنی وہی دو چیتھڑے جو ساحل پر نہانے والی خواتین کے زنانہ حصوں کو بھی آدھا ادھورا چھپا۔ تے ہیں مگر میخانے والوں کا اصرار تھا کہ یہ ساحل نہیں ہے کہ اتنا تکلف کیا جائے۔

"آخر یہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟" ہیری غرایا۔

لڑکی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "سر۔ یہ میرے لیے مشکل ہوگا۔"

"اس کی مشکل آسان کردو۔" ہیری نے گورے سے کہا "جیسے تم چاہو۔"

میں نے نہ چاہنے کے باوجود کہا "تم زبردستی نہیں کرسکتے۔"

ہیری کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک دم گھوما "تم اپنی بے ہودہ ناک اس معاملے میں مت گھساؤ۔ ہم کوئی زبردستی نہیں کررہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایگریمنٹ کیا ہے اور پوری رقم وصول کرچکی ہے۔"

لڑکی کا حوصلہ بڑھ گیا "یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسا کوئی ایگریمنٹ نہیں کیا تھا۔ ایگریمنٹ نائٹ کلب میں ڈانس کرنے کا تھا۔" اس نے اردو میں کہا۔

میں نے یہی بات ہیری سے کہی تو وہ اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کے پورے بدن میں جیسے زلزلہ سا آگیا "نائٹ کلب میں کیا سرمن SERMON ہوتا ہے۔ دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ کم آن' یہاں وقت مت ضائع کرو' مجھے اور بھی کام ہیں۔"

لڑکی نے اچانک چندا سے پوچھ لیا "کیا تم پاکستانی ہو؟"

اس وقت مجھے جو ایک سچا محب وطن' قوم پرست پاکستانی تھا' یہ سوال یوں لگا جیسے اس کا جواب دینا خود سرعام خود کو ننگا کرنے کے مترادف ہوگا اور مجھے اتنی شرم آئی کہ چندا کے بولنے سے پہلے میں نے ایک جھوٹ بول کے اس گورے اور کالے کے سامنے خود کو ذلیل ہونے سے بچالیا "نہیں۔ میں پاکستانی نہیں ہوں" میں نے کہا مگر اس طرح میں خود اپنی نظر میں گر گیا۔

میں نے چندا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔ ہیری ایک اور دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔

نارٹن نے کہا "تو تم آگئے۔ بہت اچھا کیا۔"

میں نے کہا "اور مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے بگ باس کو ملنے کے لیے کیوں نہیں بلالیا۔"

اس نے ہاتھوں کے اور چہرے کے تاثرات سے واضح کیا کہ اب کیا ہو سکتا ہے اور پھر ایک شیشے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا "جاؤ' مل لو بگ باس سے۔"

میں نے دروازے کو دھکیلا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر جیسے برف کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرے ساتھ کھڑی ہوئی چندا بھی سخت شاک کی کیفیت میں تھی۔

بگ باس کوئی مرد نہیں تھا۔ ایک عورت تھی۔

جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ منہ دوسری طرف کیے ایک گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے ایک نظر انتہائی پُرتکلف انداز میں آراستہ کمرے پر ڈالی جس کی لمبائی چوڑائی بارہ پندرہ فٹ تھی۔ ہمیں اندر لانے والے نارٹن نے دروازہ کھول کے اعلان کیا "مسٹر شا از ہیئر" اور وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ خودکار دروازہ بند ہو گیا۔

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں کرسی گھمائی اور مجھ سے مخاطب ہو کے کہا "ویلکم بیک مسٹر شا!" تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں پچیس تیس کی نظر آنے والی خاصی حسین عورت ہے۔

اس کی صورت کے نقوش میں شباب کی تازگی برقرار تھی تو یہ مناسب دیکھ بھال اور میک اپ کا کرشمہ تھا۔ اس کی ادائے حسن میں محسوس ہونے والا معصومیت کا دل نشیں انداز مصنوعی نہیں تھا' قدرت کا عطیہ تھا ورنہ وہ جس سراپا معصیت ماحول میں بگ باس کہلاتی تھی اس کا اس کی معصومیت سے اتنا ہی دور کا تعلق تھا جتنا شیطان کا پارسائی سے۔

اس نے ڈارک گرے کلر کا پینٹ کوٹ والا سوٹ پہن رکھا تھا اور لائٹ بلیو مردانہ کالر والی شرٹ پر گہرے نیلے رنگ کی ریشمی ٹائی باندھ رکھی تھی جس پر سفید پولکا ڈاٹس آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ صرف اس کے جھومتے لہراتے ریشمی بال جو اس کے شانوں سے ذرا نیچے تک تراشیدہ تھے' اس کے عورت ہونے کا راز فاش کر رہے تھے۔ پہلی نظر میں مجھے لگا تھا کہ بگ باس نے بال بڑھا رکھے ہیں۔ ہپی اسٹائل میں بہت سے مرد بھی فیشن کا یہ انداز اپنا لیتے تھے۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے اس کی گرفت مضبوط' پُراعتماد اور دوستانہ انداز میں جوشیلی محسوس ہوئی۔ وہ بلاشبہ ایک نڈر اور پُرعزم عورت تھی جس کی شخصیت میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ ان مردوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے جو نیم چڑھے کڑوے کریلے تھے یعنی ایک تو اجڈ اور طاقتور اور پھر بدمعاشی پر ناز کرنے والے۔ نارٹن اور مارک اس کی واضح مثال تھے۔

میں نے کہا "مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی یہ جان کر کہ بگ باس ایک حسین و جمیل عورت ہے۔"

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری بات سے کچھ کنفیوز ہوئی تھی اور غالباً یہ طے کرنے سے قاصر تھی کہ میں نے اسے کومپلی مینٹ کیا ہے یا اس کا مذاق اڑایا ہے۔ "آج تم اکیلے نہیں آئے ہو۔ حیرانی مجھے بھی ہوئی تھی جب نارٹن نے کہا تھا کہ مسٹر شا کے ساتھ ایک لڑکی بھی آئے گی جو تھری ان ون ہے۔"

میں نے کہا "یہ میری سیکریٹری' باڈی گارڈ اور گرل فرینڈ سب کچھ ہے۔"

وہ ہنسی "یہ بتاؤ' کیا پیو گے؟"

میں نے کہا "جو یہاں ملتا ہے وہ نہیں۔ چائے یا سوفٹ ڈرنک چلے گا۔"

"کیوں؟ تم نے توبہ کرلی ہے یا اس لڑکی کو امپریس کرنا چاہتے ہو کہ تم ابھی تک ایک پکے مسلمان ہو؟"

میں نے کہا "اب مجھے اس کو امپریس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دس سال سے ساتھ ہیں' ایسا لگتا ہے اب تو جیسے ہم ایک ساتھ اور ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔"

"دس سال!" اس کو یقین نہیں آیا "اور ابھی تک تم نے شادی نہیں کی؟ خیر یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ بچے ہیں یا نہیں؟"

چندا ایک دم بھڑک اٹھی "معاف کیجئے میڈم! ایسا صرف آپ کی سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ شادی کے بعد کی قانونی اور اخلاقی ذمے داری سے بچنے کے لیے لوگ ایسے ہی میاں بیوی کی طرح رہنے لگتے ہیں۔"

"آف کورس۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ساتھ نہیں رہ سکتے تو آسانی سے الگ بھی ہو سکتے ہیں" وہ بولی۔

چندا کا پارا اور چڑھ گیا "یہاں تو جانوروں کی طرح جوائنٹ فیملی کا نظام بھی چلتا ہے۔ مگر ہم میں ابھی شرم و حیا باقی ہے اور ہماری اخلاقی قدریں بہت مضبوط ہیں۔"

وہ جلدی سے بولی "سوری' سوری۔ میرا مقصد ہرگز تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ دراصل دس سال بہت لمبا عرصہ ہے۔ کسی کو سمجھنے کے لیے دس مہینے بھی کافی ہوتے ہیں۔"

میں نے چندا کی حمایت میں کہا "یہاں تو بعض اوقات دس گھنٹے کی جان پہچان میں بھی نوبت شادی تک پہنچ جاتی ہے۔"

چندا نے جوابی حملہ جاری رکھا "اور نتیجہ کیا؟ یہ شادیاں ختم کتنی جلدی ہوتی ہیں۔ کوئی دس دن چلتی ہے تو کوئی دس مہینے۔ دس سال کون ساتھ گزارتا ہے؟"

وہ پریشان ہو گئی کہ اس نے کہاں بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دے "ایک بات مجھے

عجیب لگی مسٹر شاہ مجھے دیکھ کے تم اتنے پریشان کیوں ہوگئے تھے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو؟"

میں نے کہا "HONESTLY میں بالکل یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ بگ باس کوئی تم جیسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ ایک تو تمہارا نام جیمس بونڈ اور پھر اس کے ساتھ ایجنٹ زیرو زیرو ایٹ۔ یہ سب عجیب اور ناقابلِ یقین تھا۔"

وہ مجھے الجھن کے ساتھ دیکھتی رہی "آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم جانتے بوجھتے اتنے انجان اور اجنبی کیوں بن رہے ہو؟"

میں نے محتاط ہو کے کہا "کیا واقعی تمہیں ایسا لگتا ہے؟"

"کیوں نہیں لگے گا؟ تم کوئی نئے آدمی تو نہیں ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ میرا شوہر تھا اور اس کا نام بھی جیمس بونڈ نہیں تھا۔ وہ جیرمی بونڈ تھا اور جمی کہلاتا تھا۔ لوگوں نے اسے جیمس بونڈ کہنا شروع کر دیا تو یہی نام مشہور ہو گیا۔"

میں نے کہا "اچھا! وہ دونوں جوکر جو مجھے لائے تھے' اسے ایجنٹ زیرو زیرو ایٹ بھی کہہ رہے تھے۔"

وہ بولی "مگر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مذاق کی بات اور ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی ہی نہیں' سب کی زبانیں بہت لمبی ہو گئی ہیں۔ جب سے جمی مفلوج ہوا ہے۔"

میں نے کہا "جمی۔ تمہارا شوہر۔ مفلوج ہے؟"

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ تم ہر بات پر ایسے چونک رہے ہو جیسے تمہارے لیے انکشاف ہے؟" اس نے درشت لہجے میں کہا "تم شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ میں جولی ہوں؟"

اب لاعلمی کا مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا تھا چنانچہ میں نے چندا کے بتائے ہوئے نسخے کو استعمال کیا۔ میں کچھ دیر اسے بے وقوفوں کی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں تذبذب اور ذہنی انتشار کا شکار ہوں۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش یا حقیقت بیان کرنے کے لیے الفاظ کی تلاش میں مصروف ہوں۔

بالآخر میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "اب میں کیا بتاؤں جولی!"

چندا نے اس کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور زیرِ لب مسکرائی۔

جولی نے کہا "کم آن۔ مجھے بتاؤ یہ کیا ڈراما کر رہے ہو تم اور کیوں؟"

"یہ ڈراما نہیں جولی۔ ایک بے رحم حقیقت ہے۔" میں نے کہا "آج سے تقریباً چھ سات مہینے پہلے ــ"

"آٹھ مہینے پہلے ــ" چندا نے سنجیدگی سے مجھے یاد دلایا۔

"ایک رات میں گھر لوٹتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ گاڑی اچانک میرے قابو سے باہر ہو گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ میں نے سامنے سے آنے والے ٹرک میں ٹکر نہیں ماری اور گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کے الٹ گئی۔ یہ کہاں ہوا تھا ڈیئر؟"

چندا نے کہا "راولپنڈی میں۔ تمہیں یاد نہیں؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "میں اچھا خاصا زخمی ہوا تھا لیکن زیادہ خطرناک چوٹ سر میں آئی تھی۔ شدید CONCUSSION یعنی جھٹکے سے سر کے اندر میرا دماغ ہل گیا تھا۔ اسے بھی ڈاکٹرز نے میری خوش قسمتی قرار دیا کہ برین ہیمرج نہیں ہوا ورنہ میں ہلاک ہو جاتا یا مفلوج۔ ہوش آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرے لیے کسی کو پہچاننا ممکن نہیں رہا۔ پولیس مجھ سے حادثے کے بارے میں پوچھتی رہی مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ میری میموری ایسے ڈسٹرب ہوئی تھی جیسے شدید زلزلے سے کسی اسٹور کا ترتیب وار رکھا ہوا سامان گر کے ڈھیر ہو جائے۔ دکاندار چاہے کہ کوئی دوا یا کوئی پرزہ نکالے تو اسے پتا ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہوگا اس ڈھیر میں۔ جب تک اسٹور پھر نہ بن جائے اور ہر چیز دوبارہ اپنی اصل جگہ پر نہ رکھی جائے یہ گڑبڑ تو رہے گی۔ میرے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا۔ جو کچھ میرے دماغ میں تھا سب گڈمڈ ہو گیا۔"

وہ بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ ایک شخص چائے کے مگ رکھنے آیا تو میں خاموش ہو گیا۔ چائے اتنی بدذائقہ تھی کہ اسے پینا دشوار تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی "میرا علاج کرنے والے ڈاکٹرز بہت ہوشیار تھے۔"

جولی نے کہا "تم لندن کیوں نہیں آگئے علاج کے لیے؟"

میں نے کہا "میڈم جولی! ایک تو اس وقت فیصلہ کرنے والا میں نہیں تھا اور اگر میں خود ہوتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔ پاکستان میں اتنے قابل ڈاکٹرز ہیں کہ لندن کے ڈاکٹرز ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ بہت پُرامید تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال بہتر ہوتی جائے گی اور ان کی رائے سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ پہلے دو ہفتے میں بالکل بلینک رہا۔ میں ہر بات پوچھتا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ جو مجھے بتایا جاتا تھا' مان لیتا تھا اور مجھے کوئی غلط بتانے والا بھی نہیں تھا۔ سب میرے ساتھ انتہائی مخلص تھے۔ نتیجہ یہ کہ تیسرے مہینے سے میری یادداشت میں تیزی سے بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔ مزید دو مہینے بعد اپنے ماحول سے متعلق میری میموری بحال ہو گئی۔ اب آٹھ مہینے بعد ایسا ہے کہ مجھے کوئی پرابلم

نہیں محسوس ہوتی لیکن وہ باتیں جن سے میرا دور کا تعلق تھا مثلاً بچپن کی باتیں اور وہ معاملات جن سے میرا عرصہ دراز سے واسطہ نہیں پڑا وہ مجھے یاد دلانے پڑتے ہیں۔ مجھے چہرے مانوس لگتے ہیں لیکن نام یاد نہیں آتے۔ اس کی مثال تم یوں سمجھو کہ جیسے کوئی پچیس تیس سال بعد اس شہر میں جائے جہاں اس نے بچپن گزارا تھا تو مشہور مقامات اور بڑی بڑی سڑکیں تو اسے یاد آجاتی ہیں مگر پُرپیچ گلیوں میں وہ بھٹک جاتا ہے۔ کوئی بتانے والا ہو تو جگہ کو دیکھ کر اسے پرانی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ بعض اوقات صرف میری ہی نہیں' دوسروں کی پوزیشن بھی بڑی آکورڈ ہو جاتی ہے۔ جو لوگ یہ سب نہیں جانتے وہ سمجھتے ہیں' میں انہیں پریشان کرنا چاہتا ہوں۔ میری لاعلمی کو وہ ایک بھونڈا مذاق سمجھ لیتے ہیں۔"

مجھے اپنی کامیابی کا اعتبار جولی کی آنکھوں میں دکھ اور ہمدردی کے جذبات دیکھ کر ہوا "اوہ ڈیئر! مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

میں نے کہا "کون بتاتا' میرا جمی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پچھلے چودہ ماہ میں ہم نے فون پر بھی بات نہیں کی اور مجھے کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملا جو درمیانی رابطے کا کام کرتا ہو۔"

اس نے سرہلایا "اب یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تمہیں کیا یاد ہے اور کیا نہیں؟"

میں نے کہا "ان کاروباری معاملات میں تو آدھی ادھوری معلومات سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے تم کو پوری بریفنگ کرنی ہوگی۔ اِدھر اُدھر سے جو تھوڑا بہت مجھے یاد ہوگا' اس سے پوری صحیح .... پکچر سامنے نہیں آسکتی۔"

"میں کوشش کروں گی" وہ بولی۔

میں نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے جمی کے بارے میں بتاؤ۔"

"تم اس سے ملو گے نہیں؟ خود ہی پوچھ لینا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اسے زیادہ افسوس ہوگا اگر میں نے کسی اجنبی کی طرح بی ہیو کیا اور مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ خود شاک کی کنڈیشن میں ہے۔ میری ٹریجڈی سے وہ زیادہ فرسٹریٹ ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم میٹنگ سے پہلے مجھے ان معاملات سے آگاہ کر دو جن پر وہ بات کرے گا۔"

"معاملات صرف کاروباری ہیں۔"

"مگر ان کی تفصیلات بالکل میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ تم اس کا بزنس کب سے دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"تم تو واقعی سب بھول گئے ہو۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جمی کے حادثے کو دو سال ہو گئے۔ اور تب سے میں ہی اس کے بی ہاف پر یہ کام کر رہی ہوں جو یقیناً ایک عورت کے کرنے کے نہیں ہیں۔ لیکن میں اس کی صحیح شریکِ حیات ثابت ہونے کی پوری کوشش کروں گی۔ اچھے وقت میں اس نے مجھے سب کچھ دیا۔ ایک گھر کا تحفظ' بچے' عیش و آرام کی زندگی اور تقریباً پچھتر فیصد محبت۔"

میں نے کہا "باقی پچیس فیصد کہاں گئی؟"

"وہ ایک خیراتی فنڈ کی طرح استعمال ہوتی رہی۔ بہت سی عورتیں اس میں سے اپنا حصہ وصول کر کے آتی جاتی رہیں۔ میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ اگر میں اس سے سو فیصد کے مطالبے پر اڑ جاتی اور ہنگامہ آرائی کرتی تو پچھتر فیصد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی۔ جذباتی معاملات میں بھی کاروباری اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے مسٹر شاہ۔ اگر آپ کے گھر کے ایک چوتھائی حصے پر کوئی قابض ہو جائے تو آپ کیا کریں گے؟ عقلمندی سے کام لیتے ہوئے تین چوتھائی کو پورا سمجھ کے سکون سے رہیں گے یا باقی ایک چوتھائی کے لیے لڑ کر یہ رسک لیں گے کہ پورا گھر آپ کے ہاتھ سے نکل جائے؟"

میں نے کہا "میں تمہاری دوراندیشی اور ذہانت سے قائل ہوا جولی!"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ جمی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے خفت ظاہر کی "یہی سمجھ لو کہ کچھ یاد نہیں۔ جو مجھے یاد ہے وہ شاید صحیح نہ ہو۔"

"تمہیں کیا یاد ہے؟"

میں نے کہا "شاید کوئی پولیس مقابلہ ہوا تھا۔ وہ کسی عمارت میں محصور ہو گیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ تیسری منزل سے کود گیا تھا۔ وہ نیچے سے گزرنے والے کسی بھوسے کے ٹرک پر گرا۔ یہ سمجھا کہ بچ گیا مگر پولیس نے ٹرک کا پیچھا کیا اور اس کے ٹائرز پھاڑ دیے۔ ٹرک الٹ گیا۔"

وہ ہنس پڑی "یہ ایک فلم کا سین سنا رہے ہو تم مجھے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "آئی ایم سوری۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرے دماغ میں سب مکس اپ ہو گیا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پرانی یادوں کا سارا کرب چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر اتر آیا "جمی نے اپنی زندگی بہت نیچے سے شروع کی تھی۔ اس جگہ سے جس کو لوگ حقارت اور نفرت سے SLUMS کا نام دیتے ہیں۔ اپنے باپ کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کیا ہوگا اگر آج کوئی تھرڈ ریٹ جواری' چور اُچکا یا

غلام زادہ یہ ثابت کردے کہ وہی میرا باپ ہے یا کوئی معزز شخص مجھے بیٹا مان لے۔ نقصان میں ایسا ماننے والا رہے گا۔ جمی کی ماں اس کا ذکر وہ بیک وقت نفرت اور محبت کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ بڑے افسوس سے کہتا ہے کہ کاش وہ کوئی گناہ کی زندگی گزارنے والی جسم فروش عورت نہ ہوتی پھر میں اس کی عزت کرکے فخر محسوس کرتا لیکن جو ہے سو ہے۔ کوئی عدم سے اپنے وجود کے لیے اپنی پسند کا ماحول نہیں مانگ سکتا۔ یہی تقدیر ہے' جمی کو اس ماحول سے کیا مل سکتا تھا۔ یہی غنیمت ہے کہ وہ پل بڑھ کے جوان ہوگیا۔ زندہ رہنے کے لیے اس نے بھی وہ سب کیا جس کی پاداش میں دوبار اسے جیل جانا پڑا۔ بچوں کی جیل سے وہ ایک بڑا مجرم بن کے نکلا۔ ایسا ہی ہوتا ہے ہر جگہ۔ جیل خانے مجرموں کی نرسری بن گئے ہیں۔ اصلاح خانے صرف کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ جمی نے نچلی سطح کے کارکن کی حیثیت سے کئی سال گزارے۔ جہاں سب EXPANDABLE سمجھے جاتے ہیں۔ خرچ ہوگئے تو ہوگئے لیکن جمی بچتا رہا۔ اس نے بہت سے بگ باس بدلے۔ بالآخر ایک نے مرتے وقت اس کو اپنا جانشین نامزد کردیا۔"

اس کی خاموشی مجھے معنی خیز لگی اور میں نے بہت سوچ کے اندھیرے میں ایک تیر چلایا "غالباً' تمہارے باپ نے؟"

وہ چونکی نہیں "لیس۔ کم سے کم اتنا یاد ہے تمہیں۔"

مجھے اپنے اندازے کے صحیح ہونے کی اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی لاٹری کا صحیح نمبر ملنے سے ہوسکتی ہے "وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔"

"لیکن یہ اس کی جانشینی کی وجہ نہیں تھی۔ اس نے خود کو ہر لحاظ سے اہل ثابت کیا تھا۔ وہ ذہین تھا' اچھا منتظم تھا۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکتا تھا اور ساتھی اسے پسند کرتے تھے۔ ایک لیڈر میں یہی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ہم نے شادی تو بہت پہلے کرلی تھی۔ ایک بچہ بھی تھا ہمارا لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی اپنے باپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ وہ جمی کو رعایت یا انعام میں کچھ دے۔ وہ سفارشی ہرگز نہیں ہے۔ میرے باپ کی موت کے بعد اس نے گروہ کو بہت بہتر طریقے پر آرگنائز کیا۔ اپنا نیٹ ورک بڑھایا اور ایسے کام کیے جن میں پیسہ تو خیر زیادہ تھا' تحفظ بھی بہت تھا۔ یہ ڈرگ اور اسلحے کے دھندے خطرناک ہیں۔ EXTORTION اور بلیک میلنگ سے بردہ فروشی تک سارے کام جان لیوا ہیں۔ جمی نے آہستہ آہستہ خود کو ایسے ہر کام سے باہر نکالا۔ WITHDRAW کیا اور دوسرے کاروبار میں قدم جمائے جو انٹرنیشنل مارکیٹ رکھتا ہے۔ جس میں کلائنٹس اتنے دولت مند اور بارسوخ لوگ ہوتے ہیں کہ قانون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا۔"

میں نے جیسے یادداشت پر زور دے کر کہا "لیس۔ اس نے آرٹ' نوادرات اور ANTIQUE کی مارکیٹ پکڑلی۔"

وہ مسکرائی "بالکل ٹھیک یاد آیا تمہیں۔ یہ مشکل کام تھا اور بالکل پروفیشن بدلنے کی طرح تھا۔ جس کاروبار کے متعلق آپ جانتے کچھ نہ ہوں' اس کو پہلے سیکھنا پڑتا ہے۔ اندر باہر سے کھنگالنا پڑتا ہے۔ چیز کو اور مارکیٹ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ لوگ کون ہیں۔ راستے کدھر ہیں اور مال کیا ہے۔ جمی نے یہ سب کیا کیونکہ وہ ذہین ہے لیکن لائن بدلنے میں اسے اپنے ساتھی بھی بدلنے پڑے۔ یہ سب سے خطرناک مرحلہ ہوتا ہے۔ جب تک جمی سے میری شادی نہیں ہوئی تھی ایک اور شخص خود کو میرے باپ کا رائٹ ہینڈ سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہی گروہ کو کمانڈ کرے گا۔ بعد میں وہ مایوس ہوکے یہ کہنے لگا کہ جمی نے شارٹ کٹ سے منزل پائی ہے۔ وہ بددل ہوکے گروہ کو چھوڑ گیا۔ عام طور پر ایسے لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا مگر میرے باپ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کیا۔ جمی آج اسی غلطی کی سزا بھگت رہا ہے۔ بعد میں جمی نے محسوس کیا کہ کچھ لڑکے اس کے نئے کاروبار کے لیے موزونیت کے معیار کو نہیں پہنچتے۔ منشیات یا اسلحہ لانے لے جانے کے لیے صرف خطرہ مول لے کر جان کی بازی لگانے والے لڑکے کافی ہوتے ہیں۔ آپ انہیں بتادیں کہ یہ چیز اس راستے سے لانی ہے یا فلاں کو پہنچانی ہے۔ وہ کہتے ہیں یس باس لیکن آرٹ اور نوادرات کا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ اس میں عقل اور ذہانت بھی ضروری ہے۔ پرکھنے والی آنکھ بھی ضروری ہے اور اپنے معزز کلائنٹس کو مطمئن کرنے کے لیے اعلیٰ قسم کی سیلز مین شپ کی کوالٹی بھی بے حد اہم ہے۔ آپ آرٹسٹوں اور فنکاروں سے ڈیل کرتے ہیں اور آپ کے خریدار بے حد امیر اور باذوق لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمی نے پہلے لڑکوں کو تربیت دے کر کارآمد بنانے کی کوشش کی۔ جو کچھ بھی سیکھنے کے قابل نہیں تھے ان کو اس نے اجازت دی کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور تم بتاسکتے ہو وہ کہاں گئے؟"

میں اس غیر متوقع سوال کے لیے تیار نہ تھا مگر اس کا جواب دینا میرے لیے زیادہ مشکل نہ تھا "جمی کے اسی رقیب کے گروہ میں۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "کیا تمہیں اس کا نام یاد ہے یا نہیں' خیر وہ رابرٹ کلے مور تھا۔ رابرٹ کینہ پرور ثابت

ہوا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں یہ خیال کب سے سمایا ہوا تھا کہ وہ جب چاہے مجھے اپنی بیوی بنا سکتا ہے' باسٹرڈ۔ اس جیسے شخص سے شادی کرنے سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں۔"

جو بات جولی نے کہی وہ ایسی نہیں کہ یہاں بتائی جاسکے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بے ہودہ بات کا چندا پر کیا اثر ہوا ہوگا چنانچہ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ "وہ جمی کا بھی دشمن ہوگیا؟"

"بس۔ میرے باپ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایسا نہ سمجھے۔ یہ کارپوریٹ بزنس ہے۔ بہت سی کمپنیاں دوائیں بناتی ہیں یا فلمیں۔ ایک ہی فیلڈ میں بہت سے ادارے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے لیکن تعمیری۔ وہ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے مگر رابرٹ نہیں سمجھا اور جب میرے باپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ دوسرے لوگ جمی سے ہدایات لیں۔ جب تک کسی کو شکایت نہ ہو یا کوئی ذاتی مسئلہ نہ ہو۔ کوئی براہِ راست اس کے پاس نہ آئے۔ تو سب نے جمی کو باس مان لیا لیکن کچھ لوگوں نے رابرٹ سے رجوع کیا اور اس نے انہیں لالچ سے ورغلایا۔ بعد میں وہ سب بہت گھاٹے میں رہے۔ جمی کے مخالف حاسد اور دشمن مل کے ایک طاقت بن گئے۔ حالانکہ ان کے درمیان کوئی کاروباری رقابت نہیں تھی۔ ان کے راستے کہیں بھی ایک دوسرے کو کراس نہیں کرتے تھے لیکن رابرٹ کے دل پر ناکامی اور شکست کا زخم تھا۔ جمی درگزر کرنے والا آدمی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دشمنی میں کسی کی ہار جیت نہیں ہوتی۔ دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ کارکن ضائع ہوتے ہیں اور پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ میرے باپ کو ہائی بلڈ پریشر تھا اور وہ علاج یا احتیاط کا قائل نہیں تھا۔ اچانک ایک ہارٹ اٹیک سے وہ ہنستے ہنستے مرگیا۔ جمی نے اسے ایک ڈرٹی جوک سنایا تھا اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ وہ اچانک خاموش ہوا اور مرگیا۔ کیا موت تھی۔ نہ اس نے دکھ اٹھایا نہ کسی کو دکھ دیا۔ ہنستے ہنستے دنیا سے چلا گیا۔"

مجھے خیال آیا کہ ایسی صورتِ حال پاکستان میں ہو تو سننے والے بڑے منافقانہ اخلاق کے ساتھ کہتے ہیں جی کہ کیا جنتی آدمی تھا حالانکہ مرحوم کے جہنمی ہونے میں کسی کو شک نہیں ہوتا۔

"جمی نے دو سال تک رابرٹ کی مخالفت اور دشمنی کو برداشت کرتے ہوئے تصادم سے گریز کیا لیکن اس انڈر ورلڈ کی دنیا میں شرافت کا تو کوئی تصور ہے نہیں۔ جو اس کا مظاہرہ کرے' اسے بزدل اور ڈرپوک سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر ظاہر ہے اس سے نقصان ہوتا ہے۔ جب بات حد سے بڑھ گئی تو جمی نے مقابلے پر آنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے ہی راؤنڈ میں رابرٹ کے چار آدمی مارے گئے جن میں اس کا دستِ راست بھی شامل تھا۔ رابرٹ کو تقریباً ایک ملین ڈالر کا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ مارے جانے والوں میں تین ایسے تھے جن کو خود جمی نے گروہ سے جانے کی اجازت دی تھی۔ جو آدمی کام کا نہ رہے' اسے گروہ سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ مروج ہے۔ اسے دوسری دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے مگر جمی نے ان کو رعایت دینے کی غلطی کی تھی۔ خیر' وہ بالآخر اسی انجام کو پہنچے جس کے وہ مستحق تھے۔ رابرٹ بہت مشتعل ہوا۔ ایک جوابی کارروائی میں اس نے جمی کے دو آدمی مروا دیے مگر جمی کا نقصان ایک لاکھ ڈالر تک محدود رہا۔ اب اس نقصان کے بھی دو حصے ہیں۔ جو میں بتارہی ہوں' وہ جمی کی سرمایہ کاری تھی۔ اس کی مارکیٹ ویلیو دس گنا ضرور تھی چنانچہ نقصان ایک ملین ڈالر کا بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اسے مل سکتے تھے مگر نہیں ملے۔ ایسے ہی تین مقابلے اور ہوئے۔ آخری مرتبہ وہ اچانک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں۔ جمی کی گولیاں اپنا کام کرگئیں۔ رابرٹ وہیں مارا گیا۔ ایک گولی اس کے سر میں لگی تھی' دوسری پیٹ میں۔ رابرٹ کی گولیوں میں سے ایک جمی کے بازو میں لگی' دوسری ٹانگ میں لیکن تیسری بدقسمتی سے ریڑھ کی ہڈی میں اٹک گئی۔ ڈاکٹروں نے جمی کی جان تو بچالی اور آپریشن کرکے گولی بھی نکال دی مگر وہ زندگی بھر کے لیے مفلوج ہوگیا۔ اب وہ وہیل چیئر پر حرکت کرتا ہے لیکن اس کا گروہ پر پورا کنٹرول ہے۔"

"تمہارے ذریعے سے۔"

"تم کہہ سکتے ہو۔ کسی حد تک ورنہ میں صرف اس کے احکامات آگے پہنچاتی ہوں اور یہ دیکھتی ہوں کہ ان پر کس حد تک عمل درآمد ہوا۔ مالی معاملات کی دیکھ بھال بھی میں کرتی ہوں۔ اصل کام ہے ساری دنیا کے لوگوں سے رابطہ رکھنا۔ یہ کام وہ خود کرتا ہے۔ اس کا کمرا ایک جدید ترین مواصلاتی مرکز ہے' تم دیکھ لوگے۔"

میں نے کہا "یہ سب بہت افسوسناک ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ جمی مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے یا دوستوں میں؟"

"وہ کاروباری رشتوں میں دوستی دشمنی کا قائل نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کا بہت نقصان ہوا۔ اگر تم یہ نقصان پورا کردیتے ہو تو وہ تم سے کچھ نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا "اور اگر ایسا نہ ہوا؟"

"یوسی' جو شخص اپنے نفع نقصان کا حساب برابر رکھنے کا اہل نہ ہو وہ بزنس نہیں کر سکتا۔ وہ پیسہ دینا جانتا ہے تو لینا بھی جانتا ہے۔ کیا یہ بات تمہیں اس کا پیغام دینے والوں نے نہیں سمجھائی تھی؟"

میں نے کہا "وہ مجھے کتنے نقصان کا ذمے دار سمجھتا ہے؟"

"یہ رقم دو ملین ڈالر تھی۔ مارک اپ لگا کے ڈھائی سے کچھ اوپر ہو گئی ہے۔ اگر تم کیش ادائیگی کر دو تو میں تمہیں کلیئر کر سکتی ہوں۔ بصورت دیگر تمہیں خود جمی سے مل کے کوئی ارینج منٹ کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا "اور اس کے ساتھ ملاقات کب' کہاں اور کیسے ہو گی؟"

اس نے گھڑی دیکھی "تقریباً آدھے گھنٹے میں۔ وہ ایک کلائنٹ کے ساتھ مصروف تھا اس لیے میں نے تمہیں روکا۔"

جولی نے درمیان میں کئی فون سنے اور دو بار ایک عقبی دروازے سے اندر گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جمی کے آفس کا راستہ ہو گا۔ کچھ باتیں وہ اسے بتانے اور اس سے ہدایات لینے اندر جاتی تھی۔

آدھے گھنٹے سے پہلے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ جولی نے انٹرکام پر اس کی آواز سنی اور اٹھ کھڑی ہوئی "آجاؤ۔ جمی تمہارا منتظر ہے لیکن ایک تو یہ بتا دو کہ تم کوئی اسلحہ چھپا کے اندر نہیں لے جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم میری تلاشی لے سکتی ہو۔"

"میں تمہاری زبان پر اعتبار کرتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اندر تم اکیلے جاؤ گے۔ کسی کے لیے باڈی گارڈ' سیکریٹری یا گرل فرینڈ کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ یہ ون ٹو ون بات چیت ہو گی۔"

"تم بھی وہاں موجود نہیں رہو گی۔"

"اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ جمی پہلے کے مقابلے میں بہت شارٹ ٹمپرڈ ہو گیا ہے۔ بہت جلد غصے میں آجاتا ہے اور چلانے لگتا ہے لیکن یہ بالکل نیچرل ہے۔ معذوری نے اسے چڑچڑا بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا "میں خیال رکھوں گا۔"

جمی تھری پیس سوٹ میں ایک جدید قسم کی وہیل چیئر پر بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہیل چیئر ایک موٹر سے چلتی تھی جسے وہ اپنے ایک ہاتھ کے قریب لگے ہوئے چینل سے کنٹرول کرتا تھا۔ وہیل چیئر کو سیڑھی کی ریلنگ پر چلا کے اوپر نیچے بھی لایا جا سکتا تھا اور اس گاڑی میں بھی فٹ کیا جا سکتا تھا جو خاص طور پر جمی کے لیے بنائی گئی تھی۔

اس نے بھاری غصیلی آواز میں کہا "تو تم آگئے؟"

میں نے کہا "تم نے میرے لیے نہ آنے کی گنجائش کہاں چھوڑی تھی۔"

"یہاں تم میرے ساتھ جھوٹ نہیں بولو گے۔ اتنی دیر سے تم جولی کو بے وقوف بنا رہے تھے کہ تمہاری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ میں سب سن رہا تھا تمہاری بکواس۔ ایسا ہے تو تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم اتنا عرصہ کہاں غائب تھے۔ میں یہاں کے اخبارات میں وہ سب خبریں دیکھتا رہا ہوں جو تم نے پیسہ دے کے شائع کرائی تھیں' سب جھوٹ۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ میری ضرورت تھا۔ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔"

وہ چلانے لگا "بکواس بند کرو۔ تم نے میرا کتنا وقت ضائع کیا۔ میں نے تمہاری تلاش میں کتنے آدمی لگائے۔ انہوں نے کہا کہ شادی اور طلاق کی سب باتیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ میں آدمی کو قبر کھود کے نکال لیتا ہوں مگر تم بھاگ گئے تھے پاکستان اور خبروں سے مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ حادثے اور تمہارے میموری کے نقصان کی خبریں سچ ہیں۔"

میں نے کہا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر جو مجھے جھوٹا کہے اور نہ میں ڈرتا ہوں تم سے۔ اگر تم مفلوج نہ ہوتے تو میں تمہاری یہ بکواس کبھی نہ سنتا۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا "میں مفلوج نہیں ہوں ۔۔۔ یو باسٹرڈ۔ سن آف اے بچ!"

میں نے کہا "میں جسمانی معذوری کی بات نہیں کر رہا تھا۔ تم ذہنی طور پر معذور ہو چکے ہو۔ تم یہ نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہو اور کس سے کہہ رہے ہو۔ تمہاری بیوی کہتی ہے کہ تم مجھ سے ڈھائی ملین ڈالر کے مساوی رقم وصول کرنا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ کیسے وصول کرو گے اور میں نہ دینا چاہوں تو کیا بگاڑ لو گے میرا' پاگل کے بچے۔"

وہ چیخنے لگا "جولی' جولی! اس کتے کے ساتھ جو کتیا آئی ہے اس کو اندر لاؤ۔ میں بتاتا ہوں اسے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

ایک منٹ پورا ہونے سے پہلے چندا کو اندر پہنچا دیا گیا۔ اسے پکڑ کر لانے والے دو قد آور اور تنومند حبشی تھے جن کی جسامت کے مقابلے میں چندا یوں لگتی تھی جیسے عقاب کے

پنجوں میں کوئی چڑیا۔ چندا نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ اسے اندر لانے والوں نے دھکیل کر جمی کے سامنے پھینک دیا۔

"اسے تم اپنا باڈی گارڈ کہتے ہو۔ اس کی باڈی کتنی سیکسی ہے؟" وہ غصے میں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا "میں دیکھنا چاہتا ہوں' یہ جو تمہاری سیکریٹری بھی ہے گرل فرینڈ بھی۔ اندر سے کتنی خوبصورت ہے۔"

دونوں حکم کے غلام چندا کی طرف بڑھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ جیسے ہی انہوں نے چندا کو چھوا۔ چندا یوں تڑپی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ اس کے جسم کا دفاعی نظام خود کار انداز میں متحرک ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پیر اتنی تیزی سے حرکت میں آئے کہ کسی کو کچھ نظر نہ آیا۔ وہ آسمانی بجلی کی طرح ان پر ٹوٹی اور تیس سیکنڈ میں دو توی ہیکل دیوزاد قسم کے مرد فرش پر ڈھیر نظر آئے۔ ان کے بھاری جسم چند منٹ کرب میں بل کھا کے بے حس ہو گئے۔

جمی کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا' چندا ایک جست میں اس کے پیچھے پہنچ گئی اور اس نے جمی کی موٹی بھینسے جیسی گردن کو ایک بازو کے حلقے میں جکڑ لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے جمی کے سر کو اتنا آگے جھکا دیا کہ وہ اذیت سے کراہنے لگا۔

"اِٹ از آل رائٹ بے بی!" وہ بولا "ٹیک اٹ ایزی!"

میں نے کہا "ہم یہاں بات کرنے آئے تھے۔ بات نہیں ہو سکتی تو ہمیں جانے دو۔ ضمانت کے طور پر ہم تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ ناممکن ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی چانس نہیں۔ تم مجھے مار سکتے ہو مگر خود بھی مارے جاؤ گے۔"

اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ جولی خاموشی سے کمرے میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت خوبصورت زنانہ ماڈل کا آٹومیٹک ریوالور تھا "چھوڑ دو جمی کو۔ اسے تکلیف ہو رہی ہے۔"

جب ہم جولی سے بات کر رہے تھے تو جمی کسی کے ساتھ میٹنگ میں مصروف نہیں تھا۔ وہ ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ ایسے ہی جولی نے سب سنا تھا۔

"میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔" چندا نے سخت غصے میں کہا "تمہارا یہ اسلحہ اس کی جان نہیں بچا سکتا۔"

"ہاں۔ مگر تمہارے اس بوائے فرینڈ کی جان تو لے سکتا ہے۔ لڑکی' آخر تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ایسے تمہارا بحفاظت باہر نکلنا مشکل نہیں' ناممکن ہے۔ کیا تم نے یہاں آتے ہوئے دیکھا نہیں تھا کہ جمی تک پہنچنے کے لیے کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے؟"

میں نے کہا "ہم یہ رسک لیں گے۔"

جولی نے نفی میں سر ہلایا "یہ بے وقوفی ہو گی۔ اگر تم نے جمی کو مار دیا۔ بالفرض محال' تو سوچو تمہیں بھی کون چھوڑے گا؟ اور چلو مان لو کہ میں تمہیں سلامتی کے ساتھ باہر پہنچانے کی ذمے داری قبول کرتی ہوں تو باہر جا کے تم کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟ جب تک تمہیں بھوت کی طرح غائب ہونا نہ آتا ہو تم لندن میں کیسے محفوظ رہ سکتے ہو۔ ہم پھر بلا لیں گے تمہیں۔"

میں نے کہا "جو کہنا ہے اپنے اس بگ باس سے کہو۔ اسے سمجھاؤ۔"

جمی نے کراہ کے کہا "چھوڑ دو میری گردن ۔۔۔ ہم بات کریں گے۔"

"تم بالکل اعتبار کے قابل نہیں رہے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ کاروباری بات چیت ہو گی اس لیے اسلحہ ساتھ مت لانا۔"

جولی نے کہا "جمی غصے میں آگیا تھا لیکن اس کی نیت ہرگز وہ نہ تھی جو تم سمجھے۔ میں جانتی ہوں' وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لڑکی کو نقصان پہنچنے سے پہلے میں اندر آجاتی۔ جمی صرف تمہیں ڈرا رہا تھا۔ ورنہ خود سوچو کیا وہ اتنا غیر ذمے دار اور پاگل ہے کہ اپنے آفس میں یہ سب کرتا۔ آفٹر آل' وہ ایک بہت بڑا بزنس چلا رہا ہے اور کم سے کم ڈھائی سو لوگوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ چلو چھوڑ دو اسے لڑکی!"

جمی نے اشتعال میں ایک بے وقوفی کی' ابھی تو چندا کے دماغ کا فیوز اڑ گیا تھا۔ دو حکم کے غلاموں کو ناک آؤٹ کرنا جائز تھا اور کافی تھا۔ جمی کو جان سے مارنے کی دھمکی دینا لاحاصل تھا۔ اس کی بیوی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ہم دشمن کے قلعے میں پوری طرح محصور تھے اور ہمارا واسطہ کسی ایک فرد سے نہیں' ایک خطرناک جرائم پیشہ لوگوں کی پوری تنظیم سے تھا۔ یہاں سے نکل کر بھی ہم محفوظ بہرحال نہیں ہوتے تھے۔

جولی نے چِلّا کے مجھ سے کہا "تم کیا خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو بے وقوف آدمی۔ اس لڑکی کو سمجھاتے کیوں نہیں؟"

اب اس سے پہلے کہ میں چندا کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہتا' صورتِ حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی اور اس سے ثابت ہوا کہ دنیا کبھی اتفاقات سے خالی نہیں رہتی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گھنٹی بجتی رہتی اور فون کرنے والا مایوس ہو کے لائن کاٹ دیتا مگر یہ عام فون کی گھنٹی نہیں تھی۔ یہ جمی کے زیرِ استعمال خصوصی فون تھا جو SCRAMBLER کہلاتے ہیں۔

اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز سرکاری عہدے دار۔ وزیراعظم یا صدر اور جنرل اس قسم کے فون استعمال کرتے ہیں۔ ان میں آواز ایک طرف سے خراب یا مسخ یعنی DISTORT ہو کے نکلتی ہے۔ اگر راستے میں کوئی اسے ٹیپ کرے تو اسے بے ہنگم آوازیں یا محض شور سنائی دیتا ہے۔ دوسری طرف کے فون میں یہ سسٹم ہوتا ہے کہ اس شور کو پھر اصلی آواز میں بدل سکے اور یوں کہنے والا جو کہتا ہے اسے صرف وہی سن اور سمجھ سکتا ہے جسے فون کیا گیا ہو۔ یہ ایک طرح سے کوڈ میسج بن جاتا ہے جسے ڈی کوڈ نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے یہ فون ٹاپ سیکرٹ گفتگو کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جولی نے کہا تھا کہ اس کے شوہر کا کمرا ایک مواصلاتی عجائب خانہ ہے۔ یہ میں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی میز پر چھ مختلف قسم کے فون تھے۔ دیواروں پر مانیٹر اسکرین تھے اور ہر طرف ٹرانس میٹر ریسیور قسم کے ایسے آلات نظر آ رہے تھے جن کے استعمال سے میں ناواقف تھا۔

جولی میز کے بہت قریب تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!" اور پھر اسکرین کو دیکھ کر بولی "مسٹر نواز! واٹ اے سرپرائز۔ ہاں' میں جولی بول رہی ہوں۔ جمی۔۔۔؟ ایک منٹ میں دیکھتی ہوں کہ کہیں وہ نکل تو نہیں گیا۔"

پھر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے کہا "تمہارا پاکستانی بزنس پارٹنر۔ ملک رب نواز فرام لاہور۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور چندا سے کہا "اسے بات کرنے دو اور مطمئن رہو۔ ان میاں بیوی سے میں نمٹ سکتا ہوں۔"

چندا نے جمی کو آزاد کر دیا "یہ یاد رکھنا کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتی کیونکہ میرے پاس جان اور آبرو کے سوا گنوانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

جمی نے ایک گہری سانس لی اور ریسیور پکڑ لیا "نواز! کتنا عجیب ہے یہ اتفاق۔ تم نے شاید چھ مہینے بعد فون کیا ہے اور ایسے وقت جبکہ تمہارا پاکستانی دوست بھی یہاں موجود ہے۔ چلو پہلے اس سے بات کرلو۔"

یہ میرے حق میں مزید بہتر ہوا۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں رب نواز کو اپنے حق میں کرسکوں اور اسے قائل کرسکوں کہ وہ سب کے باہمی مفاد میں جمی کو ہوش مندی سے کام لینے کا مشورہ دے۔

میں نے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا "ملک صاحب! شاہ عالم بول رہا ہوں میں۔۔۔ ہاں' آیا تو میں کاروباری معاملات طے کرنے کے لیے تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایک پاگل سے واسطہ پڑے گا۔"

جمی نے احتجاج کیا۔ "تم انگلش میں بات کیوں نہیں کرتے تاکہ میں بھی سمجھوں۔"

میں نے کہا "ابھی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا اور یہ بات تمہارے مطلب کی نہیں۔"

رب نواز بولا "کیا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ جمی دخل در معقولات کر رہا تھا۔ دیکھو' تم اسے سمجھاؤ کہ میں واقعی کاروباری رشتے پھر استوار کرنا چاہتا ہوں اور جتنا نقصان میری وجہ سے ہوا ہے' وہ میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ بات اتنی مشکل تو نہیں کہ تم نہ سمجھا سکو اور وہ نہ سمجھے۔"

میں نے کہا "یہ اس بات پر مشتعل ہے کہ میں کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اب میں اسے پاکستان کے سارے حالات کا خلاصہ بھی سناتا تو کئی گھنٹے لگ جاتے اور یہ شاید پھر بھی مجھ پر یقین نہ کرتا چنانچہ میں نے اس سے کہا ہے کہ ایک حادثے میں میری یادداشت چلی گئی تھی۔ پھر آٹھ مہینے بعد بھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔ تم جانتے نہیں کہ وہ کتنا حرامی ہے۔ وہ تم پر آسانی سے یقین نہیں کرے گا۔" ملک نے بگڑ کے کہا۔

میں نے کہا "اس نے یقین کرلیا ہے۔ اگر تم بھی میرے حق میں گواہی دو۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارے حق میں گواہی' ناممکن۔"

میں نے کہا "دیکھو ملک رب نواز۔ ہم طویل مذاکرات کے بعد ایک کاروباری سمجھوتے کے قریب تھے جب تم نے ایک بے وقوفی کی تھی لیکن ابھی معاملات ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلے ہیں۔ میرا یہاں آنا آخر کیا ثابت کرتا ہے؟ یہی کہ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم سب اس کاروبار کو مکمل طور پر ختم اور تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں جسے ابھی تک نقصان کا سامنا ہے۔ ٹھیک ہے' ایسا میری وجہ سے ہوا لیکن میں کفارہ' جرمانہ یا تاوان کچھ بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہوں تو پھر تمہیں بھی تعاون کرنا چاہیے۔ ہمارے درمیان جب تک پہلے والا اعتماد اور اعتبار کا رشتہ قائم نہیں ہوگا۔"

"اوکے۔ اوکے' فون اسے دو" رب نواز نے جھلّا کے کہا۔

یہ دستِ غیب کی کارفرمائی تھی یا میری خوش بختی تھی

کہ رب نواز کا فون آگیا اور مجھے اس کو قائل کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ اس نے جمی کو قائل کیا کہ میری نیت ٹھیک ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں' غلط نہیں ہے۔ جمی کی یک طرفہ گفتگو سن کے بھی میں سب سمجھ رہا تھا۔

پانچ منٹ میں صورتِ حال بالکل پلٹ گئی۔ ہم اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ گئے اور ہمارے درمیان ایک ٹیلی فونک کانفرنس شروع ہوگئی۔ ایک مشترکہ اور انتہائی حساس مائیکروفون کے ذریعے جمی کی اور میری آواز ملک رب نواز تک پہنچ رہی تھی اور ایک ٹیلی فون کے اسپیکر پر ہم دونوں اس کی آواز صاف سن سکتے تھے۔ رب نواز کی انگریزی کا معیار وہی تھا جو انگریزوں کی گوراشاہی اردو کا ہوتا تھا۔ بی اے پاس ہونے کے باوجود وہ گرامر سے بے نیاز انگلش بولتا تھا۔ تاہم وہ اپنا مفہوم واضح کرسکتا تھا۔

جب دس منٹ بعد یہ گفتگو اختتام کو پہنچی تو سب ٹھیک ہوچکا تھا۔ جولی نے اتنی دیر میں حکم کے دونوں غلاموں کو اٹھوا کے طبی امداد کے لیے کہیں ارسال کردیا تھا اور خاطر تواضع کے ماحول کو مزید دوستانہ بنانے کے لیے اقدامات بھی کیے تھے۔ میں باتوں میں مصروف تھا چنانچہ چندا نے کافی پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ میاں بیوی کوئی اعصاب کو پُرسکون رکھنے والا ڈرنک لے رہے تھے۔ جمی یقیناً خوش قسمت تھا کہ اسے جولی جیسی شریکِ حیات ملی اور اس کی معذوری کے باوجود اسے چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ اس کے معاملات کو سلجھانے اور چلانے میں پوری معاونت کرنے لگی۔ اگر اس میں پہلے سے ایک خداداد صلاحیت نہ ہوتی تو شاید وہ معاملات کو اور الجھا دیتی اور جمی کے کاروبار کا بھٹہ بٹھا دیتی۔ جمی بھی عقل کا اندھا نہیں تھا کہ بیوی ہونے کے ناتے یہ ذمّے داری اسے سونپ دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی یہ کام کرسکتی ہے۔ شاید وہ پہلے پس منظر میں رہ کے بھی اس کی مدد کرتی تھی اور اس کی مشیر تھی۔ جمی نے اسے خود یہ ٹریننگ دی ہوگی تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی جگہ لینے والی بیوی اس کاروبار کو آزادانہ طور پر خوش اسلوبی سے چلا سکے۔

اس معاشرے میں جہاں وفا کا تصور بدنام ہے اور ازدواجی زندگی میں آخری دم تک ساتھ دینے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ جولی کی یہ بے غرض رفاقت اور شوہر پرستی خالص مشرقی روایات کی حامل نظر آتی تھی اور بہت غیر معمولی بات تھی لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اس جذبۂ ایثار میں بھی خلوص نہ ہو۔ ایک خودغرضی کا خیال شامل ہو کہ کل جب جمی نہیں ہوگا تو وہی اس لاکھوں کروڑوں کے کاروبار کی مالک اور بگ باس ہوگی۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔ بعد میں جمی کو بیک گراؤنڈ میں دھکیلا جاسکتا ہے یا ضرورت پڑے تو موت کی وادی میں۔

یہ میرا ذہنی تعصب نہیں تھا۔ میرا ذہن مغرب میں عورت کے مزاج اور کردار سے منسوب واقعات سے متاثر تھا اور پھر جمی اور جولی کے کردار جس ماحول سے تعلق رکھتے تھے وہاں بے ریا محبت اور بے طلب رسم وفا کا تصور بھی بعید از قیاس لگتا تھا۔ تاہم EXCEPTIONS کے امکان کو بالکل ہی RULE OUT کرنا بھی غلط تھا۔

ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران میں ملک رب نواز نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ میری پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہے۔ اسے پارٹی کے نائب صدر قریشی نے فون کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ سوچ کے بتاؤں گا مگر اب وہ فیصلہ کرچکا ہے کہ کاروباری رشتوں کی بحالی کے لیے سیاسی اتحاد سے مزید فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

رب نواز کے فون نے جہاں مجھے ایک مشکل سے نکالا وہیں شاہ عالم کی لندن میں موجودگی اور اس کی "نیک نیتی" کا قائل کرنے والا ثبوت بھی فراہم کردیا۔

میرے اور جمی کے درمیان ایک خوش گوار دوستانہ ماحول میں گفتگو کا آغاز ہوا تو بہت سی پچھلی باتیں بھی سامنے آئیں جن کا مجھے علم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نامر عظیم تھا اور شاہ عالم کی زندگی کی کتاب کو میں نے سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ اس لیے کہ میں مجبور تھا۔ اس کتاب کے ہر صفحے کی تحریر میں کیسے پڑھ سکتا تھا۔ تاہم ہر لاعلمی پر ایک جھوٹ کا پردہ پڑا رہا۔ رب نواز کی گواہی نے ایک جھوٹ کو سچ کا درجہ دے دیا تھا۔ جو بات مجھے یاد نہیں آتی تھی جمی خود تفصیل سے بتا رہا تھا۔

رات بہت ہوگئی تھی اس لیے حساب کتاب کا معاملہ اگلی ملاقات پر اٹھا دیا گیا۔ جمی نے کہا کہ وہ مجھے ان سب پرانے لوگوں سے ملوا دے گا جن کے نام پتے میری یادداشت سے نکل گئے ہیں۔ میں بھی جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا اس لیے میں نے بھی اس کی ہر بات مان لی۔

"تم کل کسی وقت آجاؤ" وہ بولا۔

میں نے کہا "کل میری اپنی کچھ مصروفیات ہیں۔ کوشش کروں گا مگر وعدہ نہیں کرسکتا اور جلدی کس بات کی ہے۔ میں لندن آیا ہی کام کے لیے ہوں۔"

"تمہیں واپس جانے کی پریشانی تو نہیں؟"

میں نے کہا "پریشانی کیسی؟ اب تو معاملات طے ہوگئے۔

...کن ہے میں یہاں چھ مہینے رہوں۔ میری وہاں کیا ضرورت ...ہے۔"

اس نے سہلایا "ہاں۔ رب نواز ہے وہاں کے ...عاملات سنبھالنے والا۔ اس کے علاوہ اب تمہاری سیاسی ...صروفیت بھی ختم ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "دیٹ از رائٹ۔"

وہ بولا "اگر تم میرا اصل نقصان پورا کردو تو یہ ...و سکتا ہے کہ میں مارک اَپ معاف کردوں۔ دو ملین ڈالر یا ...ڑھ ملین پاؤنڈ تم اپنے منافع میں ایڈ جسٹ کرو تو سال بھر میں ...سانی سے ادا ہو جائیں گے۔ تمہیں کوئی پرابلم ہو تو دو سال ...۔"

"تم مجھے انڈر ایسٹی میٹ کر رہے ہو جمی!" میں نے کہا ...میں آج بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اتنی رقم کا ایک ہی ...یک کاٹ کے تمہیں پکڑا دوں لیکن میں بھی ایڈ جسٹ کرنے ...و ترجیح دوں گا۔ ایک سال کی مہلت بہت ہے۔ تھینک یو۔ ...س ایک بات اور۔"

"لیں!"

میں نے کہا "اب ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی باقی ...یں رہی۔ ہم نے اپنے سب اختلافات بھلا کے پھر پہلے کی ...رح دوست بننے کا اور کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو ہمارے ...رمیان اعتماد بھی ہونا چاہیے۔"

"کیوں نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہی ...روگے۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ سلسلہ نہیں ہونا چاہیے۔ نگرانی کا ...ر تعاقب کا۔ ورنہ کوئی آج سے زیادہ ناخوش گوار واقعہ ...یں آسکتا ہے۔"

وہ کچھ دیر بعد بولا "اوکے۔ میں بھی رسک نہیں لینا ...ہتا۔ یہ لڑکی تو واقعی مصیبت ہے جسے تم اپنا سب کچھ کہتے ...۔ اس کی صورت اور جسامت دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ ...مار دھاڑ بھی کر سکتی ہے؟ مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے ان دونوں ...کہیں وہ مر نہ جائیں۔"

چندا نے مسکرا کے کہا "نہیں وہ زندہ رہیں گے۔ میں ...نے ایسا چاہا ہوتا تو اب تک تمہیں ان کی موت کی خبر مل ...تی۔ میں نے انہیں صرف ناک آؤٹ کیا تھا۔"

وہ بدستور بے یقینی سے سہلاتا رہا۔ "حیرت ہے۔ ایک ...ستانی لڑکی۔ اتنی خوبصورت اور اتنی خطرناک۔ یہ مہارت ...نے کہاں سے حاصل کی بے بی؟"

"اپنے فادر سے۔ وہ ایک آرمی کمانڈو تھا۔ کرنل خان!"

"میں اس سے یقیناً ملنا چاہوں گا۔ اگر وہ میرے لوگوں کو تربیت دے؟"

میں نے کہا "افسوس کہ یہ ممکن نہیں۔ وہ مر چکا ہے۔"

"اوہ... لیکن۔" وہ کچھ سوچ کے بولا "ٹریننگ۔ تو یہ لڑکی بھی اچھی دے سکتی ہے۔ کیا خیال ہے؟ تم بھی ہمارے لیے کام کرو۔"

چندا نے کہا "سوری۔ مجھے پاکستان واپس جانا ہے۔ وہاں میں ایک اسپتال میں کام کرتی ہوں۔"

جمی کی کار میں اس کا ڈرائیور ہمیں واپس ہوٹل لے گیا۔ ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی ہماری لڑائی شروع ہو گئی۔

"تم نے تو آج مروا دیا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی۔ مار پیٹ شروع کرنے کی؟"

وہ خفگی سے بولی "کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں انتظار کرتی رہتی کہ تم غیرت میں آکے کچھ کرو۔ وہ میرے کپڑے نوچ کے پھینک دیتے پھر؟"

"اور وہ پوچھے بغیر گولی مار دیتے پھر؟ اب تک ہم دونوں کی لاشیں بھی ٹھکانے لگا دی جاتیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ رب نواز کا فون آگیا۔"

"دیکھو ناصر۔ تم ان بدمعاشوں کو چکر نہیں دے سکتے کہ تم شاہ عالم ہو۔ پھر یہ کمٹ منٹ کیوں کی تم نے؟" وہ بولی۔

"اپنی جان چھڑانے کے لیے۔ تم نے انہیں اپنے بارے میں اتنا کیوں بتا دیا اور وہ بھی سچ کہ میرے والد کا نام کرنل خان ہے اور میں ایک اسپتال میں کام کرتی ہوں" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"صرف اس سے کوئی میرا سراغ نہیں لگا سکتا۔ میرا نام انہیں معلوم نہیں اور میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ ہو تو ظاہر ہے لاہور سے آئی ہو۔"

وہ بگڑ کے بولی "تم کو کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ ہم دس سال سے جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔ اب کوئی مجھ تک پہنچے گا تو تمہاری وجہ سے۔"

میں نے چلا کے کہا "اتنا ڈرتی ہو تو مت رکھو مجھ سے کوئی تعلق۔"

پھر ہوٹل آگیا اور ہمارے اوپر جانے تک یہ لڑائی رک گئی۔ میں نے چندا کو اس کے کمرے کے دروازے تک چھوڑا اور چلنے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ناصر۔ ایسے

چھوڑ کے مت جاؤ مجھے۔ میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، پلیز!"

"باتیں کرنی ہیں یا لڑنا ہے؟" میں نے کہا مگر میں اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔

چندا ایسے بستر پر گر گئی جیسے میلوں چل کے آئی ہو "ناصر۔ ہم کس لیے آئے تھے لندن؟ اور کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟"

میں ایک آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کے لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا "یہ سب شاہ عالم کے چکر ہیں، میرے نہیں۔"

"تم کیسے جان چھڑاؤ گے ان چکروں سے آخر؟"

"وہی ایک طریقہ ہے چندا جو میں سوچ کے آیا تھا۔ مجھے شاہ عالم کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے چکروں کو اور کسی بھی طرح کم نہیں کیا جا سکتا۔ ناصر عظیم کو ساری عمر بھگتنا پڑے گا شاہ عالم کے حصے کا عذاب۔ میں ہمیشہ مصیبت میں گرفتار ہوتا رہوں گا۔ ہمیشہ بھاگتا رہوں گا، ڈرتا رہوں گا۔ کیونکہ نہ میں مقابلہ کر سکتا ہوں اور نہ شاہ عالم بن کے جمی جیسے لوگوں کے ساتھ غلط کاموں میں شامل ہو سکتا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرا تعاقب کرتے رہیں گے۔ دنیا میں ہر جگہ ملیں گے۔"

چندا بھی چھت کو دیکھتی رہی۔ "اور جمی جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے۔ کہاں کہاں ہوں گے؟"

"مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا چندا۔ جمی سے تو میں نے جان چھڑا لی آج مگر ایک معاملہ پولیس کا بھی ہے۔ جب تک وہ ختم نہ ہو جائے ہم ہوٹل چھوڑ کے غائب بھی نہیں ہو سکتے۔ پہلے انہیں بتانا ضروری ہوگا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

وہ بولی "اگر یہ پولیس تفتیش کا معاملہ نہ ہوتا تو ہم کسی کو کچھ معلوم ہونے سے پہلے پاکستان چلے جاتے۔ تم نے جمی سے کیوں نہیں کہا؟"

"یو آر رائٹ۔ شاید جمی کی مدد سے ہماری جان چھوٹ جائے۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔"

وہ بولی "کیا یہاں بھی سفارش چلتی ہے؟"

میں نے کہا "سفارش اور رشوت کہاں نہیں چلتی چندا۔ آج تو کوئی آیا نہیں۔ کل پولیس نے جو پوچھ گچھ کی تو میں جمی سے کہوں گا۔ ویسے میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔ میرا اس فقیر سے کیا تعلق۔ میں دو دن پہلے لندن آیا تھا۔ ہوٹل والے ضرور جانتے ہوں گے کہ وہ کب سے یہاں بھیک مانگتا ہے۔"

"لیکن تمہارا جھگڑا ہوا تھا اس سے۔"

"یار، جھگڑا تو نہ جانے کتنے لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ میں نے انہیں قتل کرا دیا۔ قتل اگر کیا ہے تو قادر بخش نے۔ یہ بھی پولیس کا مفروضہ ہے۔"

"مفروضہ نہیں۔ وہ کار قادر بخش نے کرائے پر لی تھی۔"

میں نے کہا "چندا۔ کیا لندن میں وہ ایک ہی قادر بخش ہے؟ اور قادر بخش نے میرے ساتھ ایک ہی فلائٹ پر سفر کیا تھا۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں اور وہ ساتھی ہیں، شریکِ جرم ہیں؟"

چندا نے بے خیالی میں کہا "ثابت تو واقعی نہیں ہوتا کچھ بھی مگر وہ کاغذ کا پرزہ جو اس فقیر نے ایک ویٹر کو دیا تھا، تمہیں دینے کے لیے؟"

"پولیس اس ویٹر سے معلوم کرے۔ میں کسی رحمان، کسی قادر بخش اور کسی جیمس کو نہیں جانتا۔ تم کیوں مجھ سے بحث کر رہی ہو؟" میں نے چلا کے کہا۔

وہ اٹھ بیٹھی "میں بحث نہیں کر رہی ہوں۔ یہ چاہتی ہوں کہ تمہارے پاس ان تمام سوالات کا جواب ہو۔"

"میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ سوائے ایک جواب کے۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیا ہے۔"

"کیوں نہ ہم کسی وکیل سے مشورہ کریں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ اپنے وکیل کے بغیر میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"لیکن یہ اس وقت کہا جا سکتا ہے جب مجھ پر فردِ جرم عائد کی جائے یا مجھے گرفتار کیا جائے۔"

"دیکھو، پولیس کے معاملے کو ختم کرانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم بھاگ جائیں گے کہیں۔ برطانیہ میں ہی رہنا پڑا تو دو چار دن گزار لیں گے۔ تم رشوت دو یا سفارش کراؤ لیکن اس قانون کے چکر سے نکلو۔"

میں نے کہا "کل کچھ کریں گے۔"

اور اس وقت رات ــ یا صبح کے تین بجے مجھے پھر شامتِ اعمال نے پاکستان سے پکارا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے سوچے سمجھے بغیر ریسیور اس لیے اٹھا لیا کہ فون میری دسترس میں تھا اور چندا کو کال لینے کے لیے اٹھ کے آنا پڑتا، یہ شبنم کا فون تھا۔

ایک بار پھر اس نے وہ سب کہا جو گزشتہ رات ہی کہہ چکی تھی۔ میں پھر چندا کے کمرے میں تھا جب کہ اس وقت مجھے اپنے کمرے میں ہونا چاہیے، وہ دن میں کئی بار فون کر چکی

اور اسے میں ایک بار بھی اپنے کمرے میں نہیں ملا تھا۔ پاکستان میں اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ ظاہر ہے اخبار کے کام سے فارغ ہو چکی تھی "آج کیا بہانہ ہے ے پاس میرے لیے؟"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "بہانہ کوئی نہیں۔"

"کیا تم اعترافِ جرم کر رہے ہو کہ تمہاری راتیں چندا ساتھ اس کے کمرے میں گزرتی ہیں۔ سارا دن تم چندا ساتھ رہتے ہو۔"

میں نے کہا "اس میں اعتراف والی کون سی بات ہے۔ ساتھ آئے ہیں۔ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ ہی واپس گے۔"

"آگئے نا بالآخر تم اپنے اصلی رنگ میں۔ اس کی ئی اور تمہاری شرافت کے سارے دعوے جھوٹے ے۔ تم دونوں رنگ رلیاں منا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ کچھ بھی کہہ سکتی یں تردید یا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی ں نہیں کرتا اور کوئی خاص بات کہنی ہے؟"

میرا خیال ہے کہ اس رویے نے شبنم کو سخت صدمہ ۔ اس نے جلدی سے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے پوچھنا تھا کہ واپس کب آ رہے ہو؟"

"ابھی میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔"

"تم اتنی رکھائی سے کیوں پیش آتے ہو میرے ساتھ؟"

میں نے کہا "اور تم کیا کرتی ہو۔ روز جلی کٹی سنانے کے ور نت نئی الزام تراشی کے سوا۔ تم کیا میرے اخلاق و ر کی ذمے دار ہو؟ یا میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں کہ میں اپنے روز و شب کے ہر لمحے کا حساب دوں؟ تم صرف دوست ہو شبنم۔ میری گارجین نہیں ہو۔ کیا میں نے پوچھا کہ تم وہاں کیا کرتی ہو صبح سے شام تک۔ تمہاری کیسے گزرتی ہیں؟"

"میں۔ میں تو بس اپنا کام کر رہی ہوں۔"

میں نے بھنا کے کہا "میں بھی اپنا کام کر رہا ہوں۔ اور تم طرح جانتی ہو' وہ کام کیا ہے۔ پھر فضول باتیں کیوں کرتی چھی بات نہیں ہے کہنے کے لیے تو کوئی ضرورت نہیں رنے کی" میں نے ریسیور رکھ لیا۔

میں پریشان تھا۔ شبنم کی کڑوی کسیلی باتوں نے جلتی پر کام کیا اور میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ فون کی پھر بجی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ریسیور نہ اٹھاؤں یا چندا وں کہ وہ بات کرے اور شبنم کو جھاڑ لگائے کہ وہ اسے

کیوں فون کرتی ہے مگر پھر میں نے خود ہی کال ریسیو کر لی۔

شبنم میرے لہجے سے ڈر گئی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے شک آمیز سخت رویے نے مجھے باغی کر دیا اور اگر اس نے صورتِ حال کو نہ سنبھالا تو میں بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ جاؤں گا۔ مرد کی فطرت تو گدھے جیسی ہوتی ہے کہ گلے میں رسی ڈال کے جتنا اپنی طرف کھینچو' وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ پیار سے چمکار کے اسے جدھر چاہو ہانک لو۔

میں شبنم کی مجبوری تھا۔ وہ مجھے کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ شاہ عالم نے اسے خوب EXPLOIT کیا تھا۔ اس نے کبھی شبنم کو وہ باعزت سماجی حیثیت نہیں دی تھی جو بیوی کے طور پر رخشندہ کو حاصل تھی اور شبنم نے اپنی اسی داشتہ جیسی پوزیشن کو بھی کمپرومائز کر کے بے شرمی کے ساتھ قبول کر رکھا تھا۔

شاید اس نے محسوس کیا کہ اس کا جارحانہ رویہ مجھے اس سے دور لے جائے گا۔ چندا میری ضد کی وجہ سے میری زندگی میں وہ اہمیت حاصل کر لے جو پہلے رخشندہ کو حاصل تھی۔ وہ پھر دو نمبر کی پوزیشن پر آجائے گی اور ساری عمر اپنے خوابوں کی تعبیر کے خواب دیکھتے ہوئے گزارنے پر مجبور ہوگی۔

اس نے فوراً اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کیا اور مجھ سے معافی بھی مانگ لی "دراصل میں اتنی پریشان رہتی ہوں تمہاری طرف سے۔ دل میں ہر طرح کے خیال آتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو محبت آدمی کا کیا حال کر دیتی ہے؟"

میں نے کہا "فون پر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں یہاں کیسے مسائل سے دوچار ہوں۔ میں آیا تھا شاہ عالم کی اسٹوری کو ایک منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے لیکن بہت سے پرانے معاملات میں الجھ کے رہ گیا ہوں۔"

"کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی۔ وہاں تمہارے ساتھ ہوتی۔"

میں نے کہا "چندا ہے نا۔"

"وہ پاگل کیا کرے گی!" شبنم نے پھر حسد سے مغلوب ہو کے کہا "یہاں کیا سلوک کرتی تھی وہ تمہارے ساتھ۔ پتا نہیں تم اتنا وقت اس کے ساتھ کیسے گزار رہے ہو۔ اس کے ذلت آمیز رویے کو کیسے برداشت کرتے ہو۔ تم تو اس کے نام سے الرجک تھے؟"

میں نے محتاط انداز میں ایک ڈپلومیٹک جواب دیا "فضول باتوں کے لیے وقت کہاں ملتا ہے یہاں۔ کام کی مصروفیت بہت زیادہ ہے اور یہ کام جتنا اس کا ہے اتنا ہی میرا بن گیا

ہے۔ ایڈورڈ اس کے ساتھ آجاتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اسپتال کا سارا سامان خریدنا کوئی آلونماٹر کی خریداری نہیں ہے۔ انتخاب مشکل ہو رہا ہے۔ اوپر سے کمال نے مجھے ذمے دار بنا دیا ہے کیونکہ یہ سب میں بطور عطیہ دے رہا ہوں۔ ظاہر ہے میں خود بھی چاہتا ہوں کہ اسپتال کو اچھی سے اچھی چیز ملے۔ جس سے ان کی کارکردگی بڑھے۔"

میں نے بڑے اطمینان سے منافقت آمیز گفتگو کی۔ اس سے جھوٹ بولا اور اسے مطمئن کرنے کے لیے یہ ظاہر کیا جیسے میں چندا کو بھگتنے پر مجبور ہوں ورنہ مجھے ہر گھڑی ہر لمحہ صرف اسی کا خیال رہتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ابھی اس کے پاس آجاؤں۔ خود میرے لیے جدائی کا ہر دن ایک سال کے برابر عذاب ناک ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کہنا اس لیے ممکن ہوا کہ چندا اس گفتگو کے دوبارہ شروع ہوتے ہی سو گئی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی اور اسے ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا اور نہ جوتے اتارے تھے۔ وہ اتنی بے خبر سو رہی تھی کہ لائٹ آف کر کے اور دروازہ لاک کر کے جانے سے پہلے میں نے اس کو سیدھا کیا۔ اس کے جوتے اتار کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور اسے کمبل اڑھایا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔

اپنے کمرے میں لوٹ آنے کے بعد میرے لیے خیالات کی رو کو بجلی کی طرح سوئچ آف کر کے سو جانا ہمیشہ کی طرح ممکن نہ ہوا۔ عام طور پر میں دن بھر کی مصروفیات سے ذہن کو آزاد کرانے کے لیے کتابوں سے مدد لیتا تھا۔ لیٹ کر کوئی دلچسپ کہانی پڑھنا دماغ کو RELEIVE کرنے اور اعصاب سے تفکرات اور سوچوں کا بوجھ ہٹانے کا سب سے مؤثر طریقہ تھا مگر یہاں صرف اخبارات تھے چنانچہ میں سونے کی کوشش میں سوچتا رہا۔

مجھے شبنم کے ساتھ اپنے منافقانہ طرزِ عمل پر شرم آئی۔ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ شاید اس لیے کہ فوری طور پر میرے لیے دو طرفہ دباؤ سے نجات کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ اچانک میں دو کشتیوں کا مسافر ہو گیا ہوں اور ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ایک کو چھوڑ دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یقیناً میں ڈوب جاؤں گا۔ میں واضح انداز میں ایک قطعی فیصلہ کرنے کے ناقابل ہوں۔ پھر میرے ذہن میں یہ سوال بھی آیا کہ میں اس کشاکش میں کیوں پڑا؟ چندا کا التفات مجھے ایک نئی

STRATEGY کا انداز لگتا تھا۔ اس کا ساتھ اتفاقی تھا مگر مجھے سازشی محسوس ہوتا تھا پھر میں نے اس کے خلاف مدافعت کیوں اختیار نہیں کی۔ میں نے اتنی جلدی SURRENDER کیوں کر دیا۔ میں اتنی جلدی کیسے بھول گیا کہ میں چندا کے خلاف کس قسم کے جذبات رکھتا تھا اور شبنم کے ساتھ میری جذباتی وابستگی میں اچانک سرد مہری کا دل شکن انداز کیوں آگیا۔

یہ دل اور دماغ کی عدالت کا مقدمہ تھا۔ جذبات اور عقل کی محاذ آرائی تھی۔ عقل کہتی تھی کہ ایسا شبنم کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ سے ہوا۔ اس نے مجھے احساس دلایا کہ وہ ہوس کو محبت سے الگ نہیں سمجھتی اور شاہ عالم کی طرح مجھ سے جسمانی تعلق کو جذبات کے اظہار کی سند مانتی ہے۔ صرف زبانی محبت کیا محبت۔ پھر اس کا مجھ پر ڈومینٹ کرنے کا اور میری زندگی کے معاملات میں اپنے فیصلے مسلط کرنے کا جارحانہ انداز۔ یہ سب ایک منفی ردِعمل کا سبب بن رہا تھا۔ چندا کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ وہ خود کو مجھ پر DEPENDANT سمجھتی تھی۔ میری مرضی اور میری رائے کو اہم سمجھتی تھی اور جذباتی رشتوں کی تقدیس کو اتنا اہم سمجھتی تھی کہ اس تمام اعتماد کے باوجود جو دس سال کی انڈر اسٹینڈنگ کا نتیجہ تھا وہ اپنے اور میرے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھتی تھی۔ میں اسے چھو سکتا تھا' چوم بھی سکتا تھا مگر اس سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ آج رات یہیں رک جاؤ اور خود کبھی میرا حوصلہ آزمانے میرے کمرے میں نہیں آئی۔ الٹا اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ جذبات کی رو میں بہ کے میں نے کوئی حد پار کی تو وہ میرا دماغ درست کر دے گی۔

دل کی دلیل بہت مختصر تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ میں چندا کی محبت کے ٹرانس سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں جبکہ یہ خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی بے اعتنائی کا صدمہ برداشت کرنا آسان نہ تھا چنانچہ میں نے شبنم کے التفات کی پناہ گاہ تلاش کر لی لیکن حقیقت سے مفر کہیں نہ تھا۔ میں چندا کا تھا اور چندا کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی پہلی عنایت کی نظر' نازِ عشق کی پہلی نگاہ اور تجدیدِ الفت کا پیام دینے والی ایک ادا نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ بقول غالب۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

چنانچہ سونے سے پہلے میرے ذہن میں کلبلانے والا

آخری سوال یہ تھا کہ میں اس دہرے تعلق کی بنیادوں میں توازن کیسے رکھوں گا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے جو الجھنیں پیدا کرے گی' ان کا حل کیا ہوگا۔ میں شاہ عالم بہرحال نہیں تھا کہ ایک کو گھر میں آباد رکھتا اور ایک کو دل میں۔ شبنم آسانی سے مجھے چھوڑنے والی نہیں تھی اور میرے لیے چندا کو چھوڑنا اب پہلے سے زیادہ ناممکن ہوگیا تھا۔

اگلے دن کا آغاز ہی ناخوشگوار انداز میں ہوا۔ ساڑھے نو بجے دروازے پر دستک ہوئی تو میں یہی سمجھا کہ ہر روز کی طرح چندا پوری طرح تیار ہوکے میرے ساتھ ناشتا کرنے آئی ہوگی مگر میں نے دروازہ کھولا تو مجھے دو اجنبی نظر آئے جو ایک جیسے سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے انداز اور تیور بھی ایک جیسے تھے اور ان کے پولیس مین ہونے کی گواہی دیتے تھے۔

"مسٹر شاہ۔ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے روایتی سپاٹ انداز میں کہا۔

میں نے کہا "اس کے لیے آپ ہال میں انتظار کریں۔ میں تیار ہوکے آتا ہوں۔ ابھی تو میں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔"

وہ مجھے دھکیل کر اندر آگئے۔ "سوری۔ ہم اتنے فارغ نہیں ہیں کہ ایک گھنٹا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ حق تمہیں کس نے دیا کہ منہ اٹھاکے جب چاہو کسی کی پرائیویسی کو قانون کے نام پر ٹریس پاس کرو۔ کوئی وارنٹ ہے تمہارے پاس؟ اور ہے تو مجھے بھی حق حاصل ہے کہ پہلے اپنے وکیل کو بلاؤں۔ اس کے بغیر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر ایک بولا "مسٹر شاہ۔ یہ کوئی سیریس معاملہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "مگر میرے لیے یہ بہت سیریس بات ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' میں کون ہوں؟ کوئی غیر قانونی تارکِ وطن؟ میں ایک اہم سیاسی لیڈر اور ایک پارٹی کا سربراہ ہوں۔ اگر تم فوراً رخصت نہ ہوئے تو مجھے اپنے ہائی کمشنر کو کال کرنا پڑے گا اور وہ سرکاری طور پر ہوم سیکریٹری کے پاس احتجاج کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔"

یہ دھمکی کام کرگئی۔ وہ اپنا سا منہ لے کر نکل گئے اور کہہ گئے کہ وہ نیچے ہال میں انتظار کریں گے۔ مجھے ان فرعون مزاج گورے پولیس والوں کی ذلت اور بے بسی سے خوشی ہوئی۔ میں نے چند منٹ میں شاور لیا اور لباس بدل کے نیچے چندا کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی تیار تھی اور کسی سے فون پر ناراضی کا اظہار کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آکے بات کرتی ہوں" اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے کہا "صبح بخیر۔ آج مزاج برہم کیوں ہے؟"

وہ بولی "وہ لوگ ایگری منٹ میں کچھ ردوبدل چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے اب؟"

"میں نے بھی انکار کردیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ ابھی تک ہم نے کوئی ادائیگی نہیں کی ہے۔ ہم چاہیں تو پے منٹ روک سکتے ہیں۔ وہ ایگری منٹ پر REVISE کیے بغیر عمل نہیں کریں گے۔"

"مگر یہ خلافِ قانون ہوگا؟"

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم قانونی چارہ جوئی کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ معاملہ ثالثی کے لیے کورٹ میں لے جایا جائے۔"

میں نے کہا "یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ پھر کیا سوچا ہے تم نے؟"

"چل کے بات کرتے ہیں۔ نظرثانی کے بعد ایگری منٹ سے نقصان ہوگا تو ہم بھی اسے کینسل کردیں گے۔"

"یعنی نئے سرے سے پھر کسی سے ڈیل کریں گے؟ خیر' یہ بتاؤ ناشتا منگوالوں؟"

وہ بولی "نیچے چل کے کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہاں دو فرشتے بیٹھے ہیں میرے انتظار میں۔ انہیں میں نے کمرے سے نکال دیا۔ صبح صبح آگئے تھے اپنی منحوس صورت لے کر۔ میں سمجھا تم ہو۔"

وہ متفکر ہوگئی "دیکھو۔ ان سے لڑکے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"مگر میں ڈر کے اتنا گر بھی نہیں سکتا کہ وہ مجھ پر سوار ہوجائیں" میں نے کہا۔

دونوں پولیس مین میرے رویے سے خوش نہیں تھے لیکن ان کے پاس میرے خلاف کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا گزشتہ بیان لکھ کر انہیں دے دوں۔ میں نے صاف انکار کردیا "اس کے لیے بھی میں پہلے اپنے وکیل سے مشورہ کروں گا۔"

ان میں سے ایک نے کہا "مسٹر شاہ۔ معاملات کو الجھائیں مت۔ ہم آپ کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ مشکل سے نکالنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

دوسرا بولا "یہ ایک مرڈر کیس ہے۔ اس میں جتنے لوگوں کے نام کا حوالہ ہے ان کا بیان لازمی ہے۔ بیان نہ دینے کا مطلب ہوگا قانون سے عدم تعاون جو ایک الگ جرم ہے۔

آپ کو خود آپ کا بیان ہی بچا سکتا ہے۔"

پہلے نے کہا "ایسا کرتے ہیں' میں کچھ سوالات کروں گا۔ آپ ان کے جوابات دیں' جو میں لکھتا جاؤں گا' آپ پڑھ کے سائن کردیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ پولیس کا مؤقف غلط نہیں ہے "اوکے' پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

اس نے ایک نوٹ بک سنبھالی "مسٹر شاہ عالم۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ کا اس فقیر سے خیرات دینے کے معاملے میں جھگڑا ہوا تھا۔ جس کا نام رحمان تھا؟"

"ہاں' یہ میں بتا چکا ہوں۔ وہ بدمعاشی جتا رہا تھا۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟"

میں نے کہا "اس نے ایک مشتعل کرنے والی اور توہین آمیز بات کی تھی جسے برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔"

وہ لکھتا رہا "وہ کیا الفاظ تھے جو اس نے کہے تھے؟"

"میرے پاس اس وقت چینج نہیں تھی۔ میں نے یہ بات کہی تو اس نے کہا کہ بتاؤ' کتنی چینج چاہیے۔ میرے پاس دس پاؤنڈ کا نوٹ تھا۔ اس کے بدلے میں سکوں کا ڈھیر قبول نہیں کرسکتا تھا چنانچہ میں نے کہا کہ اس کا مجھ پر کوئی قرض نہیں ہے۔ خیرات بعد میں بھی دے سکتا ہوں میں۔ وہ بک بک کرنے لگا کہ جھوٹ بول کے جان چھڑانا چاہتے ہو تم۔ تمہاری اپنی شکل فقیروں جیسی ہے۔ تم کیا خیرات دوگے کسی کو۔"

"ایسا کہا اس نے؟"

میں نے دل ہی دل میں مرنے والے سے ایک جھوٹ منسوب کرنے پر خدا سے معافی مانگی "ہاں۔"

"تم دونوں ایک دوسرے کے شناسا تھے؟"

میں نے کہا "صرف اس حد تک کہ وہ اکثر مجھے اسی جگہ نظر آجاتا تھا۔"

پولیس مین بولا "پھر اس نے تمہارے نام وہ پیغام کیوں دیا' ایک ویٹر کو؟"

میں نے کہا "یہ غلط فہمی کے علاوہ کچھ ہے تو میں اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں' ویٹر کیا کہتا ہے؟"

"ویٹر صرف نامہ بر تھا۔ اس نے پیغام ڈلیور کرنے کے پیسے لیے تھے۔"

میں نے کہا "اس پیغام کا میں کوئی مطلب نہیں نکال سکتا۔ کیا یہ ثابت ہوگیا ہے کہ فقیر کو کچل کر ہلاک کیا گیا تھا؟"

"یس۔ واقعاتی ثبوت بہت واضح ہیں۔"

دوسرا بولا "مسٹر شاہ۔ یہ قادر بخش جو آپ کا ہمسفر تھا۔ ہم نے اسے تلاش کرلیا ہے۔"

"ویری گڈ۔ کیا اس نے اعتراف بھی کرلیا ہے اپنے جرم کا؟"

"ہاں۔ مگر وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ پاکستان کی اس فلائٹ پر تھا جس سے تم نے سفر کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آخری بار دو سال پہلے پاکستان گیا تھا اور چھ مہینے سے جہاز پر نہیں بیٹھا۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔ اس فلائٹ کے دوسرے پیسنجر اس بات کی گواہی دیں گے۔ اگر تم کسی کا سراغ لگا سکو۔ اس کی دو بیویوں کے معاملے پر جہاز میں جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

"وہ کہتا ہے کہ اس کی ایک ہی بیوی ہے جو پاکستان میں ہے۔ ہم تصدیق کرلیں گے۔"

دوسرے نے کہا "کیا تم اسے تصویر سے شناخت کرسکتے ہو؟"

میں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "ہاں۔ اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا۔"

"کہاں؟" پہلے پولیس مین نے میرے سامنے تین تصویریں ڈال دیں "پہلے یہ بتاؤ کہ قادر بخش ان میں سے کون ہے؟"

میں نے تصویروں پر ایک نظر ڈال کے سر ہلا دیا "ان میں سے کوئی بھی قادر بخش نہیں ہے۔"

دوسرے نے ایک تصویر الگ کردی "یہ قادر بخش ہے۔ ہم اس کی تصدیق کرچکے ہیں۔ پاسپورٹ' شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا "پھر تو یہ سارا معاملہ ہی غلط ہوگیا۔ اس قادر بخش کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم جس قادر بخش کی بات کررہے تھے وہ تمہیں لندن میں کہاں نظر آیا تھا؟"

میں نے کہا "ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان میں۔ جہاں سیکنڈ ہینڈ کپڑے اکٹھے کیے جاتے ہیں' پاکستان بھیجنے کے لیے۔ وہ وہاں کام کرتا ہے۔"

ایک نے سرسری انداز میں ہاتھ ہلایا "دفع کرو اسے۔ تمہارے نام جو پیغام اس فقیر نے چھوڑا تھا۔ اس میں کسی جیمس کا حوالہ تھا۔ جو تمہاری ہڈیاں توڑ سکتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ ضرور جیمس بونڈ ہوگا۔ ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔ اس کے علاوہ میں جیمس اسٹیورٹ کو جانتا ہوں۔ وہ بھی ایکٹر تھا۔ جیمس جوائس کو۔ وہ ایک ناولسٹ ہے۔"

"ویری فی" ایک پولیس مین نے کہا "تم یہاں کاروبار کے سلسلے میں آئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو" میں نے اسے دونوں میڈیکل سپلائی کمپنیوں کے نام دے دیے "دو دن سے ہم ایک ڈیل فائنل کر رہے ہیں اور اس وقت بھی وہیں جانے والے ہیں۔"

اس نے کہا "تم جا سکتے ہو۔ مگر پہلے اس بیان پر دستخط کر دو۔"

میں نے بیان پڑھا اور اپنے سائن کر دیے "کیا اب میں کہیں بھی آنے جانے کے لیے آزاد ہوں۔ تمہیں مطلع کیے بغیر؟"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "شیور۔ تمہارے تعاون کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔"

میں نے لندن کی قانون پرست اور عوام دوست پولیس کی اعلیٰ کارکردگی اور شرافت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن اس سے پہلے میرا واسطہ صرف اس حد تک رہا تھا کہ ایک بار مجھے اوور اسپیڈنگ یعنی حدِ رفتار سے تیز گاڑی چلانے پر اور دوسری بار غلط پارکنگ کی وجہ سے ٹکٹ ملا تھا جو معمول کی بات تھی۔ سارجنٹ نے مجھ سے ڈرائیونگ لائسنس مانگا تھا۔ ٹکٹ بنایا تھا اور تھینکس کہہ کے رخصت ہو گیا تھا۔ رقم میں نے بینک میں جمع کرا دی تھی۔ نہ کوئی بک بک، نہ جھک جھک۔ نہ لین دین نہ تک مکا۔

یہ معاملہ قطعی مختلف تھا۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا اور میرا نام قتل کے کسی کیس میں آجاتا تو میری زندگی عذاب ہو جاتی۔ تاوقتیکہ میرے پاس کوئی توپ قسم کی سفارش نہ ہو، میری رہائی ناممکن تھی۔ پولیس مجھے گھر سے اور ضروری ہوتا تو چادر اور چاردیواری کے احترام کی ایسی تیسی کرتے ہوئے بیڈ روم سے گھسیٹ کر گالیاں بکتی اور مارتی ہوئی لے جاتی۔ اس حسنِ سلوک کا مقصد ہی گھر والوں کو دہشت زدہ کرنا ہوتا کہ اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا پھر تھانے میں جو تواضع ہوتی اس میں چھترول اور ڈرائنگ روم کی منافع بخش ... مجھے تاحیات یاد رہتی۔ منافع بخش اس لیے کہ بے گناہوں کو بے گناہ سمجھنے کے باوجود ان کے والی وارث جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کر کے اس جہنم سے ... ہے۔

یہاں پولیس نے میرے تعاون پر میرا شکریہ ادا کیا تھا اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ میرا اس قتل سے براہِ راست تعلق نظر نہیں آتا، انہوں نے مجھے باعزت طور پر کہیں بھی آنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

میں نے خود کو آزاد اور بہت ریلیکسڈ محسوس کیا۔ پولیس مین رخصت ہو گئے تو میں نے کہا "چندا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے یہاں سے بھاگ لینا چاہیے، کہیں وہ پھر نہ آجائیں۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "مجھے بھی یہ جگہ اب محفوظ نہیں لگتی۔"

میں نے کہا "لندن بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں لوگ یہاں غیر قانونی طور پر آکے غائب ہو جاتے ہیں پھر میں چند دن روپوش کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"تم بار بار میں کہہ رہے ہو، ہم کہو۔"

میں نے کہا "تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ تم ایک بزنس ٹور پر ہو اور تمہیں ایک کمپنی نے یہاں مہمان رکھا ہے، تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے تمہاری ضرورت ہے" اس نے سادگی سے یوں کہا کہ بات ہی ختم ہو گئی۔

ہم نے چند منٹ میں اپنا مختصر اسبابِ سفر پیک کیا اور جتنی دیر میں بیل بوائے نے ہمارا سامان جونی کے حوالے کیا، اتنی دیر میں ہم چیک آؤٹ کرنے کی رسمی کارروائی سے فارغ ہو گئے۔ جونی نے ہمارے سوٹ کیس گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیے تھے اور وہ سارا دن ایسے ہی رکھے رہے۔

کمپنی میں مذاکرات کا ایک اور راؤنڈ شروع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ کمپنی کے چیئرمین نے لیگل ایڈوائزر کے کہنے پر دو شقوں کا اضافہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ ان کا تعلق عدم ادائیگی اور تاخیر سے ادائیگی سے تھا۔

میں نے یہ ترمیم قبول کرنے سے انکار کر دیا "میرے نزدیک یہ عدمِ اعتماد کا مظاہرہ توہین آمیز ہے۔ جب ہم کمٹ منٹ دے چکے ہیں تو ادائیگی بروقت ہو گی اور اس کے لیے بینک گارنٹی کافی ہونی چاہیے۔"

کمپنی کے ڈائریکٹر اور مشیرِ مالیات نے کہا "لیکن لانگ ٹرم لیزنگ میں یہ شق لازمی ہوتی ہے۔ لیٹ پے منٹ سرچارج۔۔۔؟"

میں نے کہا "یہ جرمانہ ہے۔ انٹرسٹ تو پہلے ہی شامل کیا جا چکا ہے۔ ایک سال کی مدت میں رقم ادا کرنے پر ہم ساڑھے سات پرسنٹ زیادہ دے رہے ہیں، پھر یہ سرچارج کیسا؟"

اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "یہ ایک سہولت ہے۔ فرض کیجیے آپ کسی وجہ سے رقم کی ادائیگی مقررہ وقت

میں کرنے سے قاصر رہتے ہیں؟"

میں نے کہا "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ ذمّے داری تو بینک نے لی ہے۔ آپ کی ذمے داری کس نے لی ہے؟"

وہ کچھ حیران ہوا "ہماری طرف سے کیا خلاف ورزی ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے سروس وارنٹی دی ہے۔ اگر بریک ڈاؤن کی صورت میں آپ نے سروس کی فراہمی نہ کی یا اس میں دیر کی تو ذمّے دار کون ہو گا؟ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ایک ایک دن کی تاخیر سے ایک اسپتال کا کتنا نقصان ہو سکتا ہے؟ اس ایکوپمنٹ پر انسانی زندگی بچانے کی جدوجہد کا دارومدار ہے۔ اگر آپ کی طرف سے تاخیر ہوئی اور کمپنی کے انجینئر نہ آئے یا پارٹس فوراً فراہم نہ ہوئے تو خمیازہ کون بھگتے گا؟"

وہ بولا "ہم نے PROMIT سروس کی ذمّے داری قبول کی ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے بھی بروقت ادائیگی کی ذمّے داری قبول کی ہے۔"

وہ لاجواب ہو گیا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ میں نے معاہدہ منسوخ کر دیا لیکن ایک احتجاجی نوٹ کے ساتھ... کہ ویسے تو معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد اس کی حیثیت ایک قانونی دستاویز کی ہو چکی تھی اور اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا مگر ہم برطانیہ کی عدالت میں قانونی چارہ جوئی افورڈ نہیں کر سکتے اس لیے معاہدہ ختم کرتے ہیں مگر ہم اس غیر اصولی معاملے پر برطانوی وزارتِ تجارت کو ضرور لکھیں گے۔

چندا بہت خوش ہوئی "تم نے تو کمال کر دیا۔ کیا نکتہ پیدا کیا واللہ۔"

میں نے کہا "ارے یہ گورے سالے خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں؟ ہم نے وقت پر باقاعدہ ادائیگی کا وعدہ کیا ہے تو ہماری بینک گارنٹی کی بھی کوئی اہمیت نہیں اور انہوں نے کہا کہ خرابی ہو گی تو ہم ٹھیک کریں گے۔ تو ان کی زبانی یقین دہانی کافی ہے۔"

"اگر میں اکیلی آتی یا ایڈی بھی ساتھ ہوتا تو اس نکتے پر ہم اتفاق کرنے پر مجبور ہوتے۔"

میں نے کہا "اچھا ہے کہ ہمارے پاس دوسری کمپنی کی آفر موجود ہے۔"

"اور اگر یہی رویہ ان کا ہوا پھر؟"

میں نے کہا "اس بار ہم خیال رکھیں گے کہ معاہدے میں کوئی ایسی شق ہو تو دونوں کے لیے ہو۔ فکر کی کون سی بات ہے۔ چوائس ہمارا ہو گا کیونکہ خریدار ہم ہیں۔ ساری دنیا کی مارکیٹ ہمارے لیے کھلی ہے۔"

ایک گھنٹے بعد ہم دوسری کمپنی کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ سے بات کر رہے تھے۔ اسے اپنے ذرائع سے خبر مل چکی تھی کہ ہم نے ان کی حریف کمپنی سے معاہدہ کر لیا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے معاہدے کی منسوخی کے اصل اسباب سے آگاہ کر دوں اور یہ بھی واضح کر دوں کہ اگر انہوں نے بھی معاہدے میں ایسی ہی نامعقولیت والی شق شامل کی تو ہم دوسرے ممالک کے اداروں میں معلوم کریں گے اور ہر جگہ ایسی ہی صورتِ حال ہو گی تو ممکن ہے کوریا اور ملائیشیا کی فرموں سے رجوع کریں۔

بین الاقوامی طور پر یورپ اور امریکا کے سب سے مضبوط حریف کوریا اور ملائیشیا ہی ثابت ہو رہے تھے چنانچہ یہ دھمکی کام کر گئی ورنہ شاید یہاں بھی صورتِ حال مختلف نہ ہوتی۔ مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے مارکیٹ پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے ایسے بہت سے اصولوں پر آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جو کاروباری اخلاق کے منافی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس بدمعاشی کا توڑ کوریا اور ملائیشیا جیسے ممالک ہیں جن کی صنعتی ترقی حیران کن ہے۔ ان کے اعلیٰ معیار، آسان شرائط، کم قیمت اور کاروباری اخلاق نے سیکڑوں سال سے برتری کے زعم میں مبتلا یورپی ممالک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔

چندا کو رہائش اور آمدورفت کی سہولت کے لیے کار اس کمپنی نے فراہم کی تھی جس کے معاہدے کو ہم کینسل کر چکے تھے۔ یہ ایک طرح کی رشوت تھی مگر کلائنٹس کو انٹرٹین کرنے کے اخراجات کو پبلسٹی کے اخراجات کی طرح یہ کاروباری ادارہ اپنے بجٹ میں شامل رکھتا ہے اور رشوت کے مقابلے میں اسے کم غلط سمجھا جاتا ہے تاہم اب اس سہولت کا واپس لیا جانا طے تھا۔

یہ بات جونی نے بھی ہمیں سمجھا دی "مجھ سے کہا گیا ہے کہ مہمانوں کو وہاں چھوڑ دوں جہاں وہ کہیں اور واپس آجاؤں۔"

میں نے کہا "تھینک یو جونی۔ تم اب جا سکتے ہو اور یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں نے مہمانوں کو ہوٹل میں چھوڑ دیا تھا۔"

وہ ہنسا "یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے۔"

جونی کے رخصت ہونے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی ہائر کرلینا بہتر سمجھا۔ وہ ایک پرانا سکھ ڈرائیور بلونت سنگھ تھا اور بہت جوشیلا نوجوان تھا۔

"بیٹھو میری سرکار۔ اپنی گاڑی سمجھ کے بیٹھو۔ پیسے کی بات مت کرو۔ دل چاہے دو' دل نہ چاہے نہ دو" وہ قہقہہ مار کے بولا۔

میں نے اس کی بے تکلفی کو پسند کیا "پیسے کہاں سے دیں گے۔ جیب میں تو پاؤنڈ ہیں؟"

وہ ہربات پر گلا پھاڑ کے ہنسنے کا عادی تھا۔ "اوجی' نام کچھ بھی دے دو۔ روپیہ' ڈالر' پاؤنڈ۔ ہے تو سب ہاتھ کا میل ہے۔"

میں نے کہا "لندن کے راستوں سے واقف ہو نا؟"

وہ بولا "لوجی۔ کیسا ظالم سوال کیا آپ نے۔ میرا باپ ادھر آیا تھا چالیس میں۔ سن چالیس میں۔ پچاس سال سے اوپر ہوگئے۔ وہ اب مرنے والا ہے۔ چالیس سال ٹیکسی چلاتا رہا اور اس میں پیٹرول ڈالتا رہا۔ اب اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہے۔"

"پیٹرول پیٹ میں ڈال رہا ہے؟"

اس نے قہقہہ مارا "کیوں سرکار' کیا فرق ہے پیٹرول اور شراب میں۔ ایک گاڑی کے اندر جلتی ہے اور دوسری بندے کو اندر سے جلاتی ہے۔ یہ بھی آگ وہ بھی آگ۔ میں جب سے پیدا ہوا ہوں ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ پوچھو کیسے؟ وہ ایسے کہ میں پیدا ہی ٹیکسی میں ہوا تھا۔ میرا باپ اسپتال لے جارہا تھا میری ماں کو۔ ایک جگہ ٹریفک جام تھا۔ سگنل گرین ہوا تو میں نے کہا چل یار' راستہ تو کھلا ہوا ہے۔ سگنل پھر ریڈ ہونے سے پہلے ہی میں پیدا ہوگیا" اس نے ایک اور قہقہہ مارا "تو جناب' جو بندہ پیدا ہی ٹیکسی میں ہوا ہو' اس سے کیا پوچھنا کہ لندن کے راستوں کا پتا ہے۔ اپن تو مریں گے بھی ٹیکسی چلاتے ہوئے' دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "چلو یار مان لیا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہوٹل کے علاوہ لندن میں دو چار دن ٹھہرنے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے؟"

"جدھر آپ بولو۔ دو چار دن کیا' ساری زندگی رہو اور بالکل فری۔ ایسی جگہ بھی ہے" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔

میں نے کہا "ہم کیا فقیر' پاگل یا مفرور مجرم لگتے ہیں شکل سے؟ غریب خانے' پاگل خانے یا جیل خانے کی بات مت کرو۔ ہم پے انگ گیسٹ رہنا چاہتے ہیں۔"

"تو رہو میری سرکار۔ گورے کے رہو گے یا کالے کے؟ اکیلے ہوتے آپ تو پوچھتا کہ گوری کے ساتھ رہو گے یا کالی کے؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں کون بہتر رہے گا۔"

وہ بولا "دیکھو جی۔ ایسے تو آپ کو اپنے پاکستانی گھر بھی مل جائیں گے لیکن نہ وہ شرافت سے رہتے ہیں نہ رہنے دیتے ہیں۔ پہلے آپ کو آدھے پیسوں میں جگہ دے دیں گے۔ بعد میں بڑھاتے جائیں گے ورنہ دھمکی دیں گے پولیس کو بلانے کی۔"

میں نے کہا "او یار' ہم غیر قانونی امیگرینٹ نہیں ہیں۔"

وہ سہلانے لگا "اچھا اچھا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کو میں لے جاتا ہوں مسز تھمپسن کے پاس۔ وہ ادھر لاہور میں تھی' پچاس سال رہی۔ اس کا شوہر پاکستان بننے سے پہلے مشن اسپتال میں تھا۔ پاکستان بن گیا تب بھی ادھر ہی رہا۔ آنکھوں کا ڈاکٹر تھا۔ ٹیکسلا کے مشن اسپتال میں رہا پھر اپنی آنکھیں جواب دے گئیں تو لاہور کے کسی چرچ میں آگیا۔ پڑھاتا رہا اسکول میں۔ تین سال ہوئے مرگیا پھر یہ لندن آگئی۔ ان کے بچے سب ادھر ہی تھے مگر یہاں کون پروا کرتا ہے جی ماں باپ کی۔ وہ سخت خفا تھے ماں باپ سے کہ انہیں لندن میں رکھا اور خود ہزاروں میل دور انڈیا میں وقت ضائع کرتے رہے۔ لوجی' یہ ہے فرق۔ وہ خدمتِ خلق کررہے تھے اور سختی جھیل رہے تھے ایک مقصد کے لیے۔ بچے کہتے ہیں وقت ضائع کررہے تھے۔ اب وہ ملنے بھی نہیں آتے۔ وہ پاکستانی نوجوان طالب علموں کو رکھتی ہے۔ اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ سب ایک فیملی کی طرح خرچا اٹھاتے ہیں گھر کا۔"

بلونت سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں مسز تھمپسن کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ وہ پچھتر سال کی بوڑھی عورت تھی مگر بالکل سیدھا چلتی تھی اور اس کی آواز میں بھی بڑی کھنک تھی۔ وہ چشمہ بھی نہیں لگاتی تھی اور بہت صاف لہجے میں اردو بولتی تھی۔ اس کو پاکستان میں رہ کے شلوار قمیص پہننے کی عادت ہوگئی تھی۔

"کون ہو تم؟ بھاگ کے آئے ہو یہاں؟" وہ بولی۔

میں نے اپنا پاسپورٹ پیش کیا "اس پر اسلام آباد سے ویزا لگوایا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں شکی مزاج نہیں ہوں ورنہ کہتی کہ نکاح نامہ بھی دکھاؤ۔ تم تو دیکھنے سے ہی میاں بیوی لگتے ہو۔ ابھی شادی ہوئی ہے۔ ہنی مون منانے نکلے ہو۔ پیسے کم ہیں اس لیے ہوٹل افورڈ نہیں کرسکتے۔ خیر کوئی بات نہیں' دل جوان ہو اور جذبات مچل رہے ہوں تو پیسہ اہمیت نہیں رکھتا

لیکن میں بڑی مشکل میں پڑگئی ہوں۔ جگہ نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے سر پکڑ کے کہا "پھر اتنی لمبی تقریر کی کیا ضرورت تھی؟"

"خوامخواہ اتنی دور آئے بلونت کے کہنے پر" چندا نے بھی خفگی سے کہا۔

"ٹھہرو" مسز تھمپسن نے اسے ڈانٹا "ایک کی جگہ ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "پھر تم خود رہو وہاں۔"

"ایک تو تم نوجوان بولتے بہت ہو۔ جلد بازی اتنی ہے فطرت میں کہ پوری بات بھی نہیں سن سکتے۔ یہ میں نے کب کہا ہے کہ دفع ہو جاؤ؟"

"پھر کیا کہا ہے۔ ایک دن میں رہے ایک رات کو؟ ہم شفٹوں میں کام کرنے والے نہیں ہیں۔"

"کم آن۔ اندر آجاؤ۔ تم لوگ بہت پریشان لگتے ہو مجھے۔ کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ رہنے کی جگہ چاہیے نا' وہ میں دے رہی ہوں۔ ایک کمرے میں ایک لڑکی ہے۔ ظاہر ہے اس میں تین نہیں رہ سکتے۔ ایک شادی شدہ جوڑا اور ایک اکیلی لڑکی۔"

میں نے کہا "وہ بالکل رہ سکتی ہے اگر چاہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ایک نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ ایک اکیلی کنواری لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟ میں اس کو شفٹ کردیتی ہوں ایک انڈین لڑکی کے ساتھ۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ دونوں بہت لڑیں گی۔ پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ ایک انڈین اور پاکستانی نوجوان ساتھ تھے۔ دن رات ان کی مار پیٹ ہوجاتی تھی کسی بات پر۔ کرکٹ میچ کے دوران میں خاص طور پر۔"

میں نے کہا "آپ بات سنیں گی میری؟"

"نہیں' تم فکر مت کرو۔ انڈین لڑکی کے ساتھ آج کل ایک سکھ لڑکی ہے۔ تو وہ بھی لڑتی ہیں۔ یہ پاکستانی لڑکی البتہ نئی ہے۔ شاید ابھی نہ لڑے۔ تم دونوں کو پرائیویسی ملنی چاہیے۔ ابھی شادی ہوئی ہے تمہاری۔"

میں نے چلاّ کے کہا "ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

مسز تھمپسن کے منہ میں جیسے اسٹاپر لگ گیا۔

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی "او مائی لارڈ۔ تو تم اسے پاکستان سے بھگا کے یہاں لے آئے ہو؟"

میں نے کہا "مسز تھمپسن۔ ہم الگ الگ آئے ہیں۔ اس کا اپنا پاسپورٹ ہے' میرا اپنا۔ دونوں دیکھ لو۔ ہم بس دو چار دن رہیں گے۔"

"اچھا! پھر تو گزارا ہوجائے گا۔ ابھی تم اپنی ہم وطن لڑکی کے ساتھ رہو۔ میں ایک اضافی بیڈ لگوا دیتی ہوں۔"

بلونت سنگھ نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "سرجی۔ ادھر کوئی سکھ لڑکی ہے؟ بڈھی سے پوچھو کیسی ہے۔ شادی ہوئی ہے یا نہیں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ میں کیوں پوچھوں؟"

وہ ایک آہ بھر کے بولا "اوجی' اب خود مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میرے باپ نے پھر منگنی توڑدی ہے میری' وہ نہیں ہونے دے گا میری شادی۔"

"آخر کیوں بلونت؟"

"بس جی۔ وہ کہتا ہے شادی کے بعد بیٹا پرانا دھن ہوجاتا ہے" بلونت رونی شکل بنا کے بولا "وہ خود بھی ہوگیا تھا نا۔"

مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب مسز تھمپسن مجھے اور چندا کو اس پاکستانی لڑکی کے کمرے میں لے گئی "یہ فردوس ہے۔ یہاں ڈانس سیکھنے آئی ہے۔"

وہ لڑکی بے حد خوف زدہ نظر آنے لگی "یہ۔۔۔ یہ کون ہیں؟"

چندا نے کہا "دیکھو۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم بھی پاکستان سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "تم اکیلی آئی ہو نا؟"

چندا نے پوچھا "اور یہاں تم کس سے ڈانس سیکھو گی؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے پتا نہیں جی۔ میرا ماما ہے یہاں۔ وہی لایا ہے مجھے۔ اس کو سب معلوم ہے۔"

"یہ تمہارے ساتھ رہیں گے" مسز تھمپسن نے کہا۔

لڑکی مزید گھبرا گئی "میرے ساتھ کیوں جی؟"

میں نے کہا "صرف دو چار دن کی بات ہے۔"

مسز تھمپسن مسکرائی "ڈرو نہیں۔ یہ الگ الگ سوئیں گے۔ ان کا رشتہ میاں بیوی کا نہیں ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"یہ بات نہیں جی۔ ماما خفا ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی سے بات مت کرنا جنت!"

میں نے کہا "جنت! تمہارا نام تو فردوس ہے؟"

وہ نروس ہوگئی "وہ۔۔۔ ایک ہی مطلب ہے نا۔ فردوس اور جنت۔ ماما جنت کہتا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مگر میں نے اس سے جرح نہیں کی۔ مسز تھمپسن نے ہم پر گیسٹ ہاؤس

میں رہائش کے ضوابط واضح کیے۔ "اپنے کمرے کی صفائی اور دیکھ بھال خود رہنے والے کرتے ہیں۔ کوئی گندا رہنا چاہے تو اس کی مرضی لیکن باہر کی صفائی میں کرتی ہوں اس لیے گندگی پھیلانے کا جرمانہ ہوگا۔ ایک دن باہر کی صفائی کرنا پڑے گی۔ گیسٹ ہاؤس میں کھانے کا کوئی انتظام نہیں۔ ناشتا مل سکتا ہے لیکن صرف ٹوسٹ' انڈے' مکھن اور چائے۔ میں بوڑھی عورت ہوں زیادہ کام نہیں کرسکتی۔ یہاں رہنے والے میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ مطمئن رہیں۔ ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے اور ہر قسم کی مدد کریں گے۔ ہم جس معاشرے سے آئے ہیں وہاں بزرگوں کی خدمت ایک سعادت سمجھی جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے میں انڈین اور پاکستانی بچوں کے ساتھ خوش رہتی ہوں۔ میرے اپنے بچے تو کبھی آتے نہیں" وہ اداس ہوگئی۔

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک شخص اندر آگیا جسے دیکھ کے میں اچھل پڑا۔ وہ قادر بخش تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ ایسے بدکا جیسے قسائی کو دیکھ کے گائے بدکتی ہے پھر اس کی نظر چندا پر گئی جو فردوس سے پوچھ رہی تھی کہ آخر ڈانس سیکھنے کی اسے کیا ضرورت تھی اور تھی تو اس نے پاکستان چھوڑ کے لندن کا رخ کیوں کیا؟ فردوس ایک سیدھی سادی غریب گھرانے کی یا کسی گاؤں کی لڑکی نظر آتی تھی چنانچہ اس کا ڈانس سیکھنے کے لیے لندن آنا سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

قادر بخش کو دیکھ کے فردوس نے اطمینان کا سانس لیا "لوجی وہ ماما آگیا۔ اب آپ کو جو معلوم کرنا ہے اس سے پوچھ لو۔"

میں نے کہا "یہ۔۔ یہ تمہارا ماما ہے' شہاب الدین؟"

وہ چونکا اور گھبرا کے بولا "شہاب الدین۔۔ کون شہاب الدین؟ میرا نام تو قادر بخش ہے۔"

میں نے کہا "واہ بیٹے۔ یہ خوب چکر چلایا ہے تم نے۔ جب جی چاہا قادر بخش بن گئے جب ضرورت پڑی شہاب الدین ہوگئے۔"

مسز تھمپسن نے کہا "مسٹر شاہ عالم۔ میں جانتی ہوں اسے۔ یہ قادر بخش ہے۔"

"آپ ٹھہریں مسز تھمپسن۔ مجھے بات کرنے دیں اس سے۔ کل ایک اور شخص نے گواہی دی تھی کہ یہ شہاب الدین عرف شابو ہے۔"

"جھوٹ۔۔ جھوٹ۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں قادر بخش ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کون ہو تم؟" وہ پریشان ہوگیا۔

میں نے کہا "اب تو مجھے معلوم کرنا ہی پڑے گا کہ آخر تم کون ہو۔ قادر بخش' شہاب الدین یا اس کے علاوہ بھی کچھ اور؟"

فردوس چلانے لگی "یہ ماما ہے میرا۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس کا نام قادر بخش ہی ہے۔"

ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اندھیرے میں ایک تیر چلایا "مسز تھمپسن' یہ لڑکی فردوس دو دن پہلے آئی ہے یہاں؟"

"ہاں۔ قادر بخش کی فیملی کے لوگ ہمیشہ میرے پاس ٹھہرتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے" وہ بولی۔

میں نے کہا "آئی سی۔ اس سے پہلے قادر بخش کسے لایا تھا؟"

"تین چار مہینے پہلے۔۔ کون تھا' ہاں' اس کی بھابی آئی تھی اور اس سے پہلے یہ اپنی سوتیلی ماں کو لایا تھا۔ دراصل میں اردو سمجھ لیتی ہوں اس لیے پاکستان سے آنے والی ان پڑھ عورتوں کو پرابلم نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "قادر بخش۔ کیا کرتے ہو تم؟ پاکستان میں تمہارا گھر کہاں ہے؟ مجھے اپنا پتا بتاؤ۔"

وہ گرم ہوگیا "کیوں۔ تو تھانے دار لگا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "قادر بخش۔ مجھے شک ہے کہ تم پاکستان سے عورتوں کو لاتے ہو اور انہیں یہاں بیچ دیتے ہو یا ان سے غلط کام کراتے ہو؟"

"چپ کر۔۔" اس نے آگ بگولا ہو کے بے اختیار مجھے ایک گالی بک دی "میں ساری اکڑفوں نکال دوں گا تیری۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "گالی؟ معافی مانگ نہیں تو میں۔۔"

چندا چلائی "شاہ عالم۔ یہ کیا کررہے ہو؟"

مسز تھمپسن بھی چیخنے لگی "چھوڑ دو اسے ورنہ یہ مرجائے گا۔"

قادر بخش مچلا' تڑپا اور اس نے ہاتھ پیر چلائے مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں اور اس کے حلق سے خرخر کی آوازیں آنے لگیں۔ فردوس نے چیخ چیخ کے رونا شروع کردیا اور مسز تھمپسن الگ چلانے لگی "مرڈر۔ مرڈر۔۔ کوئی پولیس کو بلاؤ۔"

چندا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور قادر بخش ایک جھٹکے سے آزاد ہو کے پیچھے گر گیا۔ "شاہ عالم' کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" چندا نے غصے سے کہا۔

میں نے کہا "چاندنی۔ اس حرام زادے نے' اس بردہ فروش نے مجھے وہ گالی دی جو کوئی غیرت مند برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا سمجھتا ہے یہ خود کو۔"

"خدا کے لیے اسے سمجھاؤ" مسز تھمپسن گھبراہٹ میں سینے پر ہاتھ رکھ کے بولی "ورنہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

میں نے کہا "مسز تھمپسن۔ یہ شخص تین دن پہلے پاکستان سے آنے والی فلائٹ پر میرے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ دونوں اس کی بیویاں ہیں لیکن فلائٹ کے ایک مسافر نے انہیں باتیں کرتے سن لیا تھا۔ وہ ماں بیٹی تھیں۔ اس مسافر نے ہنگامہ کردیا پھر ائرہوسٹس نے انہیں واش روم میں لے جاکے تصدیق کی اور غالباً معاملہ رفع دفع کرادیا۔ ورنہ عورتیں برقعے میں تھیں اس لیے میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی مگر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ایک یہ لڑکی تھی۔ جسے آپ کے سامنے یہ اپنی بھانجی بتا رہا ہے۔ جہاز میں یہ اس کا شوہر بنا ہوا تھا۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے' بکواس کررہا ہے" قادر بخش چلا کے بولا۔

مسز تھمپسن پریشان ہوگئی "او گاڈ۔ میں کس پر یقین کروں؟"

میں نے کہا "یہ مجھے کل بھی نظر آیا تھا لیکن وہاں اس نے مجھے جھٹلا دیا اور کہا کہ یہ تو دو سال سے پاکستان نہیں گیا۔ اس کا نام شہاب الدین ہے۔"

"مگر یہ واقعی تین دن پہلے پاکستان سے آیا ہے اور یہ لڑکی اس کے ساتھ آئی ہے" مسز تھمپسن نے کہا "اس کا نام فردوس ہے۔"

میں نے کہا "اس سے پوچھو کہ فردوس کی ماں کہاں ہے؟"

"میں کچھ نہیں پوچھتی۔ میں کسی قانونی چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میری ساری عمر کی نیک نامی خاک میں مل جائے گی اگر پولیس یہاں آگئی۔ بہتر ہے کہ تم جاؤ قادر بخش' میں گیسٹ ہاؤس چلا رہی ہوں' کوئی قحبہ خانہ نہیں۔"

"ہاں ہاں' ہم بھی نہیں رہیں گے یہاں۔ لندن میں رہنے کی جگہ کم ہے کیا' جہاں ایسے لوگ آتے ہوں وہاں کون آئے گا؟ چل فردوس!" قادر بخش نے کہا۔

فردوس نے فرمانبرداری سے سرہلایا اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ قادر بخش ایک کرسی پر بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا۔ انسان کے اعمال اگر اس کی صورت اور شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں تو یہ بات قادر بخش کو دیکھ کے سچ نظر آتی تھی۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ جسمانی طور پر تندرست اور توانا تھا اور اس نے معزز نظر آنے کے لیے کوٹ پتلون کے ساتھ ٹائی بھی باندھ لی تھی مگر اس کے انداز واطوار میں شائستگی اور نفاست کی جگہ جہالت کا اکھڑپن تھا۔ اس کا سوٹ کسی اور کا نظر آتا تھا۔ اس کی کوٹ اور پتلون الگ الگ تھے چنانچہ رنگ کا فرق بھی بہت نمایاں تھا۔ ٹائی سے بدذوقی کی انتہا کا پتا چلتا تھا۔ مجموعی طور پر اس بے ہنگم مسلے ہوئے اور میلے لباس سے اس کی جہالت اور بداطواری ظاہر ہوتی تھی پھر اس کا انداز گفتگو اور اس کی شکل پر برسنے والی خباثت اس کے اعمال کے سارے پول کھول دیتے تھے۔

مسز تھمپسن نے کہا "دیکھو۔ مجھے بہت کام ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے جاتے ہی تم پھر لڑنے لگو گے اس لیے تم میں سے ایک میرے ساتھ آجائے۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہوگی مسز تھمپسن!"

اس نے کہا "قادر بخش' تم میرے ساتھ آؤ۔"

قادر بخش نے کچھ تامل کیا "میں پیکنگ کرنے میں فردوس کی کچھ مدد کردوں۔"

وہ بولی "وہ کرلے گی پیکنگ۔ اسے کون سی گرہستی سمیٹنی ہے۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے مسز تھمپسن؟"

وہ سخت لہجے میں بولی "دیکھو۔ اگر تم نے مجھے مطمئن نہ کیا تو پھر میں مجبوراً پولیس سے مدد لوں گی اور وہ مطمئن ہوئے بغیر تمہیں چھوڑنے والے نہیں ہیں۔"

"آپ خوا مخواہ اس جھوٹے شخص کی باتوں میں آکے پریشان ہوگئی ہیں۔ میں تو آپ کا پرانا کسٹمر ہوں۔"

"یہی بات تو مجھے پریشان کررہی ہے۔ میں تو بھروسا کرتی تھی۔ میرے ریکارڈ میں جو کچھ ہے وہ پولیس تمہارے خلاف بھی استعمال کرسکتی ہے۔ یہ تیسری عورت ہے جس کے بارے میں تم نے کہا کہ تمہاری رشتے دار ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس سے پوچھو کہ آخر اس کے خاندان کی صرف عورتیں ہی برطانیہ کیوں آرہی ہیں؟"

وہ غصے سے بولا "تم اپنی زبان بند رکھو۔"

مسز تھمپسن نے سرہلایا "بالکل ٹھیک سوال کیا اس

نے۔ خود میں بھی یہی پوچھنے والی تھی؟"

"مسز سمپسن! مرد پہلے سے یہاں موجود ہیں" قادر بخش بولا۔

میں نے پھر لقمہ دیا "یعنی بھابی آئی تھی تو تمہارا بھائی یہاں تھا پھر وہ خود اسے کیوں نہیں لایا۔ چلو یہ بھی چھوڑو' وہ جو تمہاری سوتیلی ماں تھی' وہ کیوں آئی تھی؟ کیا تمہارا باپ بھی ہے برطانیہ میں؟ اور وہ اس کی دوسری بیوی تھی' تیسری یا چوتھی؟"

قادر بخش نے محسوس کیا کہ میرے سوالوں کی وجہ سے وہ بری طرح پھنس گیا ہے "میرا باپ تو مرچکا ہے اور ماں بھی۔ اسی لیے میں نے سوتیلی ماں کو برطانیہ بلالیا۔ وہ اکیلی تھی وہاں۔"

اب چندا نے ایک سوال داغ دیا "اگر تمہاری فیملی کے اتنے لوگ پہلے سے موجود ہیں یہاں ماماجی' تو تم نے فردوس کو یہاں کیوں رکھا؟ ان کے پاس کیوں نہیں لے گئے؟"

قادر بخش نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہماری وجہ سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ہے فوراً ایک مصالحانہ اور خوشامدانہ انداز اختیار کرلیا "دیکھو بہن جی! بندے کی بہت سی مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جو وہ اپنوں کو بتا سکتا ہے غیروں سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ تو خیر سے اپنے پاکستانی ہو۔"

میں نے کہا "نہیں قادر بخش۔ میں تم جیسوں کو پاکستانی نہیں مانتا۔ تم تو پاکستان کے دشمن ہو۔ یہاں ہر پاکستانی اپنے ملک کے سفیر کا درجہ رکھتا ہے۔ ملک کا وقار بلند کرنے آتا ہے نہ کہ اسے بدنام کرنے۔"

مسز سمپسن نے سختی سے کہا "مجھے اب یقین آنے لگا ہے کہ آج نہیں تو کل مجھ پر تمہاری وجہ سے بدنامی کا داغ آسکتا ہے۔ میں کسی قانونی مشکل میں پڑ سکتی ہوں۔ بہتر ہے کہ میں اپنی قانونی ذمے داریاں پوری کروں' پولیس کو فون کرکے۔"

قادر بخش کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ مسز سمپسن کے پیچھے لپکا "مسز سمپسن! پلیز' میری بات سنیں۔"

کمرے میں فردوس کے ساتھ میں اور چندا رہ گئے۔ فردوس کا رنگ خوف سے پیلا پڑگیا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ چندا نے اسے تسلی دی۔ پانی پلایا اور بیڈ پر بٹھادیا "دیکھو' ہمیں سچ سچ بتادو کہ یہ قادر بخش کون ہے؟"

وہ رونے لگی "وہ میرا ماما نہیں ہے جی!"

میں نے کہا "یہ تو معلوم ہے ہمیں۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟"

"اس نے میرے۔۔۔ بھائی کو۔۔۔ پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ یہ کہا تھا کہ وہ دبئی چلا جائے۔ کرایہ تو اس نے کرلیا تھا مگر ایجنٹ کو دینے کے لیے اس کے پاس پچاس ہزار نہیں تھے۔ اس نے میرے بھائی کو یقین دلایا تھا کہ دبئی سے وہ اس کو لندن بلالے گا کیونکہ پاکستان سے لندن کا ویزا آسانی سے نہیں لگتا۔ اس کے جانے کے بعد یہ میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ بھائی لندن پہنچ گیا ہے اور اس نے مجھے بھی وہاں بلایا ہے۔ میری ماں نے مجھے اس کے ساتھ اکیلا بھیجنے سے انکار کردیا۔ یہ دو مہینے بعد پھر آیا اور اس نے بتایا کہ میری ماں کے لیے بھی لندن میں نوکری کا انتظام ہوگیا ہے۔ وہ کسی گھر میں کام کرے گی۔ میرے لیے اس نے کہا کہ مجھے اسٹیج پر کام مل جائے گا لیکن اس کے لیے مجھے ڈانس سیکھنا پڑے گا۔"

"کیا تمہیں اسٹیج پر یا فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا؟" چندا نے پوچھا۔

فردوس نے نظریں جھکالیں اور فرش کریدنے لگی۔ اس کی یہ خاموشی اعتراف جرم کے برابر تھی "ٹی وی پر فلمیں دیکھ دیکھ کے ہوگیا تھا جی!"

"انڈین فلمیں؟"

فردوس نے اقرار میں سرہلایا "میں کیسٹ لگا کے مادھوری کے ڈانس کی نقل بھی کرتی تھی۔ قادر نے مجھے لالچ میں ڈال دیا کہ یہاں کیا ملتا ہے خواری کے سوا۔ لندن میں اسٹیج پر ڈانس کرنے والیاں بہت کماتی ہیں' ہزاروں پاؤنڈ ملتے ہیں۔ پاکستانی حساب سے لاکھوں۔ میں اس کی باتوں میں آگئی۔"

چندا نے غصے سے کہا "اسے پولیس پکڑلے گی تو تم کیا کروگی؟ کہاں جاؤگی؟"

وہ زور زور سے رونے لگی "میں تو کسی کو بھی نہیں جانتی یہاں۔ میرے بھائی کا بھی کچھ پتا نہیں۔ آپ قادر بخش کو پولیس کے حوالے مت کریں۔"

میں نے کہا "عجیب بے وقوف لڑکی ہو تم۔ اب بھی اسی کا سہارا لینا چاہتی ہو جس کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو کہ اس نے تمہیں دھوکا دیا اور اسے پولیس کے حوالے کرنے والے ہم نہیں ہیں۔ یہ کام اب مسز سمپسن کرے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ بھی شریکِ جرم سمجھی جائے گی اور اس پر الزام آجائے گا کہ وہ بھی قادر بخش کے ساتھ پاکستانی عورتوں کی خرید و فروخت کے کام میں ملوث ہے۔ اس کا ذریعۂ معاش بھی گیسٹ ہاؤس ہے۔ یہ BROTHEL

مشہور ہوجائے گا۔"

چندا نے کہا "تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ قادر بخش نے اسے ائرپورٹ کے باہر ہی کسی کے حوالے کردیا تھا۔" فردوس نے کہا۔

"یا میرے خدا۔ کون تھے وہ لوگ؟ وہ پوچھے بغیر ان کے ساتھ چلی گئی اور تمہیں ان کا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ اتنا بھروسا تھا تمہیں قادر بخش پر؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"وہ۔۔۔ کوئی پاکستانی ہی تھا' داڑھی والا۔۔۔ حاجی!"

"حاجی۔!" میں نے چونک کے کہا "میں سمجھ گیا۔ اس حرام زادے نے ہی کہا تھا کہ اس کا نام شاب الدین ہے۔ شابو کہتے ہیں سب۔"

"آپ۔۔۔ آپ جانتے ہو جی اسے؟"

میں نے کہا "جانتا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ تم ایک کام کرنا' یہاں سے مت جانا۔ اگر قادر بخش زبردستی کرے تو مسز سمپسن سے مدد لینا۔ وہ پولیس کو بلا لے گی [illegible] ت۔ تم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ پولیس تم کو پکڑے۔ تم پولیس کو سب سچ سچ بتادینا۔"

وہ روتی رہی "نہیں جی۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا حشر برا ہوگا۔ تم کو لندن میں بیچ دیا جائے گا اور تم کو ایسے کام کرنے پڑیں گے جن کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا" میں نے کہا۔

بلونت سنگھ نے کمرے میں منہ ڈال کے کہا "میری سرکار۔ سامان میں نے رکھ دیا ہے اندر۔ کیا اب میں جاؤں؟"

میں نے کہا "سوری بلونت۔ میں بالکل بھول گیا' کتنا کرایہ بنا؟"

اس نے مجھے آنکھ مار کے اشارے سے باہر بلایا "کرایہ میں لے لوں گا بعد میں لیکن آپ اپنی فکر کرو۔ یہ آپ نے کیا پنگا لے لیا خوامخواہ۔"

"خوامخواہ نہیں بلونت۔ وہ پاکستانی لڑکی دھوکے کا شکار ہوئی ہے اور یہ قادر بخش سور کا بچہ بردہ فروش ہے' بدمعاش ہے۔"

"اوجی' اس سے بڑے بدمعاش تو باہر موجود ہیں۔ میں یہی بتانے آیا تھا" بلونت سنگھ نے کہا "ان کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔"

مسز سمپسن اور قادر بخش کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا اور نوبت اب یہاں تک آگئی تھی کہ مسز سمپسن پولیس کو بلانا چاہتی تھی اور قادر بخش اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اس نے ایسا کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔

میں نے باہر آکے دیکھا تو چار سرمنڈے گورے لڑکے جو وہاں SKIN HEADS کہلاتے ہیں' ایک گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ انہوں نے جینز پر رنگین بنیانیں پہن رکھی تھیں جو ان کے جسموں سے چپکی ہوئی تھیں اور ان کے جبڑے چیونگم چباتے ہوئے جگالی کے انداز میں چل رہے تھے۔ یہ بدمعاشی کے اظہار کا مخصوص انداز تھا اور ان لوگوں سے چھیڑخانی کا مطلب تھا آبیل مجھے مار۔

اچانک اندر مسز سمپسن نے چیخنا چلانا شروع کردیا "یو ڈرٹی راسکل۔ تم ایک بوڑھی عورت کو مارو گے؟"

قادر بخش نے چیخ کے باہر والوں کو آواز دی "ٹامی' سام' اندر آجاؤ۔ معاملہ خراب ہوگیا ہے۔"

دو گنجے سگریٹ پھینک کے سیدھے کھڑے ہوگئے "معاملہ کیا خراب ہوسکتا ہے۔ کیوں شور کررہا ہے قادر؟"

دوسرا بولا "ہم اندر جاکے دیکھتے ہیں' وہ بلارہا ہے ہمیں۔"

میں نے اندازہ کرلیا کہ اب کیا ہوگا "بلونت۔ تم سامان واپس ٹیکسی میں رکھو اور اس پتے پر لے جاؤ۔" میں نے اسے جیب سے اس کمپنی کا کارڈ نکال کے دیا جس کے ساتھ ہم نے اگریمنٹ فائنل کیا تھا۔"

"ان کو کیا بولوں جناب؟"

میں نے کہا "ان سے کہنا کہ مس چاندنی خان کا سامان ہے۔ وہ بعد میں آئیں گی' تم نکل جاؤ فوراً۔"

اس وقت تک گنجے آپس میں مشورہ کرکے اندر جانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ ان میں سے دو کو میں نے دروازے پر روک لیا "یس؟ کیا چاہیے؟"

"دروازہ چھوڑدو تو کچھ نہیں۔" ایک نے غرا کے کہا "ورنہ اسی سوال کا جواب تمہیں عمر بھر یاد رہے گا۔"

دوسرا بولا "ہم تمہاری ماں کے گھر میں تو نہیں گھس رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ایک نے سر جھکا کے مجھے ٹکر ماری اور میں پیچھے جاگرا۔ وہ دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ قادر بخش آفس میں شور کررہا تھا اور فردوس کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کے تار توڑدیے تھے تاکہ مسز سمپسن پولیس کو نہ بلاسکے۔ دونوں گنجے بھی اس کے ساتھ آفس میں گھس

گئے تو مجھے ان کی خبر لینے جانا پڑا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ میرا ریکارڈ ہے" مسز تھمپسن چلانے لگی۔

"چپ کر ریکارڈ کی بچی!" قادر بخش دھاڑا "میں نے کہا تھا تجھ سے کہ پولیس کو مت بلا۔"

میں نے کہا "پولیس سے پہلے میں آگیا ہوں۔ یہ رجسٹر وہیں رکھ دو۔"

ایک گنجے نے پلٹ کر مجھے پھر ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں سیدھا گیا اور ایک دھماکے سے دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ دوسرے گنجے نے خطرناک انداز میں ایک ٹیبل لیمپ اٹھالیا جو پیتل کا بنا ہوا تھا۔ اس نے لیمپ کا تار کھینچ کے الگ کیا اور لیمپ مجھ کھینچ مارا۔ میں نے اپنا سر بچالیا مگر میرے شانے پر ضرب لگی۔

قادر بخش نے پیچھے سے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈال کے مجھے جکڑلیا اور میری کمر پر سر سے ٹکریں مارنے لگا۔ دونوں گنجے اب ایک ساتھ مجھے دبوچنا چاہتے تھے۔ آفس بہت بڑا نہیں تھا اور باہر جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا چنانچہ مسز تھمپسن ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ میں نے قادر بخش کو دونوں طرف سے کہنی ماری جو اس کی پسلیوں میں لگی۔ اس نے بلبلا کے مجھے چھوڑدیا۔ میں ایک جست لگا کے میز پر چڑھ گیا۔ میری ایک کک نے ایک کو اور دوسری نے دوسرے حملہ آور گورے کو گھما کے پیچھے گرادیا۔

وہ سور جیسی تھوتھنی ہلاتے گالیاں بکتے پھر پلٹے۔ ایک نے کونے میں رکھا ہوا فرش صاف کرنے والا برش اٹھالیا اور اس کا لمبا ڈنڈا گھمانے لگا۔ ڈنڈا میری ٹانگ پر لگا۔ میں نے جھک کر ڈنڈا پکڑلیا اور پیچھے جھٹکا دیا تو ڈنڈا اس کے پیٹ میں گھس گیا اور وہ جھکا تو میری ایک اور کک اس کے سر پر لگی۔ دوسرے نے اتنی دیر میں زور لگا کے میز الٹ دی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اس کے اوپر کود گیا۔ وہ فرش پر منہ کے بل گرا۔ میں اس کے اوپر سوار تھا کہ قادر بخش مجھ پر سوار ہوگیا۔ میں نے پھر اس کے سینے پر ہاتھوں کی کہنی ماری لیکن وہ ہٹا نہیں۔ پہلے گنجے نے برش کے ڈنڈے سے مجھ پر لاٹھی چارج شروع کردیا تھا۔ وہ میری ٹانگوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ میں قادر بخش سمیت اٹھا تو ڈنڈا قادر بخش کی کمر پر پڑا۔ وہ مجھ سے جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور الٹے پاؤں دوڑ کے دیوار سے ٹکرا گیا۔ قادر بخش میرے اور دیوار کے درمیان سینڈوچ ہوگیا اور ہائے ہائے کرتا فرش پر گر گیا۔

اب میں آزاد تھا اور زخمی گنجے بھی ایک ساتھ مجھے دبوچنے کے لیے آگے آرہے تھے۔ قادر بخش ایک کونے میں لوٹ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی کوئی پسلی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ گنجوں سے کہہ رہا تھا کہ اب دیر نہ کریں۔ مجھے چوہے کی طرح دبوچ کے مسل دیں۔ میں خود یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ خیریت گزری کہ دن کا وقت تھا اور گیسٹ ہاؤس میں بڑی بی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ باقی رہنے والے اپنے اپنے کام سے نکلے ہوئے تھے۔

پوری تیاری کے ساتھ میں نے ایک گنجے کو ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ تھوڑا سا جھکا تو نیچے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنا مار کے اسے اوپر اٹھالیا۔ ایک چکر دیا اور دوسرے گنجے کے اوپر سے گزار کے دیوار پر دے مارا۔ دوسرا گنجا دو قدم پیچھے تھا۔ اپنے ساتھی کا یہ حال دیکھ کے اس نے رجسٹر اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے ایک ٹانگ بڑھا کے اسے منہ کے بل گرادیا پھر میں نے پے در پے اس کو ٹھوکریں ماریں۔ وہ ہر ٹھوکر پر چیختا تھا اور لڑھک کر آگے ہوجاتا تھا۔ اس کا ساتھی دیوار سے ٹکرا کے جہاں گرا تھا وہیں بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے تک دوسرا گنجا بھی مقابلے سے دستبردار ہوگیا۔

قادر بخش ایک کونے میں سمٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ مخالف سمت کے کونے میں مسز تھمپسن منہ کھولے بے سدھ نیم دراز تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اس کی چیخ پکار ارد گرد کے لوگوں کو متوجہ کرلیتی۔

میں نے قادر بخش کو بالوں سے پکڑ کے کھڑا کیا تو وہ کراہنے اور بلبلانے لگا۔ "او یار، مجھے معافی دے دے۔ تجھے اللہ رسول کا واسطہ۔"

میں نے اس کے سر کو کھڑکی کی چوکھٹ پر مارا "بڑی جلدی خدا رسول کا نام یاد آگیا۔ اب بتا کون ہے تو، قادر بخش یا شہاب الدین؟"

لیکن وہ جواب دینے کے قابل ہی کہاں تھا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ مجھے شک تھا کہ وہ مکر کر رہا ہے اور مزید مار سے بچنے کے لیے بے ہوشی کی آڑ لے رہا ہے مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔

پہلے اندر آنے والے گنجے بدمعاش مطمئن تھے کہ مجھ سے نمٹنے کے لیے ان کے ساتھی بہت کافی ثابت ہوں گے۔ قادر بخش نے ان سے کہا تھا کہ تم لڑکی کو باہر لے جاؤ اور انہوں نے کہا تھا کہ ہم باہر انتظار کریں گے۔ زیادہ دیر مت لگانا لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں

نے اندر کچھ شور ضرور سنا تھا۔ فردوس نے ایک بار چیخ مار کے کہا تھا "خبردار، جو مجھے ہاتھ لگایا" پھر میں نے گالیاں بکنے کی آوازیں سنی تھیں اور سمجھ گیا تھا کہ دوسرے محاذ پر چندا نے دونوں بدمعاشوں کو ان کی زندگی کا سب سے عبرت ناک سبق پڑھانا شروع کردیا ہے۔ چندا کی مجھے بالکل فکر نہیں تھی۔ وہ ہر طرح سے بہترین استاد تھی۔

جب میں فارغ ہوکے باہر آیا تو چندا میری منتظر تھی۔ "کیا کر رہے ہو اتنی دیر سے؟" اس نے کچھ شکایت کے انداز میں پوچھا۔

مجھے سخت طیش آیا "لوڈو کھیل رہا تھا اندر مسز تھمپسن کے ساتھ۔"

وہ مسکرائی "میرا مطلب ہے اتنی دیر لگادی تم نے اور شور اتنا ہو رہا تھا اندر جیسے میدانِ جنگ میں فوجیں لڑ رہی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔"

"سوری، تم مقابلہ کرنا بھول گئے ہو۔ آؤٹ آف پریکٹس ہو اس لیے۔ موقع نہیں دیا میں نے ان دونوں کو آواز نکالنے کا۔ دو منٹ میں لٹادیا۔"

میں نے کچھ خفت سے کہا "تمہاری کیا بات ہے۔ مسکرا کے ایک نظر دیکھا ہوگا انہیں اور انہیں دن میں تارے نظر آگئے ہوں گے مگر یہ بتاؤ، اب کیا کریں؟"

وہ بولی "کرنا کیا ہے، موقع اچھا ہے، نکل چلو۔"

میں نے کہا "لیکن مسز تھمپسن! اس کا کیا ہوگا؟"

چندا نے اندر جا کے مسز تھمپسن کا معائنہ کیا اور مطمئن ہوکے سرہلایا "کچھ نہیں ہوگا مسز تھمپسن کو۔ تھوڑی دیر میں خود ہی ہوش آجائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا "پولیس کے آنے سے پہلے ہی فرار ہوجائیں؟"

"کس نے بلایا ہے پولیس کو؟"

"کیا یہ ہمارا فرض نہیں بنتا کہ انہیں پولیس کے حوالے کریں۔"

چندا نے مجھے بازو سے پکڑ کے کھینچا "شاہ جی۔ بڑی مشکل سے پولیس کا ایک چکر ختم ہوا ہے۔ تم دوسرے چکر میں پڑنا چاہتے ہو۔ ان سب کو پڑا رہنے دو۔ اگر مسز تھمپسن کو پہلے ہوش آگیا تو ان سے وہ خود نمٹ لے گی۔"

"لیکن وہ ہمارا نام ضرور بتائے گی۔"

"نام کیسے بتائے گی۔ ابھی تک ہم نے رجسٹر میں کوئی اندراج نہیں کیا ہے۔ اس نے صرف تمہارا پاسپورٹ دیکھا تھا۔ اسے ہمارے نام کہاں یاد ہوں گے۔"

میں نے چندا سے اتفاق نہیں کیا "نہیں چندا۔ ہم نے ابھی تک ایسا کچھ نہیں کیا کہ ہم پولیس سے ڈریں۔ خود مسز تھمپسن پولیس کو بتائے گی کہ اسے ان چار کرائے کے بدمعاشوں سے بچانے والے ہم تھے۔"

چندا نے کہا "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم سوچ لو۔ کل کسی اخبار میں شاہ عالم کی بہادری کے اس کارنامے کا ذکر آجائے گا؟"

"اس سے مجھے فائدہ ہی ہوگا۔ مجھے ثابت کرنا ہے کہ شاہ عالم لندن میں ہے۔ خود پولیس اس کی گواہ ہوگی۔"

چندا خاموش ہوگئی۔ ہم مسز تھمپسن کو اٹھا کے اس کے کمرے میں لے گئے۔ وہ اب ہوش میں آرہی تھی۔ چندا نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی "یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"

میں نے اسے روک دیا "آپ لیٹی رہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی اب۔"

وہ کراہ کے بولا "او مائی گاڈ! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی؟"

میں نے کہا "مسز تھمپسن۔ صورتِ حال اب کنٹرول میں ہے۔"

"اچھا۔ کیا وہ بدمعاش بھاگ گئے؟"

میں نے کہا "میں نے انہیں جانے نہیں دیا۔"

"پھر کیا مار دیا انہیں؟ اف۔۔۔ مجھے ہارٹ اٹیک کیوں نہیں ہوتا آخر۔ میرا گیسٹ ہاؤس، میری زندگی، سب کا بیڑا غرق ہوگیا۔"

چندا نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ "آپ پانی پی لیں اور ایزی ہوجائیں مسز تھمپسن۔"

"کیسے ایزی ہوجاؤں" اس نے گلاس ایک طرف کردیا "مجھے کچھ برانڈی دو۔ ادھر کپ بورڈ میں رکھی ہے۔"

میں نے بڑی بی کی دیکھ بھال چندا کے سپرد کی اور خود باہر آگیا۔ صورتِ حال ابھی جوں کی توں تھی۔ چندا کے نازک ہاتھوں سے ناک آؤٹ ہونے والوں میں سے ایک دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے سو رہا ہو۔ دوسرا ایک پھولوں والے گملے کے اوپر اوندھا پڑا تھا۔ آفس میں ایک گنجا دیوار کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور اس کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے قریب جا کے دیکھا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ دوسرے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور اس

...سے رسنے والا خون فرش پر جم چکا تھا۔
... قادر بخش ہوش میں آنے لگا تھا اور بری طرح کراہ رہا ... میں اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ... سے پکڑ کے ہلایا "ماما جی کیا حال ہے؟"
... وہ کراہا "ہائے۔۔۔ میری۔۔۔ میری پسلیاں۔۔۔ ہائے۔"
... میں نے کہا "اب جو بتاتا ہے پولیس کو بتانا۔"
... اس کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ "شاہ۔۔۔ شاہ جی! ... آپ کے ساتھ تعاون۔۔۔ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ... بتا دوں گا۔ ہائے او رباّ۔"
... میں نے کچھ سوچ کے کہا "یہ کرائے کے غنڈے کیوں ... لے کر آئے تھے تم؟"
... اس نے نفی میں سر ہلایا "میں۔۔۔ میں نہیں لایا تھا۔۔۔ وہ ... پیچھا کرتے ہوئے۔۔۔ آئے تھے۔ پانچ ہزار پاؤنڈ وصول ... کے لیے۔"
... "تم نے قرض لیے تھے؟"
... "نہیں، لیکن قرض ہی سمجھو۔ ایک لڑکی تھی۔۔۔ ان کے ... میں ویٹریس رکھوایا تھا میں نے۔۔۔ وہ۔۔۔ کسی کے ساتھ ... گئی، دو ہزار پاؤنڈ بھی لے گئی۔"
... میں نے اس کے تھپڑ مارا "اور تم نے کہا کہ پانچ ہزار ... نہیں ہیں میرے پاس۔ دوسری لڑکی لے لو؟ تم انہیں ... لے آئے اپنی بھانجی دینے کے لیے، کتنے ذلیل اور بے ... غیرت آدمی ہو تم قادر بخش۔ کیا کوئی شخص اتنا بھی گر سکتا ہے ... تم مجھ سے امید رکھتے ہو رعایت کی؟ میرا دل تو چاہتا ... ہے کہ میں اس سے زیادہ اذیت دے کر ہلاک کروں۔ ... تمہارے ہاتھ پیر، سب توڑ دوں۔ ساری پسلیاں توڑ دوں اور پھر ... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں ... نہیں لینا چاہیے۔"
... میں نے ٹیلی فون کے تار کو تھوڑا سا چھیل کے جوڑ ملایا ... وہ کام کرنے لگا۔ پولیس ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کرکے میں ... نے واردات کی رپورٹ دی۔ یہ بتایا کہ میں کون ہوں اور ... کہاں سے بول رہا ہوں۔ میرا رابطہ نزدیک ترین پولیس کار ... سے کرایا تھا انہوں نے کہا کہ ہم پانچ منٹ میں پہنچ رہے ... ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے ساتھ ... ایمبولینس بھی لائیں۔ شاید کچھ لوگوں کو اسپتال لے جانا ... پڑے گا۔
... اب میرے پاس پانچ منٹ تھے۔ میں نے باری باری ان ... کی جامہ تلاشی لی۔ رقم سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایک ... کے لیے مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں ساری رقم جو

ڈھائی ہزار پاؤنڈ کے لگ بھگ تھی مسز ٹمپسن کو دے دوں تاکہ اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے لیکن اول تو وہ اس رقم کو قبول نہ کرتی اور اپنا حق قانون کے ذریعے وصول کرنے کو ترجیح دیتی۔ دوسرے پولیس کے نزدیک میرا یہ جرم چوری کے زمرے میں آتا۔ چنانچہ میں نے صرف ان کی شناختی دستاویزات دیکھنے پر اکتفا کیا۔ میں نے ان کے نام پتے اور فون نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کر لیے۔

میں چاہتا تھا کہ مسز ٹمپسن آسانی کے لیے ایک ایسا بیان دے کر اپنی جان چھڑا لے جس کے بعد اسے کوئی پریشانی نہ ہو مگر وہ پرانے اصولوں پر کاربند رہنے والی عورت سچ سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ یہ غنڈے پروٹیکشن منی مانگتے تھے اور دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ آج اتفاق سے ایک وزیٹر نے مجھے بچا لیا لیکن آئندہ کے لیے مجھے پولیس کی طرف سے حفاظت کی یقین دہانی چاہیے مگر وہ یہی پوچھتی رہی کہ آخر مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

پولیس واقعی پانچ منٹ میں سائرن بجاتی آ گئی۔ ان کے ساتھ ایمبولینس بھی تھی چنانچہ انہوں نے چاروں سرمنڈے گورے بدمعاشوں کے ساتھ قادر بخش کو بھی پولیس کی حفاظتی تحویل میں اسپتال بھیج دیا اور پھر ہم سب کے بیانات ریکارڈ کیے۔

میں نے کہا کہ ہم تینوں اور چندا یہاں عارضی طور پر کوئی کمرا لینے آئے تھے مگر یہاں کمرا خالی نہیں تھا۔ ہم واپس چلے جاتے مگر اسی وقت قادر بخش کے ساتھ چار HEADS SKIN آ گئے اور انہوں نے یہاں رہنے والی ایک لڑکی فردوس کو اپنے ساتھ زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں روکا تو انہوں نے آفس میں بہت توڑ پھوڑ مچائی اور میرا ان سے مقابلہ ہوا تو وہ سب زخمی ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے دفاع میں مارا۔ جارحانہ عزائم ان کے تھے۔

سارجنٹ سخت حیران ہوا "تم نے ان چار، بلکہ پانچ افراد کو اکیلے مارا؟"

میں نے کہا "یہاں تمہیں میرے سوا کوئی اور نظر آ رہا ہے؟ یہ بوڑھی عورت ہے۔ کیا یہ لڑ سکتی تھی؟ یہ دو لڑکیاں ہیں، ان کی جسمانی حالت دیکھو۔"

"لیکن وہ پروفیشنل لوگ تھے اور چار تھے، کیا تم مارشل آرٹ میں خود کو پاکستان کا بروس لی سمجھتے ہو؟" سارجنٹ طنز سے بولا۔

میں نے کہا "بروس لی؟ وہ کون ہے؟"

اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے افسوس ناک نظروں سے دیکھا "تم بروس لی کو نہیں جانتے، فلمیں نہیں دیکھتے؟"

میں نے کہا "انجمن اور سلطان راہی کی ہر فلم دیکھتا ہوں۔"

ان کی پیشانیوں پر شکنیں پڑ گئیں "یہ نام ہم نے نہیں سنے۔"

میں نے کہا "پھر حیرانی کی کیا بات ہے اگر میں نے بروس لی کا نام نہیں سنا؟ ہاں مارشل آرٹ میں کوئی بلیک بیلٹ ہونے کا دعوے دار ہے تو بلاؤ۔"

انہوں نے پر تمسخر انداز میں مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے سر ہلایا "سڈنی کو بلاؤ۔"

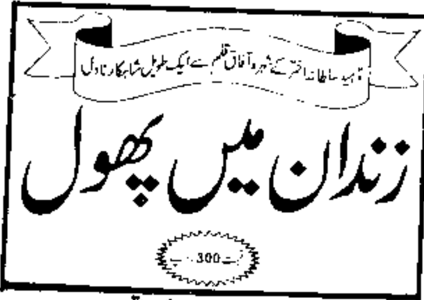
سڈنی۔۔۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ پولیس کار کا ڈرائیور اور ایک اچھا فائٹر تھا۔ وہ باکسنگ اور فری اسٹائل ریسلنگ کے ساتھ جوڈو بھی جانتا تھا مگر اس کے ساتھ اندھوں میں کانا راجا والی بات تھی۔ میرے سچ کو آزمانے کے لیے اسے میرے سامنے لایا گیا تو میں نے صرف اپنی مہارت ثابت کرنے کے لیے اس کی پٹائی کرنا زیادتی سمجھا۔ میں نے دو منٹ میں اسے اوپر نیچے گھما پھرا کے پھر قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے مجھ پر تین حملے کیے اور تینوں بار وہ مجھے چھو بھی نہیں سکا۔

سارجنٹ شرمندہ نظر آنے لگا۔ "آئی ایم سوری! میں نے تمہارے بیان کی صداقت پر شک کیا۔ تم پاکستان میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "میں ایک سیاست داں ہوں۔ ایک سیاسی جماعت ہے جس کا میں سربراہ ہوں۔ اس کی تصدیق ہمارے ہائی کمشنر کا پولیٹیکل سیکریٹری بھی کر سکتا ہے۔ تم اس سے بات کر لو۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ ضابطے کی کارروائی مختصر ہو گئی۔ اس نے پھر مجھ سے کوئی جرح نہیں کی اور مسز ٹمپسن کی طرف متوجہ ہو گیا "یس میڈم۔ آپ اپنی شکایت لکھوا دیں۔"

مسز ٹمپسن کے سامنے میں نے سو فیصد سچ نہیں بولا تھا۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ پچاس فیصد غنڈوں کو لٹانے والی یہ لڑکی تھی جو دیکھنے میں اتنی خوبصورت، معصوم اور نازک نظر آتی ہے۔ خود اس نے چندا کے ہاتھوں غنڈوں کی درگت بنتے دیکھی بھی نہیں تھی۔ اپنے گیسٹ ہاؤس کی گُڈ وِل بچانے کے لیے اس نے قادر بخش کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اس گفتگو کا حوالہ بھی نہیں دیا جو میرے اس کے یا خود مسز



ٹمپسن اور قادر بخش کے درمیان ہو چکی تھی۔

آخری بیان فردوس کا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ قادر بخش اس کو دھوکے سے یہاں لایا تھا مگر وہ غیر قانونی طریقے سے برطانیہ میں داخل نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور سفری دستاویزات دکھا کے پولیس افسر کو قائل کر لیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ قادر بخش تمہیں زبردستی کرکے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔"

فردوس نے کہا "ہاں۔"

"ایسی صورت میں کیا تم اس کے خلاف اغوا کی کوشش کی رپورٹ درج کرانا چاہو گی؟" سارجنٹ نے کہا۔

"نہیں۔ میں اس کے یا کسی کے خلاف کیس کرنا نہیں چاہتی۔"

سارجنٹ نے کہا "کیا تم خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی ہو؟"

"قادر بخش کے سوا مجھے کسی سے خطرہ نہیں محسوس ہوتا۔"

وہ بولا "کیا تمہارے جاننے والے یا عزیز ہیں برطانیہ میں؟"

"جو پاکستانی میری مدد کر رہے ہیں۔ میں ان پر بھروسا کر سکتی ہوں اور ان کے ساتھ جانا چاہتی ہوں" حیرت انگیز طور پر فردوس نے اعتماد کے ساتھ جواب دیے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تفتیش کریں گے اور امید ہے یہ بدمعاش اب تمہیں یا مسز ٹمپسن کو پریشان نہیں کریں گے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹریس پاس، مارپیٹ، توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کے الزامات مسز ٹمپسن نے عائد کیے ہیں۔ نقصانات کی تلافی کا کیس بھی انہی کی طرف سے ہوگا لیکن آپ لوگوں کو ایک بار کاؤنٹی جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے کہا۔

"اپنا بیان ریکارڈ کرانے اور ملزمان کو شناخت کرنے کے

ہے۔"

میں نے کہا "مگر ہم ایک دو روز میں واپس پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مس خان کل ہی چلی جائیں۔"

"مس خان جاسکتی ہیں۔ آپ کی گواہی بہرحال ضروری ہے اور میں کاؤنٹی جج کو مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کل سماعت ضرور کرے۔ میں آپ سے کہاں رابطہ کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "ہم آج ہی تھری ایس ہوٹل چھوڑ آئے ہیں اور میں یہاں بھی نہیں رہ سکتا۔"

اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ شام تک آپ مجھے بتادیں۔"

میں پھر پولیس کے رویے سے متاثر ہوا۔ وہ مجھے پکڑ کے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھ پر مارپیٹ کا کیس نہیں بنایا تھا۔ مجھ سے کسی کی ضمانت نہیں مانگی تھی اور مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ یہی صورت حال پاکستان میں ہوتی تو مجھے بھی ان کے ساتھ بند کردیا جاتا پھر تفتیش کا عمل حسب حیثیت شروع ہوتا۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کا سودا ہوتا کہ یہ ضربات خفیف ہیں یا شدید اور دفعہ ۳۲۳ ض ف کا اطلاق ہوگا یا ۳۲۴ کا۔ ملزمان کو چھڑانے کے لیے اپنے اپنے حمایتی سفارشوں کی طاقت کے ساتھ سامنے آجاتے اور اس سارے عمل میں سب سے زیادہ فائدے میں رہتی خود پولیس۔ بااثر اور مال دار اپنی آزادی اور عزت خرید لیتا ہے۔ بے حیثیت اور بے عزت آدمی حوالات میں رہ جاتا ہے اور اس پر وہ سب کیس ڈال دیے جاتے ہیں جن کے اصل ملزم چھوٹ چکے ہوں۔

پولیس کے جانے کے بعد میں نے مسز تھمپسن سے اظہار ہمدردی کیا اور اخلاقاً یہ بھی پوچھا کہ اگر وہ مجھے نقصان کا ذمے دار سمجھتی ہے تو میں نقصان پورا کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس نے الٹا میرا شکریہ ادا کیا۔ ہمارا سامان ٹیکسی ڈرائیور بلونت پہلے ہی لے گیا تھا۔ فردوس اپنا سوٹ کیس لے کے ہمارے ساتھ ہوگئی۔ مسز تھمپسن نے اس کے جانے پر کوئی تعرض نہیں کیا مگر یہ ضرور کہا کہ ہم کیس میں گواہی کے لیے ضرور حاضر ہوں۔

ایک بار پھر ہم اس کمپنی کے آفس پہنچے جس کے ساتھ چندا نے اپنی ڈیل فائنل کی تھی۔ بلونت سنگھ نے ہمارا سامان وہاں چھوڑ دیا تھا اور خود پھر آنے کا کہہ کے چلا گیا تھا۔ کمپنی کے پروٹوکول افسر نے کہا "آپ کا سامان محفوظ ہے مس چندا۔ کیا آپ کو رہائش کی کوئی پرابلم درپیش ہے؟"

چندا نے کہا "پرابلم کیا ہوسکتی ہے؟ جب تک میں ایک کمپنی کی کلائنٹ تھی اور ان کو مجھ سے فائدہ پہنچنے کی امید تھی، انہوں نے مجھے مہمان رکھا۔ جب معاہدہ آپ کے ساتھ ہوگیا تو انہوں نے معذرت کرلی۔"

پروٹوکول افسر نے بہت افسوس کا اظہار کیا "یہ بڑی بداخلاقی کی بات ہے۔ خیر آپ مطمئن رہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے کوئی مناسب ہوٹل تلاش کرتا ہوں۔ اب آپ ہماری مہمان رہیں گی جب تک لندن میں ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ ہوٹل میں ہم خود شفٹ کرسکتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ بزنس کے سلسلے میں میرا لندن میں قیام طویل ہوسکتا ہے۔ کیا آپ کرائے پر کوئی مکان حاصل کرنے میں میری مدد کرسکتے ہیں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا تو چندا سے بولا "یہ آپ کے شوہر ہیں؟"

چندا نے بلاتذبذب سر ہلادیا "جی... لندن کے مرکزی علاقے کے قریب کوئی دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ اگر مل جائے؟"

اس نے فون اٹھا کے کہا "میں ابھی بروکرز سے پوچھتا ہوں۔"

صرف ایک گھنٹے میں مجھے میری پسند کا گھر مل گیا۔ بروکر نے مجھے تین مختلف اپارٹمنٹ ہاؤس دکھائے اور یہ اندازہ کرلینے کے بعد کہ کرایہ زیادہ ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا، اس نے مجھے ایک پوری طرح فرنشڈ گھر بھی دکھادیا۔

"یہ صرف چھ ماہ کے لیے دستیاب ہے" وہ بولا۔

چندا نے پوچھا "چھ مہینے کے لیے کیوں؟"

میں نے کہا "یہاں مجھے کچھ بھی خریدنا نہ پڑتا۔ میں اس کا پورے سال کا کرایہ ایڈوانس بھی دے سکتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں سر۔ اس میں جو میاں بیوی رہتے ہیں وہ ایک سال کے لیے دنیا کی سیر کرنے گئے ہیں" وہ بولا "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مکان اپنی ذمے داری پر دے دوں اور کرایہ انہیں بھیج دوں۔ ابھی تک کوئی ایسا کلائنٹ نہیں ملا تھا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں بھروسے کے قابل لگتا ہوں؟"

"آپ ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ ایک جماعت کے سربراہ ہیں۔ اس سے زیادہ مستند حوالہ کیا ہوسکتا ہے؟" وہ بولا "پھر میڈم کو اتنی بڑی کمپنی نے بھیجا ہے۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں سیاسی جماعتوں کے کارکن سے لیڈر تک سب کتنے نیک نام ہیں۔ عام آدمی کسی سرکاری عہدے دار، کسی سیاسی لیڈر، وکیل یا پولیس افسر کو

مکان کرائے پر دیتے ہوئے ڈرتا ہے کہ اس نے کرایہ نہ دیا یا مکان پر ہی قبضہ کرلیا تو اس سے مقدمے بازی کا عذاب اسے تباہ کردے گا۔ یہاں جو جتنا ذمے دار تھا، اتنا ہی قانون کا پابند تھا اور اسے پبلک کے سامنے اپنی گڈول کا خیال کوئی غلط قدم نہیں اٹھانے دیتا تھا کہ پریس نے اسکینڈل بنادیا تو اس کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔

میں نے بروکر کو منہ مانگا کرایہ نقد ادا کردیا اور وہ مجھے رسید دے کر چلا گیا۔ اس چھوٹے سے گھر کے مالک میاں بیوی ہم پیشہ بھی تھے اور سمندری حیاتیات پر مل کر تحقیق کررہے تھے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے دونوں کا مضمون ایک تھا لیکن موضوعات اپنے اپنے تھے۔ وہ جس تفریحی سفر پر نکلے تھے اس میں انہیں کیریبین سی کے بعد کورل آئی لینڈ پر ریسرچ بھی کرنی تھی۔

ان کا گھر ایسا تھا کہ لگتا تھا وہ اب بھی یہاں رہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ بھی لاک نہیں کیا تھا۔ ہم اگر چاہتے تو ان کے جوتے کپڑے تک استعمال کرسکتے تھے۔ مجھے یہ سب بہت عجیب لگا کہ ان کی غیر موجودگی میں یہاں کوئی اجنبی فیملی رہے گی جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے اور کبھی جانیں گے بھی نہیں۔ ان کی واپسی پر مکان پھر خالی ملے گا لیکن انہیں کوئی اندیشہ نہیں۔ یہ ڈر نہیں کہ مکان میں رہنے والے اس کے سامان اور آرائش کا حال خراب نہ کردیں۔ چیزیں توڑ پھوڑ نہ دیں یا چوری نہ کرلیں۔ ٹرسٹ اس معاشرے کے رویے کی اساس ہے۔ اخبارات سڑک کے کنارے رکھے رہتے ہیں۔ لوگ پیسے رکھ کے اٹھاتے جاتے ہیں۔ شام کو ایک پیسہ کم نہیں ملتا۔ بسوں میں کوئی ٹکٹ دینے والا کنڈیکٹر نہیں ہوتا۔ ڈرائیور گاڑی چلاتا رہتا ہے اور مقررہ بس اسٹاپ پر روکتا جاتا ہے۔ مسافر اترتے چڑھتے رہتے ہیں اور کرایہ ادا کرنے کے لیے کہنے والا کوئی نہیں۔ دیکھنے والا کوئی نہیں مگر مسافر کرایہ ڈال کے مشین سے ٹکٹ ضرور لیتے ہیں۔ ہر جگہ سیلف سروسنگ اسٹور میں ایسے پیٹرول پمپ ہیں جہاں ملازم کوئی نہیں۔ مالک نے گھر کے باہر پمپ لگادیا ہے اور خود اندر بیٹھا ہے کہیں۔ لوگ گاڑی روکتے ہیں۔ پیٹرول خود ڈالتے ہیں اور میٹر کے حساب سے رقم ڈبے میں ڈال کے چلے جاتے ہیں۔

سگریٹ، کافی، مشروبات وغیرہ کی مشینیں ہر جگہ نصب ہیں۔ ان میں جعلی یا کھوٹے سکے کوئی نہیں ڈالتا۔ دودھ، انڈے سبزی وغیرہ کی قیمت چوبیس گھنٹے بعد نصف ہوجاتی ہے۔ دکاندار کبھی ان کی پوری قیمت نہیں لیتا۔ ایکسپائر ہونے کے بعد تو کوئی چیز برائے فروخت نظر آنے کا یا ناخالص ہونے کا تو تصور ہی نہیں۔

کئی سال پہلے میرے ایک دوست کی بیگم ساتھ تھیں۔ انہوں نے ایک اسٹور سے پسی ہوئی لال مرچ خریدی اور عادت کے مطابق پوچھ لیا کہ خالص ہے نا؟ دکاندار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے کہا کہ خالص کا کیا مطلب ہے آخر؟ آپ نے لال مرچ مانگی تھی، وہ میں نے آپ کو دے دی۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ بھائی، ان خاتون کے سوال میں ہمارا معاشرہ بول رہا ہے جہاں لال مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں ملائی جاتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ایک اور صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ پیرس کی زیرزمین ریلوے میں ہر شخص ٹکٹ خرید کر ایک مشین میں ڈالتا ہے۔ ٹکٹ پنچ ہوجاتا ہے۔ ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور مسافر کے گزرتے ہی پھر بند ہوجاتا ہے۔ اب دوسرا ٹکٹ ڈالے بغیر دروازہ دوبارہ نہیں کھلے گا۔ انہوں نے چھ پاکستانی بھائیوں کو دیکھا کہ ایک نے ٹکٹ خریدا اور دروازے سے گزر کے دروازے کو پکڑلیا اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک باقی پانچ ساتھی نہیں گزر گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ریلوے کا ایک افسر یہ سب کچھ دیکھ کے بھی خاموش تھا۔ ایک صاحب نے ریلوے کے ملازم سے پوچھا کہ آپ ان لوگوں کو پکڑتے کیوں نہیں؟ وہ بولا کہ انہیں پکڑنے، قانون کے حوالے کرنے اور مقدمہ چلاکے سزا دینے کا طریق کار تو ہے مگر بہت لمبا اور اس میں ریلوے کا خرچا بہت ہے۔ اس لیے درگزر کرنا ہی بہتر ہے۔ یعنی انہیں پکڑ کے ڈک دینے اور چھترول کرکے اور "خبردار، جو پھر یہ حرکت کی" کہہ کے چھوڑنے کا تو تصور بھی نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں چوریاں ڈکیتی کی وارداتیں یا جرائم نہیں ہوتے۔ شاید ڈکیتی، گاڑیاں چھیننے اور آبروریزی کے واقعات کا تناسب ہمارے ملک کے مقابلے میں دس گنا ہوگا مگر ایک تو مجرم پکڑے جاتے ہیں۔ دوسرے بات مجرم کی نہیں عام آدمی کی ہے۔ اس کا اصول ہے کہ ہمت ہے تو ڈاکا ڈالو مگر جہاں اعتبار کا معاملہ ہو، وہاں ایک پیسے کی چوری جائز نہیں۔

یہی صورتِ حال اس مکان کی تھی۔ اب یہ مکان مالک مکان نے اعتماد کی بنیاد پر ہمارے سپرد کردیا تھا یا اس کے نمائندے نے ہمیں اعتماد کے قابل سمجھ کے ہمارے حوالے کردیا تھا۔ اب یہ ہماری اخلاقی ذمے داری تھی کہ ہم اس کو

اور اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھ کے استعمال کریں۔ اس کی حفاظت کریں اور اسے خراب نہ ہونے دیں۔ بے شک پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں مگر یہ صورت حال اپنے پاکستان میں ہو تو شاید مالک مکان کو واپسی پر پتا چلے کہ باتھ روم کی قیمتی ٹونٹیاں غائب ہیں۔ فینسی لائٹس غائب ہیں یا ٹوٹی پڑی ہیں۔ کچن میں کراکری' کٹلری نام کی کوئی چیز نہیں بچی۔ پان کی پیک سے دیواروں کا رنگ روغن برباد ہو گیا ہے اور گھر ایک کوڑا گھر بنا ہوا ہے۔

جتنی دیر میں فردوس نے اور چندا نے مل کر گھر کو جھاڑ پونچھ کے صاف کیا' میں بازار سے چائے کافی اور ناشتے کا سامان لے آیا۔ یہ چیزیں کچن میں موجود تھیں اور فریج بھی بالکل خالی نہیں تھا مگر ظاہر ہے' کرائے میں کھانا پینا شامل نہیں تھا۔ تاہم فریج' ٹی وی' اے سی اور واشنگ مشین جیسی چیزوں کے استعمال میں کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی حائل نہیں تھی۔ بجلی' گیس کرائے میں شامل تھی مگر ٹیلی فون کا بل ہماری ذمے داری تھی۔

ہم رات کے کھانے کے لیے باہر گئے۔ یہ جگہ انتہائی محفوظ تھی۔ یہ رہائشی علاقہ خاموش اور پر سکون تھا اور کاروباری مرکز سے اس کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ فردوس پہلے بہت خوف زدہ اور نروس تھی لیکن آہستہ آہستہ ہمارے رویے نے اور چندا کی حوصلہ افزائی نے اس کو پر اعتماد کر دیا۔

رات کو فراغت ہوئی تو چندا نے اس سے پوچھا "اب تم کیا کرو گی؟"

وہ بولی "کچھ نہیں جی!"

میں نے کہا "چندا کا مطلب یہ تھا کہ لندن میں رہو گی یا واپس جاؤ گی؟"

"پہلے ماں کا پتا چل جائے۔"

میں نے کہا "پتا چل جائے گا لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ بے شک اس وقت تک تم ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو لیکن ہم تو چلے جائیں گے دو چار دن میں۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں۔"

"لیکن ۔۔ یہ مکان تو چھ مہینے کے لیے لیا تھا آپ نے؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ اس لیے کہ میں آتا جاتا رہوں گا۔ ایک مہینے پاکستان میں رہوں گا تو ایک ہفتہ یہاں۔ تم اکیلی رہ سکتی ہو یہاں؟"

"اکیلی کیسے رہ سکتی ہوں جی؟"

چندا نے کہا "بالکل رہ سکتی ہو۔ اگر ہمت کرو۔ یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی زبردستی نہیں ہو سکتی۔ تم بالکل آزاد ہو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کے لیے اور قانون پوری طرح تمہارے ساتھ ہو گا۔ تم یہاں قانونی طور پر آئی ہو۔"

میں نے کہا "تمہارے پاس برطانیہ میں رہائش اختیار کرنے کے لیے جو ویزا ہے' اس کی میعاد کتنی ہے؟ کس بنیاد پر جاری کیا گیا تھا تمہیں ویزا؟"

اس نے کہا "مجھے تو پتا نہیں جی۔ آپ دیکھ لو۔"

اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے براؤن پیپر کا ایک لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ اس میں فردوس کی ساری شناختی دستاویزات تھیں۔ ابھی تک اس کے نام نہاد ماما کو موقع نہیں ملا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے قبضے میں لے سکتا۔ ان کے بغیر فردوس ماما کے رحم و کرم پر اور بالکل بے یار و مددگار رہ جاتی۔

اس براؤن پیپر کے لفافے سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے علاوہ ایک نکاح نامہ بھی برآمد ہوا۔ یہ نکاح نامہ رجسٹرڈ بھی تھا اور اس پر نکاح رجسٹرار کی مہر بھی تھی لیکن جہاں جعلی یونیورسٹی ڈگری مل جاتی ہو وہاں اس نکاح نامے کی کیا اہمیت تھی۔ اس میں نکاح کی تاریخ دو ماہ قبل کی تھی۔

میں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد پوچھا "فردوس ۔ یہ شہاب الدین ولد وہاب الدین کون ہے جو آرائے بازار گلی نمبر دو مکان نمبر سترہ میں رہتا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "عجیب بے وقوف لڑکی ہو۔ اس نکاح نامے میں لکھا ہے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ یہ انگوٹھے کا نشان تمہارا ہے؟"

وہ بولی "انگوٹھے کا نشان ۔ میں نے تو نہیں لگایا۔ میں میٹرک پاس ہوں۔ دستخط کرتی ہوں اور نکاح نامہ جعلی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"مجھے ماما ۔ قادر بخش نے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ویسے تو میں لندن نہیں جا سکتی لیکن میں کہوں کہ میرے شوہر نے مجھے بلایا ہے تو اجازت مل جائے گی۔ اس کے لیے نکاح نامے کی ضرورت پڑے گی جو وہ بنوا لے گا۔"

میں نے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ تمہارا نکاح تو نہیں پڑھایا گیا تھا؟ تم سے کسی گواہ کے سامنے ایجاب و قبول تو نہیں کیا۔ نکاح نامہ جعلی ہو سکتا ہے مگر نکاح کا معاملہ شرعی ہے۔ اگر تم نے کسی کو شوہر قبول کیا ہو گا تو وہ تمہارا شوہر ہو گیا۔"

وہ بولی "میں نے کسی کے ساتھ نکاح نہیں پڑھوایا اور میں کسی شہاب الدین ولد وہاب الدین کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "جہاز میں تم اور تمہاری ماں۔ دونوں کو قادر بخش نے اپنی بیویاں بتایا تھا۔ یہ تمہارے لیے اور اس سے زیادہ تمہاری ماں کے لیے شرم کی بات ہے۔ کہ تم نے یہ سب سنا اور چپ رہیں؟"

اس کی نظر جھک گئی "آپ ٹھیک کہتے ہو لیکن قادر بخش نے کہا تھا کہ یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں جو کر رہا ہوں' تمہارے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔ جیسا میں بتاؤں تم کرتی جاؤ۔"

میں نے کہا "اب ذرا سوچ کے اور یاد کر کے بتاؤ کہ اس نے جہاز میں کس نام سے سفر کیا تھا۔ قادر بخش کے نام سے یا شہاب الدین کے نام سے؟"

"مجھے ۔ نہیں معلوم۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "اس خبیث کا دوسرا نام شہاب الدین عرف شابو ہے۔ اگر یہ کاغذات اس کے پاس ہوتے تو وہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ تم اس کی بیوی ہو اور تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔"

چندا نے کہا "اس نے یہ کاغذات اپنے پاس کیوں نہیں رکھے؟"

فردوس بولی "اس نے کہا تھا کہ انہیں سنبھال کر رکھو۔ میں لندن پہنچ کے تم سے لے لوں گا۔ وہ لے لیتا' اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔"

میں نے پوچھا "زبانی تو اس نے جو بکا' بک دیا مگر قانونی طور پر یہ ناممکن ہے کہ اس نے تمہاری ماں کو بھی کسی نکاح نامے کی رو سے اپنی بیوی بتایا ہو۔"

وہ کچھ تذبذب کے ساتھ بولی "میری ماں ۔ اس کے پاس نکاح نامہ تھا۔ اس کی شادی بیس سال پہلے ہوئی تھی۔ میرا ابا سعودی عرب گیا تھا۔ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس نے وہاں دوسری شادی کر لی تھی پھر سنا ہے وہ قتل ہو گیا یا کسی حادثے میں مارا گیا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ امریکا بھاگ گیا۔"

میں نے کہا "تمہارے باپ کا کیا نام تھا؟"

"محمد علی۔ قادر بخش نے کہا کہ لندن میں ایک دوست ہے اس کا۔ وہ بھی محمد علی ہے۔ شادی شدہ اور چھ بچوں کا باپ ہے مگر آدمی ایسی ہے۔ تم اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لینا لندن میں۔ تمہیں اسی نے بلوایا ہے لیکن میری ماں نہیں مانی۔ اس نے کہا کہ جب تک پکا ثبوت نہ مل جائے کہ میرا پہلا شوہر زندہ نہیں ہے' میں دوسرا نکاح کیسے پڑھوا لوں۔ اگر وہ امریکا میں ہے تو جب تک وہ طلاق نہ دے' میں اس کی بیوی رہوں گی۔ قادر بخش نے کہا کہ اچھا' میں پتا کرتا ہوں۔ مہینے بھر بعد اس نے میری ماں کو بتایا کہ محمد علی کا پتا چل گیا ہے اور وہ طلاق دینے پر بھی راضی ہو گیا ہے۔ دو ہفتے بعد میری ماں کو ڈاک سے ایک چٹھی ملی' اس میں طلاق نامہ تھا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "یہ قادر بخش تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تمہاری ماں نے کیسے مان لیا کہ وہ چٹھی اس کے شوہر محمد علی کی ہے اور وہ خط امریکا سے آیا ہے۔ کیا اس نے ڈاک کے لفافے پر مہر دیکھی تھی؟"

فردوس سخت نروس ہونے لگی تھی "پتا نہیں جی!"

میں نے کہا "چلو مہر کو چھوڑو۔ کیا تمہاری ماں اپنے شوہر کی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کے دستخط کیسے ہیں؟"

چندا نے کہا "اس سے کیا جرح کر رہے ہو۔ ان کو کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ ان کے ساتھ تو قادر بخش نے دھوکا کیا۔ فردوس کو اپنی بیوی بنا کے لے آیا اور اس کی ماں کو شاید دوسرا محمد علی لے جاتا لیکن ان کو یہاں لانے کا صرف یہی ایک مقصد نہیں ہو سکتا۔"

میں نے لفافے میں سے نکلنے والے دوسرے کاغذ کو دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ یہ ایک معاہدہ تھا جس پر فردوس کے دستخط ہونے باقی تھے۔ اس معاہدے کی رو سے لندن کے بدنام علاقے "سوہو" میں واقع ایک ہوٹل اور بار نے فردوس کو ویٹریس کی ٹریننگ کے لیے بھرتی کیا تھا۔ اس میں تفصیل سے واضح کیا گیا تھا کہ تربیت تین مہینے جاری رہے گی' اس دوران میں فردوس کو مفت ٹریننگ کے ساتھ لباس' رہائش اور خوراک فراہم کی جائے گی۔ یہ "ٹریننگ" ڈے اور نائٹ شفٹ میں ہو گی۔ اس کے بعد فردوس ہفتہ وار تنخواہ کی حقدار ہو گی۔ تنخواہ کے بارے میں صرف یہ لکھا گیا تھا کہ قواعد و ضوابط کے مطابق اور باہمی گفت و شنید کے ذریعے طے ہو گی۔ کام کے اوقات کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ چھٹی اور دیگر سہولتوں کا حوالہ نہیں تھا مگر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اس کی ڈیوٹی "روم میڈ" کے طور پر ہوٹل میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے دن رات کی تفریق بھی نہیں تھی۔

یہ بالکل عیاں تھا کہ فردوس کو جھانسا دے کر لندن لایا گیا تھا اور قادر بخش نے اسے پیشہ کرانے کے لیے بیچ دیا تھا۔ ویٹریس یا روم میڈ کا صرف نام تھا۔ اس کا اصل کام گاہکوں کا دل بہلانا ہوتا۔ ٹریننگ میں اسے آداب دلبری اور

نازواوا سے مردوں کو لوٹنے کے طریقے سکھائے جاتے۔ عریانی اور بے لباسی کو بطور فیشن اپنانا سکھایا جاتا اور شاید انگریزی میں بات کرنا بھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اس پیشے میں بہت نام اور دام کما سکتی تھی۔

جب میں نے اسے یہ سب بتایا تو فردوس سوچ میں پڑ گئی "مجھے ایسا لگتا ہے جی کہ میں تو پھنس گئی ہوں ہر طرح' اب میں کیا کہوں؟"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی تم نے اس معاہدے پر دستخط نہیں کیے ہیں اس لیے تم آزاد ہو۔ اگر تم واپس جانا چاہو؟"

"نہیں جی۔ اب واپس کیا جانا" وہ بولی "یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ ولایت پہنچ گئی۔ پاکستان میں میرے لیے کیا ہے' ہاں میری ماں مل جائے۔"

میں سمجھ گیا کہ قادر بخش نے اسے جو سنہرے خواب دکھائے تھے' ان کا اثر باقی ہے اور لندن کی تیسر س لائف نے فردوس کو مسحور کرلیا ہے۔ اس کا یہ ذرو قتی ہے۔ بالآخر وہ یہاں کی زندگی کے سب خطرات مول لینے پر رضامند ہوجائے گی اور ذہنی طور پر بھی اس نئے ماحول میں ایڈ جسٹ کرلے گی۔

فردوس ساری عمر غربت کے احساس محرومی میں مبتلا رہی تھی۔ میری اور چندا کی باتوں نے اس کا ڈر دور کردیا تھا اور اس کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو یہاں آزادی کے ساتھ اکیلی بھی رہ سکتی ہے۔ کوئی نوکری کرسکتی ہے اور وہ سب کچھ حاصل کرسکتی ہے جو عیش و عشرت کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ ابھی وہ نووارد تھی' اس لیے عزت عفت کے دیسی تصورات بھی باطل نہیں ہوئے تھے لیکن میں اندازہ کرسکتا تھا کہ کچھ عرصے بعد اس کے نظریات اور خیالات میں کتنی لچک پیدا ہوجائے گی۔ آزادی کا مفہوم اس کے لیے وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ بالآخر وہ تمام مشرقی اور مذہبی اخلاقی قدروں سے آزادی حاصل کرلے گی۔ شرم حیا سے آزاد ہوجائے گی۔ لباس کی قید سے آزاد ہوجائے گی۔ آدھا ہے تو کیا اور نہیں ہے تو کیا۔ وہ اسٹیج پر تماشائیوں سے جتنا خراج تحسین وصول کرے گی اس سے زیادہ معاوضہ لے گی۔ فہوا لمطلوب۔

وہ جو گاؤں دیہات قصبوں اور شہروں کی گلیوں میں بھولی بھالی اور نادان مگر بزعم خود ہوشیار لڑکیوں کو عزت' شہرت اور دولت کے خواب بیچتے ہیں اور ٹی وی کے ڈراموں اور انڈین فلموں سے متاثر ہونے والے ذہنوں کو خوبصورت باتوں کے سنہرے جال میں پھانس کر یقین دلاتے ہیں کہ مستقبل ان کے لیے بھی اتنا ہی خوبصورت ہوسکتا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں کہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی راہ کتنی پرکشش ہوتی ہے اور کبھی مجبوری تو کبھی ضرورت کا بہانہ بنا کے یہ لڑکیاں شرافت کی غربت والی زندگی کے بدلے دولت مندی کی بے حیائی کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتیں۔

میں نے جمی کے شراب خانے میں بھی ایک مجبور لڑکی کو دیکھا تھا جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم پاکستانی ہو اور میں نے پاکستانی ہونے سے انکار کردیا تھا۔ مجھے اس وقت بہت شرم آئی تھی لیکن میں اپنے پاکستانی ہونے کا اقرار کرلیتا تو یہ میرے لیے زیادہ شرم کی بات ہوتی کیونکہ وہ لڑکی بہت سی انڈین لڑکیوں کے ساتھ رقص کرنے کے لیے اسٹیج تک تو آگئی تھی۔ اب صرف لباس کا مرحلہ باقی تھا کہ وہ STRIPTEASE ڈانس کرنے سے ہچکچا رہی تھی مگر یہ جھجک بھی کب تک؟ پیسہ اتنی بڑی سچائی ہوگیا تھا کہ شاید اس دور میں سقراط بھی ہوتا تو زہر کا پیالہ نہ قبول کرتا۔

جب فردوس سوگئی تو میں نے یہ بات چندا سے کہی اور اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ فردوس اب واپس جانے والی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر اسے اپنی ماں کے حوالے کردیا جائے۔ آگے جو وہ چاہے۔

رات دس بجے جب پاکستان میں تین بج رہے تھے' چندا نے کمال سے بات کی۔ آدھی رات کے بعد گہری نیند سے جاگنے کے باوجود اس نے چندا کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ چندا نے اسے سپلائی کنٹریکٹ کی تازہ ترین صورت حال بتائی تو اس نے کہا کہ کام ختم ہوگیا ہے تو وہ فوراً واپس آجائے۔ میں نے اسپیکر کو آن کردیا۔

چندا نے کہا "میرا کام تو ختم ہوگیا ہے مگر؟"

"مگر کیا۔ تمہاری ضرورت ہے یہاں؟"

وہ بولی "ابھی ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائیڈ کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ناصر عظیم سے شاہ عالم بن کے پھر مشکل میں پڑگئے ہیں۔"

"اس کی مشکلات تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ اس اُلّو کے پٹھے کا ڈراما تو ابھی چلے گا۔ تم اس پر لعنت بھیجو اور آجاؤ۔"

میں نے کہا "یہی میں بھی سمجھا رہا تھا اسے مگر تو بڑا مطلبی ہے سور کے بچے! اپنا کام نکل گیا تو لعنت بھیج رہا ہے مجھ پر۔"

"اچھا ہوا تو نے سن لیا سب" وہ بولا۔

چندا نے کہا "دیکھو کمال۔ ان حالات میں ناصر کو اکیلا چھوڑنا ممکن نہیں۔"

کمال نے کہا "لیکن یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کی ایمبولینس کو ایک بس نے ٹکر ماردی تھی۔ وہ ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھائے لیٹی ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ یہاں چندا کسی طرح بھی میری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ ہوسکتا ہے الٹا اس کی موجودگی میرے لیے مسائل کھڑے کردے۔"

چندا نے خفگی سے کہا "ایک بات جب طے ہوگئی تھی۔"

میں نے کہا "بالکل طے نہیں ہوئی تھی۔ تم ضد کررہی تھیں لیکن اب اگر کمال کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو تم جاؤ۔"

اس نے سخت روکھے اور روٹھے ہوئے لہجے میں کہا "ٹھیک ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ چند دن فراغت کے مل جائیں گے۔ کام کرتے کرتے میں بھی تھک گئی تھی۔"

کمال نے فوراً بات بدل دی "اگر یہ بات ہے چندا تو میں کچھ دن کام چلاؤں گا۔ تم کو واقعی کچھ آرام کی ضرورت ہے' انجوائے کرو۔"

میں نے کہا "یہاں یہ کیسے انجوائے کرسکتی ہے میرے ساتھ؟ میرے معاملات بڑے الجھے ہوئے ہیں۔"

چندا نے چلا کے کہا "اب کہہ دیا تاکہ میں چلی جاؤں گی" اور فون بند کرکے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے کہا "تمہاری یہ ناراضی بے سبب ہے۔"

"مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں" وہ آگ بگولا ہوکے اٹھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی بٹھالیا۔ جھٹکے سے وہ میری گود میں آگری مگر فوراً الگ ہوگئی "چھوڑو مجھے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب نہیں چھوڑوں گا اور ایسے نہیں مانوگی تو منانے کے دوسرے طریقے بھی یاد ہیں مجھے۔"

"بدتمیزی کی تو ماروں گی کھینچ!" وہ غصے میں بولی۔

اس کے بعد مجھے وہی کرنا پڑا جو بہت پہلے چندا کے روٹھ جانے پر کرتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور چوم کے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس نے مزاحمت ترک کرکے خود کو ڈھیلا نہیں چھوڑا۔

میں نے کہا "دیکھو چندا! ایک بات کہنی تھی مجھے تم سے۔ کہتے ہیں ہر کام کے لیے قدرت نے ایک وقت مقرر کیا ہے اور جب وہ وقت آتا ہے تو کوئی بھی بات بہانہ بن جاتی ہے۔ جیسے تمہارا میرے ساتھ لندن آنا ایک بہانہ بن گیا۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں پانے کی جتنی کوشش کی وہ سب اس لیے اکارت گئی کہ قدرت مجھے کچھ سزا دینا چاہتی تھی یا پھر وہ وقت نہیں آیا تھا جو قدرت نے طے کیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہاں وہ سب اتنی جلدی ہوگیا جو پچھلے ایک سال میں میری کوشش کے باوجود الٹا ہورہا تھا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا تمہارا بچھڑنا کوئی بچھڑنا نہیں تھا کیونکہ ہم تو بچھڑ ہی نہیں سکتے۔ شاید میں بھٹک گیا تھا۔ تم نے کچھ اور سمجھ لیا تھا لیکن ہمیں بالآخر ملنا تو تھا اور ہم مل گئے۔ یہ درمیان کا وقفہ ایسا ہی ہے جیسے گرہن کے وقت زمین اور سورج کے درمیان چاند آجاتا ہے۔ اس کے ہٹتے ہی دھوپ پھر نکھر آتی ہے۔ زمین کا سورج سے رشتہ تو ازلی و ابدی ہے۔"

وہ رونے لگی "تم نے بڑی بے رحمی سے بھلا دیا تھا مجھے۔"

"میں نے؟ یا تم نے ٹھکرا دیا تھا مجھے؟" میں نے کہا "میں نے تو بہت وقت تمہاری ایک نظر کے انتظار میں گزارا مگر تم نے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ میں دستک دے دے کر تھک گیا مگر تم نے دروازہ نہیں کھولا۔"

"چنانچہ تم مجھے چھوڑ کے چلے گئے؟"

"نہیں۔ میں بھٹکتا رہا' اِدھر اُدھر اور دیکھو' بالآخر تمہارے پاس ہی آیا۔ مجھے معاف کردو۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔"

میں نے کہا "چلو تم نے مجھے اور میں نے تمہیں معاف کیا۔ اب ہنس دو۔"

وہ مسکرانے لگی "میں واپس نہیں جاؤں گی تمہیں چھوڑ کے۔"

"تمہیں جانا پڑے گا۔ یہ میری خواہش نہیں میرا حکم ہے۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ یہاں کے معاملات ایسے ہیں جان کہ تمہاری وجہ سے واقعی مجھے بھی پریشانی ہوگی۔ مجھے تو ابھی کئی بار آنا ہے یہاں۔ جب تک شاہ عالم کا معاملہ بالکل ختم نہیں ہوتا پھر اس کھیل میں تمہارا کوئی رول نہیں ہے۔ میں کل پرسوں تک بہت مصروف رہوں گا۔ مجھے جمی سے پھر ملنا ہے۔ کاؤنٹی کورٹ میں بیان دینا ہے۔ میں ملک رب نواز کو بھی بلانا چاہتا ہوں یہاں۔ میں اس کے ساتھ واپس بھی جانا چاہتا ہوں۔ تم ان سب لوگوں سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔"

"لیکن تم خود کو مصیبت میں مت ڈالنا۔"

میں نے کہا "میں ہر مصیبت سے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ بہت جلد میں صرف ناصر عظیم رہ جاؤں گا' تمہارا ناصر عظیم۔

شاہ عالم اس دنیا کے لیے واقعی مرجائے گا۔ میں اس کے بعد ہی کہہ سکتا ہوں کہ اب مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں' بولو مانو گی میری بات؟"

اس نے سرہلایا "اب تو حکم ہے صاحب بہادر کا۔ نہ مانوں تو سزا کیا ہوگی؟"

میں نے کہا "وہ ہم سوچ کے بتائیں گے۔"

چندا سونے کے لیے فردوس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ میں اکیلا رہ گیا اور عادت کے مطابق سونے سے پہلے اپنے خیالوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ میں خوش تھا اور بے اختیار مسکرا رہا تھا۔ جیسے میں نے اپنی گم گشتہ جنت پالی ہو۔ مجھے کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ چندا کا بھلانا تو خیر تقدیر کے فیصلے سے لڑنے کے مترادف تھا لیکن میں نے ایسا سوچا بھی کیوں؟ مجھے وہ وقت یاد آیا جو میں نے اور چندا نے خان جی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے گزارا تھا۔ اس وقت ہم ناسمجھ بچے ہی تو تھے۔ خان جی کے کتنے احسان تھے مجھ پر۔ ان کا سہارا نہ ہوتا تو شاید آج بھی میں لاوارث انسانوں کی دنیا میں کس مپرسی اور خواری کی زندگی گزار رہا ہوتا۔ انہیں میں نے کتنا دکھ پہنچایا۔ بے شک وہ میری مجبوری کو سمجھ گئے تھے اور آخری وقت میں انہوں نے مجھے معاف بھی کردیا تھا لیکن یہ خلش وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ چندا کے اور میرے درمیان فاصلہ ختم ہونے کے بجائے اتنا بڑھ گیا ہے کہ شاید ہم کبھی ایک نہ ہوں گے۔ جیسا کہ انہوں نے سوچا تھا اور غلط نہیں سوچا تھا۔ ہمیں جدا کرنا پھول سے خوشبو کو جدا کرنا تھا۔

اس رات مجھے شبنم کا خیال بھی شرمندہ کرنے نہیں آیا۔ اس کا فون بھی نہیں آیا اور میں نے اس خیال میں کوئی ندامت محسوس نہیں کی کہ میں نے اسے فون کرکے ہوٹل چھوڑنے کے بارے میں بھی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اب وہ ہوٹل میں فون کرے گی تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگی کہ لیلیٰ مجنوں اس کے ٹیلی فونوں سے بچنے کے لیے لندن میں کہیں روپوش ہوگئے۔ وہ فرید کو اور کمال کو فون کرکے پوچھے گی تو وہ بھی اسے کچھ نہیں بتا پائیں گے اور شبنم یہ سمجھے گی کہ وہ جانتے بوجھتے جھوٹ بول رہے ہیں۔ کمال سے باتوں کے دوران میں کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اسے یہاں کا فون نمبر ہی بتادیے۔ ویسے یہاں کا فون نمبر کیا ہے؟ میں نے سونے سے پہلے سوچا۔

صبح میری پہلے پولیس سے بات ہوئی "مجھے کاؤنٹی جج کے سامنے کب پیش ہونا ہے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے اپنے ملک۔"

وہ بولا "تم کیا چاہتے ہو' عدالت اپنا کام تمہارے شیڈول کے مطابق کرے؟"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں؟ سب کام چھوڑ کے۔ مجھے تو بہت مہنگی پڑے گی یہ نیکی۔ میں نے مسز تھمپسن کو بچاکے اور ان بدمعاشوں کو پکڑوا کے بڑی غلطی کی۔ میں بھاگ جاتا تو اچھا ہوتا۔"

وہ کچھ نرم پڑگیا "کب جانا ہے آخر تمہیں؟ مشکل یہ ہے کہ ان کو ابھی عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب اسپتال میں پڑے ہیں۔ تم نے انہیں تقریباً ماردیا تھا۔"

"میں ایسا نہ کرتا تو وہ مل کے مجھے مکمل ماردیتے۔"

"او کے۔ میں تمہیں ایک گھنٹے بعد بتاتا ہوں۔ کیا تم پولیس اسٹیشن آسکتے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تو آسکتا ہوں لیکن باقی دن میں کہاں ملوں گا۔ یہ میں بھی نہیں جانتا۔ مجھے کاروبار کے سلسلے میں بہت سی جگہوں پر جانا ہوگا۔"

ناشتا فردوس نے اور شبنم نے مل کے بنایا۔ ہمارے نکلنے سے پہلے ہی بروکر آگیا اور اس نے ایگریمنٹ سائن کرا کے ایک کاپی ہمیں دے دی "میں نے پروفیسر کو تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے کہا کہ ایک سال تو مشکل ہے لیکن تم یہاں دس مہینے گزار سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں چار ماہ کا کرایہ میں بعد میں دے دوں گا۔"

"شاید پروفیسر آج تم سے فون پر بات کرے۔ اس کو اپنی لائبریری کی بہت فکر رہتی ہے۔"

میں نے کہا "ہم اسے نہیں چھیڑیں گے۔"

ایک گھنٹے بعد ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو اسی سارجنٹ نے مجھے ریسیو کیا "تم نے اچھا کیا جو اس لڑکی کو بھی لے آئے۔ اسی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی نا؟ جج اس سے پوچھنا چاہتا ہے کہ آخر یہ ملزمان کے خلاف رپورٹ کیوں لکھوانا نہیں چاہتی۔"

فردوس یہ بات سن کے گھبرائی "اب میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "کہہ دینا کہ جب کچھ ہوا ہی نہیں تو میں بلاوجہ قانونی چکروں میں کیوں پڑوں۔ میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتی۔"

سارجنٹ نے کہا "کاؤنٹی جج کے سامنے ان لوگوں کو تصویر سے شناخت کروگے۔ مسز تھمپسن بھی ایسا ہی کرے گی پھر تم دونوں کا بیان ہوگا' رائٹ؟"

میں نے کہا "رائٹ۔ کیا اب ہم چلیں؟"

کاؤنٹی جج ایک دبلا پتلا سفید بالوں والا عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس نے پہلے میری شناخت کی "مسٹر شاہ عالم۔ تم پاکستان میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "یور آنر۔ میں ایک سیاسی شخصیت ہوں۔ میں خود کو صف اول کا سیاست داں تو نہیں کہوں گا لیکن میں صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا اور میری اپنی ایک سیاسی جماعت تھی۔"

"آئی سی پھر کیا تم یہاں جلاوطنی کی زندگی گزارنے آئے ہو؟ جیسا کہ دستور بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں۔ ہاں اس لیے کہ میں اب سیاست سے الگ ہوچکا ہوں۔ یہ حالات کا تقاضا تھا۔ نہیں اس لیے کہ میرا ہمیشہ لندن آنا جانا رہتا ہے۔ جیسا کہ آپ پاسپورٹ کے اندراجات سے اندازہ کرسکتے ہیں۔ میرے یہاں کاروباری تعلقات ہیں اور میں یہاں کی شہریت بھی رکھتا ہوں۔ میں دونوں جگہ رہتا ہوں۔"

"I AM IMPRESSED" وہ بولا "تم ایک اچھے فائٹر بھی ہو لیکن تمہیں ملزموں کو اتنی بے رحمی کے ساتھ مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا "یور آنر۔ مجھے ان کی نیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر میں موثر طور پر اپنا دفاع نہ کرتا تو وہ میرا اس سے برا حال کرتے۔ جتنا اب ان کا ہے۔"

"گیسٹ ہاؤس کی مالکن مسز تھمپسن نے ان کے خلاف بہت سے الزامات عائد کیے ہیں۔ کیا تم اس میں ایک فریق بننا چاہوگے؟"

"نو یور آنر۔ مجھے یہاں ان کی شناخت کے لیے بلایا گیا ہے اور اس معزز عدالت کو یہ بتانے کے لیے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ میں اس عدالت کا شکر گزار ہوں کہ میری واپسی کے امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے آج ہی طلب کرلیا گیا۔"

میرے سامنے ایک البم رکھ دیا گیا۔ اس میں سو سوا سو نامی گرامی ملزمان کی تصاویر شامل تھیں۔ قادر بخش کے علاوہ چاروں گنجوں کی تصویریں مختلف صفحات پر پھیلادی گئی تھیں لیکن میں نے ان کو کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا۔ اس کے بعد میرا بیان ریکارڈ ہوا اور میں نے وہ سب بتادیا جو پہلے پولیس کو بتاچکا تھا۔

جج نے کہا "تھینک یو مسٹر عالم۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

اگلی گواہی مسز تھمپسن کی تھی جو اس دوران میں ایک پاکستانی عورت کے ساتھ وہاں آگئی تھی۔ اس عورت کی عمر چالیس سال کے قریب تھی مگر اس نے بہت شوخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو حد سے زیادہ تائٹ تھا۔ اس کا میک اپ بھی بہت گہرا اور بھونڈا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ فردوس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہ یقیناً گیسٹ ہاؤس پہنچی ہوگی اور وہاں سے سیدھی کورٹ آگئی ہے۔ اس کا ثبوت یوں بھی ملا کہ فردوس اٹھ کے اس کے پاس جاپہنچی اور مسز تھمپسن کی گواہی اور بیان کے دوران میں وہ مسلسل باتیں کرتی رہیں جس پر جج نے ان کو دوبار ڈانٹا بھی۔

مسز تھمپسن نے قادر بخش کے علاوہ دو گورے گنجوں کو پہچانا۔ دو کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ بعد میں اندر آئے تھے جب وہ بے ہوش تھی۔ اس نے میری بہت تعریف کی اور کہا کہ میں نہ ہوتا تو وہ بدمعاش اس کے گیسٹ ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے۔ وہ ریکارڈ بھی لے جاتے اور شاید مجھے بھی مارتے۔ اس نے قادر بخش کے بارے میں بتایا۔ اپنے نقصانات گنوائے اور ایک گھنٹا بولتی رہی۔

اس ایک گھنٹے میں فردوس کی ماں نے بیٹی کو قائل کرلیا کہ وہ قادر بخش کے خلاف کوئی بیان نہ دے۔ اس نے صاف انکار کردیا کہ قادر بخش نے غنڈوں کی مدد سے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ فردوس انگریزی نہیں سمجھتی تھی چنانچہ جج کے ہر سوال کا ترجمہ میں کرتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے۔

فردوس کی ماں نے اچانک چلا کے کہا "شاہ جی تم اسے کیوں پٹی پڑھا رہے ہو کہ اپنے ماما کے خلاف بیان دے۔ کیا لگتے ہو تم اس کے آخر؟"

میں نے پلٹ کے کہا "وہ فردوس کا ماما نہیں ہے۔"

جج نے فوراً نوٹس لیا "کون ہے یہ عورت اور کیا شور کررہی ہے؟"

میں نے جج کو بتایا "یہ اس لڑکی کی ماں ہے اور لڑکی کو مجبور کررہی ہے کہ ایک ملزم کے خلاف بیان نہ دے۔"

جج نے کہا "یہ لڑکی بالغ ہے۔ بیان اپنی مرضی سے دے گی۔ اس عورت سے کہو کہ خاموش رہے ورنہ میں اسے باہر نکال دوں گا۔"

میں نے کہا "اگر مجھے اجازت ہو تو میں اس عورت کو سمجھادوں؟"

جج سے اجازت ملنے پر میں اس کے پاس گیا "تم فردوس کی ماں ہو؟"

وہ تیکھے تیوروں کے ساتھ بولی "کوئی شک ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "کیسی ماں ہو تم کہ اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے

ایک غلط آدمی کے رحم و کرم پر چھوڑ رہی ہو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوگا؟"

وہ کڑوے لہجے میں بولی "جو ہوگا اچھا ہی ہوگا اور برا ہوگا تو ہم تمہارے پاس فریاد لے کر نہیں آئیں گے شاہ جی۔ آخر وہ ماما ہے اس کا۔"

مجھے غصہ آگیا۔ "دیکھو' میرے سامنے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ فردوس مجھے سب بتا چکی ہے۔ اس بے غیرت شخص نے تو تمہیں اور تمہاری بیٹی دونوں کو اپنی بیوی بتایا تھا۔ جہاز میں جھگڑا ہوا تھا تو میں بھی وہاں تھا۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا "شاہ جی۔ یہاں سب ہی جھوٹ بول کے آتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے اس کا جعلی نکاح نامہ بھی دیکھ لیا ہے اور وہ معاہدہ بھی جس کے مطابق یہ یہاں ایک شراب خانے اور بدنام ہوٹل میں ویٹریس بنے گی۔ شراب پلائے گی لوگوں کو اور روم میڈ ہوگی' کمروں میں جائے گی۔"

وہ گھبرا گئی "یہ غلط ہے اور کون کہتا ہے وہ نکاح نامہ جعلی ہے؟"

"میں کہتا ہوں۔ اس پر انگوٹھے کا نشان بھی فردوس کا نہیں ہے اور وہ شخص جس کا نام شہاب الدین لکھا گیا ہے درحقیقت قادر بخش ہی ہے۔ اس کے پاس دو شناختی کارڈ اور دو پاسپورٹ ہیں۔"

وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آئی "دیکھو شاہ جی! آپ تو چلے جاؤ گے' ہمیں رہنا ہے یہاں۔ ہم کسی سے دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ آپ یہ معاملہ ختم کرا دو۔ فردوس کو میں سنبھال لوں گی۔ آخر میں اس کی ماں ہوں۔"

میں بے بس ہوگیا۔ میں زبردستی ان ماں بیٹی کی زندگی کے نجی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوسکتا تھا اور ان کے اخلاق و کردار کا ٹھیکے دار نہیں تھا۔ جب فردوس بیان کے لیے آئی تو ایک بار پھر مترجم کے فرائض میں نے ہی انجام دیے۔ اس نے کہا کہ قادر بخش' اس کا سگا ماما تو نہیں ہے' اس کی ماں کا دور کا کزن ہے اور اس کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ وہ گیسٹ ہاؤس سے اس کو اغوا کرکے لے جانا چاہتا تھا۔ وہ پولیس کے سامنے دیے ہوئے بیان سے پھر گئی اور اس نے کہا کہ چار گنجے بدمعاشوں کو دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی اور اس نے اپنے ماما کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے زبردستی کرنی چاہی تھی مگر اسے اغوا کی کوشش ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے اور وہ اس کے خلاف یا کسی کے خلاف بھی کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

فردوس کے بیان سے مسز تھمپسن کے بیان کی نفی ہوتی تھی اور خود پولیس کے موقف میں فرق پڑگیا تھا مگر عدالت میں فردوس اپنی مرضی سے کچھ بھی کہنے کے لیے آزاد تھی۔ مسز تھمپسن نے کہا کہ وہ نقصانات کی تلافی' ٹریس پاس' مارپیٹ اور توڑ پھوڑ کے الزامات PRESS کرے گی۔ میں نے کہا کہ اب میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا تو عدالت مجھے پاکستان جانے کی اجازت دے۔ عدالت نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ملزمان کی شناخت کے بعد میری ذمے داری ختم ہوگئی ہے۔

عدالت کے باہر میری اور پولیس کی فردوس اور اس کی ماں کے ساتھ تھوڑی سی بحث اور تلخ کلامی ہوئی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ فردوس کی ماں نے بیٹی کا کنٹرول سنبھال لیا تھا اور اب وہ اسی کی زبان بول رہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا اور ہم لوٹ کے گھر آئے جہاں میں نے فردوس کا سارا سامان اس کے حوالے کیا۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ اس نے وہ براؤن لفافہ بھی نہیں لیا جو اس نے مجھے دیا تھا اور جس میں اس کی سب دستاویزات تھیں۔ وہ لفافہ اس کمرے میں تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا جہاں میں سویا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں کوئی یہ لفافہ لینے ضرور آئے گا۔

دوپہر سے پہلے میرے ذہن پر گزشتہ دنوں پیدا ہونے والی قانونی الجھنوں کا بوجھ اتر گیا تھا۔ فردوس کا معاملہ خواہ مخواہ میرے گلے پڑا لیکن اس سے دو فائدے بھی ہوئے۔ ایک یہ کہ مجھے قادر بخش کے دہرے کردار اور اس کے دوغلے پن کا ایک اور ثبوت مل گیا اور دوسرا یہ کہ مسز تھمپسن کے گیسٹ ہاؤس کے مقابلے میں مجھے رہائش کے لیے ایک زیادہ باوقار اور آرام دہ جگہ مل گئی۔

میں نے جمی سے ایک دن کی مہلت لی تھی اور وہ دن گزر چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یقین تھا' اس کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اب میرا تعاقب نہیں کر رہے تھے۔ اس نے یقین کرلیا تھا کہ میں نیک نیتی کے ساتھ اس کے ساتھ پھر کاروباری اشتراک کا خواہاں ہوں۔ اب یہ فیصلہ خود مجھے کرنا تھا کہ میں اس سے پھر ملوں یا اسے چکمہ دے کر نکل جاؤں۔ اگر میں چندا سے پوچھتا تو وہ یہی کہتی کہ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ لعنت بھیجو اس منحوس کی شکل پر لیکن میں ابھی تک جمی اور ملک رب نواز کے کاروبار کی نوعیت اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں کرپایا تھا اور اس غیر قانونی دھندے میں شاہ عالم کے کردار کی اہمیت بھی مجھ پر واضح نہیں تھی۔ میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ پاکستان سے نوادرات آثار قدیمہ اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کو کیسے باہر نکالا جا رہا ہے۔ اس دھندے میں ملوث اور معاون لوگ کون ہیں۔ یہ مال کس راستے سے اور کتنے ہاتھوں سے گزرتا ہے اور بالآخر کہاں پہنچتا ہے۔ میرے ملک کا یہ تاریخی اور تہذیبی ورثہ جب دنیا کے بازار میں پہنچتا ہے تو اس کی کیا قیمت لگتی ہے اور یہ پیسہ کن لوگوں کی تجوریاں بھرتا ہے۔

یہ سوچ کے میں نے جمی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ کسی وجہ سے میں آج ملاقات کا وعدہ ایفا نہیں کرسکوں گا۔

وہ بگڑ گیا "موت کے سوا جمی سے کیے ہوئے وعدے کو پورا نہ کرنے کا کوئی اور بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "پھر تم فرض کرلو کہ میں دو دن کے لیے مرگیا ہوں۔ تم شوق سے یہ دو دن میری تلاش میں صرف کرو" اور ریسیور رکھ دیا۔

چندا نے پوچھا "دو دن بعد کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ میں اس سے ملے بغیر واپس پاکستان آجاؤں گا۔" میں نے چندا کو بڑی صفائی سے جھوٹ کی گولی دی۔

وہ بہت خوش ہوئی "اور ان دو دنوں میں تمہاری مصروفیت کیا ہوگی؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو تمہیں پاکستان ارسال کرنا ہے پھر کچھ ایسے کام نمٹانے ہیں جن سے تمہارا دور کا بھی تعلق نہیں۔ چنانچہ تمہیں ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔"

میرا خیال تھا کہ چندا کو آج ہی کسی فلائٹ پر جگہ مل جائے گی مگر ائرلائن کے سیلز آفس میں صورت حال مختلف ثابت ہوئی۔ چندا کو تین دن بعد بھی چانس پر رکھا گیا مگر میرے ایک شناسا نے مجھے آنکھ مار کے یقین دلایا کہ اسے آپ کنفرم ہی سمجھیں۔

میں نے ایک کار ہائر ایجنسی سے ایک بہت اچھی گاڑی لی۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بہت غور سے دیکھے۔ لائسنس EXPIRE ہوگیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں آج ہی اسے ری نیو کرالوں گا مگر انہوں نے رسک نہیں لیا۔ غصے میں چندا نے اس کمپنی کو فون کیا جس کی وہ مہمان تھی۔ وہاں سے پروٹوکول آفیسر نے بات کی اور فائدہ یہ ہوا کہ کار کمپنی کے کریڈٹ اکاؤنٹ پر فراہم کرنے کے علاوہ ایجنسی کے منیجر نے مجھ سے معافی بھی مانگی۔

اگلے تین دن میں نے چندا کو لندن کی سیر کرانے میں صرف کیے۔ ہم رات دو بجے تک پھرتے تھے اور مشکل سے چھ گھنٹے سو کے اٹھتے تھے تو پھر نکل جاتے تھے۔ وہ جتنی خوش تھی اس سے زیادہ میں RELEIVED محسوس کر رہا تھا۔ مجھے جس بریک کی ضرورت تھی وہ مجھے حاصل ہوگیا تھا اور چندا کے ساتھ سکون و طمانیت کا یہ وقفہ میرے کشیدہ اعصاب کے لیے انتہائی راحت بخش ثابت ہو رہا تھا۔ ان تین دنوں میں ہم نے لندن کا ہر قابل دید مقام دیکھا۔ میرے لیے کوئی جگہ اجنبی نہیں تھی مگر چندا کے لیے ہر تجربے میں بڑی ایکسائٹ منٹ تھی۔

میں نے اپنے سارے مسائل یکسر فراموش کردیے تھے جن کا تعلق ناصر عظیم اور شاہ عالم کے ڈبل رول سے تھا۔ میں نے ایک بار بھی پاکستان میں کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور رات کے وقت بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میرے یوں لاپتا اور لاتعلق ہوجانے سے جنجم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ چندا نے ایک بار کمال کو فون کرکے اپنے پروگرام سے آگاہ کردیا تھا مگر میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

تیسرے دن میں نے چندا کو سی آف کیا۔ وہ خاصی مطمئن لیکن کچھ افسردہ تھی۔ "یہ تین دن تو پلک جھپکتے میں گزر گئے۔"

میں نے کہا "میڈم۔ پلک جھپکتے میں بندہ گزر جاتا ہے۔"

وہ بولی "اب پاکستان میں پھر وہی دن رات کا چکر ہوگا۔ اسپتال کا روٹین۔ اس کوئن کی ٹانگ بھی ابھی ٹوٹنی تھی۔ ورنہ کچھ دن اور مل جاتے۔"

میں نے کہا "کچھ دن بعد بھی تمہاری فیلنگز ایسی ہی ہوتیں۔"

اس نے ایک آہ بھری "ہاں۔ زندگی ایسے تو نہیں گزاری جاسکتی۔ بالآخر لوٹ کے اپنے معمولات حیات کی قید میں جانا پڑتا ہے۔ خیر' اب یہ بتاؤ تم کب آؤ گے؟"

میں نے کہا "اسی ہفتے کے آخر تک۔"

"وعدہ کرو تم کسی الجھن میں نہیں پڑو گے؟"

میں نے کہا "میں جھوٹا وعدہ کرتا ہوں کہ کسی چکر میں نہیں پڑوں گا۔"

وہ ہنس پڑی "چلو اتنا سچ تو بولا تم نے۔"

میں نے کہا "دراصل میں جانتا ہوں کہ مجھے شاہ عالم کے چکروں کو ختم کرنا ہے اور اس کے چکر میں پڑے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا لیکن تم فکر مت کرو۔ میں خود کو محفوظ رکھوں

گا۔ کم سے کم اس کی کوشش ضرور کروں گا۔"

جہاز اڑ گیا تو نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا جیسے لندن کی وہ فضا جو پچھلے تین دن میں بڑی دلنواز' اجلی اور پر لطف تھی' اچانک پژمردہ اور بے رونق ہو گئی ہے۔ میں نے پھر وعدہ خلافی کی تھی اور دو دن کے بجائے تین دن بعد جمی سے فون پر بات کرکے اس کی بکواس سننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں ائرپورٹ سے سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس کی بیوی نے میرا استقبال کیا "تم آج بھی نہ آتے تو وہ تمہارا غائبانہ قتل کر دیتا۔ کیا کرتے پھر رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "وہی جو عام ٹورسٹ کرتے ہیں' عیاشی۔"

"تم تو لندن آتے جاتے رہتے ہو؟"

میں نے کہا "مگر وہ لڑکی پہلی بار آئی تھی جو میرے ساتھ تھی۔"

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے' سوچو کیا؟"

"جیسے ہی میں جمی کے کمرے میں قدم رکھوں گا' ایک آدم خور شیر مجھے کھا جائے گا۔ یا جمی مجھ پر توپ چلا دے گا۔"

"جا کے دیکھو۔"

میں نے کہا "خدا حافظ جولی۔ اگر میں زندہ رہتا تو تمہیں بھی ایک سرپرائز دیتا۔ میں تم پر عاشق ہو جاتا' دوسری بار۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "پہلی بار کب ہوئے تھے؟"

میں نے اندر جاتے جاتے کہا "جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔"

جمی کے کمرے میں قدم رنجہ فرماتے ہی میں اچھل پڑا۔ جولی نے واقعی غلط نہیں کہا تھا۔ میرے سامنے ایک صوفے پر ملک رب نواز نیم دراز تھا اور وہ صحیح معنوں میں عیاشی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ایسی کافر ادا حسینہ فرنگ بیٹھی ہوئی تھی جسے ایک نظر دیکھنے سے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔ ملک رب نواز کے ایک ہاتھ میں جائے سے باہر ہوتا شباب تھا تو دوسرے ہاتھ میں جام شراب۔

وہ مجھے دیکھ کے بھی اسی پوز میں بیٹھا رہا مگر جمی نے ایک سائلنسر لگا ہوا ریوالور نکال لیا "دوسری وعدہ خلافی پر میں تمہیں گولی مار سکتا ہوں۔"

"مار دو" میں نے بے نیازی سے کہا اور ملک رب نواز سے مخاطب ہو گیا "میں تمہیں EXPECT کر رہا تھا۔ اگر تم نہ آتے تو میں تمہیں فون کرکے بلاتا۔"

رب نواز بولا "مجھے اب تمہاری ہر بات پر یقین آنے لگا ہے۔"

میں اس خوبصورت بلا کے پہلو میں بیٹھ گیا "تمہاری بیٹی کی صورت تم سے نہیں ملتی۔ سیرت یقیناً ملتی ہے" میں نے انگریزی میں کہا۔

لڑکی نے مجھ پر ایک قہر آلود نظر ڈالی اور درمیان سے نکل گئی۔ رب نواز ہنسنے لگا۔ "تم جانتے ہو میں ایسی باتوں کا برا نہیں مانتا مگر یہ لڑکی کیا سمجھے گی؟"

میں نے کہا "اس کے پاس تو صرف جسم ہے' سمجھ کہاں؟"

جمی نے برہمی سے کہا "یہ تم دونوں اپنی زبان میں کیا بک بک کر رہے ہو۔ یہاں میں بھی تو ہوں؟"

میں نے کہا "مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ تم نے ابھی تک مجھے گولی نہیں ماری؟"

رب نواز نے کہا "تم کچھ پیو گے؟"

جمی بولا "یہ دودھ پیئے گا' فیڈر بوتل میں۔"

رب نواز نے قہقہہ لگایا "آف کورس۔ یہ شراب نہیں پیتا۔"

میں نے کہا "تم لندن میں کب تک رہو گے اور کہاں ٹھہرو گے؟"

وہ بولا "رہائش تو ہمیشہ کی طرح ہوٹل میں ہوگی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ تم چاہو تو میرا گھر بھی ہے۔"

"وہاں بیوی ہو گی تمہاری' مصیبت۔"

میں نے کہا "اسے میں پاکستان چھوڑ آیا تھا۔ میرا سسر مر گیا تھا۔ وہ چہلم کے بعد آئے گی اور اسی لیے میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔ ہم وہاں اطمینان سے ہر بات کر سکتے ہیں۔"

اس نے کچھ سوچ کے نفی میں سر ہلایا "میں کوئی گھریلو ماحول کو پسند کرنے والا آدمی نہیں ہوں اور بات چیت ہمیشہ نیوٹرل گراؤنڈ پر ٹھیک ہوتی ہے۔ جہاں کوئی خطرہ محسوس نہ کرے۔"

"حیرانی کی بات ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔"

وہ بولا "ہاں۔ اب ڈر لگنے لگا ہے تم سے۔ کیونکہ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شخص کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ میں دوبارہ رسک لینا بے وقوفی سمجھتا ہوں۔"

جمی نے کہا "بات یہاں ہو گی۔ رب نواز اپنے ساتھ کچھ ایسی چیزیں لایا ہے' کافی مقدار میں۔ تمہارے لیے موقع ہے کہ اس رقم کا دس فیصد برابر کر دو جو تم پر واجب الادا ہے۔"

رب نواز بولا "میں یہاں کسی کو نظر آنے کا رسک نہیں لے سکتا کیونکہ میں عدالت سے اجازت لیے بغیر آیا ہوں۔ کل تم میرے ساتھ چل کے کارگو کی ڈلیوری لے لو۔ تین چار

دن اس کی اچھی قیمت دینے والوں سے رابطے کے لیے کافی ہونے چاہئیں۔ پرانے لوگوں سے تمہارا حساب کیسے برابر ہوگا' یہ تم جانو۔"

میں نے کہا "میرا کام مجھ پر چھوڑ دو رب نواز۔ یہ بتاؤ تمہیں اس کی کتنی قیمت چاہیے؟"

رب نواز سوچ میں پڑ گیا "میرا اندازہ تھا' ایک لاکھ پاؤنڈ لیکن اس کی تین چوتھائی رقم کم سے کم ہونی چاہیے۔"

"یعنی پچھتر ہزار پاؤنڈ۔ اگر میں تم سے سودا کروں؟"

"کیا مطلب؟" جمی کے ساتھ رب نواز بھی چونکا۔

میں نے کہا "فرض کرو میں تم سے کیش پر مال خریدنا چاہوں۔ آگے یہ مجھے کتنا منافع دیتا ہے اور کب' یہ رسک میرا۔"

"تم مال دیکھے بغیر فیصلہ کرو گے؟" رب نواز نے بے یقینی سے کہا۔

"تم کوئی نووارد نہیں ہو اس بزنس میں۔ پاکستان سے کوڑا کرکٹ تو بیچنے کے لیے نہیں لا سکتے۔ اپنی قیمت بتاؤ۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔ تم چاہو تو کل ہی واپس جا سکتے ہو" میں نے کہا۔

رب نواز نے آہستہ سے سر ہلایا "اتنا پیسہ ہے تمہارے پاس یہاں؟"

"میں بندوبست کرا لوں گا۔"

جمی نے کہا "شاہ عالم اب مڈل مین کا کام نہیں کرے گا۔ وہ خود ڈیلر ہو گیا ہے۔ تم قیمت بتاؤ؟"

"میں تم سے ساٹھ ہزار پونڈ لے لوں گا۔ ایک پنس کم نہیں لیکن چیک اور کریڈٹ کارڈ نہیں چلے گا۔" رب نواز بولا۔

میں نے کہا "ادائیگی تمہیں یہاں بھی ہو سکتی ہے اور پاکستان میں بھی تمہارے بینک اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر ہو جائے گی۔"

وہ برہمی سے بولا "میں تم پر کیسے اعتبار کر لوں؟ اتنی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے پاکستان میں اپنا سب کچھ فروخت کر دیا تھا۔ میری پراپرٹی بہت تھی۔"

"لیکن تم لندن میں کنگال ہو گئے تھے۔ تم نے شراب جوئے اور عورتوں پر سب لٹا دیا تھا" جمی بولا۔

"افواہوں پر اعتبار مت کرو۔ اگر میری ایسی پوزیشن نہ ہوتی تو میں یہ بات ہی کیوں کہتا۔"

رب نواز کا شک اور تذبذب برقرار رہا "میں یہ مال تمہارے حوالے کر دوں اور تم مال سمیت غائب ہو جاؤ۔ پھر؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتے ہو تم رب نواز۔ تم کو ساٹھ ہزار پونڈ پہلے مل جائیں گے۔ تم مال جمی کے پاس چھوڑ دو۔"

بالآخر وہ مان گیا۔ میں نے لاہور میں فرید کو فون کیا کہ وہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ کے مساوی رقم پاکستان کرنسی میں میرے اکاؤنٹ سے رب نواز کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دے لیکن یہ کام لندن میں بیٹھ کے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے میرا لاہور میں ہونا ضروری تھا۔ لندن کے کسی پاکستانی بینک کی برانچ میں نہ میرا اکاؤنٹ تھا نہ رب نواز کا چنانچہ معاملہ وقتی طور پر کھٹائی میں پڑ گیا۔ میرے پاس تقریباً بیس ہزار پاؤنڈ کے ٹریولر چیک تھے جو ایک تہائی رقم بھی نہیں بنتی تھی پھر مجھے میڈیکل سپلائی کمپنی کو ہونے والی ادائیگی کا خیال آیا جس میں دونوں طرف سے بینک گارنٹی تھی۔ میں نے کہا کہ باقی چالیس ہزار پاؤنڈ کی ادائیگی کا انتظام میں ایک دو روز میں کر سکتا ہوں۔

رب نواز نے کہا "اب یہ تم جانو اور جمی جانے۔ اس کے ساتھ تم نے اپنا پرانا حساب بے باق کرنے کا ایک شیڈول بنا لیا ہے۔ میرے حساب کا کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارا تین کروڑ کا دوسرا مال لاہور ہی میں کسی پارٹی کے پاس ہے مگر ان کی سودا کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے؟"

وہ بے چینی سے بولا "کون ہے وہ پارٹی؟"

میں نے کہا "یہ تو ابھی مجھے بھی معلوم نہیں اور اگر معلوم ہوگا تو تمہارا کیا خیال ہے میں اتنی آسانی سے تمہیں نام پتا دے دوں گا؟ اور تم جا کے مال لے لو گے؟"

وہ غصے سے بولا "تم کوئی حرامی پن کرو گے۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم تین کروڑ سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔ اگر میری کوشش کا مطلب حرامی پن ہے تو میں باز آیا۔ تمہارا نقصان بھی میں اس طرح قسطوں میں پورا کروں گا جیسے جمی کا کر رہا ہوں۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا "اچھا ٹھیک ہے' تم بات کرنا۔"

میں نے کہا "اگر میں مال برآمد کرا دیتا ہوں تو میرا کمیشن کیا ہوگا؟"

"تمہارا کمیشن؟ کمیشن وہ بھی لے گا جس کے پاس میرا مال ہے پھر مجھے کیا ملے گا؟" وہ مایوسی سے بولا۔

"اگر تمہیں ایک کروڑ بھی مل جائیں تو کیا برے ہیں لیکن میں تم کو ایک بڑی اچھی آفر کرتا ہوں جس میں میرا بھی فائدہ ہے اور تمہارا بھی پھر اپنے انٹرسٹ میں میں بھی جان لڑا دوں گا۔ اگر تمہیں وہ مورتی کا سر مل جاتا ہے تو کیا تم میری وجہ سے ہونے والے پرانے نقصان کو بھول جاؤ گے؟"

"سارے نقصان کو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ چلانے لگا۔

میں نے سرد مہری سے کہا "ٹھیک ہے پھر اس مورتی کے سر کو بھول جاؤ۔"

وہ پھر سنبھل گیا "اوکے 'اوکے۔ تم کوشش کرو۔"

جمی نے کہا "یہ تو اچھا تصفیہ ہو گیا۔ چلو اب تم مال دکھاؤ۔"

"مال؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"میرا مطلب تھا اس کی تفصیل؟" جمی بولا۔

رب نواز نے اپنا بریف کیس کھول کے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے آٹھ بائی دس انچ سائز کی ایک رنگین تصویر برآمد کی "یہ بڑی نایاب چیز ہے۔ ٹیپو سلطان کی ایک تلوار اور یہ بالکل ویسی ہی دوسری تلوار۔"

میں نے دوسری تصویر بھی لے لی اور ان کا آپس میں موازنہ کرنے لگا۔ بلاشبہ ان میں سے ایک نقل تھی مگر تصویر میں وہ دونوں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ میں نے اس کے منقش دستے پر غور کیا مگر کوئی فرق نہ نکال سکا۔ میں نے تصویریں جمی کو دے دیں۔

"اصلی کون سی ہے؟" وہ بولا۔

"تم بتاؤ" رب نواز بولا "تمہیں بڑا دعویٰ ہے مہارت کا۔"

جمی نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے کاریگر بہت کمال کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اصلی ہوگی۔"

رب نواز ہنسنے لگا "غلط۔ یہ پشاور کے ایک کاریگر نے تیار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے دس ہزار پاؤنڈ آسانی سے مل سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "نقلی تلوار کے؟"

وہ بولا "کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ میں اصلی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ نقلی تو میوزیم میں رکھ دی گئی ہے۔"

میں نے اپنے دلی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا "کتنے میں پڑی یہ چیز تمہیں؟"

رب نواز کے پاس صحیح حساب تھا۔ "دس ہزار اس کاریگر نے لیے۔ یہ سمجھ لو کہ تقریباً ساڑھے تین سو ڈالر یا دو سو پاؤنڈ۔ ایک لاکھ میوزیم کے ایک ذمے دار شخص کو۔ دو ہزار پاؤنڈ تقریباً۔ نائٹ ڈیوٹی کے چوکیدار کے وارثوں کو میں نے خود ہی پچاس ہزار پہنچا دیے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ تین ہزار پاؤنڈ۔"

"اور ایک زندگی" میں نے کہا "کیا اس چوکیدار نے مزاحمت کی تھی؟"

"ہاں۔ اچانک اس کو ضمیر کی بیماری ہو گئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔ اس کو راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا تھا۔ دس ہزار پاؤنڈ دینے والے دو لوگ ہیں۔ وہ بارہ بھی دے سکتے ہیں۔ ان کو شیشے میں اتارنا تمہارا کام ہے۔"

میں نے کہا "اس کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟"

رب نواز نے بریف کیس میں سے ایک پمفلٹ یا کتابچہ نکالا "یہ سب اس میں ملے گا۔ یہ سارے مستند حوالے ہیں اور ان سے کوئی تاریخ داں یا آثار قدیمہ کا ماہر اختلاف نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں آخری مقابلے کے وقت جب ٹیپو سلطانؒ کی تلوار ٹوٹ گئی تھی تو کسی نمک خوار نے اسے یہی تلوار پیش کی تھی لیکن اس طرح نمک خوار نے ٹیپو سلطانؒ کی نشاندہی کی تھی۔ یہ ٹیپو کی سب سے پسندیدہ تلوار تھی جس کو وہ مبارک تصور کرتا تھا۔ آخری مقابلے سے پہلے یہ پراسرار طور پر غائب کر دی گئی تھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ایسی قابلِ قدر اور اہم تاریخی چیز جس پر ہماری تہذیب کا حق سب سے زیادہ بنتا تھا صرف دس ہزار پاؤنڈ میں انہی انگریزوں کو فروخت کی جا رہی تھی جو ٹیپو سلطانؒ کے قاتل تھے اور اس کو ہندوستان پر قبضے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

اس نے دوسرے لفافے سے پھر دو تصویریں نکالیں "یہ وہ تلوار ہے جس سے نور جہاں کے پہلے شوہر نے ایک ہی وار سے شیر کا سر تن سے جدا کر کے شیر افگن کا خطاب پایا تھا۔"

جمی نے کہا "کیا اس مرتبہ تم صرف تلواریں لائے ہو؟"

"ابھی دیکھتے جاؤ" رب نواز نے کہا "کیا تم شیر افگن کے بارے میں جانتے ہو؟"

جمی نے کہا "مجھے یاد نہیں۔"

"وہ جہانگیر کے دور میں بنگال کا حکمراں یا صوبے دار تھا۔ کہتے ہیں کہ شکار کے دوران میں ایک شیر نے جہانگیر پر حملہ کیا اور شیر افگن اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے تلوار نکالی اور ایسا وار کیا کہ شیر کا سر الگ ہو گیا۔ جہانگیر نے خوش ہو کے اسے شیر افگن یعنی شیر کو گرانے والا کا

خطاب دیا۔ یہ شیر افگن نور جہاں کا شوہر تھا۔ بعد میں کسی بات پر ناراض ہو کے جہانگیر نے شیر افگن کو مروا دیا۔ نور جہاں اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ بیوہ ہو جانے کے بعد تین سال تک وہ جہانگیر کے محل میں رہنے کے باوجود اس سے شادی سے انکار کرتی رہی۔"

جمی بہت متاثر ہوا "یہ تو بڑی نایاب چیز ہے۔"

"یہ دوسرے میوزیم میں تھی اور بہت سستی مل گئی۔ اس کا نیا ڈائریکٹر یعنی کیوریٹر ایک بے ایمان شخص ہے جس کو ابھی تک دولت کمانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ غلطی اس کی اپنی تھی۔ وہ بڑا پڑھا لکھا اور افلاطون قسم کا آدمی تھا۔ اس کی کسی سے بنتی نہیں تھی۔ اسے ایمانداری سے فرض شناسی اور حب الوطنی جیسے امراض لاحق تھے۔ نتیجہ یہ کہ اسے ہمیشہ اوٹ پٹانگ عہدوں پر بھیجا گیا جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا کہ وہاں بیٹھ کے خوب کام کرے اور خوب ایمانداری دکھائے۔ وہ طاقت کے مرکز سے دور بیٹھ کے بیوروکریسی کے کھیل کو دیکھتا رہا۔ قائداعظم کے بعد بیوروکریسی 'فوج اور جاگیرداری گٹھ جوڑ نے پاور گیم کی ابتدا لیاقت علی خان کے قتل سے کی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خود قائداعظم کی موت بھی طبعی نہیں تھی۔ اس کے بعد ناظم الدین کو ایک طرف بٹھا دیا گیا اور سازشوں کا یہ سلسلہ امریکی آقاؤں کے اشارے پر سن اٹھاون کے مارشل لاء پر ختم ہوا۔ اس شخص نے یہ سب دیکھا اور بالآخر یہ محسوس کیا کہ اگر اب بھی وہ اپنے اصولوں اور اپنی قدروں کو پوجتا رہا تو اس دنیا سے سکندر کی طرح خالی ہاتھ جائے گا۔ چنانچہ میوزیم میں آتے ہی اس نے تین سال میں تیس سال کی کسر پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریٹائر ہونے سے پہلے وہ سارا میوزیم بیچ دے گا۔ مجھے یہ تلوار تقریباً سو پاؤنڈ میں مل گئی۔ پانچ ہزار روپے دیے میں نے اسے۔ اس کی نقل لاہور کے ایک دستکار نے بنائی۔"

"ویری گڈ!" جمی بولا "رب نواز تم ایک جینئس ہو ان معاملات میں۔ یہ بتاؤ اور کیا ہے؟"

رب نواز نے بریف کیس میں سے تیسرا لفافہ نکالا اور دو تصویریں میری طرف بڑھا دیں "یہ دیکھنے میں صرف ایک پرانی پگڑی ہے جیسی کہ بادشاہ پہنتے تھے۔"

"یہ کس بادشاہ کی ہے؟"

"محمد شاہ رنگیلا کی۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور دہلی میں قتل عام ہوا تو محمد شاہ رنگیلا نے اپنی پگڑی نادر شاہ کے قدموں میں رکھ کے اس سے رعایا کے لیے رحم کی درخواست کی۔ نادر شاہ نے پگڑی واپس اس کے سر پر رکھی اور قتل عام روکنے کا حکم دیا۔ تاوان کے طور پر اس نے دہلی کا شاہی خزانہ خالی کرا لیا۔ زر و نقد اور ہیرے جواہرات سب لے گیا۔ صرف کوہ نور ہیرا تھا جو محمد شاہ رنگیلا نے اپنی پگڑی میں چھپا لیا تھا۔ کسی نمک حرام 'کینہ پرور نے نادر شاہ کو خبر کر دی کہ اس پگڑی میں کیا تھا۔ نادر شاہ نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ اس نے کہا کہ دو شاہ بدل کے عورتیں بہن بن جاتی ہیں' تو ہم پگڑی بدل کے بھائی بن جائیں اور یہ کہہ کر اپنی پگڑی محمد شاہ کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگڑی خود پہن لی۔ کوہ نور ہیرا تو وہ لے گیا۔ پگڑی اس نے انعام کے طور پر اس مخبر کے حوالے کر دی۔ اس میں کوہ نور کے علاوہ بھی لاکھوں کے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے' یہ وہی پگڑی ہے۔"

جمی بولا "کیا وہ ہیرے جواہرات تم نے رکھ لیے؟"

رب نواز ہنسنے لگا "یہ پگڑی دہلی کے ایک نواب خاندان کی ملکیت تھی۔ وہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ ظاہر ہے' یہاں انہیں کچھ نہیں ملا۔ نوابی ایک بھولی ہوئی کہانی ہو گئی جو صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ تھی۔ اس خاندان نے بہت برا وقت دیکھا مگر اس سے سبق سیکھ لیا۔ انہوں نے محنت مزدوری اور کاروبار سب کیا۔ اب خاندان کے وارث اکبری منڈی کے تاجر ہیں۔ انہیں کلیم میں جو حویلی اندرون شہر ملی تھی وہ اسی میں آباد ہیں۔ ان کے پاس اچھے وقتوں کی بہت سی نشانیاں ہیں جو خاندان کے سربراہ بوڑھے نواب کو بہت عزیز ہیں۔ اس حویلی میں بھی ایک میوزیم آباد ہے۔ مجھے یہ پگڑی ایک ملازم کے ذریعے ملی۔ کہتے ہیں ناکہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ ملازم خبیث یہاں کی ہر چیز کی تاریخی اہمیت جانتا ہے۔ پرانا خاندانی ملازم ہے۔"

"آخری عمر میں نمک حرام ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہی ہوتا ہے شاہ جی۔ ساری عمر اصولوں کے سہارے زندہ رہنے والا آخر میں پچھتاتا ہے کہ حاصل کچھ نہ ہوا۔ کسی نے وضع داری کی قدر تک نہ کی۔ فائدے میں وہ رہے جو اخلاق اور ضمیر جیسی چیزوں کو بالائے طاق رکھ کے دنیا کو بازار سمجھتے رہے اور اپنے فائدے کا ہر سودا کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب جو بے وقوف ہو اور کم ہمت ہو وہ تو پچھتاتے ہوئے آنسو بہاتا رہتا ہے اور خالی ہاتھ ملتا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ جس میں عقل ہو اور حوصلہ ہو وہ ایک حمام کے سب ننگوں میں شامل ہونے کے لیے کپڑے اتار دیتا ہے۔"

میں نے کہا "رب نواز' کیا خریدار بھی بے وقوف ہوتے

ہیں جو کہانی انہیں سنائی جائے اس پر آنکھ بند کرکے یقین کرلیتے ہیں؟"

"شاہ جی۔ دنیا میں ہمیشہ سے دو قسم کے لوگ ہیں۔ عقلمند اور بے وقوف۔ تناسب کہیں ایک اور نو کا ہے تو کہیں ایک اور دس کا۔ اب کون عقلمند ہے اور کون بے وقوف۔ یہ تعریف بھی بدلتی رہتی ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو زمانہ ساز ہو اور اپنا فائدہ دیکھ سکتا ہو وہ عقلمند ہے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں، عقلمند بھوکے نہیں مرسکتے۔"

"اور اس کے مطابق ہم عقلمندوں میں شمار ہوتے ہیں" جمی بولا۔

"خریدار عام طور پر یقین کرلیتے ہیں۔ ان کے پاس دولت کے انبار ہیں جسے وہ اپنی انا کی تسکین اور اپنے غرور کی پرورش پر خرچ کرتے ہیں اور ایسے مہنگے شوق پالتے ہیں۔ کچھ لوگ شراب، عورت اور جوئے اور عیاشی کے مشاغل میں دولت لٹاتے ہیں تو ساتھ ساتھ اپنے گھر کو نوادرات سے سجاتے ہیں۔ پینٹنگز جمع کرتے ہیں اور انویسٹ منٹ اکٹھے کرتے ہیں۔ بے وقوف اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ جینوئن چیز خریدتے وقت INVESTMENT کے نقطہ نظر سے سوچیں۔ وہ اپنا خزینہ دوسروں کو بڑے غرور سے دکھاکے خوش ہونا کافی سمجھتے ہیں۔ جو عقلمند ہیں وہ سرمایہ کاری کرتے وقت اصل مالیت کی تحقیق کرتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ دھوکا نہ ہو۔ بد قسمتی سے ہمارے خریداروں میں تناسب الٹا ہے یعنی ایک بے وقوف ملتا ہے تو نو عقلمند۔ عقلمند نہ ہوتے تو اتنے دولت مند کیسے بنتے۔ چنانچہ ہم فراڈ کا رسک نہیں لے سکتے۔ ان میں ہر چیز جینوئن ہے۔ خریدار اپنی تسلی کے لیے ریسرچ اسکالرز کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور کاربن DATIN جیسے جدید طریقے سے ہر چیز کی قدامت کا بالکل صحیح اندازہ کرلیتے ہیں۔ آج کے سائنسی طریقے میں نقل کو اصل ثابت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

رب نواز ایک ایک کرکے ان سب چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا جو میرے وطن کے تہذیبی اور تاریخی خزانے سے لاکے لائی گئی تھیں اور اب ان بین الاقوامی چوروں کے ہاتھ فروخت کی جارہی تھیں جو پہلے ہی برصغیر کو کنگال کرچکے ہیں۔ تجارت کے لیے آنے والے یہ لٹیرے ڈیڑھ سو سال ہم پر حکومت کرتے رہے اور انہوں نے خاص طور پر مسلمانوں سے ان کی تاریخی اور تہذیبی برتری کے احساس تفاخر کی سزا دی۔ تاریخ گواہ تھی کہ صرف سیاسی طور پر ہی نہیں، علمی اعتبار سے بھی وہ یورپی اقوام سے برتر تھے۔ ہندوستان میں ان کی حکومت کا زمانہ ایک ہزار سال کی شان و شوکت کا زمانہ تھا، یورپی اقوام نے اس کا بدلہ ہر سطح پر لیا۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی میں مسلمان ہی غدار قرار دیے گئے۔ ناانصافی کا یہ سلسلہ تقسیم ہند تک جاری رہا جب مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہر مرحلے پر نوازا گیا۔

لیکن جب انگریز چلے گئے تو کیا ہوا؟ ان کے پروردہ ایجنٹ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہے اور لگے ہوئے ہیں۔ جو مسلمانوں نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ آج انگریز ذہنی اور معاشی طور پر حکمراں تھے اور رب نواز جیسے ہزاروں اور خادم الملک کہلانے والے لاکھوں اپنے انگریز آقاؤں اور بابوں کی خوشنودی کے لیے غداری اور وطن دشمنی کے مرتکب ہورہے تھے اور جیسے انگریز کے خطاب یافتہ اور ان سے جاگیریں پانے والے آج مراعات یافتہ طبقے میں شامل تھے، ایسے ہی یہ غدار اور وطن دشمن عزت دار کہلاتے تھے۔

یہاں میرے سامنے ایک انگریز ایک ایسے ہی غدار سے سودا کررہا تھا اور میں اس سودے میں شریک تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی اور میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میں رب نواز کو وہیں قتل کردوں۔ جمی کو بھی مار ڈالوں اور کسی کو کچھ معلوم ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔

اس کا سائلنسر لگا ہوا ریوالور میز پر میری دسترس میں پڑا ہوا تھا اور وہ ایک تصویر پر غور کررہا تھا۔ میں اس کے قریب جاکھڑا ہوا اور بظاہر تصویر کو دیکھنے لگا مگر میرا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ ریوالور کی طرف بڑھتا رہا۔ پھر میں نے ریوالور اٹھالیا۔

جمی نے اچانک تصویر سے نظریں ہٹاکے مجھے دیکھا "کیا تم مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ میری دلی خواہش ہے لیکن افسوس کہ آدمی کی ہر خواہش اس کی مرضی سے پوری نہیں ہوتی لیکن کسی نہ کسی دن یہ ہوگا۔"

اس نے تصویر رکھ دی "تم خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟ تم مجھے قتل کرسکتے ہو۔ اس وقت بھی اور بعد میں بھی مگر اس کے بعد تم خود بھی کتے کی موت مارے جاؤگے۔ اس میں اعشاریہ ایک فیصد کا بھی چانس نہیں کہ تم بچ جاؤ۔ یہ خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟"

میں نے ریوالور سے اس کا نشانہ لیا۔ "جب ایک مسلمان کسی کافر کو قتل کرتا ہے اور خود بھی مارا جاتا ہے تو یہ خودکشی نہیں، اس کی شہادت کہلاتی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "اس کے بعد وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے، براستہ قبر۔ یہ ریوالور رکھ دو اور بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ بھی یہاں ہورہا ہے، وہ باہر والے کمرے میں میری بیوی دیکھ رہی ہے، کیوں جولی؟"

"یس ڈارلنگ!" ایک اسپیکر سے جولی کی آواز ابھری۔

جمی نے کہا "جولی وہیں بیٹھے بیٹھے تمہیں شوٹ بھی کرسکتی ہے۔ صرف ایک بٹن دباکے، اوپر دیکھو۔"

میں نے اوپر دیکھا۔ چھت کے ایک گوشے سے ایک بندوق کی نال باہر جھانک رہی تھی اور اس کا نشانہ میں تھا۔ میں گھوم کے اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ بندوق کی نال بھی تھوڑا سا گھوم کے میری طرف ہوگئی۔

میں نے کہا "خواہ مخواہ مجھے دہشت زدہ کرنے کی ناکام کوشش مت کرو۔ میں اس ریوالور کی خوبصورتی دیکھ رہا تھا۔"

جمی نے بتایا "یہ جاپانی ہے۔"

"کیا اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہے۔" میں نے سنہرے دستے اور چاندی کے نقش و نگار والے ریوالور کو پھر میز پر رکھ دیا۔

"یہاں سے تم ایک پن بھی اٹھاؤگے تو اس سے کوئی تاریخی روایت منسوب ہوگی" وہ بولا "مثلاً یہ کرسی جس پر تم بیٹھے ہو۔ ان تین کرسیوں میں سے ایک ہے جو دوسری جنگ عظیم میں ہتھیار ڈالنے کی رسم کے وقت استعمال ہوئی تھی۔ ایک پر اتحادی فوجوں کا کمانڈر بیٹھا تھا، دوسری پر جاپان کا بادشاہ اور تیسری خالی تھی۔"

"تیسری کس کے لیے تھی؟" میری دلچسپی بڑھ گئی۔

"جس کرسی پر میں بیٹھا ہوا ہوں، یہ اتحادی فوج کے کمانڈر ان چیف کی تھی۔ جس پر تم تشریف فرما ہو یہ شہنشاہ جاپان کے لیے رکھی گئی تھی۔ بالکل عام سی کرسی۔ شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد وہ اس کرسی پر نہیں بیٹھا۔ وہ تیسری کرسی پر جابیٹھا۔ جو ٹوٹی ہوئی تھی اسے مرمت کرکے رکھی گئی تھی۔ یہ ایک علامتی حرکت تھی۔ ہماری طرف سے ذلت دینے کی اور شہنشاہ کی طرف سے ذلت کو باعزت طور پر قبول کرنے کی۔ افسوس کہ وہ تیسری کرسی استعمال کے قابل نہیں۔"

میں نے کہا "اپنی کرسی پر بیٹھ کے کیا تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم نے مجھ سے ہتھیار رکھوا لیے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا "کیا تم خود کو جاپان کا شہنشاہ محسوس کرتے ہو؟"

جمی ویسے تو ایک بہت بڑا بدمعاش بلکہ بدمعاشوں کے گروہ کا سرغنہ تھا اور ایک غیرقانونی کاروبار کو چلانے والی تنظیم یا نوادرات کی اسمگلنگ اور خرید و فروخت کی مافیا کا سرغنہ تھا مگر وہ کوئی جاہل آدمی نہیں تھا۔ خصوصاً تاریخ کے معاملے میں اس کا علم کسی یونیورسٹی کے پروفیسر سے کم نہیں تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور نوادرات کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کے لیے پوری چھان بین کرتا تھا۔

یہ شاید جمی کی صحبت کا فیض تھا کہ رب نواز بھی ہندوپاک کی تاریخ کو سمجھنے لگا تھا۔ اس کے لیے بھی تاریخ اور تہذیب کے حوالوں سے آگاہی ایک کاروباری ضرورت تھی۔ اور کوئی اسے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ نوادرات کی فراہمی اور خرید و فروخت کے دھندے میں جعلسازی سب سے زیادہ تھی۔ قدیم دور کے جعلی سکوں سے جعلی تصاویر تک بنانے والے فنکار اپنا کام اس مہارت کے ساتھ کرتے تھے کہ خود کو ماہر سمجھنے والے خریدار بھی دھوکا کھاجاتے تھے۔ اس کے تین نمونے میں ابھی ابھی دیکھ چکا تھا لیکن جمی یا رب نواز کو دھوکا دینا مشکل ہی نہیں، خطرناک بھی تھا۔

ہر مافیا کے لیے کام کرنے والوں کی طرح یہاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بے ایمانی کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جمی اور ملک رب نواز کے اس گروہ میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ان میں جعلی نوادرات بنانے والے وہ ماہرین فن بھی شامل تھے جو اصل کے مطابق نقل یوں تیار کرتے تھے کہ سوائے جدید سائنسی طریقوں کے کوئی ان میں فرق نہیں

بتا سکتا تھا۔ گروہ میں چور تھے جو کسی بھی میوزیم آرٹ گیلری یا تاریخی جگہ سے کڑے پہروں اور سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود کوئی بھی چیز چرا کے لا سکتے تھے اور پھر اصل کی جگہ نقل ایسے رکھ سکتے تھے کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ ان کے ساتھ ایسے لوگ بھی تھے جو ضرورت پڑنے پر رکاوٹ یا خطرہ بن جانے والے کسی بھی شخص کو راہ سے ہٹانا جانتے تھے۔ قتل ایسے کرنا کہ وہ حادثہ یا خودکشی نظر آئے اور پھر لاش کو بھی ایسے غائب کر دینا کہ یوم حشر سے پہلے اس کا کہیں نشان نہ ملے۔ اور بد عہدی کرنے والے کو یا افشائے راز کی دھمکی دینے والے کو عبرت ناک سزا دینا' یہ سب ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھے۔

گروہ میں دوسرے درجے پر وہ لوگ تھے جو چوری ہونے والے نوادرات کو ملک سے بیرون ملک پہنچاتے تھے۔ اس کے لیے ملک کے اندر حکام سے این او سی لینے سے لے کر کسٹم والوں سے کلیئرنس لینے تک ہر مرحلے پر وہ دولت کا بلڈوزر چلاتے تھے جس کے سامنے ہر قاعدے' ضابطے اور قانون کی چٹان پس کے سُرمہ ہو جاتی تھی۔ بند راستے کھل جاتے تھے اور آنکھوں والے اندھے بن جاتے تھے۔ رشوت دینا اپنی جگہ ایک فن تھا۔ پہلے یہ اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ کیسے آسانی سے رشوت دی جا سکتی ہے اور کیسے رشوت کے جال میں پھنسانے کے لیے داؤ پیچ آزمانے ضروری ہوں گے۔ رشوت کو حق اور حلال سمجھنے والے کا مسئلہ تو سودا نقد تھا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ جو ڈرتے تھے یا رشوت کو حرام کی کمائی سمجھتے ہوں گے' ان کا خوف دور کرنے اور ایمان کو کمزور کرنے کے وسیلے تلاش کرنے پڑتے ہوں گے۔ کون مقروض ہے' کس کی بیٹی کی شادی میں مالی مجبوری حائل ہے۔ کس کو ماں باپ یا اولاد کے کسی جان لیوا مرض کے علاج کے لیے کہیں سے پیسہ نہیں مل رہا ہے چنانچہ اس نے موت کو نوشتہ تقدیر جان کے تسلیم کر لیا ہے۔ کسی کی بیوی کو گہنوں کی ہوس ہے اور کسی کی حسرت ہے کہ اس کے پاس بھی گاڑی ہو یا اپنا مکان ہو۔ آدمی اَن گنت خواہشوں کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے جن کو کاٹنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

اس طاقت ور گروہ میں تیسرے شاہ عالم جیسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے حیثیت مند ہو گئے تھے اور حیثیت سے فائدہ اٹھا کے مزید دولت سمیٹ رہے تھے۔ ایک بار کسی امریکی عہدے دار نے یہ بیان دے کر سب پاکستانیوں کی غیرت کے منہ پر طمانچہ مارا تھا کہ پاکستانی چند روپوں کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ سکتے ہیں۔ اس کا واسطہ شاہ عالم اور رب نواز جیسے لوگوں سے پڑا ہو گا کہ اس نے پوری قوم کو گالی دے دی اور یہ بھی بھول گیا کہ ایسے لوگ ہر ملک اور قوم میں ہوتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ پاکستان میں سیاست داں' تاجر اور بیوروکریٹ ہی نہیں' بے ضمیر لوگ ہر سطح پر لالچ اور خود غرضی میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اپنے خزانے بھرنے کے لیے وہ دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹ رہے ہیں اور اس کی بنیادوں کی ایک ایک اینٹ نکال کر بیچ رہے ہیں۔

رب نواز کئی تصویریں نکال کے جمی کو دکھا چکا تھا اور ان کی تاریخی حیثیت کے اعتبار سے مالیت بتانے میں کسی اچھے سیلز مین کی طرح گفتگو کے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ سب میرے وطن کا انمول خزانہ تھا جسے اغیار کو کوڑیوں کے مول بیچا جا رہا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ شاہ عالم یہ مذموم کاروبار کتنے عرصے سے کر رہا تھا اور ملک رب نواز نے اب تک نوادرات کی کتنی بڑی تعداد ملک سے اسمگل کر کے کتنا مال کمایا تھا۔ یہ سوال رب نواز سے براہ راست کیا جاتا تو وہ شک میں مبتلا ہو جاتا لیکن اس کے جانے کے بعد میں تھوڑا تھوڑا کر کے جمی سے بہت کچھ پوچھ سکتا تھا۔ میرے پاس چندا کا دیا ہوا بہترین بہانہ تھا کہ میری یادداشت پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے۔ مجھے کچھ یاد ہے' کچھ یاد نہیں۔ محتاط رہتے ہوئے اور ذہانت سے کام لے کر میں جمی سے شاہ عالم کے سب کاروباری راز معلوم کر سکتا تھا۔ ان کے پورے نیٹ ورک کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا اور اب تک ہونے والے ہر سودے کی تفصیل جان سکتا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنے ملک کے ثقافتی' تہذیبی اور تاریخی خزانے کی ہر لوٹی ہوئی چیز واپس حاصل کروں گا۔ ان لوگوں کو تباہ کر دوں گا جو خود کو پاکستانی کہتے تھے لیکن پاکستان کے تاریخی اثاثے چرا کے دشمنوں کو فروخت کر دیتے تھے اور اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ میں ان چوروں کا پتا چلاؤں گا' ان جعل سازوں کا سراغ لگاؤں گا جو اصل نوادرات جیسے نقلی نوادرات بنا کے ان دشمنوں کی مدد کر رہے تھے اور اسمگلنگ کے اس وسیع کاروبار میں ہر سطح پر ملوث کارکنوں اور سرکاری اہلکاروں کو سزا دوں گا۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا بلکہ دیکھا جائے تو میرا ارادہ ہی مضحکہ خیز تھا۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ میں کیا اور میری بساط کیا کہ میں ایک مافیا کو ختم کرنے کا سوچوں۔ وہ ایک ایسی منظم طاقت تھے جن سے نمٹنے کے لیے ایک فوج بھی

ناکافی تھی اور ایک حکومت کے وسائل بھی کم تھے۔ یقیناً وہ ہر قانون اور حکومت کے ہر ضابطے قاعدے سے زیادہ طاقتور لوگ تھے۔

لیکن صرف اس وجہ سے میں رب نواز یا جمی کی طرف سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا تھا کہ میں ان کے مقابلے میں کمزور اور بے وسیلہ ہوں۔ صرف یہ سوچ کر چوروں' ڈاکوؤں کو نہیں چھوڑا جا سکتا کہ دنیا سے چوری ڈکیتی بھلا کون ختم کر سکتا ہے۔ کوئی مہم جُو بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دنیا میں تو ہزاروں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ میں سب کو کیسے سر کر سکتا ہوں۔ بس وہ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق جتنی چوٹیوں پر فتح کا پرچم لہرا سکتا ہے' لہراتا ہے۔ باقی کام دوسرے کوہ پیما کرتے ہیں۔ بالآخر ہمالیہ کی ماؤنٹ ایورسٹ بھی ناقابلِ تسخیر نہیں رہی۔

چنانچہ میں بھی جس حد تک اس راہِ پُرخطر پر جا سکتا ہوں' ضرور جاؤں گا۔ ایک طاقت وسائل کی ہوتی ہے' دوسری ارادے کی۔ جذبے کی اور ایمان کی۔ کچھ لوگ کسی مقصد کے بغیر جنگ کرتے ہیں' کچھ جہاد کرتے ہیں۔ انہیں مادی وسائل کی کمی سے فرق نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ دشمن اگر ایک بہت بڑی اور منظم فوج ہو جن کے پاس جدید ترین اسلحہ بافراط ہو تو مٹھی بھر بے سروساماں مجاہد ان کا مقابلہ ایسے ہی کر سکتے ہیں جیسے ویت ناميوں نے امریکا کا کیا۔ فلسطینی آج بھی اسرائیل کا کر رہے ہیں یا بھارت سے کشمیری مجاہدین نبرد آزما ہیں۔

میں رب نواز اور جمی کی مافیا سے کھلی جنگ نہیں لڑ سکتا تو میں ان سے گوریلا وار کے اصولوں کے مطابق نمٹوں گا۔ انہی میں رہ کے انہیں کھوکھلا کروں گا اور سامنے آئے بغیر انہیں اس سے زیادہ نقصان پہنچاؤں گا جتنا یہ غدار اپنے چہروں پر حُب الوطنی کی نقاب ڈال کے پاکستان کو پہنچا رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔

شاید میری یہ سوچ جذباتی تھی۔ غیر عملی تھی لیکن ان وطن دشمنوں کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد میں خاموش بیٹھا تو یہ بھی وطن دشمنی ہوتی۔ مجرم کی مدد کرنا بھی جرم ہے۔ اس کی پردہ پوشی بھی جرم ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں قانون سے مدد نہیں لے سکتا تھا کیونکہ قانون کے محافظ ہی ان دشمنوں کے سب سے بڑے مددگار تھے۔ خریدے ہوئے اور بکے ہوئے لوگ۔

مجھے جو بھی کرنا تھا' خود ہی کرنا تھا۔ ملک رب نواز جیسے بہت تھے۔ میں ان سب کو نہیں للکار سکتا تھا لیکن رب نواز کے ہاتھ کاٹے جا سکتے تھے۔ ایک چور کو ضرور سزا دی جا سکتی تھی۔

جمی اور رب نواز نے یہی سمجھا کہ میں بڑے انہماک سے ہر بات سن رہا ہوں اور چوری کے مال کی تفصیل میں بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ لاہور اور لندن کے درمیان آپریٹ کرتے ہیں۔ پاکستان میں مال پہلے لاہور پہنچتا ہے اور وہاں سے لندن بھیج دیا جاتا ہے۔ لندن کے کچھ انٹرنیشنل قسم کے ڈیلر ان نوادرات کے بارے میں ساری دنیا کے لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ان میں میوزیم بھی ہیں اور نجی قسم کے کلکٹرز بھی۔ کچھ لوگ اپنے شوق کی خاطر نوادرات اکٹھے کرتے ہیں تو کچھ ان میں سرمایہ کاری کرتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کی مالیت بڑھتی ہے تو انہیں زیادہ داموں پر بیچ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے' یہ خریدار عام تاجر نہیں تھے۔ یہ طبقہ امرا کے لوگ تھے اور کچھ بہت خاندانی قسم کے شرفا تھے تو کچھ نئے دولت مند' نئے دولت مندوں کی کھیپ میں رب نواز جیسے لوگ شامل تھے جنہوں نے جائز و ناجائز کی تفریق رکھے بغیر دولت کے ساتھ شہرت بھی حاصل کر لی تھی اور معززین میں شامل ہو گئے تھے وہ صرف اپنے ذوق کی نمائش اور تشہیر کے لیے آرٹ اور نوادرات سے اپنے محلوں کو سجاتے تھے۔ انہیں تاریخ اور ثقافت سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس کی سرپرستی کر کے وہ خود کو مہذب بھی ثابت کرتے تھے۔

میری سوچ اور محویت کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب رب نواز نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تو شاہ جی پھر بات پکی؟"

میں نے چونک کے کہا "کون سی بات؟"

وہ ہنسنے لگا "ابھی خود تم سارا مال کیش پر اٹھا رہے تھے۔"

میں نے کہا "بات تو پکی ہے' بس ادائیگی کے لیے انتظام ہو جائے۔"

جمی بولا "ادائیگی کیا مسئلہ ہے۔ اگر شاہ عالم چاہے تو ایک ہفتے میں سب خریداروں سے رابطہ کر سکتا ہے اور کوئی مجبوری کا بہانہ کر کے سب سے نقد قیمت بھی لے سکتا ہے۔"

رب نواز نے سر ہلایا "لیکن میں ایک ہفتے کے لیے یہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"رسک کیسا؟ کیا تمہیں ڈر ہے کہ بیوی مارے گی؟" جمی ہنسا۔

"ایک کیس میں ابھی تک میری ضمانت کی توثیق نہیں

ہوئی ہے۔ میں کورٹ کو اطلاع کیے بغیر آیا ہوں اور یہ ایک سنگین جرم ہے۔ اس سے میری ضمانت کی درخواست بغیر سماعت کے مسترد ہو سکتی ہے اور مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

رب نواز بولا۔

"تم کب واپس جانا چاہتے ہو؟"

"زیادہ سے زیادہ پرسوں' ورنہ کل" رب نواز بولا۔

جمی نے کہا "رب نواز۔ تم اتنے غریب بھی نہیں ہو۔ تمہیں اعتبار کرنا چاہیے۔ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ تمہیں مال کی قیمت نہ ملی ہو؟"

وہ چلا کے بولا "ہاں ہوا ہے۔ اس کتے کے بچے شاہ جی نے..."

میں نے غرا کے کہا "زبان کو قابو میں رکھو ملک!"

جمی نے ہم دونوں کی طرف ہاتھ پھیلائے "ٹیک اٹ ایزی۔ ہم لڑنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں۔ شاہ عالم نے پھر تعلق استوار کیا ہے تو ہمیں مان لینا چاہیے کہ یہ سب کے مفاد میں ہے اور ہمیں پرانے اعتماد کے سہارے چلنا چاہیے۔"

"اعتماد ایسی باتوں سے بحال نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں پھر بدنیتی آگئی اور یہ پھر غائب ہو گیا تو؟"

جمی نے اس کی بات کاٹ دی "مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے اطمینان کے لیے ادائیگی کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ تم مجھ سے نقد ساٹھ ہزار پاؤنڈ لو اور جاؤ۔ اگلی کھیپ کا انتظام کرو۔"

میں نے کہا "چلو' تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب مجھ سے لے یا جمی سے مگر رقم تمہیں کل مل جائے گی۔"

رب نواز اٹھ کھڑا ہوا "پھر میں چلتا ہوں۔ میری کچھ مصروفیت ہے۔"

جمی ہنسا "تمہاری مصروفیت جولی کے پاس بیٹھی ہے۔"

میں نے کہا "اچھی مصروفیت ہے۔"

جمی نے جاتے ہی ملک کو گالی دی "باسٹرڈ۔ اسے کسی پر بھروسا نہیں۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔ خیر' اب ہم کام کی بات کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو اب تک ہم کیا کر رہے تھے؟"

وہ بولا "اب مال میرا ہے اور تم کو فروخت کرنا ہے۔ وقت کی کوئی قید نہیں' تم مجھے جب چاہو ایک لاکھ پاؤنڈ ادا کرو۔"

"ایک لاکھ پاؤنڈ۔ تمہیں ساٹھ ہزار ادا کرنے ہیں۔"

وہ بولا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ساٹھ ہزار اسے دے کر مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ ایسا کہیں ہوتا ہے کہ جتنے کا مال ہو دکاندار اتنے میں بیچ دے۔"

میں نے کہا "پھر بھی ایک لاکھ۔"

"تم کوشش کرو یا چلو' تم اسی ہزار میں مجھ سے سودا کرلو۔ ایک ہفتے میں مجھے ادائیگی کردو۔ اس کے بعد مال تمہارا۔ تم چاہو تو اسے ڈیڑھ لاکھ میں بھی بیچ سکتے ہو۔ سب تمہاری سیلز مین شپ پر منحصر ہے۔ اصل فائدہ تم اٹھاؤ گے۔ اگر دو لاکھ بھی وصول کرلو تو مجھے کیا پتا چلے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مجھے منظور ہے۔ اب ذرا مجھے متوقع خریداروں کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ کچھ حیران ہوا "متوقع خریدار! سب پرانے لوگ ہیں۔"

میں نے معذرت کی "یو سی۔ میری پرابلم ہے میری یادداشت۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جب تک لندن میں ہوں' کیوں نہ کرامویل اسپتال میں کسی اچھے نیورو سے مل لوں۔"

وہ بولا "ضرور ملو۔ میں تو کسی کو جانتا نہیں۔ میرے پاس ایک بہت لمبی فہرست ہے۔ یہ تمہارے پاس کیوں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "زبانی تو مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"لیکن تمہارے کمپیوٹر میں سب محفوظ ہے۔"

میں نے کہا "بدقسمتی سے وہ سب صاف ہو گیا۔ ایک وائرس نے سب ختم کردیا۔"

"یہ وائرس بڑا رسک ہیں۔ اسی لیے میں ایک فلاپی محفوظ رکھتا ہوں اور اس کے ساتھ اپنی ڈائری میں لکھتا ہوں" اس نے اپنی دراز کھولی۔

"تم ڈائری مجھے دے دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تم جولی سے کہو۔ وہ تمہیں ڈسک میں کاپی کردے گی لیکن کیا پتے دیکھ کر تمہیں سب یاد آجائے گا؟"

"میں کہہ نہیں سکتا۔"

جمی نے نوٹ بک کھولی "مثال کے طور پر۔ یہ لارڈ لوکس پرائس۔"

میں نے سوچنے کے لیے ماتھے پر ہاتھ رکھا "نام یاد ہے۔ اس کی ایک بیوی ہے' بہت حسین اور عمر میں بہت کم۔"

"ہر لارڈ کی ایک بیوی ضرور ہوتی ہے اور وہ عام طور پر بیویاں بدلتے بھی ہیں چنانچہ نئے ماڈل کی بیوی یقیناً حسین ہوتی ہے" جمی مسکرایا "بالکل ٹھیک۔ لارڈ کی یہ تیسری بیوی ہے۔

ایک کو اس نے چھوڑا' پھر ایک اسے چھوڑ کے کسی ایکٹر کے ساتھ رہنے لگی۔ یہ بھی ماڈل تھی لیکن بہت سینتے والی عورت ہے۔ لارڈ پرائس ایک اچھا خاصا بے وقوف پرائیویٹ کلکٹر ہے بلکہ بن رہا ہے۔"

میں نے کہا "بن رہا ہے؟"

"ہاں۔ اسے نوادرات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کی معلومات بالکل صفر ہیں مگر یہ جو نئی بیوی ہے' اس کو شوق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنا شوق ایسے ہی کسی دولت مند اور احمق لارڈ سے شادی کیے بغیر پورا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بیوی کی خوشی کے لیے خوب پیسہ خرچ کر رہا ہے اور اسے متاثر کرنے کے لیے خود بھی صاحب ذوق بن گیا ہے مگر نہ اسے چیزوں کی پہچان ہے نہ اس کی بیوی کو۔ بیوی بہت چالاک بنتی ہے کیونکہ اس کے پاس فائن آرٹس کی ڈگری ہے مگر تم جیسا سیلز مین اسے باتوں سے قائل کر سکتا ہے۔ دو سال میں ان کا گھر کاٹھ کباڑ سے بھر گیا ہے۔ جسے وہ اپنا میوزیم کہتے ہیں' وہ درحقیقت کباڑ خانہ ہے۔ اس میں ہر چیز جینوئن نہیں ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کسی نے ان کو بتایا نہیں؟"

"کون بتاتا۔ لارڈ کے سب دوست رشتے دار بھی آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اصل اور نقل کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔"

میں نے کہا "مگر نوادرات کے ڈیلر۔"

وہ بولا "جب کسی ڈیلر کو خریدار کی جہالت کا اندازہ ہوجائے تو وہ کبھی اسے صحیح چیز نہیں بیچتا۔ اسے نقل کے ایک ہزار پاؤنڈ مل رہے ہوں تو اسے کیا ضرورت ہے اصل دینے کی۔ اصل وہ جینوئن خریدار کے لیے بچا کے رکھتا ہے پھر دوسرا ڈیلر بھی یہی کرتا ہے۔ وہ نہیں بتاتا کہ دوسرے اسے الو بنا رہے ہیں۔ وہ خود اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔"

"لیکن کسی دن کوئی ایسا شخص مل گیا اسے جو اصلی اور نقلی کے فرق کو سمجھتا ہوگا اور اس نے لارڈ کو بتادیا پھر؟"

"پھر کیا۔ یا تو لارڈ سب پر دھوکے بازی کا مقدمہ کرے اور پھر کیس لڑتا رہے۔ اس میں خود لارڈ کی کتنی سبکی ہوگی۔ سب اس پر ہنسیں گے اور اس کی بیوی اونچی سوسائٹی میں تماشا بن جائے گی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے یہ صدمہ بھی برداشت کرلیں گے۔ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا اس لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے ہی تم لارڈ کو پھانس لو" وہ ہنسا۔

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے لیڈی کو۔"

وہ ہنسا "تم ہوشیار آدمی ہو۔ لیڈی پرائس کو تم نے شیشے میں اتار لیا تو سمجھو لارڈ کو خرید لیا۔ کیا پتا وہ تمہیں یکمشت ایک لاکھ پاؤنڈ کا چیک کاٹ دے۔ تمہیں ادھر ادھر زیادہ خوار نہ ہونا پڑے۔ ایک ہی جگہ سے چالیس ہزار پاؤنڈ مل جائیں وہ سب سے بہتر۔ منافع ہمارے تمہارے درمیان ففٹی ففٹی۔"

میں نے سوچ کے کہا "میں پہلے یہیں قسمت آزماتا ہوں۔ یہ مال کب تک مل سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے کل یقینی ہے" جمی بولا۔

اس نے مجھے چوالیس افراد کے نام پتے لکھوائے جو ان نوادرات کے خریدار تھے۔ بنیادی طور پر انہیں دو درجوں میں رکھا جا سکتا تھا۔ کلکٹر اور ڈیلر۔ کلکٹر وہ لوگ تھے جو اپنے شوق کی تسکین کے لیے نوادرات اکٹھا کرتے تھے اور اپنی کوئی چیز آگے کسی کو فروخت نہیں کرتے تھے۔ ڈیلر یہ چیزیں اپنی آرٹ گیلری اور میوزیم چلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس دنیا بھر سے کسٹمر آتے تھے اور خود ان کے ایجنٹ بھی نوادرات کے قدردانوں کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔

لندن میں سولہ خریدار تھے۔ ان میں سے آدھے کلکٹر تھے۔ پیرس کے آٹھ سب ڈیلر تھے۔ ایمسٹرڈیم کے چار خریداروں میں سے دو کلکٹر تھے۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں بارہ کے بارہ ڈیلر تھے جو وہاں آنے والے دنیا بھر کے دولت مندوں کو نوادرات فروخت کرتے تھے۔ میونخ میں چاروں کلکٹر تھے۔

میں نے جمی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے چوالیس خریدار ایک جیسے بے وقوف ہوں۔ تحقیق کے بغیر ہر بات مانتے جائیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تم تھوڑا بہت نہیں۔ سب کچھ بھول گئے ہو دوست۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دنیا میں کہیں کسی شعبے میں سو فیصد بے وقوف نہیں ہوتے۔ اکثریت دنیا میں بے وقوفوں کی ہے چنانچہ ہم جیسے جو اقلیت میں ہیں' فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بے وقوفوں کے بارے میں بھی یہ سمجھ لو کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ تو پیدائشی اور بے وقوفی کی قدرتی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ریڈی میڈ بے وقوف' ان کی فکر مت کرو۔ انہیں کوئی بھی مٹی کو سونا بتا کے بیچ سکتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جن کو بے وقوف بنانے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ ان کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو صرف دولت مند ہیں اور تاریخ یا

تہذیب کا مطالعہ نہیں رکھتے۔ وہ باتوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بڑی باریک بینی سے جھوٹ سچ اور اصلی نقلی کے فرق کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں قائل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ایک تو آدمی کو یہ اعتماد ہونا چاہیے اور اس کی معلومات مکمل ہونی چاہیے۔ دوسرے سب نوادرات کی PRESENTATION۔ اب تم یہ سمجھ لو کہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس کی تاریخ و تہذیب کا سلسلہ ہزاروں برسوں پر پھیلا ہوا ہے چنانچہ کوئی بھی سب کچھ جان لے، یہ ناممکن ہے لیکن انڈیا، مصر، یونان اور برطانیہ کی تاریخ اور تہذیب پر کافی مواد موجود ہے اور لوگوں کا مطالعہ بھی کافی ہے لیکن کسی دور افتادہ افریقی یا ایشیائی ملک کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تاریخ پر ایک کتاب لکھوائی جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

وہ بولا "جعلسازی ایک مشکل فن ہے دوست لیکن دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس ایک بہت ذہین مصنف ہے۔ وہ تاریخ کے ہر موضوع پر اِدھر اُدھر سے مواد اکٹھا کر کے کتاب مرتب کر دیتا ہے۔ اس میں نوّے فیصد تاریخی حقائق ہوتے ہیں اور دس فیصد یا اس سے بھی کم افسانہ طرازی۔ دس فیصد کی ملاوٹ تو واقعات کے بیان میں مورخ کرتا ہے اور یہ ساری ملاوٹ ایک جگہ نہیں ہوتی۔ کہیں ایک فیصد تو دوسری جگہ پھر ایک فیصد۔ مثال کے طور پر انڈین ہسٹری کو لو۔"

"تم انڈین ہسٹری کو کتنا جانتے ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم سے زیادہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے انڈین ہسٹری میں اسپیشلائز کیا ہے۔ اس ریسرچ کی بنیاد پر مجھے ڈاکٹریٹ ملنی چاہیے مگر ڈاکٹر جی کہلانا میرا مقصد نہیں۔ یہ ریسرچ کاروبار کی ضرورت تھی۔ یہاں ایک انڈین اسکالر ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ مجھے مل گیا اور میں نے اسے اچھی آفر کی۔ وہ بہت بددل تھا کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔ میں نے اس کا شکوہ دور کر دیا۔ جتنا اس نے میرے ساتھ رہ کے کمایا، اتنا وہ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہو کے بھی نہیں کما سکتا تھا۔ اس نے سات سال پہلے اکبرِ اعظم کے عہد پر ایک کتاب مرتب کی۔ اس میں سب وہی تھا جو دوسری کتابوں میں ملتا ہے مگر کہیں کہیں اس نے ایک واقعہ لکھ دیا۔ جو میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ تم نے جہانگیر کی زنجیرِ عدل کا نام سنا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں، یہ بات مشہور ہے کہ جہانگیر نے محل کے باہر ایک جگہ زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ انصاف کے کسی طالب کو بادشاہ سے فریاد کرنی ہوتی تھی تو وہ باہر سے یہ زنجیر کھینچتا تھا۔ زنجیر کا دوسرا سرا محل میں نصب ایک گھنٹے سے لگا ہوا تھا۔ زنجیر کھینچتے ہی گھنٹا بج اٹھتا تھا اور بادشاہ فریادی کو طلب کر لیتا تھا۔"

"رائٹ۔ کیا تم اس پر اعتبار کرتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں افسانے کو بہت دخل ہے۔"

جمی نے کہا "چلو مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی تھا لیکن بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا تاریخ میں کوئی جواب نہیں مثلاً یہ کہ زنجیر لوہے کی تھی یا سونے کی؟ گھنٹا پیتل کا تھا یا چاندی کا؟ زنجیر کتنی لمبی تھی اور کس نے بنائی تھی۔ بعد میں زنجیر کہاں گئی اور گھنٹا کہاں گیا؟"

میں نے تسلیم کیا "تاریخ میں یہ سب نہیں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ اس ہندو مؤرخ نے اکبر کے عہد کی تاریخ میں ایک جگہ لکھا کہ بادشاہ نے ایک پالتو ہرن کو باندھنے کے لیے ایک لمبی زنجیر بنوائی تھی۔ وہ باغ میں بیٹھتا تو ہرن اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا مگر وہ ایک خاص فاصلے سے آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ یہ ہرن اکبر کی ایک رانی کے ساتھ محل میں آیا تھا اور اسے بہت عزیز تھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی کی علامت کے طور پر ساتھ لائی تھی اور ڈرتی تھی کہ کہیں یہ گم نہ ہو جائے یا کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ جب اسے باہر نکالا جاتا تو اس کے ایک پاؤں میں یہ زنجیر ڈال دی جاتی تھی۔ یہ سونے کی زنجیر تھی جس کی لمبائی دو سو چالیس فٹ تھی۔ بدقسمتی دیکھیے کہ ہرن اسی زنجیر کا پھندا گلے میں پڑ جانے سے مرا۔ رانی کو سخت صدمہ ہوا اور وہ اتفاق سے بیمار ہو گئی۔ اس کو وہم ہو گیا کہ ہرن کی موت ایک بدشگونی تھی اور اب وہ بھی نہیں بچے گی۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ رانی دو مہینے بیمار رہ کے مر گئی۔ زنجیر بیت المال میں پڑی رہی۔ جہانگیر نے یہی زنجیر مظلوموں کی فریاد سننے کے لیے استعمال کی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "یہ سب جھوٹ ہے۔"

"یہ خالص جھوٹ ہے" جمی ہنسنے لگا "لیکن بہت ذہانت سے ایجاد کیا گیا ہے۔ اس کی تردید کون کر سکتا ہے۔ میں نے جہانگیر کی زنجیرِ عدل اسی کتاب کے حوالے سے بہت مہنگی فروخت کر دی تھی۔ اس کتاب میں زنجیر کا ذکر تین جگہ آیا۔

ایک جگہ یہ تھا کہ جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں نے اس کا مزار بنوایا تو یہ زنجیر مزار کے احاطے کے گرد باندھی تھی مگر اسے شاہجہاں کے دور میں چوری کر لیا گیا اور اورنگ زیب نے جب اپنے باپ اور بھائیوں کو قید میں ڈالا تو اس زنجیر سے سب کو ایک ساتھ باندھ دیا تھا۔ بس ایسی ہی بکواس سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ زنجیر بالآخر کس کے ہاتھ لگی اور سیکڑوں سال بعد کس خاندان کی تحویل میں تھی۔ جس نے زنجیر خریدی، اس نے تاریخ کی کتاب کے حوالوں کو مستند مان لیا کیونکہ لکھنے والا ایک تاریخ داں تھا۔"

"یہ تو تاریخ کو مسخ کرنے والی بات ہوئی۔"

"تاریخ سب سے مظلوم مضمون کیوں کہلاتا ہے آخر؟" جمی بولا "اور تاریخ کو کون مسخ نہیں کر رہا ہے۔ وہ جو تاریخی ناول لکھتے ہیں۔ تاریخی ڈرامے اور فلمیں بنانے والے اور متعصب تاریخ نویس، سب واقعات کو توڑتے مروڑتے ہیں اور ان میں اپنی طرف سے جھوٹ ڈال دیتے ہیں۔ سات سال پہلے لکھی جانے والی اس کتاب کو شائع کرانے پر میرے ایک ہزار پاؤنڈ خرچ ہوئے تھے۔ میں نے پروفیسر کو دس ہزار پاؤنڈ دیے لیکن اس کتاب کی مدد سے ایک لاکھ پاؤنڈ کمائے۔ اس میں مختلف چیزوں کا ذکر تھا۔ پچاس ساٹھ چیزیں میں نے اس کے حوالے سے فروخت کر دیں پھر میں نے دوسری کتاب لکھوائی۔ تین سال پہلے۔ اس میں برٹش پیریڈ کا ذکر تھا اور سیکڑوں چیزوں کا ذکر تھا جو تاریخی بن گئیں۔ پروفیسر کو پچیس ہزار پاؤنڈ ملے۔ میں نے ڈھائی لاکھ پاؤنڈ بنا لیے۔ آج کل پروفیسر کی تیسری کتاب زیرِ طبع ہے۔ اس میں ایک سو ایک چیزوں کا ذکر ہے۔ تم وہ کتاب پڑھ لو بلکہ سب کتابیں پڑھ ڈالو۔"

"کہاں سے ملیں گی یہ کتابیں؟"

وہ بولا "یہاں میرے پاس ہیں۔ بازار میں ہم نے ایک کتاب نہیں دی۔ تاریخ پر ریسرچ کرنے والے مؤرخ پروفیسر کی ایسی تیسی کر دیتے۔ آنے والی کتاب میں ٹیپو سلطان کی تلوار۔ نادر شاہ کی پگڑی اور ان سب چیزوں کا حوالہ مل جائے گا جو اب تمہیں بیچنی ہیں۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا "یعنی تم پہلے ہی طے کر لیتے ہو کہ اگلی بار کیا مال آئے گا اور اس کی مناسبت سے کتاب لکھواتے ہو۔"

وہ نیم سنجیدگی سے بولا "بزنس میں پلاننگ کی بڑی اہمیت ہے دوست اور مارکیٹنگ ایک سائنس بن گئی ہے۔ یہ دھندا جعلسازی کا ضرور ہے مگر یہ بات صرف ہم جانتے ہیں۔ دوسروں کے نزدیک ہم بے حد معزز ہیں۔ اس پیشے میں جتنی دولت ہے اتنی ہی شہرت اور نیک نامی بھی ہے۔"

"اور اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ نوادرات جعلی ہیں اور کتاب کے حوالے بوگس پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر ہمیں کیا۔ جھوٹا ہو گا پروفیسر۔ ہم تو اس کی ریسرچ کی بنیاد پر بیچے ٹھہریں گے اور پروفیسر بڑا گھاگ ہے۔ وہ جھوٹا کہنے والوں کو جھوٹا کہے گا اور اخباروں، رسالوں میں ایک علمی لڑائی چلتی رہے گی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جھوٹ بھی بولتے ہیں سند کے ساتھ۔ یہی ہماری کامیابی ہے۔"

"اور اس طرح جعلی چیز اصلی بن جاتی ہے؟"

"عام طور پر کچھ لوگ جو واقعی عقلمند ہیں کسی حوالے سے متاثر نہیں ہوتے اور خود ریسرچ کر کے اور سائنسی طریقے استعمال کر کے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہم دور رہتے ہیں۔ میرے پاس ایسے لوگوں کی فہرست ہے جنہوں نے ہمارے نوادرات کو جعلی اور ہمیں دھوکے باز قرار دے کر بھگا دیا تھا۔"

جب میں رخصت ہوا تو میرے پاس ڈاکٹر چندر موہن گپتا کی دو کتابیں تھیں۔ کتاب پر مصنف کے بارے میں بلند بانگ دعوے تھے مگر نہ اس کی تصویر تھی اور نہ اس کا پتا تھا۔ اس پر پبلشنگ ہاؤس کا پتا بھی بوگس تھا۔ یہ جمی کے بار کا پتا تھا۔ ان کتابوں کی صرف دس دس جلدیں محفوظ تھیں۔ باقی سب ضائع کر دی گئی تھیں۔

ایک پورا دن اور آدھی رات صرف کر کے میں نے دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس میں واقعی نوّے فیصد سے زیادہ تاریخ کا سچ تھا مگر اس میں بڑی ذہانت اور مہارت سے دس فیصد افسانوی واقعات ڈالے گئے تھے۔ ان کا ذکر سرسری طور پر آیا تھا مگر اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہر کتاب میں سیکڑوں چیزوں کا ذکر تھا جو تاریخی ہو سکتی تھیں مگر ان کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں گئیں یا اب کہاں ہیں؟ نور جہاں کے عطر دان (گلاب کے عطر کی ایجاد کو نور جہاں سے منسوب کیا جاتا ہے) وہ خنجر جس سے خاندانِ غلاماں کے بانی نے اپنے آقا و بادشاہ کو قتل کر کے ہند کی سلطنت حاصل کی تھی۔ وہ رسی جس سے بھگت سنگھ اور غازی علم الدین شہید کو پھانسی دی گئی تھی۔ وہ ریوالور جس سے جلیانوالہ باغ میں گولی چلوانے والے بریگیڈیئر جنرل ڈائر کو قتل کیا گیا۔ وہ قرآن جو شاہجہاں دورانِ اسیری پڑھتا تھا اورنگ زیب کی بنائی ہوئی ٹوپیاں اور جانمازیں۔ راجوں مہاراجوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں۔ جنرلوں

اور گورنر جنرلوں، رانیوں اور مہارانیوں شہزادیوں اور ملکاؤں کے ذاتی استعمال کی ہزاروں چیزیں ہوں گی جن کا آج کوئی پتا نہیں لیکن کوئی ایسی چیز سامنے آجائے اور تاریخی حوالوں سے اسے جینوئن بھی ثابت کردیا جائے تو اس کی قدر و قیمت یقیناً بہت زیادہ تسلیم کی جائے گی۔

تاریخ میں فراڈ بہت آسان ہے۔ آج اگر کوئی ایک پرانا قلم پیش کرکے دعویٰ کرے کہ یہ وہی قلم ہے جس سے قائداعظمؒ نے ۳ جون ۴۷ء کے اعلانِ آزادی پر دستخط کیے تھے اور اس قلم کی ملکیت سے منسوب ایک لمبی تاریخی کہانی ہی سنادے تو اس کی تردید کون کرے گا۔ وہ قلم یقیناً اہمیت اختیار کرجائے گا۔ کوئی ایک پرانی دو پاٹوں والی چکی لے آئے کہ یہ وہ چکی ہے جو مولانا حسرت موہانی جیل میں قید بامشقت کے دوران میں پیستے تھے۔ اور اپنے جھوٹ کو جھوٹی اسناد سے سچ ثابت کردے تو اس کی بات مان لی جائے گی۔ ایران اور افغانستان سے لائی جانے والی اور تاریخی اور مذہبی حیثیت رکھنے والی بہت سی چیزیں عقیدت اور یقین کی بنیاد پر مرجع خلائق بن چکی ہیں۔ اب جو ان کی اصلیت کو چیلنج کرے وہ مجرم۔

ان کتابوں کو پڑھ کے میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ پروفیسر گپتا جیسا اسکالر اس عمر میں دھوکے بازوں اور اسمگلروں کا آلۂ کار بن گیا اور تاریخ کے فراڈ میں شامل ہوگیا۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟ خود مؤرخ اگر تاریخ کی ایسی تیسی کرے گا تو پڑھنے والے کا کیا ہوگا؟

صبح میں نے ان کتابوں کو غصے میں پھاڑ پھینکا۔ میں نے ان چیزوں کے بارے میں مزید نہ جاننے کا فیصلہ کیا۔ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے اور مجھے کسی سے علمی جنگ نہیں چھیڑنی۔ مجھے اپنے ملک کے نوادرات کو ڈاکازنی سے بچانا ہے اور چوروں کے ایک ٹولے سے نمٹنا ہے۔ میرا واسطہ انتہائی اعلیٰ سطح کے معزز لٹیروں سے تھا جو اپنی فیلڈ میں اتنے کامیاب تھے کہ معاشرے میں باعزت مقام رکھتے تھے۔ رب نواز ایک سابق ممبر اسمبلی تھا اور آئندہ کے لیے پھر مقابلے کے میدان میں اترنے کا خواہش مند تھا۔ وہ جاگیردار اور صنعت کار بھی تھا اور اس کے جائز کاروبار کے پردے میں دوسرا کاروبار نہ جانے کب سے جاری تھا۔ اس کا ساتھی جی تھا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بھی تھا۔ وہ ایک طرف نوادرات کی مارکیٹ چلاتا تھا تو دوسری طرف بار اور نائٹ کلب۔ ایک طرف اسے ڈاکٹر گپتا جیسے تاریخ کے ماہروں کی خدمات حاصل تھیں تو دوسری طرف پیشہ ور بدمعاشوں اور قاتلوں کی۔

میرے پاس چوالیس پتے تھے۔ یہ سب رب نواز کے مال کے خریدار تھے اور ان سب سے مل کے یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ گزشتہ برسوں میں انہوں نے پاکستان سے آنے والے تاریخی اہمیت کے حامل کتنے نوادرات حاصل کیے تھے۔

سوال یہ ہے کہ ان معلومات کو حاصل کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟ کیا میں وہ سب چیزیں جو ازروئے قانون پاکستان کا تاریخی اثاثہ ہیں، میں واپس لے جاسکتا ہوں؟ چور کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہوجائے تب بھی مالک کو عدالت میں اپنا حق ملکیت ثابت کرنا پڑتا ہے اور عدالت کے حکم کے بغیر مالک کو کچھ نہیں ملتا۔ میں کیسے ثابت کروں گا کہ نوادرات چوری کرکے لائے گئے تھے۔ ان کی جگہ تو نقل رکھ دی گئی ہے۔ اگر کسی میوزیم کا ڈائریکٹر جو خود شریکِ جرم ہے یہ کہے کہ چوری، کیسی چوری؟ وہ چیز تو اپنی جگہ موجود ہے اور اصلی ہے تو اس کے مقابلے میں میری بات کون سنے گا؟

نہیں، یہ اب ناممکن ہے۔ چوری ہوکے بازار میں فروخت ہوجانے والا مال کسی جائز اور قانونی طریقے سے واپس حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اسے واپس حاصل کرنے کے دوسرے طریقے ہیں۔ چوری کا مال چرا کے واپس لایا جاسکتا ہے۔ میں چوری کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا۔ کسی عدالت میں فریاد نہیں کرسکتا۔ گھر کے رکھوالے خود چوروں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں تو چور کو چور کون کہے۔ میں کسی سرکاری ادارے یا حکام کی تائید و حمایت حاصل نہیں کرسکتا۔ پاکستان کا تاریخی ورثہ چوری ہوگیا؟ کون کہتا ہے؟ اور کہتا ہے تو کہنے دو۔ تم کیا خدائی فوجدار ہو، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میں کچھ نہیں کرسکتا مگر یہ تو کرسکتا ہوں کہ انگریزی محاورے کے مطابق ان کو انہی کے سکوں میں ادائیگی کروں۔ مجھے جہاں اپنی چوری کا مال نظر آئے میں چوری کرکے بھاگ جاؤں۔

نہ جانے کب تک میں انہی دماغ کو خراب کرنے والے چکروں میں الجھا رہتا۔ دوپہر کے بعد پاکستان سے فون آنے لگے۔ سب سے پہلے چندا نے فون کرکے مجھ سے میری خیریت پوچھی اور اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔

"تم کب تک واپس آرہے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی طے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ ہفتہ دس دن لگ جائیں گے۔ مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔"

وہ بولی "ناصر۔ تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔ تمہاری باتوں میں آکے میں واپس آگئی لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں پھر لندن نہیں آسکتی۔"

میں نے کہا "تم کیا کروگی لندن آکے۔ تمہارا کام وہاں ہے۔"

"اور تمہیں کوئی کام نہیں ہے تو تم جی اور قادر بخش جیسے لوگوں کے ساتھ الجھنے کے لیے وہاں رک گئے ہو۔ خدا کے لیے کسی چکر میں مت پڑو۔"

میں نے کہا "جس کام کے لیے میں آیا ہوں، وہ ابھی نہیں ہوا۔ نہ میں تمہارے ساتھ آیا تھا اور نہ کسی چکر میں پڑنے۔"

"میں نے بڑی غلطی کی کہ تمہیں اکیلا چھوڑ آئی۔"

میں نے برہمی سے کہا "خواہ مخواہ میری گارجین مت بنو۔ میں اپنے معاملات کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تمہاری موجودگی میرے لیے زیادہ مسائل پیدا کرے گی۔"

چندا کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ وہ میرے رویے سے مایوس بلکہ کچھ ناخوش اور ناراض ہوئی۔ اس کے فوراً بعد شبنم کا فون آگیا۔ اس نے میرا نمبر چندا سے حاصل کیا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ پُرسکون اور مطمئن تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے لیے دو آفس حاصل کرنے کے بعد وہ انہیں ذاتی نگرانی میں فرنش کرا رہی ہے۔ اس کے لہجے میں نہ شکایت تھی نہ پریشانی۔ چندا کے اکیلے واپس لوٹ جانے سے اس کا اعتماد بحال ہوگیا تھا اور اس نے مفاہمت کا رویہ اختیار کرلیا تھا۔

تیسرا فون فرید عباسی کا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے پلان میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ "کب تک دفنا رہا ہے تو شاہ عالم کو؟"

میں نے کہا "یار، یہ سب اتنا آسان نہیں۔ یہاں پہنچتے ہی خواہ مخواہ کی ایک مصیبت گلے پڑ گئی۔"

"تو چندا کو مصیبت کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "کیا تیری بات ہوئی اس سے؟"

"اس سے تو نہیں مگر کمال سے ہوئی تھی۔ تیرا فون نمبر اسی سے ملا۔"

میں نے کہا "چندا نے کیا شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے؟"

وہ بولا "ڈھنڈورے کے بچے۔ تو نے خود کیوں نہیں بتایا تھا اپنا فون نمبر؟ جب سے گیا ہے کسی کی یاد ہی نہیں آئی۔ ہم کہاں فون کرتے؟"

میں نے کہا "شبنم تو ہر روز یاد کرتی تھی۔ کل تک میں ہوٹل میں ہی تھا۔ کل یہاں رب نواز سے بھی ملاقات ہوگئی۔"

"رب نواز لندن میں ہے؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"وہ آیا ہے شاہ عالم کی لندن میں موجودگی کی تصدیق کرنے کے لیے اور میری اس سے طویل ملاقات رہی۔ بہت سے کاروباری معاملات طے ہوگئے۔ اب اسے کوئی شک نہیں رہا کہ میں شاہ عالم ہوں اور واقعی لندن میں رہتا ہوں۔ آج میں اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔"

فرید ہنسا "اپنی بیوی سے بھی ملوا دینا۔"

میں نے کہا "بیوی کا بندوبست ابھی نہیں ہوا یار!"

"رب نواز کی ضمانت کی منسوخی کے لیے ہم نے ہائی کورٹ کی ڈویژن بنچ میں درخواست لگادی ہے۔ اس کی ابتدائی سماعت سے پہلے ہی رجسٹرار نے کچھ اعتراضات کیے تھے۔ وہ ہم نے دور کردیے۔ شاید چار دن بعد اس کی سماعت ہوگی۔"

"رب نواز تو یہاں لندن میں بیٹھا ہے۔"

"اسے واپس آنا پڑے گا۔ ویسے تو اس کا پاکستان سے باہر جانا ہی جرم ہے۔ وہ عدالت سے اجازت لیے بغیر گیا ہے۔"

فرید آدھے گھنٹے تک باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ یہاں پیش آنے والے واقعات بتادیے۔ وہ مجھے محتاط رہنے اور کسی جھگڑے میں نہ پڑنے کی تاکید کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ "دیکھ میاں! تو جس کام سے گیا تھا؟ وہ کر اور واپس آجا۔"

میں نے کہا "فکر مت کر، ایسا ہی ہوگا۔"

"یہ جو دنیا کے دھندے ہیں نا۔ لڑکیاں جارہی ہیں یا بھیجی جارہی ہیں، دنیا کے بازار میں ہر قسم کے دھندوں کے لیے یا بچے بک رہے ہیں مڈل ایسٹ میں۔ اسمگلنگ ہورہی ہے چیزوں کی اور انسانوں کی۔ لڑکیاں ناچ رہی ہیں نائٹ کلبوں میں اور STRIPTEAS سے جسم فروشی تک کررہی ہیں۔ تو یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں۔ یہ دنیا بھر میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

میں نے کہا "میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سر!"

"قادر بخش اور حاجی کے کاروبار پر بھی لعنت بھیج۔ تو فانٹ کوئی پیپر میرج کرا اور واپس آجا۔ یہاں تیرے لیے بہت کام پڑے ہوئے ہیں۔"

میں نے اسے بھی وہی کہا جو چندا سے اور شبنم سے کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ رخشی نے بھی مجھ سے مختصر بات

کی پھر میں نے کہا کہ مجھے کام سے جانا ہے اور ابھی فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی "یا میرے خدا' کیا سب نے ایک ساتھ' ایک ہی وقت میں فون کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

میرے ہیلو کہنے پر قمر کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگی "کیا بھائی۔ ولایت پہنچتے ہی تمہارا خون بھی سفید ہو گیا۔ سب کے ساتھ بہن کو بھی بھول گئے۔ وہ تو ایک ہی تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "یہ کیا ہے۔ نہ سلام نہ دعا' سات سمندر پار اکلوتے بھائی پر چڑھائی کردی۔ یہ تو پوچھ لے کہ بھائی سب خیریت ہے نا؟"

وہ ہنسنے لگی "تمہاری پل پل کی خیریت چندا سے مل گئی۔ وہ تو جب سے آئی ہے نا بھائی' بالکل ہی بدل گئی ہے۔ وہی پہلے والی چندا بن گئی ہے۔ کیا جادو کیا ہے اس پر تم نے بھائی!"

میں نے کہا "ہم بڑے باکمال مداری ہیں بہنا۔"

وہ ہنسنے لگی "سنبھل جاؤ بھائی۔ ورنہ دو مرغیوں میں ملا حرام' الٹا محاورہ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "تو ملاجی کی فکر مت کر۔ ذرا چندا کو سمجھا کہ یہاں میری مصروفیات کے بارے میں کسی سے بات نہ کرے۔ فی الحال پہلے کی طرح لاتعلق رہنا ہی بہتر ہے۔ جب تک کہ یہ شاہ عالم کا قصہ تمام نہیں ہو جاتا۔ وہ ناصر کے ساتھ نہیں شاہ عالم کے ساتھ لندن آئی تھی' یہ بات نہ بھولے۔"

"تم بھی ایک بات مت بھولنا بھائی! اگر تم چاکلیٹ لے کر نہ آئے نا تو۔"

"تو کیا جہاز نہیں اترنے دے گی پاکستان میں؟"

وہ بولی "گھر میں نہیں گھسنے دوں گی اپنے' دیکھ لینا۔ دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

میں نے کہا "مت کھولنا۔ میں دیوار پھاند کے اندر آجاؤں گا۔ نقب لگا کے گھس جاؤں گا۔ یہ بتا سونی یا نیلم نے پوچھا میرے بارے میں؟ ر میں نے فون کیا؟"

وہ بولی "نہیں' مجھ سے تو کسی کی بات نہیں ہوئی لیکن میں نے سنا ہے بھائی کہ وہ بھی لندن میں ہیں۔"

"کون لندن میں ہے؟"

"وہی' تمہاری نیلم اور کون۔ اس کی کسی فلم کی شوٹنگ ہے وہاں۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا فلمی صفحے پر۔"

میں نے کہا "کون سی فلم کی شوٹنگ ہے؟"

وہ بولی "نام تو یاد نہیں مگر بھائی' خبر میں یہ تھا کہ فلم کا یونٹ لوکیشن شوٹنگ کے لیے دو ہفتے لندن میں قیام کرے گا۔ کہو تو معلوم کرکے بتاؤں؟"

میں نے کہا "رہنے دے۔ یہاں سفارت خانے سے پتا چل جائے گا۔ انہوں نے این او سی وغیرہ حاصل کیا ہوگا۔ سفارت خانے کے ذریعے۔ کیا وہ سونی کو اکیلا چھوڑ گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم بھائی!"

"کمال ہے۔"

"وہ تو اسپتال چلے گئے" قمر بولی۔

میں نے کہا "میں اس الو کے پٹھے کو نہیں پوچھ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور فرید نے بھی۔ میں نیلم کے گھر فون کرتا ہوں۔"

نیلم کے پرائیویٹ فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی لیکن ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ عام طور پر نیلم کی غیر موجودگی میں یا تو خالہ کال ریسیو کرلیتی تھیں دوسرا فون نمبر آفس کا تھا لیکن نیلم پاکستان میں نہ ہوئی تو شام کے وقت آفس میں کون ہوگا؟ قمر کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی تھی مگر نیلم نے سونی کو کہاں چھوڑا؟ اگر سونی گھر میں ہی ہے تو یہ خاصی تشویش کی بات ہے۔ نیلم کے لندن جانے کی خبر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ بالآخر یہ بات ملک رب نواز کو بھی معلوم ہو جائے گی۔

اچانک میرے ذہن میں بہت سے سوالات نے یلغار کی۔ کیا نیلم کو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ اسے لندن جانا ہے؟ اسے ضرور معلوم ہوگا۔ شوٹنگ کا شیڈول تو بہت پہلے بن جاتا ہے پھر اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ فرید کو یا شبنم کو کیوں نہیں بتایا۔ وہ شبنم سے پوچھتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں لندن میں ہی ہوں۔ وہ مجھ سے رابطہ کرسکتی تھی۔ روانگی سے پہلے ہی مجھے فون پر بتا سکتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سونی کو بھی اپنے ساتھ لے آئی ہو؟ سونی کے پاس نہ شناختی کارڈ تھا اور نہ پاسپورٹ مگر نیلم کے لیے ان چیزوں کا حصول کوئی مسئلہ نہیں بن سکتا۔ اسے تو پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس ایک اشارہ کافی ہے۔ اس کا کوئی پرستار دونوں چیزیں لاکے اس کے قدموں میں رکھ دے گا۔ رہا سوال ویزے کا تو فلم یونٹ کے ساتھ سونی کا آنا کیا مشکل ہے۔ نیلم اصرار کرے تو اس کو کاسٹ میں شامل دکھایا جا سکتا ہے۔ ہیروئن تو سونی بھی لگتی ہے۔

میں نے ایک بار پھر نیلم کے گھر فون کیا۔ گھنٹی پھر مسلسل بجتی رہی۔ میں مایوس ہوکے ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ بانو خالہ کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی "ارے کون ہے کم بخت۔ چین سے نہیں بیٹھنے دیتا دو گھڑی۔"

میں نے کہا "بانو خالہ' آداب۔ میں ناصر بول رہا ہوں۔"

"ارے تم ہو۔ میں سمجھی وہی ہے' بہت دیر سے فون پہ فون کیے جا رہا ہے۔ نام نہیں بتاتا۔ کہتا ہے نیلم سے بات کرنی ہے۔ پتا نہیں کس نے یہ نمبر دے دیا اسے۔ اب میں سمجھا رہی ہوں کہ نیلم یہاں نہیں ہے۔ لندن گئی ہے تو مان کے نہیں دے رہا۔ خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔"

میں نے کہا "بانو خالہ۔ میں بھی لندن سے بول رہا ہوں۔"

انہوں نے بدمزگی سے کہا "کیا؟ یعنی تم وہاں بھی ساتھ ہو؟"

میں نے کہا "میں نیلم کے ساتھ نہیں آیا۔ پہلے سے یہاں تھا۔ مجھے تو ابھی پتا چلا ہے اس کے آنے کا۔ وہ کہاں ہیں لندن میں؟"

"ہائے بیٹا' مجھے کیا پتا۔ میں کون سا لندن میں رہی ہوں۔ ہوگی کسی ہوٹل میں۔ مجھے تو پرسوں اچانک ہی بتایا کہ لندن جا رہی ہوں' دو ہفتے کے لیے۔"

میں نے کہا "یعنی آپ کو بھی پروگرام کا علم نہیں تھا؟"

"ویسے تو بتا دیتی ہے کہیں جانا ہو تو۔ اس مرتبہ شاید اچانک ہی جانا پڑا ہوگا" خالہ نے کہا "تم وہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں تو آیا تھا اپنے بزنس کے سلسلے میں۔ یہ بتائیں کہ سونی کہاں ہے؟"

"اے لو۔ جہاں نیلم وہاں سونی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

میں نے کہا "یعنی سونی بھی لندن پہنچ گئی ہے؟ اچھا خالہ' اب نیلم فون کرے تو اس سے پوچھ لیں کہ وہ کس ہوٹل میں ہے۔ حیرت ہے کہ اس نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔"

"اطلاع کیسے دیتی اور کہاں دیتی۔ تم نے ایک بار بھی فون کیا اسے لندن جا کے؟ نیلم خود پریشان تھی اسی وجہ سے۔ اس نے پوچھا تھا اس اخبار والی لڑکی سے تو اس نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے کہا "کیا؟ شبنم نے کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ بس یہی پتا چلا تھا نیلم کو کہ تم لندن میں ہو۔ شبنم نے کہا کہ فون نمبر وغیرہ کا تو اسے بھی علم نہیں تھا پھر نیلم کیا کرتی؟"

میں نے کہا "اچھا خالہ۔ میں معلوم کرلوں گا کہ وہ کہاں ٹھہری ہے' آداب۔"

فون رکھنے سے پہلے ہی مجھے شبنم پر سخت طیش آیا۔ اس نے جانتے بوجھتے یہ حرکت کی تھی کہ نیلم کو میرا فون نمبر اور ہوٹل کا نام نہیں بتایا تھا حالانکہ خود اس نے فون کر کر کے میری زندگی مشکل کر رکھی تھی۔

میں نے سوچا کہ اسے ابھی فون کرکے کھری کھری سناؤں کہ ایڈیٹر ہو جائے یا جنرل' عورت وہی ناقص العقل مخلوق رہتی ہے۔ خصوصاً معاملاتِ عشق میں تو ان کی یہ ناقص عقل بھی جواب دے جاتی ہے۔ اب بھلا نیلم کو میرا فون نمبر اور میرے ٹھکانے کے بارے میں نہ بتانے سے کیا ہوگا؟ آج نہ سہی' کل تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ نیلم جس فلم یونٹ کے ساتھ پاکستان سے آئی ہے وہ کہاں ہے؟ اور پھر نیلم کے معاملے میں یہ رقابت اور حسد کے جذبات آخر کیوں؟ ہزار بار سمجھا چکا ہوں کہ اس کے اور میرے رشتے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ میری محسن ہے اور ایک تنہا عورت ہے۔ اس اکیلے پن کے احساس نے اور بے غرضی نے ہی ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے ورنہ اسے چاہنے والوں کی کیا کمی!

کچھ دیر میں میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو میں نے شبنم سے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ہر بے وقوفی کا سب سے اچھا جواب یہی ہوگا کہ اسے نظر انداز کردیا جائے۔ غلط حرکت کرنے والے کو بڑی مایوسی ہوتی ہے جب اس کا ردِعمل سامنے نہ آئے۔ نیلم کا معاملہ تو نہ جانے کیوں سب کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ کوئی یقین کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان صرف خلوص اور اپنائیت کا رشتہ گزشتہ دس برسوں سے بے غرضی کی بنیاد پر قائم ہے۔ شاید اس لیے کہ نیلم ایک ایکٹریس تھی۔ طے شدہ طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ ہر ایکٹریس پوری نہ سہی' آدھی طوائف ضرور ہوتی ہے۔ وہ کسی شریف خاندان کی بہو نہیں بن سکتی اور اس کا تعلق لازمی طور پر اس بازار سے ہوتا ہے۔ وہ پیار محبت' نیکی اور شرافت کا مطلب کیا جانے۔ وہ صرف پیسے سے پیار کرتی ہے۔ انسانوں سے اس کا پیار محض دھوکا ہوتا ہے' صرف ایکٹنگ۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آتا جب وہ ایکٹریس نہ ہو اور صرف عورت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ یہ بھی کسی کی عقل میں نہیں آتا تھا کہ میرے جیسا شخص اس کو وہ عزت اور اہمیت دے سکتا ہے جو معاشرے میں کسی معزز خاندانی عورت کو حق کے طور پر حاصل رہتی ہے خواہ کردار کے اعتبار سے معاملہ اس کے برعکس ہو۔ نیلم کے لیے میرے حقیقی جذبات وہی تھے جو قمر کے لیے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ قمر مجھ سے چھوٹی تھی اور

نیلم عمر میں کم نظر آنے کے باوجود مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ قمر کے لیے مسلسل قربت کے باعث میں زیادہ جذباتی تھا اور نیلم سے اتنا بے تکلف بھی نہیں تھا۔

میں نے پاکستانی سفارت خانے میں فون کیا تو کلچرل اتاشی سے میری باقاعدہ لڑائی ہو گئی۔ اس کا انداز خالص بیوروکریٹس والا تھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا "دیکھیے مسٹر شاہ عالم۔ میرا بزنس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ کمرشل اتاشی سے بات کریں۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ یہ بات تو مجھے آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ فلم اسٹار نیلم کہاں ہیں؟"

"میں کسی فلم ایکٹریس کا سیکریٹری نہیں ہوں۔ کلچرل سیکریٹری ہوں اور میں کسی نیلم کو نہیں جانتا۔"

"آپ نیلم کو نہیں جانتے؟ پاکستانی فلموں کی نمبر ون ایکٹریس ہے وہ۔"

"ہوگی مگر میں پاکستان کی فلمیں نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "اور آپ بنے ہوئے ہیں کلچرل سیکریٹری۔"

وہ خفگی سے بولا "فلموں کا کلچر سے کیا تعلق؟ مجھے معلوم ہے کہ پنجابی اور پشتو فلموں میں کس قسم کا کلچر پیش کیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ سے فون پر بحث نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ نیلم جس فلم یونٹ کے ساتھ آئی ہے، وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"آپ میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "کیوں؟ کیا آپ کے توسط سے انہوں نے لندن میں شوٹنگ کی اجازت نہیں لی ہوگی؟"

"لی ہوگی مگر یہ تو آپ کو کوئی کلرک بھی بتا سکتا تھا۔"

میں نے کہا "آپ بتا دیں گے تو کیا آپ کی شان میں فرق آ جائے گا۔"

وہ برہم ہو گیا "میں یہاں لوگوں کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔"

میں نے کہا "سفارت خانہ اور کس لیے ہے۔ ہر پاکستانی کا مسئلہ حل کرنا آپ کے فرائض میں شامل ہے اور آپ کو اگر پاکستان سے آئے ہوئے فنکاروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو آپ کو کلچرل سیکریٹری کی کرسی پر بیٹھنے کا کیا حق ہے؟ آپ مجھے کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا سمجھنے کی غلطی مت کریں۔ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

"دھمکی دے رہے ہیں آپ مجھے؟"

"یس۔ یہ کھلی دھمکی ہے اور اگر کل صبح پاکستان کے کم سے کم ایک بڑے اخبار میں آپ کے غیر ذمے دارانہ اور "ان کلچرڈ" رویے کے بارے میں رپورٹ نہ آئی تو میرا بھی نام۔"

ایک دم اس کا لہجہ بدل گیا "آپ تو خفا ہو گئے بلاوجہ۔ میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ ہولڈ کریں پلیز۔!"

میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں لوگوں کا رویہ کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ شرافت کی زبان میں بات کرنے سے بات نہیں بنتی اور حالات کو دیکھ کے تو ایسا لگتا ہے کہ وقت بہت دور نہیں ہے جب سلام کا جواب دینے کے لیے بھی لوگ سفارش یا رشوت طلب کریں گے یا بدمعاشی کے ڈر سے جواب دیں گے۔ شرافت سے صرف ذلت ملے گی۔

چند منٹ بعد کلچرل سیکریٹری صاحب نے فرمایا "مسٹر ناصر۔ فلم یونٹ نے ریجنٹ پارک میں لندن کے چڑیا گھر اور قریب ہی مادام تساؤ کے مومی میوزیم کی لوکیشن پر شوٹنگ کا اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یونٹ کہاں ٹھہرا ہوا ہے مگر خود مس نیلم وہیں پارک روڈ کے ہوٹل گریس میں ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو!"

وہ بولا "آپ کا کوئی اخبار بھی ہے؟"

میں نے کہا "شبنم فاروقی کا نام سنا ہوگا آپ نے؟"

"بالکل سنا ہے۔ انہیں کون نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "واقف ہیں میری اور اس اخبار میں میرے بھی شیئرز ہیں۔ پچاس فیصد سے زیادہ۔"

"پھر تو آپ ہی مالک ہوئے نا" اس کا لہجہ اب دوستانہ بلکہ خوشامدانہ ہو گیا "بات یہ ہے ناصر صاحب کہ ہمارے فنکار بھی کام کے سلسلے میں ہم سے رابطہ ضرور کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمیں گھاس نہیں ڈالتے۔ کسی شو میں بلانے کا تکلف بھی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "فنکار تو فنکار ہوتے ہیں۔ ان کا کام کسی کو گھاس ڈالنا نہیں ہوتا اور آپ خدانخواستہ گدھے تو نہیں ہیں" اور فون رکھ دیا۔

ایک بددماغ بیوروکریٹ کا دماغ درست کرنے کے لیے میں نے جس جھوٹ کا سہارا لیا تھا، اس نے کلچرل سیکریٹری صاحب کی ساری اکڑفوں نکال دی تھی۔ بیرونِ ملک پاکستانیوں کے ساتھ سفارت خانوں کے غلط سلوک اور عدم

اعتنائی کی شکایات بہت عام ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ جو لوگ سیاسی دباؤ یا رشوت اور سفارش کے بل پر سفیر بنا دیے گئے ہیں یا سفارت خانوں میں اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہیں، وہ نااہل ہیں اور انہیں احساس ہی نہیں کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں اور یہ منصب کس قسم کی ذمے داریوں کا متقاضی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو صاحب پریس اتاشی بنے بیٹھے ہیں، جو اخبار پڑھنے کی زحمت تک نہیں کرتے اور پی آر کے نام سے ناواقف ہیں۔ کلچرل سیکریٹری صاحب وہ ہیں جن کا سارا بیک گراؤنڈ ایگری کلچر سے تھا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ پاکستان کا امیج بگاڑ ہی سکتے ہیں بقول شاعر۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

میں نے ہوٹل گریس فون کیا تو ایک شوخ قسم کی خوش اخلاق ریسپشنسٹ نے کہا "مس نیلم۔ وہ خوبصورت خاتون جو پاکستان سے آئی ہیں، فلم ہیروئن ہیں؟"

میں نے کہا "آپ کی دونوں باتیں صحیح ہیں۔"

"آپ کا تعلق بھی فلمی دنیا سے ہے؟"

میں نے کہا "میں فلمیں پروڈیوس کرتا ہوں۔"

اس نے ایک خوشی کی چیخ ماری "مجھے یقین نہیں آتا۔ کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟"

میں نے کہا "یقیناً۔ جب میں نیلم سے ملنے آؤں گا تو آپ ہی سے ملوں گا۔"

"OH. I AM SO EXCITED" وہ بولی "کیا نام ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "سید محمد شاہ عالم لیکن تم مجھے شاہ جی کہہ سکتی ہو۔"

"ساں زی۔" اس نے گنگناتے ہوئے دہرایا "بالکل فرنچ ہے یہ تو۔"

میں نے کہا "کیا اب آپ مجھے بتائیں گی کہ نیلم موجود ہے؟"

وہ بولی "میرا نام تو مارلن فرگوسن تھا مگر میں نے اسے مارلن منرو کروا دیا ہے۔ یو سی، ایک تو میں بہت بڑی فین ہوں اس کی۔ دوسرے، لوگ کہتے ہیں کہ میں اس جیسی ہوں، صرف میری صورت ہی نہیں، میرے فگر۔۔۔"

میں نے کہا "ول یو پلیز شٹ اپ۔ میں نے تم سے نیلم کے بارے میں پوچھا تھا۔"

وہ ڈر گئی "او آئی ایم سوری سر! وہ تو موجود نہیں ہیں لیکن جب وہ رات کو آئیں گی تو میں انہیں آپ کا نام ضرور بتا دوں گی۔ کیا ان کی یہ فلم بھی آپ پروڈیوس کر رہے ہیں جس کی شوٹنگ ریجنٹ پارک میں جاری ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا۔ فلموں میں خودنمائی کا جنون ایک عالمی بیماری ہے اور بزعم خود مارلن منرو کو ایک فلم پروڈیوسر کا نام سنتے ہی دورہ سا پڑ گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور دوسرا فون جمی کو کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ رب نواز اپنا مال کلیئر کرانے گیا ہوا ہے اور امید ہے دو گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں دو گھنٹے بعد آؤں گا۔"

وہ بولا "نہیں۔ آج ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ میرے بار کی ایک ڈانسر تمہاری ہی ہم وطن ہے۔ دو انڈین لڑکیاں ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا "جمی۔ میں انڈین کہے جانے کا سخت برا مانتا ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

وہ بولا "مجھے پتا ہے لیکن فرق تو صرف لیبل کا ہے ورنہ انڈین پاکستانی ایک ہی ہوتے ہیں۔ خیر، اس لڑکی کا کوئی چاہنے والا پیدا ہو گیا تھا جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بڑی پرابلم ہے ہماری۔ ہم بڑی مشکل سے کسی کو ڈانسر بناتے ہیں اور جب اس پر ڈیمانڈ کرنے لگتے ہیں تو اسے سوجھ جاتی ہے گھر بسانے کی۔ میں نے اس رومیو کی ٹھیک ٹھاک پھینٹی لگوائی۔ ہڈیاں تڑوا دیں اس کی دوبار لیکن وہ باز نہیں آیا۔ وہ لڑکی بے وقوف پر یگننٹ ہو گئی۔ وہ چھوڑ کے جانا چاہتی تھی۔ کہنے لگی کہ نوٹس کا پیریڈ پورا ہو گیا۔ میں آج ڈانس نہیں کروں گی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا کہ نئی لڑکی کے آنے تک رک جاؤ تو شور کرنے لگی۔ میں نے اسے مارا تو اس کا ابارشن ہو گیا اور مصیبت گلے پڑ گئی۔ اس کا عاشق بھی بہت حرامی ہے۔ کہتا ہے کہ شرافت سے لڑکی کے واجبات اور دس ہزار پاؤنڈ جرمانہ ادا کرو ورنہ پولیس کیس کر دوں گا۔"

میں نے کہا "تمہیں دھمکی کا کیا ڈر؟"

وہ بولا "تم نہیں سمجھتے۔ میں تو دس ہزار پاؤنڈ میں بہت سستا چھوٹ رہا ہوں۔ وہ ایک لاکھ پاؤنڈ بھی مانگ سکتی ہے اور مجھے دینے پڑیں گے۔ اس کیس میں کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے جیل بھی ہو سکتی ہے۔ میں یہ معاملہ نمٹانے جاؤں گا۔ تم رات کو آ جاؤ۔ کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔"

میں نے کہا "کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں۔ رات کو مجھے کسی سے ملنا ہے۔"

وہ ہنسا "اوکے اوکے۔ عیش کرو۔ رات بنی ہی اس لیے ہے۔ دنیا کے کام دن میں ہو سکتے ہیں۔"

ایک ٹیکسی نے مجھے ریجنٹ پارک پہنچادیا۔ ایک پاکستانی فلم کی شوٹنگ لوکیشن تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہاں کچھ لوگ ایک حلقہ بنائے خاموشی اور حیرت سے ایک گانے پر ڈانس فلمائے جانے کا سین دیکھ رہے تھے۔ ہیرو اور ہیروئن مخصوص پاکستانی اسٹائل میں اور سنسر کی مقرر کردہ اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے پیار کا اظہار کررہے تھے۔ بیک گراؤنڈ میں گانا جاری تھا۔ ہیرو ہیروئن صرف ہونٹ ہلا رہے تھے۔

یہ صورت حال پاکستان میں ہوتی تو مجمع بے قابو ہوجاتا اور شاید لاٹھی چارج کی نوبت آجاتی مگر یہاں اول تو بہت کم لوگ تھے جو ذرا سی دیر کے لیے رکتے تھے پھر یہ جانے بغیر کہ یہاں کیا ہورہا ہے' اپنی راہ لیتے تھے۔ جو لوگ کھڑے تھے وہ بھی خاموش تھے کیونکہ شوٹنگ کے لیے مخصوص علاقے میں ایک چھوٹے سے بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے' پلیز ڈسٹرب نہ کیجئے۔ وہاں صرف ایک پولیس مین تھا جو ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔

عام لوگوں کے ساتھ میں نے کافی فاصلے پر رک کے شوٹنگ میں وقفے کا انتظار کیا۔ سگریٹ منہ میں دبائے ایک عورت میرے پاس آکے ٹھہر گئی۔ اس کا ہیئراسٹائل' میک اپ' لباس کے نام پر بے لباسی کا شوق۔ اس کے جسم سے نشر ہونے والی خوشبو سب بہت ہیجان انگیز تھے۔

"یہاں کیا ہورہا ہے؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑا بور کام ہے۔ شوٹنگ صرف دیکھنا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "پھر بھی ہم دونوں یہی کررہے ہیں۔"

وہ ہنسی "ہم دونوں اس سے زیادہ دلچسپ مصروفیت میں اچھا وقت گزار سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو۔ اور تمہارا خرچ بھی زیادہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بہت ہے۔ پیسہ بالکل نہیں ہے۔ تم کہیں اور قسمت آزماؤ۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اور زیرلب کچھ کہہ کے چلی گئی پھر اچانک نیلم کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس سے بڑی گڑبڑ ہوئی۔ وہ ہیرو کی بانہوں سے نکل کے اور اسے بیزاری سے دور دھکیل کے میری طرف لپکی۔ ہیرو' کیمرامین اور ڈائریکٹر ایک ساتھ چلائے۔ میں نے اسے روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

"تم آگئے ناصر۔ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔"

میں نے خود کو چھڑایا "نیلم۔ کیا کررہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"بھاڑ میں گئے لوگ۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر کہ میں کیا بتاؤں۔"

میں نے کہا "سونی کہاں ہے؟"

"سونی ابھی تو یہاں تھی۔ اُدھر وینڈنگ مشینیں لگی ہوئی ہے۔ گئی ہوگی کوک یا کافی لینے" وہ بولی "یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔ میں تو گریس ہوٹل میں ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔"

وہ ہنسی "مجھے پتا تھا کہ تم ہمیں ڈھونڈ لوگے۔ میں نے سونی سے بھی کہا تھا۔ وہ بہت بے چین تھی۔ لو وہ آگئی۔ ذرا دیکھو اسے۔"

میں نے دیکھا تو شرٹ بلیزر اور جاگرز کے ساتھ سر پر چھجے والا ٹنکوں کا کاؤبوائے ہیٹ پہنے ایک لڑکی کافی کے مگ سے چسکیاں لیتی آرہی تھی۔ ابھی تک اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ "یہ۔ یہ سونی ہے؟" میں نے کہا۔

نیلم بولی "نہیں۔ ہم اسے عینی رضا کے نام سے ساتھ لائے ہیں۔ عینی میرا میک اپ کرتی تھی۔"

سونی نے قریب آکے مجھے دیکھا اور تیر کی طرح ہماری طرف آئی "ناصر۔ تم۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ چلائی۔

میں نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا "مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے اپنا؟"

وہ ہنسی "جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں انجوائے کررہی ہوں یہ آزادی۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔"

"مگر ایسے تم بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی ہو۔"

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا "چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔ کیسے ہو' ایک بات بتاؤں' میں عینی ہوں' سونی نہیں" وہ زور سے ہنسی۔

میں نے کہا "تم دونوں بھی نوٹ کرلو کہ میں یہاں ناصر نہیں' شاہ عالم ہوں۔"

ڈانس سیکونس کے نامکمل رہ جانے سے اور نیلم کے اتنی وارفتگی کے ساتھ ایک اجنبی کی طرف ملتفت ہونے سے ہیرو کچھ برہم تھا۔ کیمرامین بیزار کھڑا تھا اور ڈائریکٹر سب سے زیادہ پریشان تھا۔

قریب آکے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "آپ نیلم کے بھائی ہیں؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے مذاق کیا۔ لوگ

مسکرانے لگے۔

میں نے بُرا مانے بغیر کہا "یہی سمجھ لیں۔ آپ ہیرو ہیں اس فلم میں نیلم کے ساتھ۔"

پینتالیس پچاس سال کا آدھے سے زیادہ گنجا ڈائریکٹر سخت جزبز ہوا کیونکہ مسکرانے والے زور سے ہنس پڑے تھے۔ اس نے نیلم سے کہا "یہ کیا غیر ذمے دارانہ حرکت کی ہے آپ نے۔ سین تو پورا کرالیتیں۔ ایسے دوڑ پڑیں۔"

نیلم کا چہرہ غصیلا ہوگیا "ہمدم صاحب! باقی شوٹنگ کل کریں گے۔"

ڈائریکٹر کی آواز جیسے بند ہوگئی "جی۔!"

"جی۔ کم سے کم اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیے آپ کو۔ آپ نے میرے مہمان کے سامنے اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں کیا" نیلم نے رکھائی سے کہا۔

وہ ایک دم منت سماجت پر اُتر آیا "آئی۔ آئی ایم سوری۔ دیکھئے میڈم! ہمارے پاس صرف دو دن کی لیے این او سی ہے اور ابھی ایک چوتھائی شوٹنگ بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی سے کیسے پیک اَپ کردیں۔"

نیلم کا رویہ مزید سخت ہوگیا "میں جارہی ہوں۔ میری طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ چلو شاہ عالم۔"

ڈائریکٹر کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا "دیکھئے سر' اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔"

میں نے متانت سے کہا "میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا۔"

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑا "چلو شاہ جی۔ کہیں کافی پیتے ہیں۔"

ڈائریکٹر پیچھے آیا "کافی میں منگوا دیتا ہوں میڈم۔ پلیز میرا کچھ خیال کریں۔"

مجھے اس پر رحم آگیا "نیلم۔ میں نے ہوٹل میں پیغام چھوڑ دیا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ تم اپنا شیڈول مت خراب کرو۔"

سونی مان گئی "چلو تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔"

ہم سرسبز قالین جیسے گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گئے۔ شوٹنگ میں وقفہ آگیا۔ نیلم نے پیر جھٹک کے اپنے جوتے اتار پھینکے۔ سونی نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنے بال جھٹک کے پاؤں گھاس پر پھیلا دیے "مجھے یہ سب بالکل خواب کی طرح لگتا ہے۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی لندن نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آتا کہ میں لندن میں ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اچانک لندن آنے کا پروگرام کیسے بن گیا؟"

نیلم نے کہا "ہمیں دو ہفتے بعد آنا تھا مگر ڈیٹس میں گڑبڑ ہوگئی۔ یہاں سفارت خانے والوں نے این او سی لے لیا۔ ادھر ویزا ہوگیا اور ٹریول ایجنٹ نے کہا کہ سفر کی تاریخ بتائیں تو میں فلائٹ پر سیٹ کنفرم کروں۔ ہمدم صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ اگر دوسروں کے ساتھ میری ڈیٹس آگے پیچھے ہوجائیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن سونی میرے ساتھ جائے گی۔"

میں نے کہا "سونی نے ضد کی تھی۔"

"نہیں' اسے تو پتا ہی نہیں تھا مگر میں اسے کہاں چھوڑ کے آتی۔ ہمدم صاحب بڑی مشکل میں پڑ گئے لیکن وہ بڑے پریکٹیکل آدمی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ گیارہ افراد کے لیے ویزا ہے۔ ان میں صرف دو خواتین ہیں۔ ایک آپ خود' ایک آپ کی ہیئرڈریسر اور میک اپ آرٹسٹ یعنی بارھویں کی گنجائش کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ گنجائش نکالنا آپ کا کام ہے۔ میں سونی کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گی ورنہ آپ باقی یونٹ کے ساتھ جائیں اور موج کریں۔ انہوں نے بالآخر ایک ترکیب نکالی اور سونی کو عینی کی جگہ فٹ کروا کہ میک اپ آرٹسٹ ہم لندن سے لے لیں گے۔"

میں نے کہا "اور اس کے لیے سونی کو عینی کیسے بنایا گیا؟"

"سونی تو عینی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے لیے قرۃ العین کے نام سے نیا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کیا گیا۔ پاکستان میں کیا نہیں ہوسکتا شاہ جی!"

میں نے کہا "لیکن اتنی جلدی برطانوی سفارت خانے والوں نے ویزا لگا دیا؟"

"ہماری وزارت خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری میرے بڑے فین ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟"

نیلم بولی "تم چندا کے ساتھ آئے تھے یہاں؟ جواب ہاں یا ناں میں دو۔"

میں نے کہا "ہاں اور نہیں۔ وہ اسپتال کے کام سے آئی تھی اور اسے ایک دن پہلے آنا تھا مگر سیٹ نہیں ملی تو وہ اور میں ایک ہی فلائٹ پر مل گئے۔ اسے تم ایک فلمی اتفاق سمجھ لو۔"

"فلمی اتفاقات کا سلسلہ آگے کہاں تک چلا؟" وہ بولی۔

"یہ ساری باتیں فرصت میں ہوں گی" میں نے کافی

لانے والے ایک شخص سے ٹک لے لیا جو مجھے بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا "تمہارے یونٹ کے لوگ میری تشریف آوری سے سخت ناخوش ہیں اس لیے کافی پی کے میں جاتا ہوں۔"

"رات کو کس وقت آؤ گے؟" سونی نے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہاں سے مجھے اپنے کام سے کہیں اور جانا ہے۔"

"میں لندن گھومنا چاہتی ہوں" سونی نے کہا۔

"شوق سے گھومو۔ ٹیکسی لے لو اور اسے کہو کہ سب دکھاوے۔ لندن کے سارے قابلِ دید مقامات۔ صبح سے شام تک یا ساری رات گھومو۔"

"کیا مطلب ہے؟ میں اکیلی پھروں؟"

میں نے کہا "یہاں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی تمہیں اغوا کر کے نہیں لے جائے گا۔ خصوصاً ٹیکسی والا۔ آج مجھے بالکل فرصت نہیں ہے۔"

نیلم بولی "میرا شوٹنگ کا شیڈول صرف ایک ہفتے کا ہے۔ اس کے بعد میں یہاں رک جاؤں گی پھر اکٹھے گھومیں گے۔"

"اور تب تک میں کیا کروں؟ روز یہ شوٹنگ کی بوریت جھیلوں؟"

میں نے کہا "تمہیں تو بڑا شوق تھا۔ فلم اسٹوڈیو دیکھنے کا اور فلمی ہستیوں سے ملنے کا۔ اب کیا ہوا؟ شوق ہو گیا پورا؟"

وہ بولی "ہاں' ناصر! میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں' ابھی۔"

میں نے کہا "ناممکن۔ رب نواز لندن میں ہے ابھی۔ اس نے ہمیں ایک ساتھ دیکھ لیا تو بڑی خرابی ہو جائے گی۔ یہ مت بھولو کہ نیلم سے اور سونی سے ناصر کا تعلق تھا۔ شاہ عالم انہیں نہیں جانتا۔"

سونی کچھ مایوس ہوئی "اس کمینے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔"

میں نے کہا "بس ایک دو دن کی بات ہے پھر وہ چلا جائے گا۔ اس کی عدالت میں پیشی ہے۔ نیلم کے بارے میں تو اسے ...ہور جا کے بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ شوٹنگ کے سلسلے میں ...و ہفتے کے لیے ملک سے باہر ہے اور لندن میں ہے۔ اگر ابھی ...ک اس کا اطمینان نہیں ہوا ہے تو ان دو ہفتوں میں وہ پھر ...سی بہانے نیلم کے گھر میں تمہاری موجودگی کی تصدیق کرے ...۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس کے لیے بھی اور ہمارے لیے ...ی۔ اسے اپنی تسلی کر لینے دو۔ وہ ایک بار نہیں دس بار دیکھے۔ اول تو اس کا شک اتنی دور تک نہیں جائے گا لیکن بالفرضِ محال وہ سوچتا ہے کہ نیلم کہیں سونی کو بھی ساتھ نہ لے گئی ہو۔ وہ کیسے تصدیق کرے گا؟ فلمی دنیا میں دھکے کھانے اور ہر ایک سے پوچھنا آسان نہیں۔ ہاں فلائٹ کا ریکارڈ وہ آسانی سے چیک کرا سکتا ہے۔ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ جس فلائٹ سے نیلم لندن گئی تھی اس پر سونی بھی تھی یا نہیں۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ فلم یونٹ کے گیارہ ارکان کون تھے۔ بس اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔ رب نواز دفع ہو جائے۔ پھر ہم سب بے فکر ہو کے لندن میں کہیں بھی آئیں جائیں۔"

سونی مطمئن ہو گئی "چلو ایک دو روز گزارا کر لوں گی میں۔"

نیلم بولی "کل ہم شوٹنگ کے لیے ہائیڈ پارک جائیں گے۔ اس میں ایک تو خاصی بڑی جھیل ہے۔ بڑا اچھا سا نام ہے۔"

میں نے کہا "SURPENTINE" اور ایک تالاب ہے جو ہرگز گول نہیں ہے مگر اس کا نام ہے راؤنڈ پونڈ۔"

"تم تو اتنی اچھی طرح جانتے ہو لندن کو کہ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی" نیلم ہنسنے لگی۔

"خاتون" میں نے کہا "گائیڈ' شوفر' محافظ' ساتھی اور کیا نہیں کیا کچھ ہوں میں۔"

نیلم بولی "وہیں کوئی مارکیٹ ہے نوادرات کی۔ ایک سین وہاں بھی ہے۔"

میں نے کہا "نوادرات کی مارکیٹ؟ اس کے بارے میں تو مجھے بھی علم نہیں۔ کیا نام ہے مارکیٹ کا؟"

"ہمدم صاحب سے پوچھتی ہوں" نیلم نے کہا۔

ہمدم صاحب مجسم انکسار بنے حاضر ہوئے۔ "وہ جگہ کینسنگٹن این تک ہائی پر "(KENSINGTON) مارکیٹ کہلاتی ہے سرجی! اگر آپ ادھر سے جائیں تو پہلے رائل کالج آف آرٹ آئے گا اور ذرا آگے تھوڑا سا سیدھے ہاتھ پر ہے کینسنگٹن پیلس۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔"

یونٹ کے ممبر محاورتاً ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ ہیروئن کی بازیابی تک شوٹنگ کیسے ہوتی۔ عملاً وہ اس غیر متوقع بریک کو انجوائے کر رہے تھے۔ ہیرو صاحب کو کچھ مداحوں یا تجسس کے ماروں نے گھیر لیا تھا۔ ان میں قدرتی طور پر خواتین کی تعداد زیادہ تھی اور خواتین میں نوجوان لڑکیوں کی۔ ہیرو زاہد رضا ایک پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اس کہانی میں عموماً نیلم کو پاکستانی فلم انڈسٹری کا سپر اسٹار بتایا گیا ہے۔ فلم انڈسٹری کی تاریخ میں سپر اسٹار کہلوانے والی اداکارائیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور پاکستان کے فلم بیں حضرات ان سب کے نام و نسب تاریخ جغرافیہ' پس منظر اور پیش منظر سے بخوبی واقف ہیں۔ ظاہر ہے نیلم نام کی کوئی پاکستانی ایکٹریس نہیں جسے سپر اسٹار کہا جائے۔

نیلم کا اصل نام بہت سی مصلحتوں کے پیشِ نظر استعمال نہیں کیا گیا۔ پڑھنے والے ازخود طے کر سکتے ہیں کہ۔ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ یہاں جس فلم کی شوٹنگ کا حوالہ ہے وہ بن کے ریلیز بھی ہوئی تھی اور پاکستان کی نوّے فیصد فلموں کی طرح باکس آفس پر فلاپ ہونے کے باعث آج شاید اس کا نام بھی کوئی یاد نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود کچھ قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے فلم' ہیرو اور ہدایت کار وغیرہ کے اصل نام لکھنے سے گریز ضروری تھا۔

ہمدم صاحب بڑے ذہین ہدایت کار اور لاجواب انسان تھے مگر ان کی ایک خامی یہ تھی کہ وہ فلم بناتے ہوئے عوامی ذہن کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے تھے چنانچہ ان کی ہدایت کاری میں بننے والی فلمیں تکنیکی اعتبار سے اور موضوع کے حوالے سے بڑی معتبر سمجھی جاتی تھیں مگر کمرشل اینگل سے ناکام رہتی تھیں۔

پارک میں بہت سے سیاح اور فارغ لوگ فلم یونٹ کے لوگوں سے فلم کے بارے میں سوالات کر رہے تھے اور وہ انگریزی میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق جھوٹ سچ بول رہے تھے۔ بدقسمتی سے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں اکثریت ایسے جاہلوں کی ہے جو ٹھیک طرح سے اردو بھی نہیں بول سکتے۔ ان میں صرف کیمرا مین (جو ڈائریکٹر آف فوٹو گرافی کہلاتا تھا) ہی تعلیم یافتہ تھا چنانچہ اسے ادھر اُدھر مترجم کے فرائض بھی انجام دینے پڑ رہے تھے۔ فلم یونٹ والے آپس میں اردو بول کے مسئلے کا حل تلاش کرتے تھے۔ سوال کیا ہے اور اس کا کیا جواب دینا مناسب رہے گا کہ اپنی عزت بھی بچی رہے اور ملک کی بھی۔ مجموعی طور پر صورتِ حال دلچسپ تھی۔

نیلم نے کہا "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

میں بھی اصل بات کو گول کر گیا۔ "کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ سونی کا نکل آنا ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ یہاں یہ آزادی سے کہیں بھی آ جا سکتی ہے۔"

"ہاں۔ اب یہ مستند عینی ہے۔ دستاویزی طور پر۔"

میں نے کہا "عینی کا پورا نام کیا ہے؟ قرۃ العین؟"

"یہی ہو سکتا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دونوں جینوئن ہیں تو عینی بھی جینوئن ہے۔ سونی کا اب کوئی وجود نہیں۔"

"یہ تو بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ شاید بالآخر ہم بھی یہی کرتے مگر تم نے پہل کر کے ہماری مشکل آسان کر دی۔ اب تم تو خیر لوٹ جاؤ گی شوٹنگ ختم ہونے کے بعد' عینی یہیں رہے گی۔"

سونی کا چہرہ چمک اٹھا "یہاں؟ لندن میں؟"

میں نے کہا "یس۔ فی الحال چھ مہینے کا ویزا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو اس کی معیاد میں توسیع کرا لیں گے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی "کہیں تم میرے واپس پاکستان جانے کے امکانات کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تو نہیں چاہتے؟"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں کیا دشمن ہوں تمہارا کہ تمہیں جلاوطنی کی سزا دوں۔ یہ سب وقتی بات ہے۔ سال دو سال میں کسی کو سونی یاد نہیں رہے گی لیکن تم وہاں رہو گی تو میرے ساتھ تمہارے ماضی کی پرچھائیاں بھی آسیب کی طرح تمہارا پیچھا کریں گی۔ تم نے تو اپنے ماضی کو دفن کر دیا ہے مگر انہوں نے نہیں جو تمہیں ایک مفرور اور مطلوب مجرم کا درجہ دلوا چکے ہیں۔"

نیلم نے سونی کا اُداس چہرہ دیکھا "بس اب تم عینی ہو تو عینی ہی رہو۔ ہمارے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔"

میں نے کہا "ہم تمہیں ایک عملی طور پر نیا ماضی دیں گے۔ قرۃ العین یا عینی کا سونی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو گا۔ رہی صورت تو میری مثال سامنے رکھو۔ مجھ پر جو شاہ عالم کے ماضی کا تاریک سایہ ہے' اسے میں ہٹا رہا ہوں۔ تاکہ ناصر عظیم محفوظ اور باعزت طریقے پر جی سکے۔ ایسا تم بھی کر سکتی ہو۔"

"شاید اور کوئی صورت نہیں" سونی نے کہا۔

"نہیں اور کوئی صورت نہیں۔ قانون کی نظر میں خود کو بے گناہ ثابت کرنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ تمہیں کبھی بے گناہی کی وہ سند نہیں مل سکتی جس سے تم معاشرے میں معزز ہو جاؤ۔ اپنے ماضی کو اپنی زندگی سے کاٹ کے الگ کر دو اور ایک نیا مستقبل بناؤ۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے سونی!" نیلم بولی۔

"سونی نہیں' عینی اور میں ناصر نہیں شاہ عالم ہوں نی

الحال۔" میں نے کہا "قدرت نے از خود حالات پیدا کر دیے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تم اس ماحول سے نکل آئی ہو جہاں تم خطرات کے حصار میں خوف کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ عینی بن کے اعتماد کے ساتھ لندن میں رہو۔ پاکستان آ جاؤ اور جب تمہیں یقین آ جائے کہ اب تم کو سوئی چبھونے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تو جہاں چاہو رہو۔ جو چاہو کرو۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ورنہ تمہارے فلم یونٹ والے مجھے مل کے ماریں گے۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے۔"

"رات کو دیر مت کرنا۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے" نیلم بولی۔

میں نے کہا "تمہیں کب فراغت ہوگی؟"

"یہاں تو دو ڈھائی گھنٹے کا کام باقی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے پھر میں فارغ ہوں۔" وہ بولی۔

لندن میں خریداری کے لیے میں نے ہمیشہ سیئرز SEARS کو ترجیح دی تھی۔ ایک سیلز گرل نے جو اپنے کام میں یعنی خریدار کو پھانسنے اور مطمئن کر کے رخصت کرنے میں تجربہ اور مہارت رکھتی تھی، پہلے میری ضرورت اور پسند کا اندازہ کیا اور پھر کم سے کم دو درجن سوٹ دکھائے۔ میں نے جو تین سوٹ منتخب کیے وہ میری پسند کے معیار کی بخوبی عکاسی کرتے تھے۔ سیلز گرل اور زیادہ مؤدب اور مستعد ہو گئی۔ میں نے ان سے میچ کرنے والی چھ ٹائیاں لیں اور پھر تین شرٹس۔ اس دوران میں میری خواہش پر مجھے کافی پیش کی گئی جو بلاشبہ لاجواب تھی۔ آخری چیز جوتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ سب سامان ایک مناسب سائز کے سوٹ کیس میں پیک کروا دیا جائے اور مجموعی طور پر ساڑھے چار سو پاؤنڈ کا بل ادا کیا۔

وہیں ایک پبلک بوتھ سے میں نے جمی کو فون کیا۔ اس کی بیوی اور سیکریٹری جولی نے بتایا "وہ تو گیا ہوا ہے کسی کام سے اور شاید رات تک لوٹے گا۔"

"اس کا مطلب ہے موقع اچھا ہے، تم سے ملنے کا اور وہ بات کہنے کا جو کسی شوہر کی موجودگی میں اس کی حسین بیوی سے نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ ہنسنے لگی "کیا تم مجھے ورغلا رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ جان کا خطرہ مول لے کر۔"

"میں ضرور تمہیں بلا لیتی مگر جمی کا اور تمہارا دشمن رب نواز اندر موجود ہے۔"

میں نے کہا "اکیلا ہے یا اس کی مصروفیت ساتھ ہے؟"

"مصروفیت سے پیچھا چھڑا کے آیا ہے۔ بات کرو گے؟"

میں نے کہا "کرا دو۔"

چند سیکنڈ بعد ہی رب نواز بولا "شاہ جی کہاں غائب ہو تم۔ آج پتا نہیں کتنی بار یہاں فون کر کے تمہارے بارے میں پوچھتا رہا۔ جمی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کل تمہاری مصروفیت دیکھ کے میں نے خود ہی تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کون تھی وہ؟"

"لعنت بھیجو اس پر۔ یہ بتاؤ، مجھے پیسے کب ملیں گے۔ میرے وکیل نے مجھے مطلع کیا ہے کہ جمعرات کو میری عدالت میں پیشی ہے۔"

"آج تو سوموار ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

وہ برہمی سے بولا "جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ یہ سب مصیبت اس شخص نے کھڑی کی ہے جو تمہاری بیوی کا خصم ہے۔"

"رخشی میری بیوی تھی۔ زمانہ ہوا اسے طلاق دیے۔ اب وہ میرے لیے ایک نام سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تمہیں فرید عباسی سے رقابت محسوس نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ فضول باتوں میں وقت ضائع کر کے اور اپنا خون جلا کے مجھے کیا ملے گا؟ رخشی جیسی عورت کسی سے تو شادی کرتی۔"

وہ بولا "کمال یہ ہے کہ تمہاری وہ سابقہ داشتہ شبنم بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے میرے خلاف۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ میرے سامنے بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے شبنم سے پنگا لیا تھا۔ تم نے اسے اغوا کرایا۔ اس کی گاڑی کی چوری کا ڈراما کیا اور پھر اسے بم فٹ کر کے اپنی گاڑی دی مگر وہ بچ گئی۔ تم اپنے کسی مزارع کی بیٹی کی طرح اس کی آبرو کا تماشائے عبرت بنانا چاہتے تھے۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟"

"خود شبنم نے۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو کہ اس سے اب تمہارا کوئی تعلق ہی نہیں؟"

"اب نہیں ہے، پہلے تو تھا" میں نے کہا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیسے تم نے رئیس خان نام کے ایک سیاسی لیڈر۔۔۔"

"سیاسی لیڈر۔۔۔ مائی فٹ! وہ ایک بدمعاش کے سوا کچھ نہیں ہے جسے تم جیسے لیڈر استعمال کرتے رہے۔" وہ مشتعل

ہو گیا۔

"چلو سیاسی کارکن۔ بدمعاش۔ کچھ بھی کہہ لو، اس کے دو نوکروں کو مروایا تم نے۔"

"پھر کیا ہوا شاہ جی۔ وہ نوکر ہی تو تھے، رشتے دار تو نہیں تھے۔"

میں نے کہا "یہ فرق ہے سوچ کا اور رویے کا۔ رئیس انہیں رشتے داروں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تم رشتے داروں کے ساتھ بھی نوکروں سے بدتر سلوک کر سکتے ہو اور نوکروں کو اپنے پالتو کتوں سے بھی کم حیثیت دیتے ہو پھر تم نے اس کے گھر میں آگ لگوائی اور اسے راکھ کر دیا۔ تم نے اس پر دوہرے قتل کے جھوٹے مقدمات کھڑے کرنے کی کوشش کی۔ اس کے جواب میں وہ فرید عباسی کے ذریعے تمہارے خلاف قانون کی طاقت کو استعمال کر رہا ہے تو غنیمت جانو۔ اگر وہ بھی تمہاری طرح لاقانونیت کا اسلحہ اٹھا لیتا تو تم اب تک سزا بھگت چکے ہوتے۔"

رب نواز نے کہا "یہ کیسی عجیب بات ہے۔ تم بھی اس کی حمایت کرتے ہو۔"

میں نے کہا "میری حمایت یا مخالفت کی کیا اہمیت ہے تمہارے اپنے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ اب تو تمہیں عقل آ جانی چاہیے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وقت پہلے جیسا نہیں رہا۔ تمہاری بدمعاشی کے دن لد گئے۔"

"میں ایسی باتوں سے حوصلہ ہارنے والا نہیں ہوں۔ دیکھتا ہوں میں یہ وکیل اور صحافی مل کے میرا کیا بگاڑتے ہیں؟"

میں نے کہا "بالآخر میری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی مگر اس وقت تک معاملات تمہارے ہاتھ سے نکل چکے ہوں گے۔ ان کے عزائم کا اندازہ اس سے کر لو کہ وہ تمہاری ضمانت پر رہائی کے خلاف قانونی جنگ کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہائی کورٹ کی ڈویژنل بینچ نے بھی ان کی بات نہ سنی تو وہ یقیناً سپریم کورٹ میں جائیں گے اور تمہاری ضمانت منسوخ کرا کے چھوڑیں گے۔ تم اندر ہو گئے تو تمہارے ہاتھ پاؤں کٹ جائیں گے رب نواز۔ تم آدھی جنگ ہار جاؤ گے پھر تو خود کو پھانسی کے پھندے سے یا عمر قید سے بچانے کی لاحاصل جنگ ہوگی۔"

"لاحاصل کیوں؟ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں" وہ چلانے لگا "اور تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں تمہارا خوشامدی مصاحب یا نمک خوار نہیں ہوں۔ وہ تمہارے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ نہیں رکھتے لیکن میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ ایک بات اور سمجھ لو رب نواز۔ یہ جو داڑھی والے جن کا چکر ہے نا، یہ بھی بڑی خطرناک بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے خلاف قانونی جنگ لڑنے والے تم سے غیر قانونی جنگ کا اعلان بھی کر چکے ہیں۔ تم خاموش کیوں ہو؟"

وہ بجھے ہوئے مایوسانہ لہجے میں بولا "یار شاہ جی۔ تم آ جاؤ یہاں۔"

میں نے کہا "سوری۔ آج میں فارغ نہیں ہوں۔"

"تو کل ملتے ہیں کہیں۔ میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے رہتے ہو۔ تمہاری بیوی کہاں ہے آج کل؟"

میں نے کہا "یہیں لندن میں ہے اور کہاں۔ کل کا وعدہ نہیں کرتا مگر تمہارے واپس پاکستان جانے سے پہلے میں اسے تم سے ضرور ملوا دوں گا۔ ساٹھ ہزار پاؤنڈ تمہیں جمی ادا کرے گا۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے۔"

"معاہدہ کیسا؟"

"یہی کہ فی الحال تمہاری ڈیمانڈ جمی پوری کرے گا کیونکہ تمہیں جلدی پڑی ہوئی ہے۔ بعد میں مال کی فروخت سے جو بھی منافع حاصل ہوگا، وہ ہم آپس میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کر لیں گے اور تم جانتے ہو کہ منافع چالیس ہزار بھی ہو سکتا ہے اور اس سے دگنا تین گنا بھی۔"

اس نے ناراضی اور دکھ سے کہا "پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

میں نے کہا "پہلے تم مال چھوڑ جاتے تھے۔ عدم اعتماد کا مظاہرہ اس بار تمہاری طرف سے ہوا رب نواز۔ اب اپنی قیمت لو اور جاؤ۔"

اس نے اچانک پوچھا "شاہ جی۔ تم ناصر عظیم کو جانتے ہو؟"

اس کا سوال چونکا دینے والا تھا مگر فون پر وہ میری صورت کے ردعمل کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا "کون ناصر عظیم!"

"لاہور میں رہتا ہے۔ اس کی صورت تم سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ اتنی کہ میں دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا وہ تم ہو اور داڑھی والا جن بن کے لاہور میں پھر رہے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟ میں تو لندن میں تھا سارے زمانے کو معلوم ہے۔"

وہ بولا "بکواس، تم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے یہاں۔"

میں نے کہا "پھر بھی بہت لوگ جانتے تھے۔ ویسے دنیا یں بہت لوگ ہیں جن کی شکل صورت آپس میں جڑواں ھائیوں کی طرح ملتی ہے مگران کا زندگی میں کبھی آمنا سامنا نیں ہوتا۔"

وہ بولا "میں بھی دھوکا کھا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ تم ہی ھیس بدل کے میرے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہو۔ یک بار میں نے اسے پکڑلیا اور بڑی مشکل میں پڑگیا۔"

میں نے بے نیازانہ لہجے میں پوچھا "کرتا کیا ہے یہ صر عظیم؟"

"مختلف کاروبار ہیں اس کے۔ پہلے امپورٹ یکسپورٹ اور کنسٹرکشن کے بزنس میں تھا۔ کروڑوں کا مالک ہے۔ تم فلم ایکٹریس نیلم کو جانتے ہونا؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔"

"اس نے عدالت میں میرے خلاف گواہی دی اور کہا ۔ وہ ناصر عظیم کو دس سال سے جانتی ہے۔ اسی وقت سے ب اس کی پہلی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی شاہدہ تھی جسے رے ہوئے کئی سال ہوگئے۔ اس کو کینسر ہوگیا تھا۔ اس ت وہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ وہ پاگل ہوکے گھر ے نکل گیا اور کرنل خان کے گھر پہنچ گیا۔"

"کون کرنل خان!"

"پرانا ریٹائرڈ کرنل تھا، مرگیا۔ ناصر عظیم کو اسی نے ۔الا۔ پڑھایا لکھایا اور اس کا بزنس پھیلانے میں اس کی مدد ۔ لاہور میں ایک کمال کا اسپتال ہے۔"

"ڈاکٹر کمال کا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر کمال نے بھی کہا کہ وہ اسے بچپن سے جانتا لیکن یار، میرا شک بھی بے سبب نہیں تھا۔ اس ناصر عظیم ب سے پرانا دوست ہے رئیس خان۔ دونوں ہوش لنے سے پہلے ایک ہی یتیم خانے میں تھے۔ دونوں کے باپ کا کچھ پتا نہیں۔"

"یار، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میں یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں کہ مجھے ناصر عظیم وجہ شک نہیں ہوا تھا کہ وہ تم ہو۔ یہ بڑا عجیب چکر ہے ی سابقہ بیوی رخشندہ نے جس وکیل فرید عباسی سے ا کی ہے، وہ وکیل بن گیا ہے اس حرام زادے رئیس کا۔"

"اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ تم یہ کہنے کی کوشش ں کررہے ہو کہ رخشی کے کہنے پر اس نے رئیس خان کا بننا منظور کیا؟"

"نہیں یار۔ یہ جو رئیس خان ہے۔ یہ سگے بھائی سے زیادہ ہے ناصر عظیم کے لیے۔ دونوں کی کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں۔ ناصر عظیم کہتا ہے کہ وہ شبنم کو نہیں جانتا مگر یہ جھوٹ ہے۔ ایک زمانے میں میرے ڈر سے شبنم غائب ہوگئی تھی۔ اخبار اور صحافت سب چھوڑ کے روپوش ہوگئی تھی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں تھی۔ وہ اس رئیس خان کے رئیس خانے میں تھی۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس بات کا علم ناصر کو بھی نہ ہو۔ دونوں جگری یار ہیں۔ ناصر اور رئیس۔"

میں نے کہا "ہوگا یار، دفع کرو۔"

وہ بولا "نہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ شبنم تمہاری بیوی تو نہیں تھی مگر میرا خیال ہے کہ بیوی سے زیادہ تم اسے چاہتے تھے۔"

"یہ بات خود اس نے مشہور کی تھی۔"

"چلو یوں سہی۔ اب اس تکون کو دیکھو۔ شبنم جا کے رہی رئیس کے گھر میں۔ ظاہر ہے اسے بہت بھروسا ہوگا رئیس پر۔ شبنم جیسی کوئی لڑکی ایسے ہی تو کسی اجنبی کے گھر میں جاکے نہیں رہنے لگتی پھر وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ ناصر کو نہیں جانتی۔ میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ جب شبنم کو اتنا اعتماد تھا رئیس پر اور وہ تمہارے بھی اتنے قریب تھی تو..."

میں نے کہا "خدا کے لیے میرا دماغ خراب مت کرو۔ بھاڑ میں جائیں شبنم اور اس کے ساتھ رئیس اور ناصر عظیم۔ میں لندن میں تھا۔ مجھے کیا وہاں کے معاملات سے۔"

وہ بولا "دیکھو۔ میرا شک بے سبب نہیں تھا۔ تم کہتے ہو کہ تم لندن میں تھے اور تمہارے بارے میں کچھ خبریں بھی ضرور شائع ہوئی تھیں لیکن تصدیق کرنے پر بہت سی باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ مثلاً ایک مشہور ماڈل سے تمہاری شادی اور طلاق کی خبر جھوٹ تھی۔"

میں نے کہا "وہ جو باقاعدہ قسم کی شادی ہوتی ہے، کوئی مولوی نکاح پڑھائے یا چرچ میں پادری۔ وہ واقعی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کرسچین تھی، میں مسلمان۔"

"ایسی شادیاں کورٹ میں رجسٹر ہوتی ہیں۔"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا "آف کورس۔ قانونی طور پر اسے شادی نہیں کہا جاسکتا لیکن ہم میاں بیوی کی طرح ایک ساتھ رہتے تھے۔ کسی رپورٹر نے لکھ دیا کہ ہم شادی کرچکے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ شادی شدہ ہونے کی

خبر کسی ایکٹریس یا ماڈل کے کیریئر کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ بس وہ بھی اسی پر چراغ پا ہوگئی۔ اوپر سے کسی نے اس کے کان بھردیے کہ یہ خبر میں نے لگوائی تھی۔ اخبار کو مجبوراً تردید کی خبر چھاپنی پڑی اور میں نے بھی کچھ دے دلا کے جان چھڑائی ورنہ قانونی جھگڑا بہت مہنگا پڑتا لیکن اس کے بعد میں نے واقعی شادی کرلی تھی۔ اپنا گھر بسانے کے لیے۔ وہ ایک پاکستانی خاتون ہے۔"

"خاتون یا لڑکی؟"

میں نے کہا "خاتون۔ وہ کوئی نوعمر لڑکی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھی تقدیر نے ایک سنگین مذاق کیا تھا۔ ایک دردِ مشترک نے ہمیں یکجا کردیا۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارے لہجے سے شک کی بو آتی ہے۔ خیر تم ملوگے اس سے تو دیکھ لوگے۔ شادی سے کچھ پہلے میں نے ایک گھر خرید لیا تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ میں۔ ہم وہاں بڑے سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ ابھی تک مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جو اپنے پاس تھا وہ کافی تھا۔ اگر میں کہیں انویسٹ کردیتا تو کچھ کیے بغیر بھی ہم آرام سے رہ سکتے تھے لیکن ایک تو میری عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ میں آرام کی نہیں عیاشی کی زندگی گزارتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بے کار کون بیٹھ سکتا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا کام یا ملازمت کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ پرانے کاروباری تعلقات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تم بلاوجہ شک میں مت پڑو۔"

وہ بولا "نہیں یار۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی۔ پہلے شک ضرور تھا کہ تم ہی ناصر عظیم بن گئے ہو مگر ایک تو اس کے سب پرانے حوالے انتہائی معتبر ثابت ہوئے پھر وہ لاہور میں ہے اور تم یہاں ہو۔ اس کی تو بالشت بھر لمبی داڑھی ہے۔"

"پھر کبھی لاہور آیا تو میں اس سے ملوں گا۔ بڑی دلچسپ ہوگی یہ ملاقات" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

سوٹ کیس کو ساتھ لیے پھرنا کوئی عقلمندی نہ ہوتا۔ میں ٹیکسی میں گھر گیا اور سارا راستہ یہ سوچتا رہا کہ لندن میں میرا قیام کس حد تک طویل ہونا چاہیے۔ چندا کے ساتھ ہونے سے میرا اصل پروگرام التوا میں پڑ گیا تھا۔ اس کے سامنے تو مجھے شاہ عالم کا نام لینا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ میں شاہ عالم بن کے لندن آیا ہوں اور میرے اس دورے کا مقصد اپنی شخصیت پر لگی ہوئی شاہ عالم کے نام کی مہر کو ہمیشہ کے لیے مٹانا ہے تاکہ باقی زندگی میں تحفظ کی پوری ضمانت کے ساتھ صرف ناصر عظیم بن کے گزار سکوں۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ یہ کام کیسے ہوگا اور میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں یہ کام کیسے کروں گا۔ مجھے چندا کے ساتھ اپنے پروگرام کو ڈسکس کرتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ یہ بہرحال ایک مجرمانہ نوعیت رکھتا تھا۔

تین دن اس کے ساتھ اسپتال ایکوئپ منٹ اینڈ میڈیکل سپلائی کمپنیوں میں خریداری کے معاہدے کرتے گزر گئے تھے اور دو دن سیر تفریح کرتے۔ اس دوران میں نہ اس نے گزرے ہوئے وقت کی کسی ناخوشگوار یاد کا حوالہ دیا تھا اور نہ میں نے۔ نہ اس نے کوئی حرفِ شکایت لبوں تک آنے دیا تھا جو میرے لیے باعثِ ندامت ہوتا اور نہ میں نے۔ نہ اس نے گزشتہ اٹھارہ ماہ کے کسی پُرآزار دکھ سے نسبت رکھنے والے لمحے کی بات کی تھی نہ میں نے۔

ہم نے اپنی زندگی کے ڈیڑھ سال کے وقت کو حرفِ غلط کی طرح مٹادیا تھا اور ایسے بھلادیا تھا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ کبھی ہماری زندگی میں شامل ہی نہیں رہا۔ وہ ہماری یادداشت پر کوئی نقش نہیں رکھتا۔ یہ جھوٹ تھا لیکن ہم نے اسے کسی ناگزیر سچ کی طرح اپنالیا تھا۔ اسی میں ہماری فلاح اور عافیت تھی۔ ہمارے لیے سکون تھا اور ایک خوش آئند مستقبل کی امید ہم دونوں کی ضرورت تھی۔

چندا کی موجودگی میں بھی کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آگئے تھے جو شاہ عالم کے مجرمانہ ماضی سے نسبت رکھتے تھے اور کچھ معاملات ایسے تھے جن میں نہ چاہنے کے باوجود میں ملوث ہوگیا تھا۔ چندا نے دل جمعی کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیا تھا کیونکہ اسے ایک محفوظ مستقبل کے لیے میری خواہش اور جدوجہد پر یقین تھا اور وہ دل سے اس مستقبل کو اپنا ہی سمجھتی تھی۔ اس خوش اعتقادی کے ساتھ جو سالہا سال سے ایک طرح سے جزوِ ایمان تھی اور جسے میری اٹھارہ ماہ کی گمراہی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔

جاتے وقت وہ میرے لیے متفکر تھی اور میں نے جھوٹ بول کے اسے واپس بھیجا تھا۔ یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اپنا خیال رکھوں گا اور اپنی سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا اور دو تین دن میں لوٹ آؤں گا۔ شاید اسے اندازہ ہوگا کہ یہ جھوٹ ہے مگر وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنے سے گریز کرتی رہی۔

لیکن اب مجھے یقیناً کچھ کرنا تھا اور کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے آئندہ چند دنوں کے معمولات کو ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیتا رہا۔

سرفہرست شاہ عالم کی شناخت کے ثبوت اور گواہ پیدا کرنا تھا۔ اس میں جزوی طور پر مجھے کامیابی ہوئی تھی۔ شاہ عالم کے کاروباری راستے پر جو پاکستان سے شروع ہوتا تھا' جس کی حیثیت دوسرے اہم جنکشن جیسی تھی جہاں سے مجھے دوسرے ممالک تک پھیلے ہوئے چوالیس راستوں کا سراغ مل گیا تھا۔ یہ انفارمیشن بہت اہم تھی اور آگے جانے والے سارے راستوں کا پتا لگانے میں میری مدد کر سکتی تھی۔

اب مجھے پیچھے ان راستوں کو تلاش کرنا تھا جو پاکستان کے گاؤں قصبوں اور شہروں میں چھپے ہوئے چوروں کی کمین گاہوں تک پہنچتے تھے۔ یہ چہروں پر شرافت کی نقاب رکھنے والے چور' ہوس زر میں پاکستان کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو چپکے چپکے محفوظ سمجھے جانے والے ٹھکانوں سے نکال رہے تھے اور رب نواز کے ہاتھوں اونے پونے داموں میں فروخت کر رہے تھے۔ ان میں کچھ سرکاری چور تھے جو مختلف شہروں میں عجائب خانوں کی حفاظت اور دیکھ بھال پر مامور تھے۔ کچھ نمک حرام تھے جو قدیم خاندانی لوگوں کے اسلاف کی یادگاروں اور نشانیوں کو غائب کر کے رب نواز تک پہنچاتے تھے۔

لیکن ان چوروں سے بڑھ کر وہ جعلساز اہم تھے جو نوادرات کی نقل مطابق اصل تیار کرتے تھے' کہتے ہیں کہ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور یہ نقال تو بلاشبہ فنکار تھے۔ ان کی دستکاری میں مہارت پر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جو خداداد ہوتی ہے۔ جیسے مصور پہلی بار ایک شہکار کو اپنے تخیل کی مدد سے تخلیق کرتا ہے پھر اسے دنیا میں جتنے لوگ چاہیں نقل کریں۔ اصل ایک ہی رہتی ہے اور ایک ہی بار بنتی ہے لیکن نقل بنانے والے بھی اپنے کام میں مہارت نہ رکھتے ہوں تو اصل کے مطابق نقل بنا ہی نہیں سکتے۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ آج کے ہنرمند اور فنکاروں کو یہاں میسر نہ تھے اور ان کے فن کا خریدار کوئی نہیں تھا۔ آرٹ اور فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ سازی کا پاکستانی معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا کیونکہ مذہبی نقطہ نظر سے بھی ان کی حوصلہ شکنی کے اسباب موجود تھے۔ آرٹ گیلریاں نہ ہونے کے برابر تھیں اور وہاں ایک مخصوص دولت مند طبقے کے افراد خصوصاً خواتین کو یہ موقع فراہم کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ ذوق کی نمائش اور تشہیر کر سکیں اور کچھ غریب فن کاروں کی سرپرستی فرما کے علم و فن پر احسان فرمائیں۔ موسیقار اور گلوکار کا یہ حال تھا کہ انہیں اکثریت حقارت سے مراثی کہتی تھی اور نچلی ذات کا مانتی تھی۔ کچھ فلمی موسیقار نسبتاً خوش حال تھے۔ عوامی میلوں ٹھیلوں والے خاصا کما لیتے تھے مگر وہ طے شدہ طور پر کنجر اور مراثی تھے۔ رہے گنتی کے چند استاد تو ان کی گزر اوقات ریڈیو' ٹی وی یا پرائیویٹ محفلوں کی پرفارمنس پر تھی۔

بڑے مصور یورپ میں مارکیٹ تلاش کر لیتے تھے اور وہیں رہنا چاہتے تھے۔ فنکار اور موسیقار بھارت کا رخ کرتے تھے اور ہنرمند ہاتھ کا کام کرنے والے بھوکے مر رہے تھے۔ لکڑی پر کندہ کاری کرنے والے' پیتل کے ظروف پر نقاشی سے جادو جگانے والے۔ قالین میں گل بوٹوں اور نقوش سے لازوال رنگ بھرنے والے۔ کیلی گرافی سے قرآنی آیات کے حسن کو نکھارنے والے۔ یہ سب مزدور سے بھی کم اجرت پا رہے تھے کیونکہ ان کا کام مشینیں زیادہ صفائی' تیز رفتاری اور کم لاگت پر کر رہی تھیں۔

چنانچہ ان میں سے کچھ کی معاشی مجبوریوں نے انہیں EXPLOIT ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجرموں کے مددگار بن گئے تھے۔ پیٹ میں روٹی نہ ہو تو فن کی آبرو' حب الوطنی اور اخلاقیات کے اصول سب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ رب نواز جیسے وطن فروش اور ضمیر فروش انہیں اتنا پیسہ دے رہے تھے کہ زمانے سے شکایت رکھنے والے فنکار باغی ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے ضمیر کے بدلے اپنے لیے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے دنیاوی آسائشوں کا سودا کر لینا عقلمندی سمجھا تھا۔ پاکستان واپس جا کے مجھے ان لوگوں کا سراغ لگانا تھا۔ مجبوری میں کیا جانے والے جرم کی سنگینی کو کم مانا جا سکتا ہے مگر جرم بہرحال جرم رہتا ہے۔

میں نے بہت کم وقت میں ایک مخصوص جرائم پیشہ گروہ کے راستوں کا سراغ دیکھ لیا تھا۔ مجھے ابتدا سے انتہا تک ان کے ٹریک اور آپریٹرز کے روٹ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب مجھے شاہ عالم بن کے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ اب میرا شاہ عالم ہونا میرے مقاصد کے خلاف اور میرے عزائم کے منافی تھا۔ مجھے شاہ عالم کے اور اس کے مجرم ٹولے کو ہدف بنانا تھا۔ یہ کام شاہ عالم نہیں اس کا کوئی دشمن ہی کر سکتا تھا۔

وقت آگیا تھا کہ شاہ عالم کی پہلی موت کو آخری موت کر دیا جائے۔ وہ جو مر کے بھی زندہ کہلاتا تھا' ایسے مر جائے جیسے سب مرتے ہیں۔ آج تک اس کے نام کو میں نے ہی زندہ رکھا تھا مگر اب میرے لیے اس دہری شناخت کے عذاب کو ختم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس ڈرامے کا آخری سین بھی مجھے ہی پیش کرنا تھا۔

میں نے شاہ عالم کی لندن میں موجودگی کے ثبوت اور گواہ پیدا کر لیے تھے۔ میرے پاس شاہ عالم کے وجود کے دستاویزی ثبوت' اس کے شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس اور ٹریول ڈاکومینٹس کی صورت میں موجود تھے۔ میں نے اس کے نام سے ایک گھر حاصل کر لیا تھا جو کرائے پر تھا چنانچہ کرائے نامے میں اس کا نام مع ولدیت موجود تھا۔ اس مکان کو میں شاہ عالم کی ذاتی ملکیت قرار دے چکا تھا اور رب نواز اس سازوسامان سے بھرے گھر کو دیکھتا تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی شک نہ ہوتا کہ یہ سب میرا نہیں ہے۔

اب ضرورت تھی ایک ایسی عورت کی جو خود کو شاہ عالم کی منکوحہ کہلانے پر راضی ہو اور اس ڈرامے کے آخری سین کو اختتام تک پہنچا سکے۔ یہ کام مشکل تھا۔ غیر اخلاقی تھا۔ خطرناک تھا اور ہمت کے ساتھ ذہانت کا متقاضی تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ جو عورت میرا ساتھ دیتی اس کے لیے جھوٹ کے ایک کھیل میں شریک ہونے کے سوا کوئی رسک نہیں تھا۔ اسے میرے ساتھ بیوی کا رول کرنا تھا مگر یہ خطرہ نہیں تھا کہ کسی مرحلے پر میں حقیقی شوہر کی طرح حقوق زوجیت کا مطالبہ نہ کر بیٹھوں۔ اس کے جھوٹ سے دنیا کے کسی فرد کو نقصان پہنچنے کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ بعد میں جو بھی کرنا تھا' مجھے کرنا تھا۔ اسے طے شدہ معاوضہ لے کر الگ ہو جانا تھا۔

سوال یہ تھا کہ ایسی عورت کون ہوگی اور کہاں ملے گی؟ اس کے لیے میں اخبار میں اشتہار تو دینے سے رہا۔ میں جانتا تھا کہ پیسے کی قوت خرید میں سب کچھ ہے اور مجھے منہ مانگی قیمت دے کر اپنے مطلب کی عورت ضرور مل جائے گی لیکن مسئلہ وہی تھا کہ اسے تلاش کیسے کیا جائے اور کہاں؟ اگر دس عورتوں میں سے انتخاب کرنا پڑے تو وہ دس عورتیں کون ہوں گی اور میں اپنی پوزیشن کو قانونی طور پر محفوظ رکھنے کے لیے اس انتخاب کا جواز کیا پیش کروں گا۔ کیا کہانی سنا کے ہر عورت کو قائل کروں گا کہ پوری چویشن کو سمجھ لے اور پھر اس کام کے لیے ہامی بھر لے۔ معاوضے کی تو کوئی بات نہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیسے کے لالچ میں دس کی دس عورتیں اس کام کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان میں کون سب سے بہتر ہے؟ یہ کیسے معلوم ہوگا؟ کوئی بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ گھبرا کے بھاگ نہ جائے۔ دھوکا نہ دے اور الٹا مجھے بلیک میل نہ کرے۔ ان سب باتوں کا کیسے پتا چلے گا؟

بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے جوا کھیلنا ہوگا اور بہت کچھ تقدیر پر چھوڑنا پڑے گا۔ مجھے اس عورت کو ہر مرحلے پر سمجھانا ہوگا اور گائیڈ کرنا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک اچھا فلم ڈائریکٹر کسی نئی فلم کے سیٹ پر ایک نئی ایکٹریس کو سمجھاتا ہے۔

مگر گھوم پھر کر بات اسی ایک بنیادی اہمیت کے حامل سوال پر آ کے رک جاتی تھی کہ اس ایکٹریس کو میں کہاں سے لاؤں۔ کس سے کہوں کہ اس تلاش میں میری مدد کرے۔ میں تو کسی کو رازدار بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک عورت کے سامنے اپنا پورا پلان رکھنے کا رسک لیا جا سکتا تھا۔ یہ چیلنج کسی اوپن میرٹ سلیکشن کے لیے پیش ہونے والی دس عورتوں کے سامنے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں ایک منتخب ہو اور نو مسترد تو وہ چلی جائیں سیدھی پولیس کے پاس۔

سوچتے سوچتے اچانک مجھے قادر بخش کا خیال آیا۔ وہ حرام زادہ صحیح معنوں میں دلال اور عورتوں کا سپلائر تھا۔ اس کے بارے میں میری معلومات کا ذخیرہ فی الحال صرف فردوس اور اس کی ماں تک محدود تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ عرصہ دراز سے اس کاروبار میں مصروف ہے اور ایسی بہت سی عورتوں کو جانتا ہوگا جن کو وہ پاکستان سے لا کے یورپ یا مشرق وسطیٰ کی مارکیٹ میں پہنچا چکا ہوگا۔ ممکن ہے یہ کام وہ ریکروٹنگ ایجنٹ بن کے کرتا ہو یا اسٹیج آرٹ پروموٹر بن کے۔

مجھے معلوم تھا کہ دنیا بھر میں ریکروٹنگ ایجنسی کے نام پر بردہ فروشی کا دھندا کتنے منظم انداز میں چل رہا ہے۔ بیرون ملک ملازمت دلوانے کا جھانسا دینے والے جب ریالوں اور ڈالروں کی بے حساب آمدنی کا ذکر کرتے تھے تو مفلسی کی چکی میں پسنے والی ہزاروں لاکھوں عورتوں کی آنکھوں میں خواب کروٹیں بدلنے لگتے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ باہر پرائیویٹ نرسنگ یا گھریلو خادمہ بن کے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ ٹیوٹر اور سیکریٹری جیسے نام بھی دھوکا دینے کے لیے استعمال ہو رہے تھے اور پی آر اسسٹنٹ' پرسنل ایڈوائزر' ہیومن ریلیشن منیجر جیسے پرکشش متاثر کن فرضی عہدوں کے نام ہیں۔ یہی حال ان کا تھا جو فنکاروں کے گروپ بنا لیتے تھے' دنیا بھر میں اسٹیج شو پیش کر کے پاکستانی کلچر اور ثقافت کے نام پر عریانی اور فحاشی سے بھرپور پروگرام پیش کرتے تھے اور فنکاروں کے نام پر پیشہ ور عورتوں کو باہر لے جاتے تھے۔ اس چکر میں کچھ شوقین مزاج یا انتہائی ناسمجھ لڑکیاں بھی پھنس جاتی تھیں جن کا تعلق عزت دار گھرانوں سے ہوتا تھا مگر

عزت کا معاملہ تو کچھ ایسا ہے کہ جب ایک بار خود اتروالی تو پھر اُتر گئی۔ آدمی جب دیکھتا ہے کہ اس حمام میں تو سبھی ننگے ہیں لیکن ننگا ناچنے کے پیسے ملتے ہیں تو وہ شرم بھی محسوس نہیں کرتا۔

قادر بخش بالکل صحیح چوائس تھا۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرتے ہوئے اس کا نام خود بخود میرے ذہن میں آگیا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ لندن میں وہ دہرے ناموں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پاکستان سے بیویاں ایکسپورٹ کرتے وقت اس کا نام قادر بخش ہوتا ہے لیکن لندن میں وہ شہاب الدین عرف شابو بن کے رہتا ہے۔ دہری شخصیت کا ایک روپ چور دروازے کی طرح تھا کہ اگر کبھی قانون کی گرفت کا اندیشہ ہو تو جس کی شامت اعمال آئے وہ نکل جائے۔

مجھے قادر بخش کا وہ ٹھکانا معلوم تھا جہاں وہ دوسرے کاروبار میں ایک حاجی صاحب کا شریک تھا۔ وہ جگہ میں نے اتفاق سے دیکھ لی تھی۔ نہ چندا کے کپڑے خراب ہوتے، نہ حاجی صاحب ایک ہم وطن کی مدد کے جذبے سے سرشار ہو کے مجھے اپنے اسٹور میں لے جاتے اور نہ وہاں مجھے قادر بخش پھر نظر آتا۔

حاجی صاحب کے اسٹور تک پہنچنے کے لیے میں نے شریفانہ اور معزز حلیے کی اہمیت کو نظر انداز کردیا۔ اس کے ساتھ میں ایک غیر شریفانہ معاملہ کرنے جارہا تھا اور مجھے شرافت کی زبان میں بات ہی نہیں کرنی تھی۔

ٹیکسی نے مجھے اس علاقے میں پہنچادیا مگر میں غلط جگہ اُتر گیا اور اصل جگہ تک پہنچنے سے پہلے کچھ دیر بھٹکتا رہا، جب وہ جگہ سامنے آئی تو میں نے اس پورے منظر کو کسی تصویر کی طرح شناخت کرلیا جو میری یادداشت کے البم میں محفوظ تھی۔ دن کے اجالے میں مجھے "حاجی شیر گل اینڈ شہاب الدین" کا بورڈ بھی نظر آگیا جس کے نیچے سیکنڈ ہینڈ گارمنٹس ڈیلر بھی لکھا ہوا تھا۔

زینے سے تہ خانے میں اترتے ہوئے موڑ پر مجھے دوسرا چھوٹا سا بورڈ نظر آیا جس پر نام کے ساتھ ایک تیر سے "ویر ہاؤس" کی نشاندہی ضروری سمجھی گئی تھی حالانکہ اس زینے سے اترنے والا اور کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ زینے کے اوپر بھی میلے اور پرانے کپڑوں کی بو محسوس ہوتی تھی مگر نچلا موڑ کاٹتے ہی بو اتنی شدید ہوگئی کہ مجھے اپنے وطن کے لنڈا بازار کی وہ دکانیں یاد آنے لگیں جہاں سے بابو لوگ اور کالج میں فیشن کرنے والے لڑکے جینز جیکٹ اور رنگین شرٹس خریدتے تھے تو بار بار دھونے اور پرفیوم چھڑکنے کے باوجود وہ بُو خود اپنا راز افشا کرتی تھی۔

ہال کا منظر وہی تھا جو میں ایک رات چندا کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ تہ خانے کی چھت کی بلندی آٹھ فٹ کے قریب تھی یا شاید اس سے بھی کم۔ اوپر کے حصے میں چھت کے قریب ہوا کو باہر پھینکنے والے دو ہی پنکھے تھے جو اتنے بڑے ہال سے گھٹن کے احساس کو دور کرنے میں ناکام تھے۔

دیواروں پر چاروں طرف دو دو فٹ کی دوری سے لوہے کے پائپ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں کے حساب سے زنانہ اور مردانہ جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دائیں جانب کی دو دیواریں زنانہ کپڑوں کے لیے وقف تھیں۔ اس میں بھی اوپر نیچے کی قطار الگ تھی۔ نچلی دو قطاروں میں بڑے سائز کے کپڑے تھے۔ اسکرٹ، شلوار قمیص سوٹ اور ساڑیاں سب کپڑے دُھلے دھلائے اور استری کیے ہوئے تھے۔ یہ مقامی آبادی کے غریب غربا اور ضرورت مند خریدتے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ولایت پہنچ کے بھی ان کے نصیب نہیں کھلے تھے اور یہاں بھی ان کے لیے سفید پوشی کا بھرم رکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا اپنے وطن میں پھر یہ جلاوطنی کس لیے؟ شاید ایک خواب تمنا کی تعبیر تلاش کرتے ہوئے سات سمندر پار آجانے والے خالی ہاتھ واپس بھی نہیں جاسکتے تھے اور ان کے پاس امید کے سراب کا تعاقب کرتے رہنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

سب سے اوپر والی قطار بچوں کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی اور اس میں مجھے مشرقی لباس کا کوئی نمونہ نظر نہیں آیا۔ نئی نسل جو ولایت میں پرورش پارہی تھی، مغربی لباس کو ترجیح دینے میں آسانی محسوس کرتی تھی۔ اپنے تہذیبی رشتوں سے کٹ جانے کے بعد ان کے لیے ستر پوشی کے معاملے میں صحیح اور غلط کا کوئی بھی مفہوم نہیں رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کا سارا اسٹاک لڑکوں اور مردوں کے کپڑوں کا تھا جس میں زیادہ بڑی تعداد پینٹ شرٹ جینز اور جیکٹ وغیرہ کی تھی مگر خاصی تعداد میں سوٹ بھی نظر آرہے تھے۔ فرش پر ملے جلے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور تین افراد خالص دیسی طریقے پر دھوتی بنیان میں ملبوس فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ان کی چھانٹی کررہے تھے۔

تینوں ماحول کی گھٹن اور آلودگی کو بڑھانے کے لیے سگریٹ کے کش پر کش لے رہے تھے، ان کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے اور اِدھراُدھر پھینکے جانے والے کپڑوں کے ہر چھوٹے ڈھیر میں نوعیت کے اعتبار سے زنانہ مردانہ اور بچکانا کپڑے جمع ہورہے تھے۔ بعد میں ہر ڈھیر کی "کوالٹی" کے اعتبار سے اور سائز کے حساب سے مزید تقسیم ہوتی تھی۔

میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ آفس آخری حصے میں ہے اور اس کو شیشے کی دیوار سے الگ کردیا گیا ہے۔ شیشے پر سرخ رنگ سے حاجی گل شیر اور شہاب الدین اینڈ کمپنی لکھا گیا تھا اور دروازے پر اُردو میں "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" کی چھوٹی تختی صرف ان کے لیے لگادی گئی تھی جو اردو پڑھنے والے دیسی لوگ تھے۔ گوری چمڑی والے انگریز کو از خود اس پابندی سے استثنا حاصل ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں آتا ہی کب ہوگا مگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ حاجی صاحب کے اسٹور سے صرف اپنے انڈین اور پاکستانی سیلون اور بنگلہ دیشی ہی استفادہ نہیں کرتے تھے، مقامی آبادی کے نیگرو ہی غریب نہیں تھے، یہاں مفلس گورے بھی خریداری کرتے تھے۔ وطن سے دولت کمانے کے لیے ولایت جانے والوں کو وہاں فقیروں، آوارہ گردوں اور بے گھروں کی بہت بڑی تعداد کو دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ جہاں وہ امیر بننے گئے ہیں وہاں پہلے ہی غریب کم نہیں۔ مفلس گورے صاحب کا تصور بھی ان کے لیے مضحکہ خیز اور مشکل تھا۔

کسی بے پروا آدمی کی طرح میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اسٹور کا معائنہ شروع کیا تو آفس کا دروازہ ہلا اور میں نے کن انکھیوں سے حاجی گل شیر کو برآمد ہوتے دیکھا۔ میری صورت پر غور کرنے کے بعد اس کا تجسس ایک واضح ناپسندیدگی کی شکن میں ڈھل گیا جو اس کے خط بنے ہوئے ماتھے پر نمودار ہوگئی تھی۔

وہ اپنی تھل تھل کرتی توند کا چربی والا گوشت ہلاتا آگے آیا۔ وہ اندر کچھ کھا رہا ہوگا کیونکہ اس کے جبڑے ابھی تک حرکت میں تھے۔ اس نے بہ آوازِ بلند ایک ڈکار لی اور "الحمدللہ" کہا پھر بولا "او جی، آپ۔۔ خیر سے بڑی مہربانی کی ہم پر۔ یہاں تشریف لا کے قدم رنجہ فرمانے کا شکریہ۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "کیا حال ہے شیر گل؟"

اس نے میرے بے تکلف مربیانہ انداز کو بھی ناپسند کیا "یہاں کیا ہے جی، آپ کے ملاحظہ فرمانے کے لیے۔ ادھر تو چھوٹے اور بے عزت لوگ آتے ہیں۔"

میں نے کہا "بے غیرت بھی آتے ہیں قادر بخش جیسے، بیویاں بیچنے والے۔ پوچھو کون قادر بخش؟"

وہ میرے لہجے سے کھٹک گیا "تم خود ہی بتادو۔"

میں نے کہا "تم اسے شہاب الدین عرف شابو کہتے ہو، تمہارا پارٹنر۔ مجھے وہ نظر نہیں آرہا ہے۔ کیا کسی بیوی یا بہن کا سودا کرنے گیا ہے؟"

حاجی کا موڈ خراب ہوگیا "فالتو باتوں کے لیے ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا "اگر تم نے اونچا بولنے کی غلطی کی تو مجھے بھی آواز کا والیوم بڑھانا پڑے گا اور یہ جو تمہارے ملازم ہیں۔ یہ تمہیں دی جانے والی گالیاں سن کے بہت خوش ہوں گے۔"

حاجی کا چہرہ پُر تشویش ہوگیا "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم آفس میں بیٹھ کے بات کریں؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "چلو جی، جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے تو سمجھ آتی نہیں کہ آپ نے اور میں نے کون سا کشمیر کا مسئلہ حل کرنا ہے بیٹھ کے۔"

آفس میں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہاں ایک لمبی چوڑی میز لگی ہوئی تھی جس پر دو فون رکھے ہوئے تھے اور دو بھنی ہوئی مرغیاں۔ ان میں سے ایک نصف سے زیادہ حاجی کے پیٹ کی دیگ میں منتقل ہوچکی تھی۔ میز کے پیچھے فرش پر ایک بستر لپٹا ہوا رکھا تھا۔ غالباً حاجی اس آفس کو اپنی خواب گاہ کے طور پر بھی استعمال کرلیتا تھا اور میز اس کے لیے بیڈ کا کام دیتی تھی۔

اس نے دوسری طرف ایک پرانی کرسی پر بیٹھ کے بقیہ مرغیوں کو نگلنے کا عمل پھر وہیں سے شروع کیا جہاں سے ادھورا چھوڑا تھا۔ اس نے اخلاقاً بھی مجھے شریک ہونے کے لیے نہیں کہا۔

میں نے کہا "تم حاجی بھی کہتے ہو خود کو اور دھندا کرتے ہو خیرات کے مال کو بیچنے کا۔"

"اجی لعنت خیرات کا مال بیچنے والے پر۔ میں تو نقد خریدتا ہوں نقد۔ ابھی یہ جو لاٹ آئی ہے یہ کپڑے ایک چرچ کے کارکنوں نے اکٹھے کیے تھے۔ وہاں لینے والا تو کوئی تھا نہیں۔ میں نے پچاس پاؤنڈ چرچ کو دے کر لے لیے تو کیا برا کیا۔ انہیں چندے کی ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "قادر بخش کہاں ہے؟"

وہ مجھے گھورنے لگا "اجی لعنت قادر بخش پر۔ میں نہیں جانتا کسی قادر بخش کو۔"

میں نے کہا "حاجی۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں پولیس کے ساتھ آؤں اور پولیس قادر بخش کے ساتھ تمہیں بھی پکڑ کرلے جائے۔ تم اس کے بزنس پارٹنر ہو۔ اس کے ساتھ تم پر بھی بردہ فروشی کا الزام آگیا تو تمہارا یہ دھندا بھی چوپٹ

ہوجائے گا۔ تمہیں کم سے کم تین سال تک جیل کی روٹیاں توڑنی پڑیں تو سوچ لو تمہارا کیا حال ہوگا۔ یہ دیگ جیسی توند سمٹ کر دیگچی بن جائے گی۔"

وہ بولا "پتا نہیں تم شہاب الدین کو قادر بخش کیوں کہتے ہو؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ اتفاق سے میں اور وہ پاکستان سے ایک ہی فلائٹ پر لندن پہنچے تھے۔ اس کے ساتھ دو بیویاں بھی تھیں لیکن یہاں ایک کاؤنٹی جج کے سامنے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ کیا دونوں کا ایک ہی شوہر ہوسکتا ہے؟ کورٹ اسے قادر بخش کے نام سے جانتی ہے۔"

حاجی فکرمند ہوگیا "تم ان کے وکیل ہو؟ جن کو اس نے اپنی بیویاں کہا تھا یا رپورٹ تم نے لکھوائی تھی؟"

میں نے کہا "میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ میں اس مقدمے میں ایک فریق ہوں۔ قادر بخش نے بیٹی کو مسز ٹمپسن کے گیسٹ ہاؤس میں رکھا تھا۔ لڑکی کا نام فردوس ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قادر بخش ان ماں بیٹی کو کیا کہہ کے ولایت لایا تھا لیکن یہاں فردوس ایک کلب اور ہوٹل میں وہی کرے گی جو وہاں اس جیسی بہت سی لڑکیاں کررہی ہیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے فردوس کو مظلوم سمجھ لیا اور قادر بخش نے غنڈوں کی مدد سے اسے زبردستی لے جانے کی کوشش کی تو میں نے مظلوم کی حمایت کی اور ان غنڈوں کو اسپتال پہنچادیا۔ مسز ٹمپسن نے اس کے خلاف ہرجانے کے بہت سے کیس کردیے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس میں خاصی توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ انہوں نے گیسٹ ہاؤس کا ریکارڈ لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔"

حاجی کھانا بھول گیا "وہ کس لیے؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ قادر بخش بہت عرصے سے یہ دھندا کررہا ہے۔ وہ جب بھی پاکستان سے کوئی لڑکی لاتا ہے اسے مسز ٹمپسن کے گیسٹ ہاؤس میں لے جاتا ہے۔ وہاں سب کا اندراج ہے۔ قادر بخش نے کسی کو اپنی بھانجی بتایا تو کسی کو چاچی، مامی۔ گیسٹ ہاؤس کی مالک تو یہی سمجھتی تھی کہ آہستہ آہستہ قادر بخش سب فیملی ممبرز کو لندن لا رہا ہے۔"

"بڑے بڑے حرامی پڑے ہیں دنیا میں... مگر..."

میں نے کہا "اب قادر بخش نے عقلمندی سے کام لیا تو مسز ٹمپسن کا سارا نقصان پورا کرکے عدالت سے باہر ہی کوئی سمجھوتا کرلے گا اور مسز ٹمپسن نے سارے الزامات واپس لے لیے تو شاید وہ سزا سے بچ جائے۔"

خلافِ توقع حاجی کا ردِعمل اتنا شدید نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ کسی غیراخلاقی مگر قانونی طور پر جائز کاروبار میں شریک دو پارٹنرز میں سے ایک کو اچانک پتا چلے کہ دوسرا چوری چھپے انسانوں کی اسمگلنگ یعنی غیرقانونی تارکینِ وطن کو برطانیہ لا کے بیچنے اور جسم فروشی کے دھندے میں ملوث ہے تو اسے اپنی سلامتی کی فکر پڑجائے گی۔ اس کا حیرت، صدمے اور غصے کا ردِعمل انتہائی شدید ہوگا۔

لیکن یہاں صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے حاجی صرف مجھے ٹالنے کے لیے حیران اور پریشان نظر آنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کی ایکٹنگ مجموعی صورتِ حال کے مطابق نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے قادر بخش کے دوسرے دھندے کے بارے میں معلومات فراہم کرکے کوئی انکشاف کا دھماکا نہیں کیا ہے۔ حاجی شیر گل تمام معاملات سے پہلے ہی باخبر ہے لیکن جانتے بوجھتے انجان بننے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے۔

وہ بولا "قادر بخش کو سزا ہو بھی جائے تو مجھے کیا؟"

میں نے کہا "گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے حاجی صاحب!"

"وہ تو ہے لیکن میرا پارٹنر ہے شہاب الدین اور اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا، وہ شریف آدمی ہے۔"

"جیسے شریف آدمی تم ہو" میں نے طنز سے کہا "دیکھو حاجی، میرے سامنے یہ ڈراما مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قادر بخش ہی شہاب الدین ہے۔ اگر میں نے مسز ٹمپسن کو یہ بتادیا کہ قادر بخش دہرا پاسپورٹ رکھتا ہے تو خود کو بچانے کے لیے وہ الزامات واپس نہیں لے گی اور الٹا عدالت میں وہ سب بتادے گی جو ابھی تک اسے معلوم نہیں، پھر پولیس یہاں ضرور آئے گی۔"

وہ چڑ گیا "او جی نہ آئے تو تم لے آنا۔ آخر تم ہو کون؟ کیوں ہمارے پیچھے پڑگئے ہو خدائی فوجدار بن کے۔"

میں نے کہا "میں یہاں قادر بخش سے ملنے آیا تھا۔ تم سے نہیں مگر تم اپنی بات پر اڑے رہے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ مجھے چیلنج مت کرو۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ فردوس نام کی جس لڑکی کو وہ بیوی بنا کے لایا تھا، مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گی۔ میرے پاس اس کلب کا کنٹریکٹ ہے جہاں اسے رکھوایا گیا ہے۔ اس کی ماں کے بارے میں بھی پتا چل جائے گا کہ وہ لندن میں کیا کررہی ہے اور وہ قادر بخش کی سات پشتوں کے بارے میں بتادے گی۔"

اس نے مرغی کی آخری ٹانگ چبا کے ایک گونج والی ڈکار لی "اگر میں اس کا پتا بتادوں، تو میری جان بخشی کردو گے میرے باپ؟"

میں نے کہا "میری تمہارے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔"

اس نے خلال کرتے ہوئے کچھ سوچا "اچھا... یہ لو" اس نے میز کی دراز میں سے ایک کارڈ نکال کے میری طرف پھینک دیا "یہ ہماری ورکشاپ ہے۔"

میں نے کارڈ پر لکھا ہوا پتا دیکھا اور اسے جیب میں رکھ لیا "تمہاری قسمت اچھی تھی حاجی کہ فی الحال میرے پاس وقت نہیں ہے اِدھر اُدھر کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔ میں اس سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "بڑی مہربانی ہوگی جناب کی اگر دوبارہ تشریف کا ٹوکرا اِدھر نہ لائیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی تمہاری یہ کچرے کے ڈرم جیسی توند اور تمہارا کوڑے دان جیسا چہرہ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ سڑک پر ایک سے ایک اچھی صورت نظر آتی ہے۔"

ویر ہاؤس سے ورکشاپ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اب رات ہورہی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا نکال سکتا تھا پھر مجھے وعدے کے مطابق نیلم اور سونی کے ساتھ ڈنر کے لیے جانا تھا۔

پندرہ منٹ کی واک کے بعد میں نے ورکشاپ کو تلاش کرلیا۔ یہ ایک چھوٹی سی سڑک پر واقع نیم تجارتی عمارت تھی۔ اس میں گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ اوپر کی چھ منزلوں پر چالیس پچاس رہائشی اپارٹمنٹ تھے۔ فرسٹ فلور اور دکانوں کے درمیان میزائن فلور تھی۔ اس میں رہائش کی اجازت نہیں تھی۔ یہ جگہ اسٹور کے طور پر استعمال کے لیے نکالی گئی تھی مگر ایشیائی باشندے یہاں بھی "سب چلتا ہے" کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ ہر اپارٹمنٹ کے نیچے والے میزائن فلور کے باہر قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو سائن بورڈ لگایا گیا تھا، اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ یہ کسی کمپنی کا اسٹور ہے چنانچہ قادر بخش کی جستجو میں مجھے بہت سے در کھٹکھٹانے پڑے۔ ایک جگہ میں نے چوڑیاں بنتے دیکھیں۔ دوسری جگہ پشاوری چپل اور سنہرے روپہلے کھسے تیار ہورہے تھے۔ کام کرنے والوں کی صورتوں سے یا حلیے سے ان کی قومیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ انڈین ہیں یا پاکستانی۔ جب میں دستک دیتا تھا تو اندر کچھ دیر کے لیے ایک پُراسرار قسم کی خاموشی چھا جاتی تھی پھر شاید کوئی دروازے کی آنکھ یعنی ڈور آئی میں سے میرا جائزہ لیتا تھا کہ کہیں میں کسی قانون کا نمائندہ تو نہیں ہوں جو تفتیش، پوچھ گچھ کے لیے آیا ہوں۔ پھر یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ یہ تو اپنا ہی کوئی لگتا ہے، ان معاملات کو سنبھالنے کا ماہر دروازے سے باہر آکے مجھ سے پوچھتا تھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے؟

"حاجی شیر گل اینڈ شہاب الدین" کی ورکشاپ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ میری دستک کے جواب میں قادر بخش خود نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر ناگواری کے جذبات نے شکنوں کا جال بچھادیا۔ کچھ دیر ہم کینہ توز نظروں سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ چونکہ کسی تعارف کی ضرورت نہ تھی اس لیے قادر بخش نے ہی پہلا سوال براہِ راست کیا "کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا "تم سے ملنے۔"

"کیا کام ہے مجھ سے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "جیسے کام تم کرتے ہو، ویسا ہی کام ہے۔"

وہ مطمئن نہیں ہوا مگر اس نے دروازے سے ہٹ کے کہا "اچھا آجاؤ۔"

ورکشاپ ایک نیچی چھت والی جگہ تھی جس کا رقبہ شاید سو مربع گز ہوگا۔ یہاں بیک وقت بہت سے کام ہورہے تھے۔ ایک طرف تین پاکستانی کاریگر سلائی کی مشینیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس کپڑوں کے ڈھیر تھے اور وہ غالباً انہیں تراش خراش کرکے قابلِ استعمال بنارہے تھے۔ کسی بڑے سائز کے ڈریس میں سے چھوٹے سائز نکالے جارہے تھے۔ کسی میں سوراخ تھا اسے اوپر ڈیزائن بنا کر چھپایا جارہا تھا۔ ادھڑی ہوئی سلائی رفو ہورہی تھی اور نئے بٹن وغیرہ لگائے جارہے تھے۔ دوسری طرف ٹھیک ہوجانے والے کپڑے دھوکے ڈرائی کیے جارہے تھے۔ دو حضرات بڑے انہماک کے ساتھ اور بہت تیزی سے کپڑوں پر استری پھیر رہے تھے اور ان کے معاون انہیں ہینگرز پر لٹکا رہے تھے۔ وہ سب خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مگن تھے چنانچہ میں نے فرض کرلیا کہ وہ سب اپنے پاکستانی بھائی ہیں۔ یہ ورکشاپ پاکستان میں ہوتی تو کام کے ساتھ لوگ گپ شپ کرتے اور اونچی آواز میں کیسٹ بجاتے مگر یہاں خاموشی ایک ضرورت تھی اور شاید قادر بخش ایک سخت گیر قسم کا سپروائزر بھی تھا۔

یہاں بھی لکڑی اور شیشے کے فریم والا ایک کیبن قادر بخش کا آفس تھا۔ دیواروں کا نچلا حصہ لکڑی کا تھا۔ اوپر کے شیشوں والے حصے سے قادر بخش باہر کا پورا منظر دیکھ سکتا تھا اور ہر کاریگر پر نظر رکھ سکتا تھا کہ وہ کس حد تک حرام

خوری میں مصروف ہے۔ ان شیشوں کے پیچھے پردے تھے جن کو وقتِ ضرورت پھیلا کے پرائیوسی حاصل ہوجاتی تھی۔ دروازے کے بالکل سامنے چھوٹی سی میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف فوم کا گدا دیوار کے ساتھ لگا کے کھڑا کردیا گیا تھا۔ کرسیاں ہٹا کے اسے فرش پر بچھایا جاسکتا تھا۔

میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے کہا "پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں میں تم کو کس نام سے مخاطب کروں؟ تم قادر بخش ہو یا شابو؟"

اس نے دروازہ بند کردیا "دیکھو شاہ جی۔ کیا تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میری جگہ تم ہوتے تو اپنا کام نکالنے کے لیے سب کچھ کرتے لیکن ڈرو نہیں، میرے لندن آنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ یہاں جتنے بھی پاکستانی ہیں ان سب کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی دھندے بند کرادوں۔ یہ کام برطانیہ کے بادشاہت والے نظام کو صدارتی نظام میں بدلنے سے زیادہ ناممکن ہے۔"

اس کے چہرے پر کچھ آسودگی آئی "شاہ جی، آپ تو بڑے معزز آدمی ہو، بڑے مانے ہوئے سیاست داں ہو اور میں نے سنا ہے پاکستانی سیاست دانوں کی طرح مال بھی خوب کمایا ہے آپ نے اس پیشے میں... کروڑ پتی ہو۔"

میں نے اس کے نیم خوشامدانہ لہجے پر غور کیا۔ "اس میں تھوڑی بہت سچائی ہے۔ میں سیاست داں تھا لیکن بڑا مانا ہوا کبھی نہیں تھا اور اب تو سیاست سے بھی توبہ کرچکا ہوں۔ مال میں نے سیاست سے نہیں کمایا۔ میرا اچھا خاصا بزنس تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا اور کنسٹرکشن کا۔ یہاں لندن میں بہت سے لوگ جانتے ہیں مجھے۔ ان میں ایک جی ہے۔ تم نے اس کا نام سنا ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "لندن میں ایک ہزار جی ہوں گے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "شاید زیادہ مگر اس کا ایک بہت بڑا بار، نائٹ کلب اور کیسینو ہے۔ ایک اچھی خاصی بڑی مافیا کو کنٹرول کرتا ہے اور انڈر ورلڈ میں اس کے نام کی خاصی ویلیو ہے۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا "ضرور ہوگی۔ اب آپ بتاؤ کہ میرے جیسے معمولی آدمی سے آپ کو کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "قادر بخش۔ اب تک تم پاکستان سے کتنی عورتوں کو اسمگل کرچکے ہو، اندازاً؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے ایک عورت چاہیے۔"

وہ چونکا "آپ کو عورتوں کی کیا کمی۔ لندن میں ہر رنگ نسل اور عمر کی مل جاتی ہے۔ آسانی سے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک پیپر میرج کرنی ہے، تم سمجھتے ہو نا؟"

اس نے سمجھنے کے انداز میں سرہلایا "کاغذات میں دکھانے کے لیے؟"

"ہاں اور دنیا کو دکھانے کے لیے۔ اسے تقریباً چھ مہینے میرے ساتھ گزارنے ہوں گے، میرے گھر میں۔"

وہ مسکرانے لگا "پھر کاغذی شادی کیوں کہتے ہو اسے؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ درحقیقت ہم میاں بیوی نہیں ہوں گے۔"

"وہ تو ہے۔ چھ مہینے بعد آپ اور وہ اپنے اپنے راستے... لیکن۔"

میں نے کہا "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اسے ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔"

وہ ہنسنے لگا "لگاؤ گے تو کون سا وہ گھس جائے گی اور وہ برا کب مانے گی، ویسے پتا نہیں کیا سمجھے۔"

"صاف کہو نا کہ مجھے نامرد سمجھے گی۔ یہ سب میں اسے سمجھادوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ عورت سمجھ دار ہونی چاہیے۔ چھ مہینے تک اسے میری بیوی کا رول کرنا ہے۔ ایسے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ صورت شکل، عمر اور تعلیم سب ایسی ہو کہ وہ میرے جیسے شخص کے ساتھ واقعی بیوی لگے۔ نوکرانی یا داشتہ نہ نظر آئے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ میرے لیے مصیبت نہ بنے۔ کبھی غلط توقعات وابستہ نہ کرے اور کبھی مجھے بلیک میل کرنے کا نہ سوچے۔"

وہ سوچ میں پڑگیا "پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ساری عمر کے لیے بھی غلامی قبول کرسکتی ہے عورت لیکن جو آپ چاہتے ہو، اس کے لیے مناسب عورت..."

میں نے کہا "بے شک اسے اچھی اداکارہ ہونے چاہیے۔ اسے میرے ساتھ ہر جگہ جانا ہوگا۔ لوگوں سے ملنا ہوگا۔"

اس نے چٹکی بجائی "لو جی حل ہوگیا آپ کا مسئلہ۔ آپ نے اداکاری کی بات کی تو مجھے ایک دم یاد آگیا۔ بالکل آپ کے مطلب کی ہے مگر ذرا مہنگی پڑے گی۔"

میں نے کہا "اگر وہ مجھے مطمئن کرسکتی ہے تو میں اسے یقیناً خوش کردوں گا مگر وہ ہے کون؟"

"ایکٹریس ہی ہے بلکہ تھی۔ ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تھی۔ ایک دو فلموں میں بھی آئی تھی۔ یہاں آئی تھی

کسی ثقافتی طائفے کے ساتھ۔ ایک پاکستانی بزنس مین اس پر عاشق ہوگیا اور اس سے شادی کرلی۔ اپنی طرف سے اچھا ہی سوچا تھا اس نے کہ شوبزنس میں کیا رکھا ہے، بدنامی کے سوا۔ اپنا گھر بسانے کا موقع مل رہا تھا، اس نے فائدہ اٹھایا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ بزنس مین پہلے ہی دو شادیاں کرچکا تھا۔ ایک بیوی پاکستان میں تھی، دوسری یہاں۔ پاکستان والی تو اللہ میاں کی گائے تھی جو گھر کے کھونٹے سے ایسی بندھی ہوئی تھی کہ سینگ بھی نہیں ہلاسکتی تھی۔ یہاں والی نے ہنگامہ کردیا۔ تیسری شادی مشکل سے چھ مہینے چلی پھر اس نے حق مہر ہاتھ پر رکھا۔ تین بول طلاق کے بولے اور گھر سے نکال دیا۔ بے چاری اِدھر اُدھر بہت بھٹکی۔ قانونی طور پر بہت کچھ کرسکتی تھی مگر اس کی مدد کسی نے نہیں کی۔"

میں نے کہا "وہ واپس پاکستان کیوں نہیں گئی؟"

"وہاں زیادہ بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا منگیتر ایک پٹھان تھا۔ سرپھرا یا غیرت مند۔ کچھ بھی سمجھ لو۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب بھی موقع ملا اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اس کا ایک بھائی تھا۔ وہ افغانستان میں روسیوں کے خلاف جہاد کرنے چلا گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ اس نے کسی ذریعے سے مجھ سے رابطہ کیا کہ اس کی ماں کو اور ایک بہن کو لندن لانے کا بندوبست کردوں۔"

"اور تم نے یہ نیک کام کیا، فی سبیل اللہ؟"

وہ کچھ جھینپا "پیسہ تو اس کے پاس اتنا نہیں تھا۔"

"پھر؟ تم نے قیمت کیسے وصول کی؟"

"بس ایسے ہی مگر... میں نے اس کا کام کیا۔ اس نے احسان کا بدلہ چکادیا۔ کرائے کا بندوبست پاکستان میں اس کی ماں نے مکان بیچ کے کیا تھا۔ میں ان کو یہاں لے آیا۔ بہن تو یہاں آکے چھ مہینے میں بے قابو ہوگئی۔ آج کل کسی کلب میں ویٹریس ہے۔ شراب پلاتی ہے دن میں۔ رات کے لیے گاہک پھانس لیتی ہے۔ بہن سے کوئی تعلق نہیں۔ ماں بے چاری نے بڑے صدمے جھیلے۔ آدھی پاگل پہلے ہی ہوگئی تھی، یہاں آکے پوری ہوگئی۔ کسی پاگل خانے میں اس کا علاج ہورہا ہے مگر وہ اب کیا ٹھیک ہوگی۔ مرجائے گی وہیں کسی روز۔ بیٹی پر بڑا بوجھ ہے کیونکہ علاج بہت مہنگا ہے۔ بڑی پریشانی میں مبتلا ہے۔ چاہے تو چھوٹی بہن کی طرح اچھی کمائی کرسکتی ہے، صورت اچھی دی ہے خدا نے۔"

میں نے تلخی سے کہا "کیا تم نے اسے یہ مشورہ دیا تھا؟"

"دیا تھا۔ لیکن... وہ کسی اور چکر میں تھی۔ مجھ سے شادی کرنے کے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ چار بچے ہیں پاکستان میں۔"

میں نے کہا "دوسری شادی ایسے حالات میں گناہ تو نہیں؟"

"ہاں مگر اس جیسی عورت کے ساتھ اپنا گزارا مشکل تھا۔ آپ چھوڑو یہ ساری باتیں۔ جاکے اس سے مل لو۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے اس کا؟ کہاں رہتی ہے؟"

وہ بولا "نام تو ہے گلاب جان مگر ٹی وی اور فلموں میں روشنی کے نام سے آئی تھی۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک رومنگ ہاؤس میں رہتی ہے۔ عورتوں کا ہاسٹل سمجھو۔ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ وہاں کچھ پاکستانی لڑکے آگئے۔ انہوں نے روشنی کو پہچان لیا اور اس سے فری ہونے کی کوشش کی۔ دو پاکستانی سیلز مین بھی ہیں وہاں۔ انہوں نے منع کیا تو مارپیٹ ہوگئی۔ انتظامیہ نے روشنی کو نکال باہر کیا۔ آج کل پتا نہیں کیا کرتی ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں ضرورت مند ہیں اور ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔"

روشنی کا پتا بہت آسان تھا لیکن ابھی اس سے ملنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ جتنا میں اس لڑکی کے بارے میں سوچتا تھا، اتنا ہی مجھے یقین آتا جاتا تھا کہ شاید قدرت بھی میری مدد کررہی ہے کہ میری تلاش کو آسان کردیا۔ بظاہر روشنی میری توقعات پر پوری اترتی دکھائی دیتی تھی۔ اگر وہ ایکٹریس تھی تو اس کے لیے حقیقی زندگی کا یہ رول کرنا بہت آسان تھا جس میں اسے اسکرپٹ کے بغیر اور ریہرسل کیے بغیر آزادانہ اداکاری کا مظاہرہ کرنا تھا اور بیوی کا رول غالباً واحد رول ہے جو ہر لڑکی بڑی کامیابی سے نبھالیتی ہے خواہ وہ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ، دیہاتی ہو یا شہری۔

روشنی کے بارے میں ایک قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اس نے اشد ضرورت کے سوا اپنی بہن کی طرح خود فروشی کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا تھا اور صرف دولت کما کے عیاشی سے زندگی گزارنے کے لیے اپنے جسم کو کیش نہیں کرایا تھا۔ بے شک مجبوری حالات نے ایک مرحلے پر اسے اتنا بے بس کردیا تھا کہ وہ قادر بخش جیسے شخص سے سمجھوتا کرنے پر تیار ہوگئی تھی مگر یہ گناہ بھی اس نے اپنی ماں اور بہن کی زندگی بچانے کے لیے کیا تھا۔ یہ ایک قربانی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں